دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2011
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

چینی تلک چینی — منزہ علی — 11
تو دین کی سرحد سمیانیوں کی جانب اچا کی جمع تمام تہمتیں اچانک لٹ گئیں

طمع بے کنار — کاشف زبیر — 16
سمندر کی آغوش میں بہت کچھ کھو دینے اور پالینے والے کرداروں کا سفر

آزادی جرم — مریم کے خان — 63
خیرہ کن آزادی کا حصول کی تمنا کرنے والوں کے لیے ... صرف ایک داستان

جڑواں شادی — منزہ امام — 77
لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے والی پر مزاح و شگفتہ تحریر

سونے کی کان — صفیہ انور — 85
دلوں کے لین دین کا انوکھا اور عبرت اثر احوال

للکار — طاہر جاوید مغل — 88
محبت کے مقابل ایک عیار شخص کی چھیڑ ... اسے اپنے شوق کی جنگ کا سامنا تھا

اونچی بولی — تنویر ریاض — 131
اب ودریا پاٹ رہ جانے والے سودائی کا ڈرامائی انداز

شکست — آصف ملک — 141
پُر اسرار ماحول کی پروردہ ... ایڈونچر سے بھرپور کہانی

شکار — بابر نعیم — 155
اپنی ذہانت میں کامیابی سے شکار کر لینے والے شکاری کا المیہ

کہانی کار — محسن آزاد — 161
ایک کہانی کار کا قصہ جو افسوس چہرہ صورت کامیابی کی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا

گرداب — اسما قادری — 172
تقدیر کی تیغ کی زد میں قسمت کی آنکھ مچولی تقدیر کا کھیل تلے اور جھگڑ جانے والوں کی کہانی

بازی — جمال دستی — 201
سراغرساں کو پیش آنے والے عجیب و غریب کیس کے پیچ و خم

خوف پیما — ظفر سعید یوسفی — 211
خوف و دہشت اور انسانی نفسیات کی باریکیوں کا احاطہ کرتی تحریر

خود کردہ — رضوانہ منظر — 225
طاقت کے زور پر فتح حاصل کرنے والے تین ساتھیوں کا قصہ

نیکی کا صلہ — محسن علی — 227
جب کوئی صورت باقی نہ رہے تو بساط اس طرح بھی الٹ جاتی ہے

چھٹکارا — علی نعیم — 238
چند ساعتوں میں پلٹ جانے والی بازی عشق کا فسانہ

طلسم خواب — نسیم فاروقی — 241
نازک جذبوں سے لبریز دو محبت کرنے والوں کا عبرت اثر احوال

معما موت — حسام بٹ — 268
ایک لاش کی بازیابی سے شروع ہونے والی پُراسرار و سنسنی خیز سروری کہانی

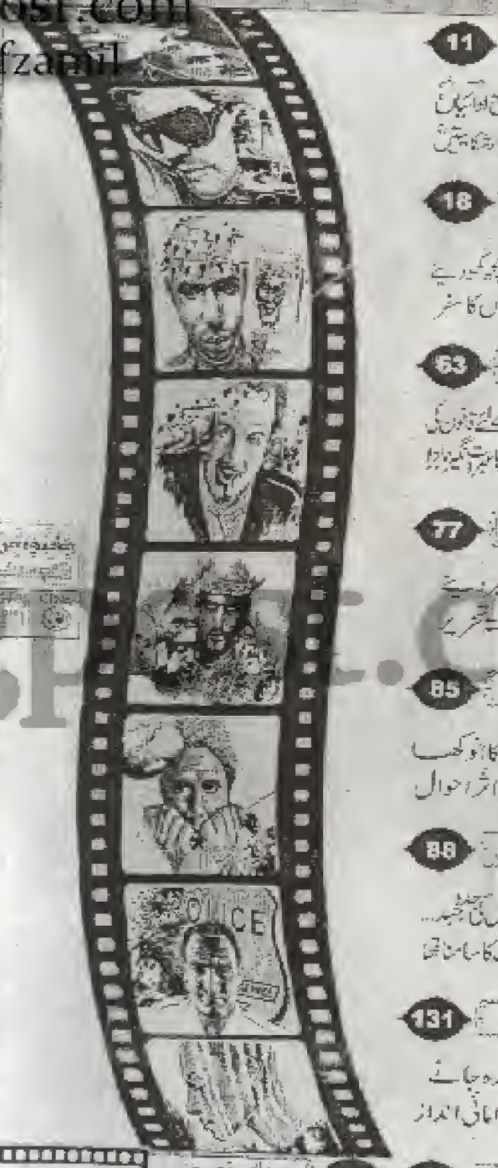

مدیر اعلیٰ
منزہ امام

جلد 40 • شمارہ 04 • اپریل 2011ء • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021)35802551 فیکس (021)35895313 E-mail: jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اپریل 2011ء کا شمارہ پیش خدمت ہے... کئی سال پہلے معروف فکاہیہ شاعر پروفیسر عنایت علی نے کرکٹ ورلڈ کپ کے ایک موسم میں بہت خوب بات کہی تھی!

ذرا ورلڈ کپ ہوجائے تو اس کے بعد دیکھیں گے...

تو جناب یہ بات آج بھی ویسی ہی تروتازہ ہے جیسی کہ پہلے دن تھی اور... یہ بات کرکٹ ورلڈ کپ کے ہر موسم میں سچ ثابت ہوتی رہے گی۔ ایک دو ہفتے گزر گیا اور ابھی لگ بھگ دو ہفتے باقی ہیں شائقین کرکٹ کا بخار چڑھتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اس بار پاکستانی ٹیم کی اب تک کی کارکردگی واقعی بہت خوب رہی... کوارٹر فائنل میں پاکستان کی شاندار فتح اور ویسٹ انڈیز کی شکست نے صرف کرکٹ کے متوالوں کو ہی نہیں، پوری قوم کو خوشی سے سرشار کر دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس بار ورلڈ کپ شروع ہونے سے پہلے ہی پاکستانی شائقین برملا ٹیم کی کارکردگی کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے پھر رہے تھے مگر اب ان کی تحسین کارکردگی پر لوگ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں... سیمی فائنل اور فائنل... بس یہ آخری دو مرحلے باقی رہ گئے ہیں۔ اب تک جو کارکردگی پاکستانی ٹیم نے دکھائی وہ واقعی لائق تحسین ہے۔ امید ہے ورلڈ کپ کے بعد بھی وہ اسی جذبے کو برقرار رکھیں گے۔ دعا کرتے ہیں کہ خدا اس بار ورلڈ کپ کو ایک بار پھر ہمارے وطن عزیز کا مقدر کر دے۔

اس دعا کے ساتھ اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں... اور دیکھتے ہیں کہ آپ خواتین و حضرات کیا سوغاتیں لائے ہیں۔

علی آتش، کی سرمہری قصور سے "اس بار جاسوسی کے لیے بارش کے دوران بک اسٹال کے اتنے چکر لگائے پھر بھی اس ماہ جاسوسی نمبر 4 مارچ کو ملا۔ سب سے پہلے بازار میں ہی کھڑے ہو کر محفل میں [illegible] بہت برا ہوا لیکن اس نے [illegible] کے ساتھ جو کیا اور دوسروں کے ساتھ کرکے مجرم کا پتا چلانے کی کوشش کر رہی تھی وہ بھی بہت غلط تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی [illegible] بہترین تحریر تھی۔ پھر واپس محفل [illegible] کی طرف بڑھتے۔ [illegible] دعا ہے کہ [illegible] پوری دنیا کے مسلمانوں کی اس وقت [illegible] کے ساتھ ہیں۔ کرسی صدارت پر اعجاز احمد براجمان تھے۔ تبصرہ گزار [illegible] پھر بھی مبارک باد۔ [illegible] صاحب آپ اپنی تصویر بھیج دیں۔ [illegible] ضلع [illegible] سے ہے لیکن آپ صنف کرخت سے تعلق [illegible] سرورق پر نوجوانوں کی تصویر [illegible] نہیں آسکتی۔ سید محی الدین اشفاق ہم تو آپ سے کئی دور ہیں، اس کا مطلب تو یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا ہر تبصرہ شائع ہونا چاہیے۔ نعیم احمد ہاشمی، نوری اے کا مختصر تبصرہ اور محمد سلیم کے تبصرے بہترین تھے۔ باقی تبصرے بھی ٹھیک ہی تھے۔ تصویر [illegible] صاحب! آپ کو کیا ہوا؟ آپ تو لگاتار غیر حاضر ہونے لگی ہیں۔"

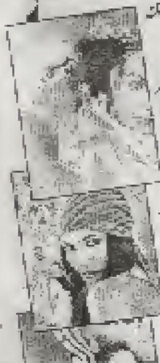

مہر اسیال ایڈ پر بیٹھے سیال کی امیدیں انگیں منڈی بہاؤالدین سے "دو مارچ کی سہ پہر بارش اور کیچڑ میں بھیگ کر گھر پہنچے تو جاسوسی کو اپنا منتظر پایا۔ سرورق پر چمکتے ہوئے چہرے والی چڑیل نما حسینہ شاید اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اف! کیا ڈھال دیکھ کر تو ہماری ہنسی ہی گم ہو گئی [illegible] گرین اینڈ وائٹ [illegible] کا شخص ایک نیم حسینہ کے ہاتھوں میں چھوڑ کر دوسرا نہ جانے کہاں لے کر جا رہا تھا۔ بزم محفل مستی میں اترے ہوئے۔ مسٹر عاجز! [illegible] کی بادشاہی مبارک ہو۔ نجاز احمد آپ کی بے گناہ [illegible] پر بہت افسوس ہوا۔ ہاشمی صاحب! کوئی بات نہیں، پہلا قدم آپ اٹھائیں اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی باشعور ہو جائیں گے۔ یہ ہم بھول رہے تھے کہ آپ کا دل تو صنف نازک سے بھی نازک ہے۔ اس لیے ایسے کام آپ کے لیے [illegible] ثابت ہوں۔ بات ختم پھر کرتے ہیں آجاتی ہے کہ

ہر کسی کو خواہش ہے روشنی کی مگر
سوال یہ ہے پہلا دیا جلائے کون...

سفیان ہاشمی! آپ ڈائجسٹ پڑھتے وقت دماغ اور آنکھیں بھی کھلی رکھا کریں۔ ابھی تو کچھ ہی وقت گزرا ہے، ایک خاتون سراغ رساں کی اسٹوری پڑھتے ہوئے جس میں شاید ہالی وڈ کے ڈائریکٹرز کا ذکر تھا۔ (بالکل درست کہا آپ نے...) بشریٰ و تمر، کہاں غائب تھیں۔ باقی خطوط میں سعید، شاہد، عائشہ اور آمنہ کے تبصرے بہت پسند آئے۔ محمد قلائی سیالکوٹ کی جانب [illegible]

digestpk.blogspot.com

دنیا بھر سے اچھے برے انسانوں کی
سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں،

ماہنامہ سرگزشت

منفرد و خاص شمارہ

پراسراریت نمبر

حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کر دیں جن کا کوئی علمی جواز نہ ہو مگر وہ زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں...

اپنے سحر میں جکڑ لینے والی پراسرار، انوکھی اور محیر العقول سچ بیانیاں، قصے اور کہانیاں

تحقیقی مضامین سے سجا ایک ایسا خصوصی شمارہ جو سرگزشت ہی پیش کر سکتا ہے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے

ترکتیں بہت فضول لگیں۔ بڑی حیرانی ہوئی تابش کو ثروت کے بجائے سلطانہ کے نام کی مالا جپتے ہوئے دیکھ کر۔ گرداب میں اسے ہی اب ہمیں بطور ہیرو بالکل بھی پسند نہیں رہا۔ بیرسٹر [illegible] کی تصویر واقعی جچتی رہی۔ اس نے کافی ہوشیاری سے اداکاری کی لیکن پاپا رازی تو بلی سے بھی شاطر نکلا۔ رازدوست میں سوریٹا کی بے رخی بہت بری لگی۔ باپ کا کیا بھرا ان کے سامنے آیا۔ [illegible] کی ذہانت اور میت کی چالاکی سے مجرم اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ [illegible] پڑھ کر مزہ آیا۔ خود اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ ریحانہ نے مسعود کی چال اسی پر الٹ دی۔ اس سے صنف نازک کی ذہانت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ [illegible] نے بہت اچھا کیا۔ ہمارے خیال میں فراز کو اس سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے تھی۔ ویسے کہانی مجموعی طور پر اچھی رہی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں کیونکہ سب پاکستانیوں کی توجہ کا مرکز آج کل ایک ہی ہے۔ یعنی ورلڈ کپ۔ (یقیناً) انشاء اللہ آئندہ بھی اسی طرح انکل کی اجازت سے حاضری دیتے رہیں گے۔"

ہنوں سے ہمایوں سعید راج کی آمد" کرکٹ کا موسم ہے۔ ایک طرف تو کرکٹ بخار نے ادھ موا کر رکھا ہے تو دوسری طرف جاسوسی کے انتظار نے۔ ڈاکٹر انکل نے اس بار خوفناک قسم کا ٹائٹل بنایا جو ذرا بھی نہیں بھایا۔ عاجز بھائی آخر آپ کس سے اتنے عاجز ہیں۔ اور تم مرضی نویس بھی ہو پہلے کیوں نہیں بتایا بے ایمان آدمی۔ [illegible] صنف نازک پر دیوان لکھنے کے لیے صنف مخالف ہونا شرط ہے اور آپ کے نام سے تو ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ میر جی! گرداب کے متعلق کچھ بھی کہنے سے قبل آپ کو دوسرے دوستوں کے جذبات کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ [illegible] ہم آپ کی خوش فہمی پر [illegible] صورت کو سلامت دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے [illegible] زبردست تبصرہ کیا ہے۔ سلیم جی کیا آج کل ہر کوئی ڈیکی کیوں لگانا چاہتا ہے۔ [illegible] کہاں گم تھیں آپ؟ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ [illegible] صاحب کا کردار ایک لڑکھڑاہٹ سے اور بھی مضبوط ہو گیا۔ ایک لغزش [illegible] اپنے ہاتھ پیلے کرنے زبردست۔ [illegible] چودھری کے ہاتھوں میں آتے آتے نکل گئی اور شاید آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

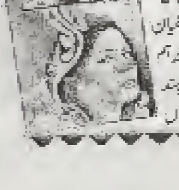

اور عائش کی سلطانہ سے محبت اور توجہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ پہلا رنگ زہر بلے پنچے تحریر اسلام حسین کی تھی۔ کیپٹن سلیم اور بدری کی مہم جوئی خوب تھی۔ سنہری زور کیپٹن کو ملا دیتے تو اچھا تھا۔ اسلام حسین کا عدالتی تحریر سیم قدرتی جیسا تھا۔ دوسرا رنگ ابھی دو دو تحریر سلیم انور کی تھی۔ کافی اچھی تحریر تھی۔ دولت نے بھانجے کو خالہ کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ شیام اور گوپال کا مقابلہ اچھا تھا۔ گرداب نے تو گھما کے رکھ دیا ہے۔ اسلمی! آپ نے شہریار کی شادی ڈاکٹر ماریا سے کروا کر ظلم کیا ہے۔ وہ بانو بے۔ ادھر ماہ بانو چودھری کے چنگل سے نکل کر ڈاکوؤں کے ہاتھ چڑھ گئی ہے آخر میں ماہ بانو پھر سے کسی مصیبت میں پڑ گئی ہے۔ جس کو ہم کہانی کا ہیرو سمجھتے تھے انعام صاحب نے اس کی شادی کروا دی ہے۔ باقی جاسوسی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا ابھارتے گا۔"

دلنشین بلوچ کی افسردگی تیکسلا سے "مارچ کا شمارہ ہاتھ میں لیے افسردہ ملول بیٹھی ہوں۔ اپنے محنت و محبت سے لکھے گئے تبصرے کے بری طرح ریجیکٹ ہونے کا بہت افسوس ہے۔ مارچ کا شمارہ 4 مارچ کو ملا۔ آج 7 مارچ ہے۔ تین دن سے میں نے کسی سے بات نہیں کی۔ دل رنج و غم اور غصے کی کیفیت میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ میں نے ان 5 ماہ میں دو بار ریجیکٹ ہونے کا دکھ اٹھایا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر لیٹر میں کوئی غلطی ہوتی ہے تو پلیز بتا دیا کریں۔ بلیک لسٹ میں ہی کسی نام تو لکھ دیا کریں۔ سب کے سب شامل تھے، سب چہک مہک رہے تھے، آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ٹائٹل پر بلیک بیوٹی تھی۔ ہیرو کو اس دفعہ مردوں کے بے حد اصرار پر نمایاں مقام مل گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی لٹیرا پڑھی۔ کہانی میں کئی جھول تھے۔ پسند نہ آئی۔ بینا کی فضول ہی سیکنڈ تیری تھی۔ اس کے بجائے مجرم کو پکڑنے کے اور کئی طریقے تھے جیسے کہ بینا کی دوست یا باپ بھائی مدد کر سکتے تھے جبکہ اس کے پاس لٹیرے کی واضح نشانی بھی تھی۔ پھر خواہ مخواہ دلدل میں گرنے کا فائدہ۔ انتقام میں امینہ آرا کی روح نے مرنے کے بعد بھی انتقام لے لیا۔ واقعے کو کئی سال گزرنے کے بعد بھی مجرم کو چین نصیب نہ ہوا۔ قانون شکن میں بہروز نے بتا دیا کہ اپنے بھائی گیری کے مجرم کو قانون کے مطابق سزا دلوائی۔ ہلکی پھلکی تحریر جس نے آخر تک تجسس برقرار رکھا۔ آبلہ پا میں گھگر نے آہستہ آہستہ سفر کرتے کیلی کے مجرم پر بیسے کو گرفتار کروایا لیکن معاوضے سے محروم رہا۔ گرداب جو کہ شروع سے کی جان ہوا کرتی تھی، اب وہ بیت کی طرف گامزن ہے۔ ماہ بانو اغوا تو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن اس میں قصور کس کا اور کیا مطلب سراسر اس کی اپنی بے وقوفیاں ہوتی ہیں۔ پچھلی بار اغوا ہونے والی جتنی تفتیش کھنگال لیں اس میں اس نے خود ہی کہا کہ کیسے مجھے اغوا کرو۔" (جب ہمیں خط موصول ہی نہ ہوا تو اسے بلیک لسٹ کی زینت کس طرح بنا سکیں؟)

غلام اللہ ضلع کرک سے لکھتے ہیں "میں 1997ء سے جاسوسی کی زلفوں کا اسیر ہوں۔ (اب تک کتنی بڑھ چکی ہیں؟) اس وقت میں پہلی جماعت کا طالب علم تھا۔ اپنے پیاروں کی اس پیاری محفل میں بارہا شرکت کا شرف حاصل ہے لیکن چاند رات جو ختم ہونے پر دل جو دکھ اجھیوں میں چلا گیا اور مجنوں کی طرح صحرا کی خاک چھانتا مقدر ٹھہرا۔ بہت عرصے سے جاسوسی سے ناتا ٹوٹ گیا تھا لیکن جاسوسی تھا تو میرا اپنا پیارا بھلا کیسے کوئی اپنا پیار بھول سکتا ہے۔ 4 فروری 2011ء کو اچانک ایک بک اسٹال پر جاسوسی سے آنکھیں چار ہو گئیں تو نظر ہٹانا ہی بھول گیا۔ ایک بار پھر دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آج اتنے برس بعد ایک بار پھر محفل یاراں میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ ہمارے پیارے پیارے دوست مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ (خوش آمدید) سب سے پہلے ٹائٹل پر موجود دوشیزہ کی طرف نظر اٹھی جو گھرے بالوں کے ساتھ سر اٹھائے آنکھیں پھر رہی ہے کہ جو بیگ مجھے ملنا چاہیے تھا وہ شرارتاً کہ ہو جائے گا۔ محفل بھی وہ ہی تازگی میں چھوڑ سکا۔ پھر اپنی محفل میں قدم رکھا تو ہر طرف پیارے پیارے تبصروں کے ساتھ پیارے پیارے چہرے ہنستے کھیلتے نظر آئے۔ سب سے پہلے اعجاز احمد صاحب کا دیدار نصیب ہوا جو دکٹری اسٹینڈ پر حیران و پریشان کھڑے سوچ رہے تھے کہ بھلا مجھے یہاں صدارت کی کرسی پر کس نے بٹھایا۔ واہ رے قسمت، بہرحال اعجاز صاحب دل سے مبارک باد قبول کریں۔ سب کے تبصرے اچھے لگے۔ محفل یاراں سے رخصت ہو کر اپنے پسندیدہ رائٹر طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار کی طرف دوڑ پڑے۔ وقتی اس بار مزہ آیا۔ شکریہ مغل صاحب تھوڑا بہت رومانس شامل کرنے کا۔ عمران کا کردار بہت زیادہ پسند آیا۔ گرداب بھی اچھی کہانی ہے لیکن شہریار کا کردار جان دار لگا۔ ماریا سے شادی کر کے شہریار نے ماہ بانو کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ ماہ بانو کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ لٹیرا ایک زبردست شاہکار تھی جو ہمارے معاشرے کے ان بھیڑیوں کی عکاسی کرتی تھی جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے گھناؤنے کاموں سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ چاہے کسی کے جذبات بھی مجروح ہو جائیں۔ رنگوں میں دوسرا رنگ ابھی دو دو زبردست شاہکار تھی۔ دوسرے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔"

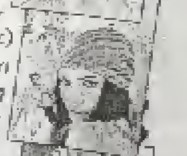
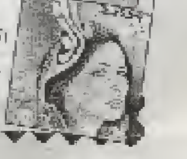

رضا عمی کی محبت گوجرانوالہ سے "اس دفعہ سرورق عجیب سا تھا۔ حسینہ کسی آسیب کے زیر اثر لگ رہی ہے۔ کئی مہینوں سے اس بزم رنگ و بو میں شرکت کی خواہش مچل رہی تھی مگر مصروفیت آڑے آتی رہی۔ وہ بھی ایک وقت تھا کہ ہم دو دن میں رسالہ ختم کر دیتے تھے مگر ابھی پچھلے رسائل ہی زیر مطالعہ ہیں۔ ایک اور بات بتاتے چلیں کہ پچھلے مہینے گیارہ فروری کو عارف شادی سرانجام پا گئی ہے۔ (بہت مبارک) میرا ارادہ ہے کہ بیگم کو بھی جاسوسی پر لگا دینا چاہیے تاکہ ایک اور قاری کا اضافہ ہو جائے۔ (واہ کیا بات ہے آپ کی) اس کے علاوہ تیرہ مارچ کو میری سالگرہ کا دن بھی ہے۔ (ہماری طرف سے ڈبل مبارک باد) محفل کا ماحول بڑا خوش گوار تھا۔ اعجاز احمد کو وکٹری سیٹ مبارک ہو۔ اچھا تبصرہ تھا۔ گل رانا کیا آپ کے نانا جان اب بھی جاسوسی پڑھتے ہیں؟ سیدہ حرا گیلانی! آپ گرداب کے پیچھے کیوں پڑ گئیں۔ ام ثمامہ آپ بہت اچھی تبصرہ نگار بن گئی ہیں۔ سفیان ہاشمی کی انٹری زبردست رہی۔ گرداب میں شہریار کے مثبت پہلو نے کافی حیرت زدہ کیا۔ نکار بھی زبردست جا رہی ہے۔ عمران کی انٹری نے کہانی کو خوش گوار ٹچ دیا ہے۔ ایچ اقبال کی لٹیرا ابھی زبردست رہی۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ انٹری دیں گے۔" (ضرور.... انتظار رہے گا)

سعید عباس کا جادو جلال پور سے "مارچ کا چمکتا دمکتا شمارہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل کچھ خطرناک تھا۔ لڑکی نے اپنے منہ پر انگلی رکھی ہوئی تھی جیسے پیچھے سے کسی چڑیل نے اس کے بال کھینچ رکھے ہوں۔ سائڈ والے دوست کا منہ اپنے کھلا ہوا

تھا جیسے اس کے سامنے کوئی جن آ گیا ہو اور بریف کیس اٹھائے جو دوست کھڑا تھا وہ اپنے چلا رہا تھا جیسے آج کل کے باپ مگر چلاتے ہیں۔ محفل میں پہنچے تو ہمیں یقین تھا اس بار بھی ہمارا خط ضرور شائع ہو گا لیکن ہمارا تو دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ حتیٰ کہ انکل کی مہربانی دیکھیں، ہمیں بلیک لسٹ کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ انکل! ایک تو آپ کہتے ہیں خط 5 تاریخ کو ارسال کر دیا کریں پھر مجھے سمجھ نہیں آتی میرا خط کہاں گیا؟ (یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم) اسے پوسٹ کی خرابی کہوں یا قسمت کی خرابی۔ غصے سے میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اسی خیال میں، میں آ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے موٹر سائیکل دے ماری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بڑا رنگ تھا لیکن خط شائع نہ ہونے والی وجہ سے میں اپنا سارا غصہ اس پر اتار دیتا لیکن جب پرانے دوستوں میں بشریٰ افضل کی جھلک دیکھی تو سارا غصہ ختم ہو گیا۔ میں التجا کرتا ہوں ان دوستوں سے کہ وہ لوٹ آ جائیں۔ مس گلنار وکیل بھار، رضوان یوسف، معدیہ جاجا، شیخ امیاں، راحت چودھری، توثیق چودھری، شجاع چودھری تا نام تو اور بھی بہت زیادہ ہیں اگر ساروں کے نام لکھے تو شاید پھر انکل ہمارا خط شائع نہ کریں۔ سفیان ہاشمی! پہلے آپ یہ تجربہ کریں۔ اس کے بعد میں کوشش کروں گا۔ سمیعہ لیاقت علی کے تبصرے پر ہنسی آ گئی، کیا خوب تبصرہ تھا۔ عائشہ رانی ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو کافی صحت یاب کر دے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے نکار پڑھی۔ یہ کیا مغل صاحب! کہانی کا یہ کیا حال کر دیا ہے آپ نے کہ کردار بڑھائے جا رہے ہیں۔ اب ایک اور کردار نوری کہاں سے آ گئی۔ اب آتے ہیں گرداب کی طرف۔ گرداب میں وہی ظلم و ستم، ماہ بانو ایک بار پھر خطرے میں ہے۔ شہریار کی شادی ماریا سے چاہ کر بھی رائٹر کہانی کے ساتھ کیا گل کھلائے۔ آخر پچھلی بھی اقساط کو دیکھیں تو یہ کہانی زبردست جا رہی تھی۔ اب کہانی کا موڑ ہی کچھ اور ہے۔ رنگوں میں پہلا رنگ اسلام حسین کے قلم سے لکھی گئی داستان کافی اچھی تھی۔ کہانی پُر مزاح تھی اس لیے کہانی چہرے پر ہنسی بکھیر گئی۔ دوسرا رنگ سلیم انور کی محنت سے لکھا گیا کافی خوب صورت اور دلکش تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں رضوانہ منظر کی انتقام بہت ہی ہولناک اور ڈرا دینے والی کہانی تھی۔ اس کے بعد لٹیرا پڑھی جس کے لیے زونگ والوں نے تعاون کیا تھا، وہ بھی دل کو چھو گئی۔"

ایم احمد ہاشمی ضلع بونیر سے لکھتے ہیں "مارچ کا شمارہ 4 تاریخ کو موصول ہوا۔ بہار کے موسم اور دم جھم برستی بارش میں جاسوسی ڈائجسٹ کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ٹائٹل بالکل ہی پسند نہیں آیا۔ اس لیے ٹائٹل کی شان میں قصیدہ لکھ کر آپ کے کاغذ، اپنی سیاہی اور قارئین کے قیمتی وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس دفعہ جوہر آباد سے اعجاز احمد عاجز صاحب پہلے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔ بہت بہت مبارک باد۔ بی بی آمنہ پٹھانی! اس میں بھلا شک ہی کیا ہے کہ میں پٹھان ہوں لیکن آپ نے آج تک یہ وضاحت ہی نہیں کی کہ آپ کہاں کی پٹھانی ہیں؟ آپ تو مجھے اصلی کیا نقلی پٹھانی بھی نہیں لگتیں اور آپ نے ظاہر کر دیا کہ میں بھی اصلی مقلدی بن گئی ہوں تو اس کے لیے ڈھیروں مبارک باد۔ سمیعہ لیاقت! بہت لکھیں گا کہ ہم آپ کی باتوں سے مرعوب ہو جائیں گے۔ اعجاز قریشی صاحب! ابھی آپ بروقت بے حد تجربے، سچے ہیں کیا وجہ ہے؟ وہیں آپ کا تبصرہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ بہت خوب۔ کہانیوں کی ابتدا گرداب سے کی۔ بہادی! آپ نے تو صحافت کا حق ادا کر دیا۔ شہریار کو یوں لگ رہا ہے کہ ہو جو کچھ بھی دانا ہے وہی بات ہے۔ ماریا کے ارادے مجھے ٹھیک نہیں لگتے۔ پھر وہی بات سامنے آگئی ہے کہ ... [illegible] ... چودھری نے جس طرح ماہ بانو کو ... [illegible] ... معلوم نہیں پھر کون سی افتاد پڑنے والی ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی لٹیرا ایک منفرد کہانی تھی۔ ایس پی کی عجلت کے لیے اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ گرمی کی دھوپ چھاؤں کی طرح۔ اس کہانی کا تیور بہت سلو ہے۔ ... یہ کہانی ایک ہی ٹریک پر چل رہی ہے۔ پہلا رنگ زہر بلے پنچے، اس کہانی کو ہم اس ایک مناسب کہانی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ دوسرا رنگ زبردست ثابت ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اصل پیشہ بہترین تحریر تھی۔ دولت کی ہوس نے مسعود کو بیوی کے ساتھ ساتھ بچے سے بھی محروم کر دیا۔ رضوانہ منظر کی انتقام بھی اچھی تحریر تھی۔ امینہ آرا بہت اچھا ہوا۔ اس کے برعکس اس کے عاشق پر بے حد غصہ آیا۔ ایک گناہ کو چھپانے کے لیے دوسرا گناہ کر بیٹھا۔ قانون شکن بھی بہترین کہانی تھی۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

اعجاز احمد کی رائے ساہیوال سے "سرورق پر موجود گم صم اور بکھری زلفوں والی حسینہ شاید یادِ ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔ زلف پریشاں میں پھنسا آدمی بھی تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک بندہ بریف کیس پکڑے لٹک رہا تھا۔ سرورق پُراسرار لگا۔ ہوا میں جھکتی شاخوں پر مستی سے جھومتے پھول اور پھولوں کی خوشبو سے مدہوشی میں ناچتی ہوئی تتلیاں ہمیں موسم بہار کا سندیسہ دے رہی ہیں۔ یہ پھولوں کے مہکنے اور کلیوں کے چٹکنے کے دن ہیں۔ یہ مسرتوں کے لمحے ہیں لیکن اس دل کا کیا کریں جس میں مدت ہوئی خزاں کی رُت اداسیوں کا موسم ٹھہرا ہوا ہے۔ پھر ہمارا بہار سے کیا واسطہ؟ (آپ یاسیت اچھی نہیں) محفل بہاراں میں باغباں محفل کے طور پر اعجاز احمد عاجز موجود تھے۔ بہاروں کے اس موسم میں ہماری طرف سے بھی مبارک باد۔ وہ تاپ گل رانا! دل سے مشکور ہوں آپ نے ہمیں یاد رکھا۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ سفیان ہاشمی اینڈ بشریٰ افضل ویلکم بیک۔ ام ثمامہ کا تبصرہ دل کے تاروں کو چھیڑ گیا۔ محمد سلیم تیجی! گزری سے کبھی کسی حسینہ کی آنکھوں میں دوبئے کی غلطی نہ کرنا کیونکہ... سیدہ حرا گیلانی فرام لاہور، ماہ بانو اور شہریار کی وجہ سے گرداب تک بہار ہے۔ اتنا مختصر اور غصے سے بھرا تبصرہ وہ بھی سمیعہ لیاقت علی سندھو! اپنی تحریفوں میں مصروف نظر آئیں۔ یعنی اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات۔ عائشہ رانی فرام ملتان! ڈاکٹر شکیل کوثر کی سیدھا کرنے کا مشورہ دیں۔ نوید براہوی! آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔ سیدہ محی الدین اشفاق! میں بھی آپ کے خیال سے متفق ہوں۔ یقیناً سرورق پر کسی 40 آدمی کی تصویر ہونی چاہیے۔ (کافی مشکل ہو جائے گی) ایم احمد ہاشمی کا پُر لطف تبصرہ اچھا لگا۔ محفل میں بابر عباس، ایس ایس ناز، مجاہد سعید محمد نعمان کی کمی محسوس ہوئی۔ سب

سے پہلے لانا پڑی تھی۔ عمران نے کہانی میں سنسنی پیدا کر دی ہے۔ کہانی اب نئے رخ پر چل رہی ہے۔ ایک طرف عظیم تی اور دوسری طرف جنوبی گروپ۔ گرداب میں پھنسے شہریار پر بڑا ترس آیا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے۔ ماہ بانو تو چوہدری کی اسیری سے نکل کے ایک اور گرداب میں پھنس گئی۔ لگتا ہے جینز اور ٹی شرٹ والا آدمی ماہ بانو کی مدد کرے گا۔ لٹیرا موجودہ معاشرے کے عین مطابق لکھی گئی کہانی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ آخر خواہ کی بیٹی کو دولت ہونے کے جرم کی سزا کب تک بھگتنا پڑے گی؟ سرورق کے رنگوں میں انجمی ذوالفقار کی کہانی میں موجود تمام اختر ہوگی ذہانت متاثر کر گئی۔ گوپال کی کامیاب پلاننگ کو شیام نے اپنی ذہانت سے ناکام کر دیا۔ دولت حاصل کرنے کے لیے انسان کیسے کیسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ اس موضوع پر لکھا گیا رنگ زہر ملے پنچے اچھا لگا۔ حالات کے گرداب میں پھنسی کلی کو بدر اور سلیم نے نکال دیا۔ مختصر کہانیوں میں قانون شکن میں حیدر کی کار فیلڈ نے اپنے بھائی کے مشن کو تکمیل تک پہنچایا۔ یقیناً جیت حق کی ہوتی ہے۔ آنے والے وقت کے بارے میں پہلے سوچنے والے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ بچی کچھ یہ ہیر پھیر میں پڑ جاتا آصف ملک کی آبلہ پا میں جذبات پر مبنی اسٹوری پسند آئی۔ دکھاوے کی محبت، دولت کا لالچ اپنے آپ پر اعتبار۔ اپنے موضوع پر لکھی گئی اچھی تحریر تھی۔ ریٹائرڈ زبردست کہانی تھی۔ یقیناً ہمیں سب کہہ دینا چاہیے، چاہے وہ ضمیر کی آواز ہو یا دل کی صدا۔ ایک رائے اگر آپ کو بری نہ لگے۔ مختصر کہانیوں کو کم کر کے قسط وار کہانیوں کے ایک دو صفحات زیادہ کر دیں۔"

اورنگا عامر کی شمولیت لاہور سے ”اس بار ٹائٹل بالکل پھیکا سا تھا۔ آخر ماہ مارچ کو سمیٹا ہے تو گل کو رنگوں سے سجا دیتے یا ایک عدد حسین سا پھول ہی بنا دیتے۔ اسد قادری صاحب! گرداب کو حقیقت کے قریب رہنے دیجیے اور ہمارے پسندیدہ کرداروں کو بھی ہنس کھیل لینے دیجیے۔ اس ڈیزی میں اگر برائی ہے تو اچھائی بھی بہت ہے۔ یہ اچھائی ہی ہمارے ملک کی سلامتی کی ضامن ہے۔ لہٰذا اس کہانی کے کردار کو سلامت رکھیے گا تاکہ ہماری امیدیں نہ دم توڑیں۔ طاہر جاوید مغل، آصف ملک، ضوانہ مظفر اور ایچ اقبال سب میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔"

اے کے بھٹی خانیوال سے اپنی پسند نہ پسند کا اظہار کرتے ہوئے ”پہلی نظر ٹائٹل پیج پر ڈالی پر اس بار کا ٹائٹل پیج کچھ خاص نہ لگا۔ ٹائٹل پیج چھوڑ تے ہی محفل یاروں میں جا پہنچا۔ اعجاز احمد کو کرسی صدارت پانے پر مبارک باد۔ ام ثمامہ کی تخالفی دل کو بھا گئی۔ اس کے علاوہ محمد سلیم اختر تیلانی، آمنہ چغتائی، نوین اسد اور باقی تمام ساتھیوں کی نرم گرم باتوں سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے۔ سرفراز، افضال اینڈ صبا مرزا آپ لوگ اس دفعہ کہاں ہیں...؟ محفل دوستاں کو خیر باد کہتے ہی کہانیوں کی طرف چلے۔ اس بار کی ساری کہانیاں ایک گلدستے میں مختلف قسم کے رنگوں کی مختلف خوشبو بکھیرتے پھولوں کی طرح تھیں۔ ساری کہانیوں میں نکار کی خوشبو سب سے منفرد تھی۔ سو ہم پہلے نکار کی طرف ہی گئے۔ بلانکار ہی گی۔ عمران کی باتوں نے بہت ہنسایا اور شادی کی بہادری بھی قابل داد ہے۔ نکار ختم ہونے کی دیر تھی کہ ہم نے ایک زوردار چھلانگ لگائی پر چھلانگ بھی ادھر کہیں بلکہ گرداب کی طرف تھی۔ ہائے ہائے بیچاری ماہ بانو بہت افسوس ہوا اسے بچ کر سے قید میں پا کے۔ شہریار کی شادی تو مجھے ڈاکٹر بابر کی تیری کو رہ دکھی پلانے کی کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ پھلا رنگ زہر لیے پہنچے کا اختتام کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ اس دفعہ کے بس اتنی امید کرتا ہوں کہ اب کی بار خوش اسلوبی کہیں کی جائے گی۔"

قمر تقی، کہوٹہ، راولپنڈی سے لکھتے ہیں ”مارچ کا شمارہ 4 تاریخ کو کمیٹی چوک سے خریدا۔ سرورق کافی پراسرار اور پچھلے شماروں سے بالکل مختلف اور جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ جلدی جلدی کو پرچیوں میں داخل ہوئے۔ محفل میں اعجاز صاحب کرسی صدارت پر فائز تھے اور ان کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ میری سرورق پر کسی نوجوان کی تصویر روان ہوری کی کی نے حمایت کی اور کسی نے تحریر کے ساتھ سلجھے گی؟ میر دل مانگیں۔ دوسرے نمبر پر موجود ماہ تاب صاحبہ حسب معمول بونگیاں مارنے میں مصروف تھیں۔ (اگر چیک لسٹ میں نام موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کا خط نہیں ملا) سب سے پہلے تیسرا رخ کی جو کہ اسٹوری آف دی منتھ تھی۔ ہیرا اور اس کا انتقام بھی انوکھا تھا لیکن بقول منیر ازہ بابر اور راحیل کے کرداروں نے کہانی میں چار چاند لگا دیے۔ کہانی صرف ہیرو اور ہیروئن ہی نہیں کامیاب بناتے بلکہ دوسرے کردار بھی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں۔ (کچھ میں آئی یہ بات؟) باقی تمام کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ نکار اپنے پورے زور و شور سے آگے بڑھ رہی ہے اور عمران کی واپسی نے کہانی میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ گرداب میں شہریار بھی بالآخر برائی کی دلدل میں پھنس گئے اور اب اس غلطی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ پہلا رنگ مجھ طور پر کچھ نہیں آیا۔ دوسرا رنگ بھی ابتدا میں ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن بعد میں تجسس اور منصوبے کی وجہ سے بہترین ہو گیا۔"

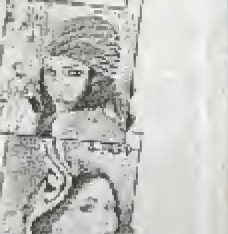

افضال مرزا اینڈ صبا مرزا چکوال سے لکھتی ہیں ”5 تاریخ کو غروب آفتاب کے ساتھ ہی جاسوسی کو چاند سا چہرہ نظر آیا۔ سامنے شکوے شکایتیں ایک طرف رکھ کر ڈائجسٹ کو ہاتھوں میں لیا۔ ٹائٹل کو دیکھتے ہی ہم ڈر گئے۔ لگا کہ کوئی خوفناک رسالہ ہاتھ میں آ گیا ہو۔ اعجاز صاحب اپنے حصے کی مبارک ہم سے بھی وصول کر لیں۔ کیا آپ محفل پر تبصرہ کرنا بھول گئے تھے یا صدارت کی کرسی کا انجام ہو گیا تھا۔ ماہ تاب کی رپورٹ آپ ماہ تاب کے ساتھ وزارت پر کنٹرول سنبھالا ہوا ہے۔ سفیان ہاشمی، ترکی میں رہ کر سے شاید بجلی کا بحران حل ہو جائے لیکن ملوں کا بحران ہمارے کنٹرول سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ بشریٰ آپی! آپ کو دیکھ کر ہم خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ ہماری محفل کی پریاں، جنوں کی طرح قدر غائب ہو گئی ہیں۔ مس اے ناز! کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟ کیوں نہیں آ رہیں؟ تصویر انسن! خیریت تو ہے۔ سب سے پہلے نکار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہیرو بھائی کی زندہ دلی نے ایک بار پھر کہانی کو دلچسپ بنا دیا۔ عمارہ اور نگی بھی نیچے ہیرو کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ گرداب میں کچھ زیادہ ہی گرد و غبار اڑ رہی ہے۔ اسماعیل! ہمارے محفل سنگ مرمر سے بنے سے خواہش ہے کہ شہریار اور ماہ بانو کے درمیان رومانس ہونا چاہیے۔ ایچ اقبال محمد داؤد کی طرح کبھی ہوئی کہانی پڑھنے کو دی۔ لیکن ہماری توقعات کے خلاف افسوس ناک ہوا۔ رنگوں کی دنیا میں پہلے کوئی خاص رنگ نہیں

تھے۔ انجمی ذوالفقار بند کو بھی لگتی کہ گوپال عمر و عیار بنا ہوا تھا۔ ایک طرف خالد کی کار و گل اور دوسری طرف خالد کی کا جوہر۔ مختصر کہانیوں میں تاک جھانک بھی اچھی تھی۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی اٹھکیلیاں ”مارچ کا شمارہ دو تاریخ کو ہمارے گھر تک پہنچا۔ اس دفعہ کا سرورق بالکل بھی جاسوسی کے معیار کا نہ تھا۔ محفل میں اعجاز احمد عاجز صاحب کو میری جگہ لینے پر مبارک باد۔ ام ثمامہ عزیز! اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ یقیناً ڈاکٹر ام ثمامہ ہیں۔ آپ کا شگفتہ سا تبصرہ پڑھتے ہوئے بہت مزہ آیا۔ کہانیوں میں پہلی ملاقات ہمیشہ کی طرح گرداب سے ہوئی۔ سب سے زیادہ مزہ مجھے نکار کی اس دفعہ کی قسط پڑھ کے آیا۔ عمران تعیم اس مقولے پر عمل کرتا ہے کہ جہاں سے گزرو پھول برساتے جاؤ تاکہ تمہیں اپنی واپسی پر بڑی مہربانی دکھائی دے۔ ایچ اقبال کی لٹیرا بھی پسند آئی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ کسی لو اسٹوری رائٹر کا تھا جس نے شراک ہو جو سے زیادہ تین شب کے ناولوں کی یاد تازہ کی۔ گو کہ پلاٹ قدرے پھیکا سا تھا۔ جس ایمپائر کی تحریر تھی۔ دوسرے رنگ انجمی ذوالفقار سے واضح ہوا کہ اختیار، طاقت اور دولت ملنے پر لوگوں کے چہرے بدلتے نہیں بلکہ بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ مختصر تحریروں میں سیما رضا کی ایک تصویر پاپارازی فوٹوگرافرز کے کردار پر روشنی ڈالتی نظر آئی۔ محمد عثمان آزاد کی تحریر رنگوں دوست بے ضمیر امریکیوں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ پرویز ملک سراج ذوالفقار یمن نے بڑی مہارت سے جیزل اور اولوپی کو گرفتار کروایا اور ان سے جو جان بچا کے اکھوں پاسے۔ مریم کے قانون کی قانون شکن تیز رفتار اور سنسنی خیز تحریر تھی۔ آصف ملک کی آبلہ پا جاسوس سے زیادہ متاثر کن تحریر تھی۔"

ملتان سے عائشہ رانی کی شگفتگی ”جاسوسی کے درشن 3 مارچ کو ہوئے۔ اپنی محفل، وہاں تک پہنچے۔ سب کے تبصرے ملاحظہ فرمائے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے ہمارے دوستوں کے دوست اعجاز احمد عاجز صاحب۔ اب یہ کہ میں نہیں آ رہا کہ یہ عاجز! اپنے نام سے ہیں یا دوستوں کے لئے چلیے اور عمیں غلط ہے؟ آمنہ چغتائی اور عائشہ رانی بھی بھی یوں لگتا ہے کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔ ویسے میرے والد صاحب مجھے عائشہ چغتائی ہی کہتے ہیں۔ سید تصور صاحب! بہت خوشی آئی آپ کے اس طرح سوچنے پر کہ ماہ بانو اور شہریار کو بھی مار دیجیے۔ میری رائے بھی تقریباً آپ جیسی ہو گی۔ چلتے ہیں جا بری کو چاکھی کہاں کہاں سے مزید صدمات اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اب یہ مصنف کے ہاتھ میں ہے کہ کب وہ کہانی کا پلٹ دیں۔ نکار میں تابش صاحب کی بہادری اور عمران کی مزاح سے لطف اندوز ہوئے۔ شکر ہے کہ عمران کے کمالات کی وجہ سے سلطانہ کے رویے میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی آئی ہے۔ اب وہ ایک نئی افتاد ان کوگوں پر ٹوٹنے والی ہے۔ دوسرا رنگ بہتر تھی۔ لگتا ہے اگر گوپال کچھ حاصل کرتا تو اتنا درد ناک کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ محبت میں بچا اور کوگوں کو بھی وفا داری دی۔ وہ پہلے نیچے تارل دوست کی گئی میں ہیں۔ گرداب میں ابتدا ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اسلام حسین صاحب کی... بس یہی تو چھ رہی ہوں کیونکہ وہ کی وقت موت کے منہ سے بچا۔ نکار کہانی پڑھی۔ معاشرے سے بہت قریب کی۔ مجھے کہانی کے وسط میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمار کی روشنی کا تیر محمد مسعود کا قاتل وہ دوڑ رہا ہے۔ (والدہ بہت ہی) آپ سب کی دعاؤں کی وجہ سے میری والدہ صاحبہ کی صحت کافی بہتر ہو چکی ہے۔ اللہ پاک انھیں مزید صحت یابی عطا کریں، آمین۔ تمام لوگوں کے لیے کی اپنی والدہ کے سلسلے میں دعا کر دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔"

عبادت کاظمی کی خواہش ”میں جاسوسی ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ (شکریہ) جاسوسی کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے۔ مارچ کے شمارے کی بھی تحریریں اچھی تھیں لیکن گرداب میری پسندیدہ ہے۔ پلیز اسماعیل! شہریار اور ماہ بانو کی شادی کی صورت نہیں ہونی چاہیے۔ نکار میں عمران کی واپسی مبارک ثابت ہوئی ہے اور پلیز اب شازی اور جمیل کی کہانی اپریل میں شامل کریں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکے۔ احمد خان توحید، کراچی۔ ایم وائی، گوجی۔ ملک عتیق مظہر، گجرات۔ ماہ تاب راؤ، رحیم یار خان۔ محسن علی، بالاکوٹ۔ محمد نعمان یارے، تھیہ۔ منظور حسین شاہین، نامعلوم مقام۔ فرید احمد خان، سکھر۔ ایم عزیز اسد، چکوال۔

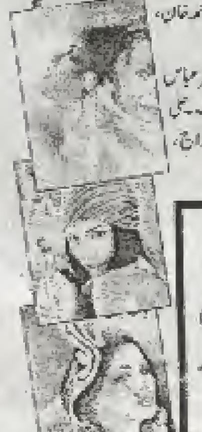

نگر زاک کی مہربانی سے فروری 2011ء کے شمارے پر لکھے گئے تبصرے ہمیں اب موصول ہوئے ہیں۔ ان میں تصویر عباس بابر، اوکاڑہ۔ ماہا ایمان، پنجاب۔ عمر دراز تونسہ شریف۔ انعام محمد، کوٹلہ۔ افضال مرزا اور صبا مرزا، چکوال۔ محسن علی، بالاکوٹ۔ جمی آرٹس، قصور۔ عمیر عباسی عرف شہزادہ، اسلام آباد۔ محمد اسماعیل معاری، پنڈی گھیپ۔ شیخ محمد سجاد تابانی، آزاد کشمیر۔ ہمایوں سعید راج، جتوئی۔ ایم عمران مغل، مروان۔ قمر تقی، کہوٹہ اور نامعلوم مقام سے ایم اے انجم کے خطوط شامل ہیں۔

سانحۂ ارتحال

گوجرانوالہ میں ادارے کے ایجنٹ رحمٰن نیوز ایجنسی کے محترم منظور احمد بھٹی علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا الیہ راجعون) ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

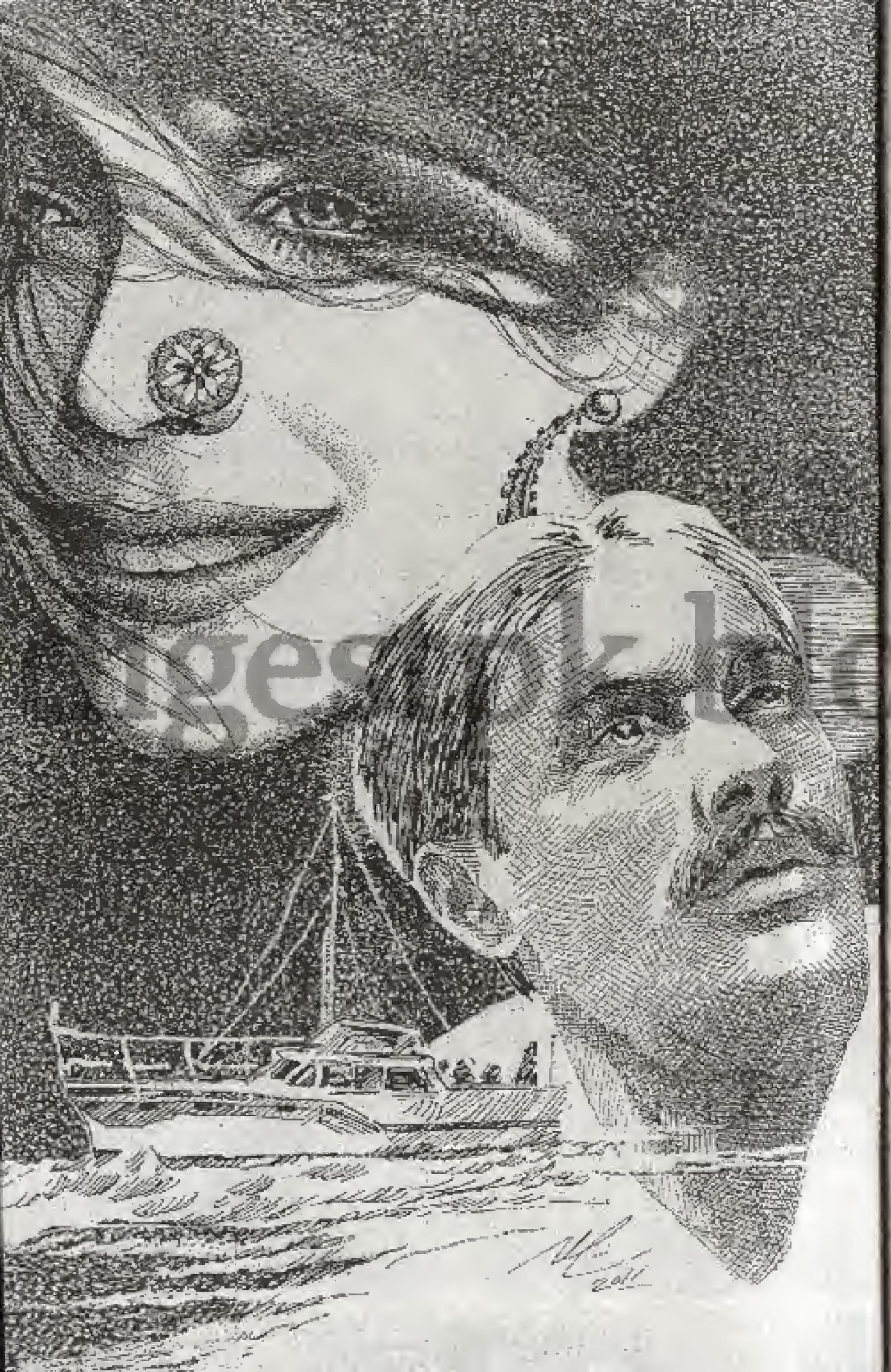

سمندر کی آغوش میں بہت کچھ کھو دینے اور پالینے والے کرداروں کا سفر

طمعِ بے کنار

کاشف زبیر

سمندری بھنور دور سے بہت بھلا لگتا ہے لیکن اپنی زد میں آنے والی ہر جان دار اور بے جان چیز کو بہت بے رحمی سے نگل لیتا ہے... مال و زر کی ہوس ایسے بھنور سے زیادہ طاقتور، ہولناک اور خون آشام ہوتی ہے جو اس کے چنگل میں آجاتا ہے... وہ قتل و غارت اور اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے... یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس دوڑ کا انجام کیا ہوگا... مگر کچھ فرزانے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس گرداب کا ایندھن بننے کے بجائے دور سے جال ڈالتے ہیں کہ شاید کچھ ہاتھ آجائے... ایک ایسے ہی نوجوان کے گرد گھومتی کہانی جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے...

ان دغاباز ساعتوں کی کہانی جب انسانی رشتوں نے اپنا اعتبار کھو دیا

سفید رنگ کی درمیانے سائز کی لانچ کھلے سمندر میں اونچی نیچی لہروں پر دوڑتی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے سامنے والے عرشے پر دو افراد نظر آرہے تھے۔ اس وقت سمندر میں دور دور تک کوئی دوسری بحری جہاز نہیں تھا۔ ان دونوں میں سے ایک نے دوربین لگا رکھی تھی اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''میرا خیال ہے کوئی بوٹ ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔'' اس نے دائیں طرف اشارہ کیا اور دوربین اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دی۔ اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ سمندر میں لہریں معمول سے اونچی جارہی تھیں اس لیے حدِ نظر محدود تھی لیکن جلد ہی دوسرے آدمی کو وہ موٹر بوٹ نظر آگئی جو ان کی کشتی کے دائیں طرف کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور وہ بالکل متوازی چل رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔

''ہاں نظر آئی ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمارا پیچھا کر رہی ہو؟''

''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ خطرہ ہے۔'' پہلے آدمی نے کہا اور دوربین لے کر دیکھنے لگا۔ وہ اچانک اضطراری لہجے میں بولا۔ ''گڑبڑ ہے... بوٹ ہماری طرف آرہی ہے۔ سب کو خبردار کردو۔''

دوسرا آدمی عرشے سے ہٹ کر کشتی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ دو منٹ کے اندر عرشے اور کشتی کے پچھلے حصے میں کوئی نصف درجن مسلح افراد نظر آنے لگے۔ وہ سب خودکار رائفلوں سے لیس تھے۔ اب دوسری کشتی اتنی قریب آگئی تھی کہ بغیر دوربین کے بھی اسے دیکھا جاسکتا تھا۔ دوربین والے آدمی کے حکم پر سب نے مختلف مقامات پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔

کشتی اب کوئی چھ سو گز کے فاصلے پر تھی۔ یہاں کی کشتی سے ذرا چھوٹی تھی لیکن اس کی رفتار بتا رہی تھی کہ اس میں طاقتور انجن نصب ہے۔ اچانک اس کے سامنے والے عرشے پر ایک خانہ سا کھلا اور اس میں سے ایک آدمی اسٹینڈ پر نصب بھاری مشین گن سمیت نمودار ہوا۔ یہ کوئی میکنزم تھا۔ بھاری مشین گن کی جھلک دیکھتے ہی دوربین والے نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا اور انہوں نے اپنی رائفلوں کے دہانے کھول دیے مگر دوسری کشتی ابھی ان کی رینج سے باہر تھی۔ پھر اس سے بھاری مشین گن گرجی۔ برسٹ کا ایک حصہ پانی میں گیا اور دوسرے نے کشتی کا نچلا حصہ چھلنی کر دیا۔ مشین گنر شاید عرشے کو نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن لہروں پر دونوں کشتیاں اس طرح ڈول رہی تھیں کہ درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ آنے والوں کا پلّہ بھاری تھا کیونکہ ان کے پاس بھاری مشین گن تھی۔ دوربین والا اس صورتِ حال پر جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ نیچے کی طرف لپکا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں سے جوابی کارروائی کرنے کو کہہ رہا تھا۔

کشتی کے نچلے حصے میں کئی کیبن بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کیبن میں گھسا اور اس نے الماری کھولی۔ اس الماری میں جدید اسلحہ تھا۔ اس نے ایک دور مار رائفل لی اور اس کا میگزین اٹھا کر باہر کی طرف لپکا مگر اسی لمحے کشتی بری طرح لرزی اور اس نے راہداری میں پانی داخل ہوتے دیکھا۔ کشتی کا نچلا حصہ مشین گن کا نشانہ بنا تھا اور سوراخوں سے پانی اندر آرہا تھا۔ یہ خوف ناک صورت حال تھی لیکن پہلے دوسری بوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہ عرشے پر آیا تو اسے صورت حال کی سنگینی کا درست اندازہ ہوا۔ اس کے دو ساتھی خون میں ڈوبے ہوئے تھے اور باقی بدحواسی کے عالم میں فائرنگ کر رہے تھے جس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے اپنا ساتھی نظر نہیں آیا۔ اس نے چیخ کر اسے آواز دی۔

''منیر... کہاں ہو تم؟''

مگر منیر وہاں نہیں تھا۔ اسی لمحے بھاری مشین گن کا ایک اور برسٹ آکر کشتی پر لگا۔ اس سے انجن متاثر ہوا کیونکہ اس کی آواز بند ہوگئی اور کشتی کی رفتار گھٹنے لگی۔ وہ منیر کو بھلا کر دوسری کشتی کے گنر کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس رائفل کی مار ایک کلومیٹر سے زیادہ تھی۔ رفتار کم ہونے سے کشتی اب زیادہ نہیں ہل رہی تھی۔ اس نے سانس روک کر گنر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ گنر الٹ کر پیچھے گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔

''کیپٹن۔'' دوربین والا غرایا اور اسی وقت کشتی تیزی سے ایک طرف جھکنے لگی۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ دوربین والا دوبارہ نیچے کی طرف بھاگا لیکن جیسے ہی اس نے راہداری کا دروازہ کھولا تو پانی خاصا اوپر تک آچکا تھا۔ اس کے باوجود وہ پانی میں اتر گیا۔ اس کا رخ اس کیبن کی طرف تھا جہاں سے اس نے رائفل لی تھی۔ کیبن میں بھی کمر تک پانی جمع ہوگیا تھا اور اس کی سطح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سرعت سے ایک تصویر تک آیا اور اس نے تصویر اتار پھینکی۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹے سائز کا سیف تھا۔ اس کے سامنے نمبروں والا ڈائل تھا۔ وہ جلدی جلدی نمبر ملانے لگا۔ سیف دہرے نمبر ملانے سے کھلتا تھا۔ دونوں نمبر خاصے طویل تھے۔ اس نے پہلا نمبر ملایا لیکن سیف کے ڈائل سے مخصوص کلک کی آواز نہیں آئی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے دوسرا نمبر ملایا اور سیف کھولنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں کھلا۔ وہ غصے سے مغلظات بکنے لگا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار بھی سیف نہیں کھلا۔ کسی نے سیف کے ساتھ گڑبڑ کر دی تھی۔

دوسری ناکامی نے اسے آتش زیر پا کردیا اور اس نے دیوانہ وار گالیاں دیتے ہوئے تیسری کوشش کی۔ ناکامی اس بار بھی اس کا مقدر رہی۔

تب اس نے دیکھا کہ سیف کے ڈائل کے گرد کوئی جم جانے والی چیز تھی اس نے اسے چھوا تو محسوس ہوا کہ یہ چیزیں جوڑنے والا سلوشن ہے۔ اس نے نمبروں والے حصے کو جام کر دیا تھا، اسی وجہ سے سیف نہیں کھل رہا تھا۔ سلوشن چند سیکنڈ میں پکا ہوجانے والا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ پانی اس کے شانوں سے کچھ نیچے تھا اور اسی لمحے کیبن کی روشنیاں بجھ گئیں۔ کشتی کی بیٹریوں تک پانی پہنچ گیا تھا۔ ایک طرف ہول سے ہلکی سی روشنی آرہی تھی۔ پانی جتنی تیزی سے بڑھ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے وہاں ٹھہرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ مجبوراً وہ باہر کی طرف بڑھا۔ عرشے تک آنے کے لیے اسے پانی میں غوطہ لگانا پڑا۔ جب وہ عرشے پر آیا تو کشتی کا اگلا حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کشتی پوری طرح سمندر برد ہوجاتی۔ اس کے ساتھی نہ جانے کہاں تھے۔ ان میں سے دو تو اس کے سامنے مر چکے تھے اور باقی شاید جان بچانے کے لیے سمندر میں کود گئے تھے۔ اس کے پاس بھی سوائے سمندر میں کودنے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

لیلیٰ بکریاں لے کر ساحل کی طرف جارہی تھی۔ وہ تقریباً انیس بیس برس کی دل کش لڑکی تھی۔ گندم جیسی سنہری رنگت، ہلکے براؤن بال اور اسی رنگ کی آنکھیں... خوب صورت نقوش اور متناسب جسم تھا۔ وہاں جوار بھاٹے کی نمی سے اگ آنے والی جھاڑیوں اور گھاس کی بہتات تھی۔ سورج ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کی روشنی پھیل رہی تھی مگر ساحل پر ابھی ویرانی تھی۔ آج کل سمندر چڑھا ہوا تھا اس لیے گاؤں کا کوئی ملاح اپنی کشتی لے کر نہیں نکلا تھا۔ جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر بکریاں بے تاب ہوگئیں۔ وہ بکھر کر جھاڑیوں پر منہ مارنے لگیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر لیلیٰ ساحل کی طرف بڑھی۔ دور کشتیاں ساحل پر کھڑی تھیں اور سامنے سے بلند ہوتی لہریں آرہی تھیں۔ اچانک لیلیٰ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سامنے ہی ریت پر ایک لاش پڑی تھی۔ لاش کسی مرد کی تھی اور اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ ڈوب کر مرا ہے۔ لیلیٰ پلٹ کر بھاگی۔ وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ بکریوں کو بھی بھول گئی۔ وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی گھر تک آئی اور بدحواسی میں دروازے پر اپنے باپ کریم سے ٹکرا گئی۔

''ارے چھوکری... کیا بات ہے۔ بکری کے باقی دیکھے بغیر بھاگی ہے۔'' کریم بلوچ نے خفگی سے کہا۔ ''ابھی گریں گا تو سر پھٹ جائیں گا۔''

''بابا... لاش۔'' اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔ ''ادھر ساحل پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔''

''لاش۔'' کریم بلوچ چونکا۔ ''لیلیٰ! تیرا مغز پھر گیا ہے یا دن میں خواب دیکھنے لگی ہے۔''

''نہیں بابا! وہاں لاش ہے۔'' وہ اسے یقین دلانے لگی۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' وہ باپ کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساحل کی طرف لے جانے لگی۔ ''بابا! وہ بے چارہ ڈوب کر مر گیا ہے۔ بالکل مر گیا ہے۔''

کریم بلوچ کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے بدستور خفگی سے کہا۔ ''لیلیٰ! تو بالکل پاگل ہے۔ کوئی تھوڑا بھی مرتا ہے کیا؟''

مگر ساحل پر پڑے شخص کو دیکھ کر اسے بھی یقین آگیا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور جسم پر جابجا زخموں کے نشانات تھے۔ خاص طور سے شانے پر بڑا سا زخم تھا۔ کریم بلوچ نے ڈرتے ڈرتے اسے سیدھا کیا۔ لیلیٰ نے چیخ مارنے کی تیاری کی۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کا چہرہ بھی اسی طرح زخم زخم ہوگا مگر پھر اس کا صاف چہرہ دیکھ کر رک گئی۔ چہرے سے وہ بالکل بھی مردہ نہیں لگ رہا تھا۔ کسی خیال کے تحت کریم بلوچ نے اس کی نبض دیکھی اور اچھل پڑا۔ اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

''ارے... یہ تو زندہ ہے۔''

''زندہ ہے۔'' لیلیٰ خوش ہوگئی۔ ''بابا! اسے گھر لے چلو، شاید یہ بچ جائے۔''

کریم بلوچ نے مرد کو اٹھایا اور شانے پر ڈال لیا۔ چوالیس سالہ کریم بلوچ مضبوط جسامت کا مالک تھا اور جفاکشی اس کے وجود میں شامل تھی۔ اس نے بہ آسانی وزنی مرد کو اٹھا لیا۔ اس کا گھر اس چھوٹے سے ساحلی گاؤں کے شروع میں تھا اس لیے کسی نے انہیں نہیں دیکھا تھا ویسے بھی صبح کے وقت لوگ اپنے گھروں میں ہوتے تھے۔ اس شخص کو صحن میں چارپائی پر لٹا کر اس نے لیلیٰ سے کہا۔

''جا کر بڈھے حکیم کو بلالا۔''

بڈھا حکیم گاؤں کا واحد معالج تھا اور جوانی کی عمر سے بڈھا کہلاتا تھا۔ اس کا گھر ان کی گلی میں ہی تھا۔ لیلیٰ نے جاتے ہی اتنے زور و شور سے دروازہ بجایا کہ بڈھا حکیم فوراً باہر نکل آیا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ ''ارے چھوکری... تیرا باپ مرنے والا ہے کیا؟ دروازہ کیوں توڑتی ہے؟''

لیلیٰ نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''بڈھا چاچا... جلدی چلو، بابا نے بلایا ہے۔''

''بابا نے بلایا ہے...'' بڈھا بدستور خفا تھا۔ ''تیرے باپ کا نوکر ہوں جو وہ بلائے تو دوڑا جاؤں؟''

''چاچا! ادھر ایک زخمی ہے۔ سمندر کے کنارے سے ملا ہے۔ اسے دیکھنا ہے۔''

بڈھا حکیم چونکا۔ ''زخمی... کیسا زخمی... کیا ہوا ہے اسے؟''

''چاچا ادھر کھڑا کیا پوچھتا ہے، چل میرے ساتھ۔'' لیلیٰ نے اس کی قمیص پکڑ کر کھینچی۔ بڈھا حکیم اس کے ساتھ چلا آیا۔ وہ اندر آئی تو کریم بلوچ نے اسے آواز دے کر روک دیا۔ وہ چارپائی کے سامنے چادر لیے کھڑا تھا۔ ''ارے لیلیٰ... ادھر مت آنا۔ اس کا کپڑا اتار دیا ہے۔''

''اچھا بابا۔'' وہ صحن کے بجائے اپنے کمرے میں آگئی۔ جفاکش زندگی گزارنے سے اس کا جسم خود بہ خود مضبوط ہوگیا تھا اس کے باوجود اس میں نسوانیت کے سارے پیچ و خم اور نزاکتیں موجود تھیں۔ اس کے براؤن بال کمر سے نیچے تک آتے تھے جنہیں اس نے چوٹی کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے گاؤں کے اسکول سے آٹھویں تک پڑھا تھا۔ اسکول بس یہیں تک تھا اس لیے شوق کے باوجود آگے نہیں پڑھ سکی تھی۔

لیلیٰ کی ماں اس کے بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ اسے ہیضہ ہوگیا تھا اور شہر ان کے گاؤں سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ جب تک کریم بلوچ اسے شہر کے اسپتال... لے جاتا، اس نے دم توڑ دیا تھا۔ کریم بلوچ نے پھر شادی نہیں کی اور لیلیٰ کو ہی اپنی زندگی کا محور بنالیا مگر وہ مرد تھا۔ کام پر جانا اس کی مجبوری تھی اس لیے لیلیٰ کی پرورش کے لیے وہ اپنی رشتے کی ایک پھوپی کو گھر لے آیا جو بیوہ اور بے سہارا تھی۔ اس نے ہی لیلیٰ کی پرورش کی تھی مگر دو سال پہلے وہ بھی گزر گئی تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کریم بلوچ کا کوئی اور رشتے دار نہیں تھا اور اسے لیلیٰ کو اکیلے چھوڑ کر کام پر جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ مگر مجبوری تھی، روٹی بھی تو کمانی تھی۔ پھر لیلیٰ ذرا نڈر لڑکی تھی۔ وہ گھر میں اکیلی رہ جاتی تھی۔ ان کا مکان چھوٹا مگر پکا تھا۔ کریم بلوچ نے اس کی چار دیواری اونچی رکھی تھی۔ لیلیٰ یہاں محفوظ تھی، اس کے باوجود اسے ڈر لگتا تھا۔ جب کریم بلوچ گھر سے باہر کشتی پر جاتا تھا تو اس کا دل لیلیٰ کے لیے پریشان رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد لیلیٰ

digestpk.blogspot.com

کی شادی کر کے اسے رخصت کر دے۔ مگر اسے ابھی تک اس کا کوئی اچھا رشتہ نہیں ملا تھا۔ اس کے جاننے والوں میں کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جس سے وہ لیلیٰ کو بیاہ دیتا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کو اچھا لڑکا ملے اور اچھے لڑکے نایاب تھے یا ان کے مطالبات بہت زیادہ تھے اور کریم بلوچ ایک غریب آدمی تھا۔

لیلیٰ نے اپنا چھوٹا سا کمرا صاف ستھرا اور سجا کر رکھا تھا۔ کریم بلوچ شہر سے آتے ہوئے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک چھوٹا سا بیڈ تھا، ایک الماری تھی اور ایک ریک تھا جس میں اس نے مختلف چیزیں سجا رکھی تھیں۔ دیواروں پر اس نے اللہ اور محمد ﷺ کے نام کے طغرے لگا رکھے تھے۔ مکان میں دوسرا کمرا اس کے باپ کا تھا جو آنے جانے والوں کی بیٹھک بھی تھا۔ اس سے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ اور دوسری طرف غسل خانہ تھا۔ اس سے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ برآمدے کے سامنے لوہے کی مضبوط گرل تھی۔ صحن میں دروازے کے قریب سفیدے کا بڑا سا درخت لگا تھا، اس کی ایک شاخ پر لیلیٰ نے جھولا ڈال رکھا تھا۔ اس کے نیچے ہی وہ اپنی چند بکریاں اور دو بکرے باندھ کر رکھتی تھی۔ بکریوں سے انہیں دودھ مل جاتا تھا اور کبھی بچہ ہو جاتا تھا تو کریم بلوچ اسے بیچ کر اس سے ملنے والی رقم سے لیلیٰ کی شادی کے لیے کوئی چیز لے آتا تھا۔ بہت تھوڑی سی خواہشات تھیں اور بہت سادہ سی زندگی تھی۔

لیلیٰ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اسے بے تابی تھی کہ زخمی کے بارے میں جان سکے۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ یعنی سمندر میں کیسے گرا اور اس کا تعلق کہاں سے تھا؟ ان سارے سوالوں کے جواب اسے کریم بلوچ سے مل سکتے تھے۔ وہ حکیم کے ساتھ مل کر زخمی کو صحن سے اس کمرے میں لے گیا تھا اور وہاں سے بڈھے حکیم کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کریم بلوچ کو ہدایات دے رہا تھا۔ کریم بلوچ نے آ کر لیلیٰ سے کہا۔ ''پانی گرم کر کے دے۔''

''ابھی دیتی ہوں بابا۔'' لیلیٰ لپک کر اٹھی۔ کریم بلوچ والا کمرا باورچی خانے کے ساتھ تھا۔ وہاں جاتے ہوئے لیلیٰ نے چند نظر سے کمرے میں دیکھا تو اسے زخمی نیچے چٹائی پر لیٹا دکھائی دیا۔ اس کی کمر تک ایک چادر تھی اور کشادہ سینے پر کئی جگہ زخموں کی سرخی تھی۔ شاید اسے آبی جانوروں نے کاٹا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی شیو تھی اور لمبے بال شانوں تک آ رہے تھے۔ اس کی عمر شاید تیس بتیس برس تھی۔

لیلیٰ نے پانی گرم کیا اور کریم بلوچ کو دے دیا۔ ''بابا! کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''ہاں، دودھ ہے تو گرم کر دے۔''

''بابا!'' اس نے کہا پھر ہچکچائی۔ ''وہ ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، ٹھیک ہے... تو اپنا کام کر۔'' کریم بلوچ نے اسے جھڑکا اور کمرے میں چلا گیا۔ لیلیٰ نے دودھ گرم کیا اور کریم بلوچ کو دے کر کمرے میں آ گئی۔ زخمی کی جان خطرے میں نہیں تھی ورنہ بڈھا حکیم اسے اسپتال لے جانے کو کہتا۔ اس کی مرہم پٹی کر کے وہ آدھے گھنٹے بعد رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد کریم بلوچ لیلیٰ کے پاس آیا۔ ''بڈھے حکیم نے کچھ دوائیاں بتائی ہیں، وہ لانی ہیں۔ میں لینے جا رہا ہوں، کچھ دیر میں آتا ہوں۔''

''بابا! میں اکیلی...'' لیلیٰ بولتے بولتے رک گئی۔

کریم بلوچ نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ''وہ بے چارہ زخمی اور بے ہوش ہے۔ کئی وقت سے بھوکا بھی ہے۔ ابھی اسے اتنی جلدی ہوش نہیں آئے گا، فکر مت کر۔''

''اچھا بابا۔''

کریم بلوچ کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے زخمی کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے دیکھنے کو بھی دل کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمت کر کے کریم بلوچ کے کمرے میں آئی۔ کریم بلوچ نے زخمی کو اپنا ایک شلوار قمیص پہنا دیا تھا۔ اس کے سر کے نیچے تکیہ تھا لیکن وہ چٹائی پر ہی لیٹا تھا۔ اس کمرے میں چٹائی بچھی تھی۔ ایک طرف کریم بلوچ کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کا صندوق تھا۔ لیلیٰ نے اسے پاس سے دیکھا۔ آدمی اچھے اور تیکھے نقوش والا تھا۔ اس کا رنگ صاف اور بال سیاہ تھے۔ لیلیٰ کو وہ مقامی نہیں لگا۔ وہ شاید شہر سے آیا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں محو تھی کہ اچانک ہی وہ کراہا۔ لیلیٰ بدک کر بھاگی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا دل...... بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اسے زخمی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ''پانی۔''

وہ پانی مانگ رہا تھا اور لیلیٰ کو وہاں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ پانی مانگا تو اس کے لہجے میں فریاد آ گئی۔ اس بار لیلیٰ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے صحن میں رکھے گھڑے سے پانی نکالا اور کمرے میں آ گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تکلیف دہ تاثرات تھے کہ لیلیٰ کا سارا خوف ختم ہو گیا اور وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کا سر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اسے پانی پلانے لگی۔ زخمی نے بے تابی سے پانی پیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اس نے پہلی بار آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ لیلیٰ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ زخمی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''میرے گھر پر ہے۔'' لیلیٰ نے سادگی سے جواب دیا۔ پھر وضاحت کی۔ ''تو سمندر سے ملا ہے۔ ادھر ہمارے گاؤں کے ساحل سے۔''

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیلیٰ کو خیال آیا۔ وہ باورچی خانے میں آئی اور اس کے لیے دودھ نکال لائی۔ اس نے دودھ بھی خاموشی اور رغبت سے پی لیا۔ وہ واقعی بھوکا تھا۔ اس بار بھی لیلیٰ کو اسے سہارا دینا پڑا۔ اسے شرم آ رہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی غیر مرد کو ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اس شخص کے انداز میں اتنی سادگی تھی کہ اس کی جھجک ختم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پیالہ خالی کر دیا۔ لیلیٰ کو خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''اور لے گا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیلیٰ کو غصہ آیا کہ اس نے ایک نظر بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی۔ کٹورا باورچی خانے میں پٹخا اور درخت سے لٹکے جھولے پر جا بیٹھی۔ بکریاں اس کے پیروں سے جسم رگڑنے لگیں، وہ بھوکی تھیں اور اس سے باہر چلنے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ ان کو صبح سے چرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیلیٰ کو اپنی بکریوں سے پیار تھا لیکن اس وقت اس کا موڈ خراب تھا۔ اس نے غصے سے ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور کریم بلوچ اندر آیا۔

''وہ کیسا ہے؟''

''اسے ہوش آ گیا تھا بابا۔ میں نے اسے پانی اور دودھ دے دیا تھا۔'' لیلیٰ نے اسے رپورٹ دی۔

''اس کا مطلب ہے اچھا تگڑا جوان ہے ورنہ بڈھے کا خیال تھا کہ اسے دیر سے ہوش آئے گا۔''

''پر بابا... وہ کچھ بولتا نہیں ہے، بالکل خاموش ہے۔''

''میں دیکھتا ہے۔'' کریم بلوچ سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد دودھ مانگا تو لیلیٰ نے اسے دے دیا۔ شاید وہ اس شخص کو دوائی دے رہا تھا۔ بکریاں اب زیادہ ہی تنگ کر رہی تھیں اس لیے اس نے کریم بلوچ سے کہا۔

''بابا! میں بکریاں چرانے لے جا رہی ہوں۔''

''جا... پر جلدی آنا۔'' کریم بلوچ نے اسے اجازت دے دی۔ وہ بکریاں لے کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

شمشیر علی نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ ''شاہ میر۔'' اس نے بلند لہجے میں کہا۔ ''اب تم بڑے ہو اور تمہیں منیر کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''جی پاپا۔'' شاہ میر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''گڈ بوائے۔'' شمشیر علی نے رسمی سے انداز میں بیٹے کا سر تھپکا۔

منیر دروازے سے اندر آیا اور دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا۔ شمشیر نے اس کے سر پر پیار کیا۔ اس بار اس کا انداز رسمی نہیں تھا بلکہ والہانہ تھا۔ شاہ میر نے عجیب سا محسوس کیا۔ اگرچہ اسے اپنے بھائی سے حسد نہیں تھا لیکن اس وقت اسے اپنے باپ کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا کہ اس کا باپ اس کے مقابلے میں منیر سے کہیں زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس پر زیادہ توجہ دیتا تھا اور اس کی فرمائش فوراً پوری کرتا تھا۔ وہ اس بات پر کڑھتا رہتا۔ اس گھر میں صرف اس کی ماں عمیرہ اس کی کیفیت محسوس کرتی تھی اور وہ شوہر کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتی تھی کہ وہ بیٹوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے۔ مگر شمشیر اس کی بات بے پروائی سے ٹال جاتا تھا۔ اپنے طرز عمل کی وضاحت کے لیے اس کے پاس ایک ہی دلیل تھی۔

''منیر چھوٹا ہے اور چھوٹے بچوں سے ماں باپ زیادہ لاڈ کرتے ہیں۔''

''بے شک چھوٹوں سے لاڈ زیادہ کیے جاتے ہیں لیکن بڑے بچوں اور خاص طور سے بیٹے کی اہمیت الگ ہوتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ شاہ میر کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' شمشیر اسے ٹال جاتا۔ ''شاہ میر بھی میری اولاد ہے۔''

عمیرہ بھی بیٹے کی طرح کڑھ کر رہ جاتی۔ شوہر کے سلوک کی تلافی وہ اپنی محبت سے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ شاہ میر اس معاملے میں کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا تھا لیکن جب اس کے سامنے ہی اس کا باپ اس سے اور اس کے بھائی سے بالکل الگ سلوک کرتا تو اس پر دکھ کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ منیر اس سے صرف دو سال چھوٹا تھا

digestpk.blogspot.com

اس لیے شمشیر کا یہ کہنا بھی درست نہیں تھا کہ وہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے منیر سے الگ سلوک کرتا ہے۔

شمشیر بھی میرین انجینئر تھا اور اس کی ڈیوٹی اکثر کسی نہ کسی بحری جہاز پر ہوتی تھی اس لیے اسے بعض اوقات مہینوں بعد گھر آنے کا موقع ملتا تھا۔ جب تک وہ گھر میں نہیں ہوتا تھا، گھر کا ماحول بہت اچھا ہوتا تھا۔ شاہ میر بھائی سے محبت کرتا تھا اور اس کا چھوٹے بھائی کی طرح خیال رکھتا تھا۔ منیر ذرا بے پروا تھا یعنی اسے بھائی کی اتنی پروا نہیں تھی۔ اس کا انداز فطری طور پر ان بچوں جیسا تھا جنہیں زیادہ توجہ ملتی ہے تو وہ دوسروں سے بے پروا ہو جاتے ہیں اور ان کی نظر میں سب سے زیادہ اہم ان کی اپنی ذات ہو جاتی ہے۔ وہ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ میں رہتے تھے جو ساحلِ سمندر کے ساتھ تھا اور دسویں فلور سے سمندر کا نظارہ دور تک اور بہت خوب صورت دکھائی دیتا تھا۔ اپارٹمنٹ بہترین فرنیچر اور سہولتوں سے آراستہ تھا اور اس میں ہر چیز تھی۔ شمشیر علی کی آمدنی یقیناً بہت اچھی تھی۔ ان کے پاس گاڑی بھی تھی۔ باپ کی بے پروائی کے باوجود شاہ میر کے لیے وہ وقت بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔

شاہ میر بارہ برس کا تھا جب عمیرہ کی طبیعت اچانک خراب رہنے لگی۔ اس نے زیادہ توجہ نہیں دی اور عام ڈاکٹروں کے پاس جاتی رہی۔ پھر ایک دن اچانک ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ شمشیر علی شپ پر تھا۔ ان کے چند پڑوسیوں نے عمیرہ کو اسپتال پہنچایا جہاں اسے ہوش آ گیا۔ ڈاکٹرز کو شبہ تھا کہ اس کے جگر کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے اور رپورٹ آنے پر تصدیق ہو گئی۔ اسے ہیپاٹائٹس ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کا علاج بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی کوشش کے باوجود عمیرہ کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ شمشیر چھٹی لے کر آیا۔ اس نے عمیرہ کو ایک مہنگے اسپتال میں ٹرانسفر کیا لیکن اس کا وقت آ گیا تھا۔

شاہ میر کے لیے یہ سانحہ یوں بھی شدید تھا کہ اس گھر میں ماں ہی اس کے لیے محبت کی علامت تھی۔ ابھی وہ دکھ کی کیفیت سے نکل نہیں پایا تھا کہ شمشیر نے منیر کی ذمے داری اس کے ناتواں شانوں پر ڈال دی۔ شمشیر گھر کے حوالے سے بھی پریشان تھا کہ اب گھر کون سنبھالے گا۔ اسے مہینوں باہر رہنا پڑتا تھا۔ شاہ میر بارہ سال کا اور منیر دس سال کا تھا۔ وہ سمجھ دار تھے لیکن اکیلے نہیں رہ سکتے تھے۔ شاہ میر ذہین تھا اور وہ صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار باپ سے پوچھا کہ جب وہ چلا جائے گا تو دونوں بھائی کس طرح رہیں گے۔ شمشیر اسے ٹال جاتا۔ اس کے ذہن میں اس مسئلے کا حل تھا لیکن اس نے شاہ میر کو نہیں بتایا۔ جب اس کے واپس جانے میں چند دن رہ گئے..... اس روز وہ صبح سے کہیں گیا ہوا تھا اور شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک جوان عورت اور اس کے ساتھ چھ سات سال کی گڑیا سی لڑکی تھی۔ شمشیر علی نے ان کو بتایا۔ ''بچوں... اب یہ تمہاری ماں ہے۔''

☆☆☆

اس چھوٹے سے گاؤں میں مچھیروں کے چند سو گھرانے تھے جو صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ خشکی کے راستے یہاں سے شہر بہت دور تھا مگر کشتی یا لانچ کے ذریعے کچھ دیر میں شہر کی بندرگاہ پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لیے گاؤں والے شہر جانے کے لیے سمندر کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ گاؤں ایک ایسے ٹاپو پر تھا جو تین طرف سے سمندر میں گھرا ہوا تھا اور خشکی کا راستہ ایک ہی تھا۔ وہاں کے لوگوں کو پینے کا پانی اس ٹینکر سے خریدنا پڑتا تھا جو روز وہاں کا چکر لگاتا تھا اور نہانے دھونے کے لیے وہ کنوئیں کا پانی استعمال کرتے تھے۔ گاؤں میں بجلی تھی مگر وولٹیج بہت کم آتا تھا۔ بلب اور پنکھے بھی بہ مشکل کام کرتے تھے۔ گاؤں والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت گندے پانی کی نکاسی کا انتظام بنایا تھا جس کی وجہ سے گلیوں میں بہتے گندے پانی سے نجات مل گئی تھی۔ دو اسکول تھے، ایک لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا۔ لڑکوں کا اسکول میٹرک تک تھا اور لڑکیوں کا آٹھویں تک۔ شمال میں کیکر کی جھاڑیوں کا گھنا جنگل تھا۔ اکثر لوگ اپنے جانور چرانے یہاں لے جاتے تھے مگر لیلیٰ اس طرف بہت کم جاتی تھی کیونکہ وہاں سناٹا بہت تھا۔ اسے ڈر لگتا تھا اس لیے وہ گاؤں کے آس پاس رہتی تھی یا پھر سمندر کی طرف چلی جاتی تھی۔ ویسے بھی اس کے پاس صرف تین بکریاں تھیں۔ وہ بکریاں چرا کر واپس آئی تو کریم بلوچ صحن میں چارپائی پر کسی سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ لیلیٰ اس کے پاس آ بیٹھی۔

''بابا! کیا سوچ رہا ہے... زخمی تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، ویسے تو ٹھیک ہے پر...'' کریم بلوچ کہتے کہتے رک گیا۔

''پر کیا بابا؟''

''اسے اپنے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔''

لیلیٰ سمجھی نہیں۔ ''کیا نہیں پتا بابا؟''

''اڑے چھوری... کچھ نہیں پتا۔ سب بھول گیا ہے۔ اپنا نام، کدھر سے آیا ہے اور سمندر میں کیسے گرا... اس کو کچھ یاد نہیں ہے۔''

''اس نے خود بتایا ہے بابا؟''

''اڑے نہیں، ہر سوال پر منہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ پھر نہیں میں سر ہلا دیتا ہے۔''

''تب اس کا کیا ہوگا؟'' لیلیٰ پریشان ہو گئی۔ اسے زخمی سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی یادداشت گم ہو گئی ہے۔ ''اب اس کا کیا کرتا ہے بابا؟''

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔'' کریم بلوچ نے کہا۔ ''اسے پولیس کو نہ دے دوں؟''

لیلیٰ پولیس کے نام پر سہم گئی۔ ''پر اس بے چارے نے کیا کیا ہے؟''

''پاگل، پولیس اسے کچھ کہے گی نہیں، اسے شہر بھیج دے گی۔ ویسے بھی یہ شہری لگتا ہے۔''

''نہیں بابا! اگر انہوں نے اسے مارا تو۔'' لیلیٰ نے اعتراض کیا۔

''اس نے کیا کیا ہے جو پولیس مارے گی؟''

''بابا! جس نے کچھ نہیں کیا ہوتا، پولیس اسے ہی تو مارتی ہے۔ یار محمد والا قصہ یاد ہے؟''

یار محمد ایک ملاح تھا اور اس نے اسمگلروں کی کشتی دیکھ کر گاؤں کے پاس کی پولیس چوکی پر اطلاع کر دی تھی۔ اس پر پولیس نے اس بے چارے کو پکڑ لیا اور مار مار کر اس کا حشر کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے رہائی ملی تھی۔ اس کے بعد سے گاؤں کے مچھیروں نے توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کوئی اطلاع لے کر پولیس کے پاس نہیں جائیں گے۔ لیلیٰ اسی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' کریم بلوچ قائل ہو گیا۔ ''پھر اس کا کیا کریں؟''

''بابا! ابھی تو آیا ہے بے چارہ... ابھی اس کو رہنے دو۔ ہو سکتا ہے دو تین دن میں اسے کچھ یاد آ جائے۔''

''اچھا ایسا بھی کر کے دیکھتا ہے۔'' کریم بلوچ نے سر ہلایا۔ وہ سادہ مزاج شخص تھا اور بیٹی کو آٹھ جماعت پڑھی ہونے کی وجہ سے بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کی بات مان جاتا تھا۔ ''یہ سمندر میں گرا ہے۔ نہ جانے ڈوبنے سے کیسے بچا، پر مچھلیوں نے اسے بہت جگہ کاٹا ہے۔''

''بابا! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔'' لیلیٰ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جب تک کسی کا وقت نہ آئے، وہ کیسے مر سکتا ہے۔''

''ہاں بابا... مرنا تو سب نے ہے۔ پر اس کا بے چارے کے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' کریم بلوچ کو بھی یہی تجسس تھا۔

لیلیٰ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''بابا! پریشان مت ہو۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا تو بتا دے گا۔ میں کھانا بنا لوں۔''

اس نے اندر جانے سے پہلے کمرے میں دیکھا۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹا ہوا تھا۔ لیلیٰ باورچی خانے میں آ گئی۔ ان لوگوں کی غذا بہت سادہ تھی۔ عام طور سے مچھلی کے ساتھ روٹی یا چاول بنا لیتے تھے۔ یہاں سبزی اور گوشت بہت مہنگا تھا کیونکہ دور شہر سے لاتے تھے۔ مچھلی گھر کی ہوتی تھی اس لیے یہی زیادہ کھائی جاتی تھی۔ لیلیٰ نے کریم بلوچ سے پوچھا۔

''بابا! کیا یہ کھانا کھائے گا؟''

''نہیں، ابھی اسے ایک دن تک کچی ہوئی چیز نہیں دینی ہے۔ صرف دودھ دینا ہے۔''

بکریوں کی وجہ سے دودھ کی کمی نہیں تھی۔ اپنی ضرورت کا رکھ کر وہ باقی دکان والے کو دے دیتے تھے۔ کھانا بناتے ہوئے لیلیٰ اس کے بارے میں سوچتی رہی کہ جانے وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ بے چارے کے گھر والے اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ لیلیٰ کا خیال تھا کہ ابھی تو وہ اس حادثے کی وجہ سے پریشان ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے سب یاد آ جائے گا۔ کھانے کے بعد کریم بلوچ اس شخص کے بارے میں گاؤں کے نمبردار کو بتانے چلا گیا۔ وہ اس سے اس کے بارے میں مشورہ بھی لے سکتا تھا۔ اس وقت وہ جاگ رہا تھا مگر اس کی حالت کی وجہ سے کریم بلوچ کو اعتماد تھا۔ وہ ابھی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ لیلیٰ نے اس کے پاس پانی لے جا کر رکھ دیا تا کہ جب اسے پیاس لگے تو وہ خود پانی پی لے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے دودھ پیے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے اسے بھوک لگی ہو۔ اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس سے پوچھا۔

''تجھے بھوک لگی ہے؟''

''ہاں، مجھے کچھ کھانے کو دو۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بابا نے کھانے کو منع کیا ہے، ابھی دودھ پی سکتے ہو۔''

''دودھ ہی لا دو۔'' اس کے لہجے کی بے تابی بتا رہی تھی کہ وہ بہت بھوکا ہے۔ لیلیٰ اس کے لیے دودھ گرم کر کے لائی۔ یہ اس کے لیے موقع بھی تھا کہ وہ اس سے اس کے بارے میں پوچھ سکے۔ اس بار وہ خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بے تابی سے دودھ کا گلاس لیا۔ لیلیٰ دروازے کے پاس

digestpk.blogspot.com

دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ جب اس نے گلاس ختم کر دیا تو لیلیٰ نے پوچھا۔
"اب تیری حالت کیسی ہے؟"
"ٹھیک ہوں۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔
"جب میں نے تجھے پہلی بار سمندر کے کنارے پڑا دیکھا تھا تو میں ڈر گئی تھی۔ تو بالکل لاش لگ رہا تھا۔"
"مجھے تم نے دیکھا تھا؟" اس نے پہلی بار لیلیٰ کی طرف غور سے دیکھا۔ "تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟"
"بکریاں لے کر گئی تھی۔" اس نے کہا۔ "تو سمندر میں کیسے گرا؟"
"مجھے یاد نہیں ہے۔"
"کیا اپنے گھر والوں کے ساتھ تھا؟"
"گھر والے۔" اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات دکھائی دیے مگر اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا اور پہلے کی طرح سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں۔"
لیلیٰ کو لگا کہ گھر والوں کے ذکر پر اسے کچھ یاد آیا تھا مگر وہ اسے بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ "تیرے بیوی بچے تو ہوں گے؟"
اس نے اپنا سر تھام لیا۔ "خدا کے لیے مجھ سے سوال مت کرو۔"
"اچھا... اچھا تو آرام کر۔" لیلیٰ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ باہر آئی اور گھر کی صفائی کرنے لگی۔
پھر کریم بلوچ آگیا۔ اس نے پوچھا۔ "اسے کچھ کھانے کو دیا؟"
"ہاں بابا... دودھ دیا ہے۔"
"ابھی نمبردار آئے گا، وہ اس سے بات کرے گا۔" یہ کہہ کر کریم بلوچ اندر چلا گیا۔ اس شخص نے شاید اس کی بات سن لی تھی کیونکہ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس سے بات کرنے کون آرہا ہے۔ کریم بلوچ اسے نمبردار کے بارے میں بتانے لگا۔ گاؤں کا نمبردار ایک اچھا آدمی تھا اور اپنی حد تک گاؤں والوں کا پورا خیال رکھتا تھا۔ اسی کی کوشش سے یہاں بجلی آئی تھی اور سیوریج کا کام بھی اسی نے کرایا تھا۔ اب وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کو پانی کی لائن بھی مل جائے۔ نمبردار کچھ دیر کے بعد آیا۔ کریم بلوچ اسے کمرے میں لے گیا۔ لیلیٰ کو تجسس تھا کہ وہ اس سے کیا پوچھتا ہے اور وہ کیا جواب دیتا ہے۔ وہ کمرے کے آس پاس ہی تھی مگر اسے مایوسی ہوئی جب اس آدمی نے نمبردار کے ہر سوال کا جواب ایک ہی طرح سے دیا۔

"مجھے نہیں معلوم... مجھے یاد نہیں۔"
اس سے مایوس ہو کر نمبردار کریم بلوچ کو صحن میں لایا اور اس سے کہا۔ "اسے کچھ یاد نہیں ہے، اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ خود اس کے لوگوں کو تلاش کرے گی۔"
"نہیں نمبردار... پولیس بے چارے کو مارے گی یا کسی ایسے جرم میں اندر کر دے گی جو اس نے کیا ہی نہیں ہے۔ اس بے چارے کو تو کچھ یاد بھی نہیں۔ اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا۔" کریم بلوچ نے ہمدردی سے کہا۔
"تو ٹھیک کہہ رہا ہے کریم۔" نمبردار نے سوچ کر کہا۔
"پر اس کا کیا کرے گا؟"
"ابھی تو بے چارے کو ایک ہی دن ہوا ہے۔ دو تین دن اگر اس کو یاد نہیں آیا تو کچھ کریں گے۔"
"چل دیکھ لے، پر اب یہ بات زیادہ لوگوں کو نہ پتا چلے۔ بات پولیس تک گئی تو تو بھی پھنس سکتا ہے۔"
"میں سمجھتا ہوں۔ ابھی تک تجھے اور بڈھے حکیم کو ہی بتایا ہے۔"
"بس اسے اپنا مہمان بنا کر رکھ۔ میری کسی اور مدد کی ضرورت ہو تو کہنا۔" نمبردار یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کریم بلوچ نے لیلیٰ کو بلایا۔
"لیلیٰ! سن لیا تو نے؟ اب اس کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلے۔"
لیلیٰ مسکرانے لگی، اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی بات کسی سے چھپانا بہت مشکل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک دو دن میں سب کو پتا چل جائے گا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے بابا... پر اسے کیا کہیں؟ اسے تو اپنا نام بھی یاد نہیں ہے۔"
"ابھی کیا بولے۔" کریم بلوچ کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اسے کیا کہے۔ لیلیٰ سوچنے لگی پھر اس نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔
"بابا! ملاح کیسا رہے گا؟ یہ سمندر سے ملا ہے۔"
کریم بلوچ ہنس دیا۔ "پاگل... سمندر سے ملا ہے، پر مچھی تو نہیں پکڑتا۔"
"نہیں بابا! جب تک اس کا نام نہیں معلوم ہو جاتا اسے ملاح ہی کہیں گے۔" لیلیٰ نے ضد کی۔
کریم بلوچ مسکرانے لگا۔ "اڑے چھوری تو بالکل پاگل ہے۔ چل جیسی تیری مرضی۔"
اگلے روز تک اس کی حالت بہت بہتر ہوگئی اور اس نے اٹھ کر چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ اس دن اس نے تھوڑی غذا بھی کھائی مگر اسے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں آیا

تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بالکل یاد نہیں کہ وہ کون ہے اور اس پر کیا گزری ہے۔ اس کے لباس سے بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جو اس کی شخصیت پر روشنی ڈال سکتی... بلکہ لباس بھی کیا تھا، چیتھڑے تھے جو اس کے جسم پر جھول رہے تھے۔ بڈھا حکیم پہلے دن رات کے وقت آیا تھا اور اگلے روز بھی دو دفعہ اسے دیکھنے آیا۔ اس نے کریم بلوچ سے کہا کہ ملاح کے زخم بہت تیزی سے بھر رہے ہیں اور ایک دو دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اس کے شانے کا زخم بھرنے میں وقت لگے گا کیونکہ وہ خاصا گہرا تھا۔ اس کی حالت بھی اچھی تھی۔ اپنی دواؤں کے ساتھ حکیم نے زخم خشک کرنے والی اینٹی بائیوٹک دوائیں بھی تجویز کی تھیں۔
کریم بلوچ بھی مچھیرا تھا اور گاؤں کے ایک آدمی نورالدین عرف نورو بھائی کے ساتھ کشتی پر جاتا تھا۔ اس کے پاس کشتی نہیں تھی۔ وہ جال پھینکنے کا ماہر تھا اسی وجہ سے اسے کام ملتا رہتا تھا۔ وہ ساحل کے ساتھ مچھلیاں اور جھینگے پکڑتے تھے اور کھلے سمندر میں جانے سے گریز کرتے تھے۔ مہینے میں وہ دو تین بار نکلتے تھے اور ہر ٹرپ ایک ہفتے کا ہوتا تھا۔ جب ان کی کشتی بھر جاتی تھی تو وہ کسی بندرگاہ کا رخ کرتے اور وہاں مچھلی بیچ کر واپس آجاتے۔ جب کریم بلوچ کی پھوپھی مر گئی تو اسے لیلیٰ کو اکیلے چھوڑ کر جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ ان دنوں سمندر چڑھا ہوا تھا اس لیے کریم بلوچ کا خیال تھا کہ انھیں شاید ایک ہفتے تک شکار پر نہیں جا سکیں گے لیکن ملاح کے آنے کے اگلے روز شام کو نورو بھائی نے اسے بلایا۔ وہ ساحل کے پاس اپنی کشتی کی مرمت کرا رہا تھا۔ کریم بلوچ اس کے پاس آیا تو اس نے کہا۔ "کریم! پرسوں نکلنا ہے۔ تو تیار ہے؟"
"پرسوں؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "پر ابھی تو میرے گھر مہمان ہے۔ میں اتنی جلدی نہیں جا سکتا۔"
"کریم! ادھر مغرب کی طرف مچھی کا بہت اچھا جھنڈ آیا ہے۔ دیر کیا تو سارا مچھی دوسرا لے جائے گا۔ چلنا ہے۔" نورو بھائی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "تو تیاری کر لے۔"
کریم بلوچ جانتا تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ وہ پریشان سا گھر آیا۔ لیلیٰ نے اس کی پریشانی محسوس کر لی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بابا! کیا بات ہے؟ تو پریشان ہے۔ نورو بھائی نے کیوں بلایا تھا؟"
کریم بلوچ نے سر ہلایا۔ "وہ ابھی سمندر میں جانے کو کہہ رہا ہے۔"

"ابھی؟" لیلیٰ بھی پریشان ہوگئی۔
"ابھی نہیں، پرسوں جانا ہے۔"
لیلیٰ نے سکون کا سانس لیا۔ "تم نے تو ڈرا دیا تھا۔"
"پر فکر تو اب بھی ہے۔" کریم بلوچ چڑ کر بولا۔ "اسے کدھر چھوڑ کر جاؤں گا؟ گھر میں تو نہیں چھوڑ سکتا تیرے ساتھ۔"
لیلیٰ سرخ ہوگئی۔ "ہاں بابا! یہ تو ہے۔"
وہ دونوں صحن میں چارپائی پر بیٹھے آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے، اچانک ملاح اندر سے نکل آیا۔ وہ کریم بلوچ کی نسبت طویل قامت تھا، اس وجہ سے اس کو شلوار سوٹ اسے کچھ تنگ تھا مگر اس پر برا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے صبح سے چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھا۔ "کیا تم لوگ میری وجہ سے پریشان ہو؟"
"اڑے نہیں۔" کریم بلوچ بوکھلا کر بولا۔ "تم تو مہمان ہے۔"
"بابا اس لیے پریشان ہے کہ پرسوں اس نے سمندر میں جانا ہے اور یہ تم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" لیلیٰ نے وضاحت کر دی۔ اس پر کریم بلوچ نے اسے گھورا مگر کچھ کہا نہیں۔ ملاح نے سر ہلایا۔
"میں سمجھتا ہوں۔ تم مجھے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ ایسا کرو کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"
"اپنے ساتھ؟" کریم بلوچ سمجھا نہیں۔
"ہاں، اپنے ساتھ کشتی میں۔ میں بھی تمہارے ساتھ کام کروں گا اور ممکن ہے سمندر میں جا کر مجھے کچھ یاد آجائے۔"
"ہاں بابا! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" لیلیٰ خوش ہو کر بولی۔
"اڑے چھوری تو چپ کر۔" کریم بلوچ نے اسے ڈانٹا۔ "ادھر ہر بندہ سمندر میں نہیں جا سکتا۔"
"پر میں جا سکتا ہوں۔" ملاح نے اصرار کیا۔
"تم ادھر کا نہیں لگتا۔ کوسٹ گارڈ نے چیک کیا تو روک لے گا۔"
"میں ادھر کا بن سکتا ہوں۔ میں گونگا بن جاؤں گا اور حلیہ بھی تم لوگوں جیسا ہوگا۔" اس نے اصرار جاری رکھا۔ لیلیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس نے کتنی آسانی سے اس مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔ واقعی اس مسئلے کا اس سے بہتر حل ممکن نہیں تھا۔ کریم بلوچ اسے آسانی سے لے جا سکتا تھا۔ نورو بھائی کی کشتی خاصی بڑی تھی۔ لیلیٰ نے اس کی تائید کی۔
"بابا! ملاح ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ملاح؟" وہ چونکا۔

کریم بلوچ کھسیا گیا۔ "اڑے یہ چھوری بہت شرارتی ہے۔ اس نے تیرا نام ملاح رکھ دیا ہے۔"

"ہاں، تم سمندر سے ملے تھے اس لیے۔" لیلیٰ نے جلدی سے وضاحت کی۔

وہ پہلی بار مسکرایا۔ "اچھا نام ہے۔ جب تک مجھے اپنا نام یاد نہیں آجاتا، یہ نام ٹھیک ہے۔"

"اچھا ہے۔" لیلیٰ خوش ہو گئی۔ اسے ملاح کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اتنی جلدی یہاں سے نہ جائے۔

"کیا ٹھیک ہے؟" کریم بلوچ چڑ کر بولا۔ "ابھی نورو بھائی سے پوچھنا پڑے گا۔"

"تو پوچھ لو نا۔" لیلیٰ نے شوخی سے کہا۔

"میں بات کر کے آتا ہوں۔" کریم بلوچ چلا گیا اور اس کے جاتے ہی لیلیٰ کی ساری تیز طراری ہوا ہو گئی۔ وہ شرمائی سی نظر آنے لگی۔ ملاح اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔ لیلیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے تو وہ چائے بنانے چلی گئی۔ اس نے اب تک چائے نہیں پائی تھی مگر لیلیٰ کو اندازہ تھا کہ وہ چائے پیتا ہوگا۔ شہر میں تو سب پیتے ہیں۔ وہ چائے بنا کر لائی تو ملاح نے اسے خوش ہو کر دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے چائے چاہیے؟"

"بس پتا چل گیا۔" وہ بولی اور جھولے پر بیٹھ گئی۔

"ادھر تم اور تمہارا بابا رہتا ہے؟"

"ہاں، بس ہم دو ہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کریم بلوچ مچھیرا ہے؟"

"بابا کی اپنی کشتی نہیں ہے۔ وہ نورو بھائی کی کشتی میں جاتا ہے۔"

"تمہارا بابا تو ادھر کے سارے سمندر کو جانتا ہوگا؟"

"بالکل۔" اس نے فخر سے کہا۔ "بابا کو ادھر کا ایک ایک جگہ کا پتا ہے۔"

"جب کریم بلوچ چلا جاتا ہے تو تم اکیلی رہ جاتی ہو؟"

"ہاں، ادھر اور کون ہے جو میرے ساتھ رہے۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"پہلے لگتا تھا، پر اب نہیں لگتا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"پھر بھی تم اکیلی ہوتی ہو اور اکیلی عورت محفوظ نہیں ہوتی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو ہے، پر غریب کیا کرے۔" لیلیٰ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "آدمی نے روٹی بھی تو کھانی ہوتی ہے۔ اس لیے بابا کو جانا پڑتا ہے۔"

"یہ جگہ کہاں پر ہے؟"

لیلیٰ نے اپنی معلومات کی حد تک وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جگہ کہاں ہے اور شہر یہاں سے کتنا دور ہے۔ وہ خود دس بارہ مرتبہ ہی شہر گئی تھی جب کریم بلوچ اسے کسی خاص موقع پر شہر گھمانے لے کر گیا تھا۔ شاید عید کا دوسرا دن ہوتا تھا یا پھر کسی اور تہوار کے موقع پر۔ وہ ہمیشہ کشتی سے جاتے تھے اس لیے اسے شہر جانے والے خشکی کے راستے کے بارے میں بھی کچھ نہیں پتا تھا۔ یہ سن کر وہ کسی قدر مایوس نظر آنے لگا کہ لیلیٰ اس جگہ کے بارے میں خاص نہیں جانتی۔ اس نے باتوں کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

"تم سارا دن کیا کرتی ہو؟"

"میں کام کرتی ہوں۔ کھانا بنانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی کرنا اور یہ بکریاں چرانا۔"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے، تم نے کچھ پڑھا ہوا ہے۔"

لیلیٰ خفا ہو گئی۔ "میں نے کچھ نہیں پوری آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ شہر میں تو لڑکیاں چودہ سولہ جماعتیں پڑھتی ہیں۔"

"اگر ادھر اسکول آٹھ جماعت سے آگے ہوتا تو میں ضرور پڑھتی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے پوچھا۔ "تمہارا رشتہ ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔" لیلیٰ شرمائی اور جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "تو اور چائے پیے گا۔"

"نہیں، شکریہ۔" اس نے پیالہ نیچے رکھ دیا۔ "تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔" یہ کہہ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیلیٰ نے جھجک کر پوچھا۔ "تجھے سچ مچ کچھ یاد نہیں ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ تجھے یاد ہے، پر تو بتاتا نہیں ہے۔" لیلیٰ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ وہ چپ ہو گیا اور کچھ دیر بعد سو گیا۔ کم سے کم لگ تو یہی رہا تھا۔ لیلیٰ اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔ اسے رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔ اس نے سوچا اور مچھلی کی بریانی بنانے لگی۔ ساتھ میں اس نے کھیر

بنائی۔ یہ کھیر سادہ سی تھی یعنی دودھ میں چاول ڈال کر ابال لیے اور اس میں چینی ملا کر کھیر تیار کرلی۔ کریم بلوچ آیا تو اس نے بتایا کہ نورو بھائی ملاح کو بھی ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا ہے۔

"پر اس کا کہنا ہے کہ اس کا خرچ میں دوں گا۔"

"کوئی بات نہیں بابا... ادھر بھی تو ہمارا مہمان ہے۔"

"یہ تو ہے۔" کریم بلوچ نے باورچی خانے سے آتی خوشبو کو سونگھا۔ "لگتا ہے تو نے آج بریانی بنائی ہے۔"

"ہاں بابا! میں نے سوچا بےچارے کو ایک وقت تو کچھ اچھا کھانے کو ملے۔" لیلیٰ بولی۔ "یہ شہری لوگ ہماری طرح تھوڑی کھاتے ہیں۔"

"تجھے کیسے پتا چلا کہ یہ شہری ہے؟"

"اس کے بولنے کا انداز نہیں دیکھا ہے؟ ہمارے یہاں کوئی بولتا ہے ایسے؟"

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔" کریم بلوچ نے چارپائی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "یہ کیسا آدمی ہے... تجھے اس سے ڈر تو نہیں لگا؟"

"نہیں بابا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تو بہت اچھا آدمی ہے۔ مجھے اس سے ایک بار بھی ڈر نہیں لگا۔ بابا! یہ تو میری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے اور نہ مجھ سے بلاوجہ بات کی۔"

"اس کا مطلب ہے یہ اچھا آدمی ہے۔" کریم بلوچ نے سر ہلایا۔

"بابا! کھانا کب نکالوں؟"

"ابھی اسے سونے دے۔ جتنا سوئے گا، اتنی جلدی اچھا ہو جائے گا۔ جب اٹھے تو کھانا لگا دینا۔"

دو گھنٹے بعد کریم بلوچ نے اسے جگا دیا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور پھر وہ سونے کے لیے چلے گئے۔ لیلیٰ اور کریم بلوچ کو جلدی سونے کی عادت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ اس روز بھی وہ جلدی چلے گئے۔ رات کسی وقت لیلیٰ کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ہے۔ پھر اسے لگا جیسے کوئی دبی آواز میں رو رہا ہے۔ آواز صحن سے آرہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی جھری سے جھانکا۔ اسے ملاح صحن میں چارپائی پر بیٹھا نظر آیا۔ صحن کا بلب بجھا ہوا تھا مگر تاروں کی روشنی کافی تھی۔

"یہ کیوں رو رہا ہے؟" اس نے بے چین ہو کر سوچا۔ اس نے منہ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا تا کہ اس کی سسکیاں کسی کے کانوں تک نہ جا سکیں۔ لیلیٰ کا دل دکھنے لگا۔ اتنا مضبوط مرد بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ دروازہ کھول کر دبے قدموں باہر نکل آئی اور اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی موجودگی محسوس کر کے بدک گیا۔ لیلیٰ نے آہستہ سے کہا۔ "ڈرو مت... یہ میں ہوں۔"

"تم۔" اس نے غیر محسوس انداز میں آنسو صاف کیے۔ "مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے باہر چلا آیا۔"

"تم کیوں رو رہے تھے؟"

اس نے کرب زدہ لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنا سب کھو دیا ہے۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔"

لیلیٰ نے کریم بلوچ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ باپ کی آنکھ کھل گئی تو اسے اور ملاح کو یہاں ایک ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے۔ مگر تجسس اسے روک رہا تھا۔ "تمہیں سب یاد ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے تم لوگوں سے جھوٹ بولا تھا لیکن مجبوری میں بولا تھا اور میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے اسی وجہ سے اب تمہیں بتا دیا۔"

"جھوٹ کیوں بولا؟" لیلیٰ آہستہ سے بولی۔

"میں اپنے بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میرے دشمن میرے پیچھے ہیں۔ میں ان سے چھپنا چاہتا ہوں۔"

"تم کو انہوں نے ہی سمندر میں پھینکا ہے؟" لیلیٰ نے اندازہ لگایا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ بولا۔ "سنو تم یہ بات اپنے..."

"تم فکر مت کرو۔ میں بابا کو یہ بات نہیں بتاؤں گی۔" وہ بولی۔ "اب اندر جاؤ۔ اگر بابا نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو وہ مجھ پر شک کرے گا اور اگر اس نے مجھ پر شک کیا تو میں مر جاؤں گی۔"

"تم لوگ میرے محسن ہو اور میری وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف ہو، یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور اندر چلا گیا۔ لیلیٰ بھی کمرے میں آگئی۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ اس سے پوچھے کہ اس پر کیا گزری ہے اور وہ کون ہے مگر باپ کے ڈر سے اس نے زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

عورت کا نام ماریہ تھا اور وہ اینگلو نسل سے تھی۔ جب انگریز اس خطے سے گئے تو وہ جاتے جاتے لاکھوں ایسے بچے چھوڑ گئے... جو دوغلی نسل سے تھے۔ عام طور سے ایسے

digestpk.blogspot.com

بچوں کی ماں کوئی مقامی عورت ہوتی تھی اور باپ انگریز۔ کبھی کبھی معاملہ اس کے الٹ بھی ہو جاتا تھا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ یہ نسل اب ختم ہوتی جا رہی ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے۔ ماریہ ان میں سے ایک تھی۔ اس کا باپ خالص اینگلو سیکسن تھا اور اس نے مقامی عورت سے شادی کی تھی اس لیے ماریہ خوب صورت تو تھی لیکن وہ مقامی رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس کی عمر شاید تیس کے قریب تھی اور وہ شاہ میر اور منیر کے لیے مہربان عورت ثابت ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کے انداز میں ان کے لیے ممتا نہیں ہوتی تھی لیکن وہ ان کا پورا خیال رکھتی تھی۔

شاہ میر کو شروع میں وہ پسند نہیں آئی اور وہ اس سے دور دور رہا جبکہ منیر فوراً ہی ماریہ اور تھی نازیہ سے گھل مل گیا۔ وہ خوش تھا کہ اسے کھیلنے کے لیے ایک اور ساتھی مل گیا تھا۔ اتفاق سے اس اپارٹمنٹ کمپلیکس میں ان کے ہم عمر بچے کم تھے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی کھیلنا پڑتا تھا۔ شاہ میر بچپن سے سنجیدہ تھا اور اسے کھیل کود سے زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس کے بجائے اس کی توجہ تعلیم کی طرف تھی۔ دونوں بھائی ایک اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھتے تھے جہاں ہر طالب علم پر انفرادی توجہ دی جاتی تھی۔ نازیہ کو بھی اسی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد شاہ میر نے بھی ماریہ اور نازیہ کو رفتہ رفتہ قبول کر لیا لیکن پھر بھی اس کا ان دونوں سے ایک غیر محسوس فاصلہ برقرار رہا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شمشیر کا ماریہ سے رابطہ کیسے ہوا کیونکہ کم عمری کے باوجود وہ اتنا تو سمجھتا تھا کہ کوئی عورت محض دو ہفتے میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتی جبکہ وہ پہلے بھی ایک شادی کر چکی ہو اور اس کی ایک بچی بھی ہو۔ کیا ان دونوں کے پہلے سے تعلقات تھے... یعنی عمیرہ کی زندگی میں؟ یہ سوال کانٹے کی طرح شاہ میر کے دل میں چبھتا۔

وقت گزرتا رہا اور چند سال بعد شاہ میر نے ہائی اسکول پاس کر لیا تو شمشیر نے اسے میرین انجینئرنگ پڑھنے کے لیے ملائیشیا بھیج دیا۔ اس معاملے میں اس نے شاہ میر سے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بس اسے اطلاع ملی تھی کہ اب اسے ملائیشیا جانا ہے۔ اس سے پہلے وہ ملک سے باہر تو کیا شہر سے باہر بھی نہیں گیا تھا اس لیے اس نے دبی زبان میں کہا۔

"پاپا! میں یہاں بھی تو پڑھ سکتا ہوں۔"

"یہاں پڑھ کر تم کیا کر لو گے؟ وہاں پڑھو گے تو زندگی بن جائے گی۔" شمشیر نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمہارا داخلہ کرا چکا ہوں۔"

اسے ملائیشیا جانا پڑا۔ وہاں میرین یونیورسٹی کا معیار تعلیم واقعی بہت اچھا تھا۔ اسے آنے والے پانچ سال تک ملائیشیا میں رہنا تھا۔ شمشیر نے اس کے لیے ایک مقامی بینک میں اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا جس میں وہ ہر مہینے معقول رقم جمع کرا دیتا تھا۔ یہ پاکستانی روپے میں لاکھوں میں بنتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کیا اس کے باپ کی تنخواہ اتنی ہے کہ وہ اسے اتنی مہنگی تعلیم دلا سکے اور پھر اتنا کھلا خرچ دے سکے۔ پہلے سال امتحان کے بعد اس نے گھر آنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اس نے ساتھی طلبا کے ہمراہ آسٹریلیا اور اس کے آس پاس کے ممالک کی سیاحت کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ اس سے اگلے برس شمشیر فیملی کے ساتھ لندن گیا ہوا تھا۔ یوں اس کا چھٹیوں میں گھر جانے کا ارادہ بنتا اور ملتوی ہوتا رہا۔ پانچ برس بعد وہ انجینئر بن چکا تھا۔

وہ پانچ برس بعد گھر آیا تو سب بدل چکا تھا۔ منیر اب قد میں اس سے بھی نکل گیا تھا۔ وہ مقامی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کر رہا تھا جبکہ اسکول سے کالج میں آنے والی نازیہ بچی سے دل کش لڑکی میں بدل گئی تھی۔ شمشیر علی خاصا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس نے ملازمت چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ ساٹھ برس کی عمر تک ملازمت کر سکتا تھا۔ سب سے اہم تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ اس فلیٹ سے میرین ڈرائیو پر واقع ایک شان دار کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ شاہ میر کو پہلی بار صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ اس کے باپ نے کتنا کما لیا تھا۔ شہر میں اس کی بے شمار جائداد تھی اور بینک بیلنس اس کے علاوہ تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔

"جب آپ اتنا کما چکے ہیں تو کام چھوڑ دیں۔"

"نہیں برخوردار... بچایا تو بہت ہے لیکن خرچے بھی بہت زیادہ ہو گئے ہیں، ان کے لیے کمانا ضروری ہے۔" شمشیر علی نے انکار کر دیا۔ "بہر حال میں ابھی اپنے کام کو انجوائے کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

شاہ میر نے سنگاپور کی کچھ کمپنیوں میں جاب کے لیے سی وی بھیجی تھی۔ اس نے باپ کو بتایا۔ شمشیر نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے فی الحال تجربہ حاصل کرنے کے لیے برا نہیں ہے۔ دو تین سال بعد تمہیں اپنی میرین لائن میں لے آؤں گا۔ ممکن ہے تجربہ حاصل کر کے تم میری جگہ سنبھال لو۔"

شمشیر علی ایک یونانی میرین لائن میں کام کرتا تھا۔ شاہ میر کو فخر محسوس ہوا کہ وہ باپ کی جگہ لیتا۔ یعنی اس کی حیثیت تسلیم کر لی گئی تھی۔ اسے سنگاپور کی ایک کمپنی سے انٹرویو کال آ گئی۔ اس نے جا کر انٹرویو دیا اور اسے منتخب کر لیا گیا۔ اس نے فرسٹ کلاس میں انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی اس لیے اسے ملازمت حاصل کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اسے سنگاپور جا کر شپ جوائن کرنا تھا۔ اب وہ اپنے باپ کی طرح تین چار مہینے میں ایک بار ایک دو ہفتے کے لیے گھر آتا تھا۔ یہ کمپنی یورپ کے لیے بحری جہاز چلاتی تھی اور اس کے روٹ بھی لمبے تھے۔ شاہ میر جس جہاز پر تھا، وہ بحیرۂ روم کی متعدد بندرگاہوں پر رکتا تھا اور اس وجہ سے ایک ٹرپ خاصا طویل ہو جاتا تھا۔

عملی زندگی میں آنے کے بعد اسے پہلی بار علم ہوا کہ ایک بحری جہاز کے انجینئر کی آمدنی کیا ہو سکتی ہے۔ ایک انجینئر جو سب سے زیادہ تنخواہ لیتا تھا، اس کے باپ کی آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ شاہ میر کے دل میں شبہ سر اٹھانے لگا کہ اس کا باپ کہیں کسی غلط کام میں تو ملوث نہیں تھا، کیونکہ اسے چند مہینوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لائن میں بے حساب دولت تھی، اگر آدمی اپنے ضمیر کو خواب آور دوا دے دے۔ دھندے بے شمار تھے اور ان میں سے اکثر تو ایسے تھے جو صرف قانون کی کتابوں میں جرم شمار ہوتے تھے ورنہ میرین لائن کے لوگ انہیں جرم نہیں سمجھتے تھے اور بحری انتظامیہ ان کی پکڑ کرتی تھی، یعنی کھلی اجازت تھی۔ ایک سال میں اس کا شبہ پختہ ہو گیا اور وہ گھر آیا تو اس نے پہلی بار ہچکچاتے ہوئے باپ سے اس کی تنخواہ پوچھ لی۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی پاپا۔" اس نے دبے لفظوں میں کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس لائن میں آدمی کہاں تک کما سکتا ہے؟"

شمشیر نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اپنی آمدنی سے مطمئن نہیں ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے پاپا..."

"برخوردار! یہاں بھی صرف تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔ آدمی کو ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ ویسے اس لائن میں بہت آمدنی ہے۔"

"پاپا! میں نے صرف آپ کی تنخواہ پوچھی ہے۔" شاہ میر کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "جہاں تک دوسرے دھندوں کا تعلق ہے تو مجھے بھی ان کا علم ہے۔"

شمشیر کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میری تنخواہ اتنی ہے جتنی رقم میں ہر مہینے تمہاری تعلیم پر خرچ کرتا تھا۔"

یہ منگا بھی ضابطے کے خلاف ہے... مجھے اصول سکھانے والے کا یہی انجام ہوتا ہے

شاہ میر کو یقین نہیں آیا لیکن اس کے باپ کے الفاظ وضاحت کرنے کے لیے کافی تھے کہ وہ دوسرے غلط کاموں میں بھی ملوث تھا اور یہی اس کی دولت کا اصل راز تھا۔ ورنہ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے بیرون ملک اتنی مہنگی تعلیم دلوا سکتا۔ شاہ میر کو چپ دیکھ کر شمشیر نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہاری تسلی ہو گئی ہے۔"

شاہ میر کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ باپ سے بہت سارے سوال کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی پھر وہ واپس جانے لگا تو شمشیر نے اس سے کہا۔ "تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ اس بار تمہارا شپ برسلز تک جائے گا؟" شمشیر نے فرانس کی ایک بندرگاہ کا نام لیا۔

"جی پاپا... کام کیا ہے؟"

"برسلز کی بندرگاہ پر ایک آدمی تمہارے جہاز پر آئے گا اور تمہیں ایک چھوٹا سا اسٹیل بکس دے گا جو چاروں طرف سے مکمل بند ہوگا۔"

شاہ میر نے پوچھا۔ "مجھے اس کا کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں، تم اسے اپنے پاس بہت حفاظت سے رکھو گے کیونکہ یہ بہت قیمتی ہوگا۔ واپسی میں ممبئی کی بندرگاہ پر جب شپ رکے گا تو اسی طرح ایک شخص تم سے یہ بکس لے لے گا۔"

"برسلز میں تو میں لے لوں گا لیکن ممبئی میں مجھے کیا پتا چلے گا کہ کس شخص کو بکس دینا ہے؟"

"جو شخص تمہیں بکس دے گا، وہ تمہیں ایک نمبر بتائے گا۔ تم اس نمبر کو نوٹ کر لینا اور ممبئی میں شپ پر تم سے رابطہ

digestpk.blogspot.com

کرنے والا یہ نمبر بتائے گا تو تم بکس اس کے حوالے کر دو گے۔"

شاہ میر کو یہ معاملہ پُراسرار سا لگا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔

"پاپا! اس میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟"

"نہیں، اصل میں یہ کام میرے دوست کا ہے اور اس نے کہا ہے کرنے کو۔ بکس اسی کو چاہیے۔"

شاہ میر روانہ ہوا۔ تین ہفتے بعد اس کا جہاز برسلز پہنچا اور وہاں بندرگاہ پر جب شپ برتھ پر تھا تو ایک شخص اس سے ملنے آیا۔ اس نے خود کو شاہ میر کا دوست قرار دیا تھا۔ شاہ میر اسے اپنے کیبن میں لے آیا۔ اس نے شاہ میر کو ایک بکس دیا اور ایک نمبر بتایا جو اس نے نوٹ کر لیا۔ وہ صرف دس منٹ اس کے پاس رکا اور جانے سے پہلے اس نے شاہ میر سے کہا۔

"اس بکس کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ یہ اب مسٹر شاہ میر کی ذمے داری ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" اس نے جواب دیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد شاہ میر کی چھٹی حس نے اشارہ کیا اور اس نے بکس ایک ایسی جگہ چھپا دیا جہاں اس کے سوا کوئی اسے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی احتیاط کام آئی کیونکہ آدھے گھنٹے بعد ہی ان کے جہاز پر مقامی کسٹم حکام چڑھ دوڑے.... اور انہوں نے سب سے پہلے شاہ میر سے پوچھ گچھ کی.... وہ جاننا چاہتے تھے کہ مذکورہ شخص کیوں آیا تھا۔ اس شخص نے دس منٹ کے دوران اسے بتا دیا تھا کہ اگر اس کے بارے میں پوچھا جائے تو شاہ میر نے کیا کہانی سنانی ہے ورنہ بکس اور نمبر تو اس نے آتے ہی دے دیا تھا۔ اسی وجہ سے شاہ میر نے بکس چھپا دیا تھا اور اس نے کسٹم حکام کو وہی کہانی سنا دی۔ وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے جہاز کی تلاشی لی مگر انہیں بکس نہیں ملا.... کسٹم حکام کو شبہ تھا کہ اس شپ پر چرائے گئے قیمتی ہیروں کی ایک کھیپ اسمگل کرنے کے لیے لائی گئی ہے کیونکہ جو شخص جہاز پر آیا تھا، وہ ایک ایسے ہی نیٹ ورک کا مقامی سربراہ تھا جو یورپ اور امریکا بھر سے چرائے گئے ہیروں کو ایشیا اسمگل کرتا تھا.... جہاں ان کو دوبارہ تراش اور پالش کے بعد نئی شکل دے کر چین، انڈیا اور مڈل ایسٹ میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔

یہ ساری تفصیلات شاہ میر کو شپ کے یونانی کپتان نے بعد میں بتائی اور اس نے شاہ میر سے کہا کہ وہ اس واقعے کی رپورٹ کرے گا۔ شاہ میر شدت سے بے عزتی محسوس کر رہا تھا اور اس سے زیادہ دکھ اسے باپ کی حرکت پر تھا جس نے اس کو بتائے بغیر ایک ایسے جرم میں استعمال کیا تھا جس میں وہ گرفتار ہو جاتا تو اسے جرم ثابت ہونے پر کم سے کم پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا جاتا اور اس کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ کمپنی میں اس کی ساکھ ویسے ہی ختم ہو چکی تھی اور کپتان کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ شاید اس ٹرپ کے بعد فارغ کر دیا جائے گا۔ غم و غصے کی کیفیت میں ایک بار اس کے دل میں آیا کہ بکس کسٹم حکام کے حوالے کر دے مگر پھر اسے اس شخص کی وارننگ یاد آ گئی کہ یہ بکس اب شمشیر علی کی ذمے داری ہے۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اسمگلرز کے ہاتھ لگ گیا ہے اور شاید اس کا باپ بھی اسی گروپ کا ایک حصہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مشکوک ہو گیا ہے اور کم سے کم یورپ میں اس کی نگرانی کی جائے گی کیونکہ یہاں سب یورپی ممالک اسمگلرز کے معاملے میں ایک دوسرے سے مکمل تعاون کرتے ہیں۔ مصر پہنچنے سے پہلے وہ گھر فون بھی نہیں کر سکتا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کی کال ٹیپ نہ ہو جائے اور وہ پکڑا جائے۔ اس نے اسکندریہ سے گھر کال کی۔ اس نے شمشیر کو سب بتا کر کہا۔

"پاپا! میں اس بکس کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔"

"تم نے اچھا کیا ورنہ ہم دونوں ہی مشکل میں پڑ جاتے۔"

"لیکن میں تو مشکل میں پڑ گیا ہوں۔" شاہ میر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اپنے لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو گیا ہوں اور سب سے اہم بات یہ کہ اب میں زیر نگرانی ہوں۔ کوئی مجھ سے شپ پر آ کر بکس نہیں لے سکتا۔ میں اسے سمندر میں پھینک دوں گا۔"

"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" شمشیر نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ یہ ہیرے کن لوگوں کے ہیں اور اگر انہیں نقصان پہنچے تو وہ نقصان کرنے والے کو بھی نہیں چھوڑتے۔"

شاہ میر ڈر گیا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

"میں کچھ کرتا ہوں۔" شمشیر بولا۔

پھر ممبئی پر جب جہاز لنگر انداز ہوا تو عملے کو بندرگاہ پر اترنے کی اجازت ملی اور ایک شخص نے شاہ میر سے وہ بکس برتھ پر لے لیا۔ اس سے چھٹکارا پا کر شاہ میر نے سکون کا سانس لیا۔ ممبئی سے واپسی پر سنگاپور میں اس کی ملازمت بچ گئی تھی۔ البتہ کمپنی حکام نے اسے وارننگ دی کہ آئندہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دو ہفتے کی چھٹی پر واپس ملک آیا۔ اس نے باپ سے صاف کہہ دیا کہ وہ غلط کام نہیں کرے گا۔ باپ بیٹے میں تلخ کلامی ہوئی اور انجام کار شاہ میر

فہرست کتب 2009 2010

کتابیات پبلی کیشنز
مکتبہ نفسیات

Urdud Novels Jasoosi
jasoosimovelsurdu.blogpost.com
digestpk.blogpost.com

تصوف

سفیران حرم	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	
سوانح انبیاء	(ضیاء تسنیم بلگرامی) 2 حصے	250/- فی حصہ
روشنی [illegible]	[illegible]	
عظمت کے مینار	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
پراسرار بندے	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	250/-
[illegible]	(ضیاء تسنیم بلگرامی) 2 حصے	250/- فی حصہ
احوال اولیا	(ڈاکٹر [illegible])	350/-
[illegible]	(ڈاکٹر [illegible])	250/-
سفر آخرت	[illegible]	250/-
حکایات اولیاء (3)	(ضیاء تسنیم بلگرامی)	30/- فی حصہ

افسانے / ناول

ایمان کا سفر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	250/-
[illegible] گھر	(محی الدین نواب کی کہانیوں کا مجموعہ)	200/-
ادھا چہرہ	(محی الدین نواب کا طویل معاشرتی ناول)	300/-
[illegible]	(نامیہ سلطانہ اختر کا رومانی ناول)	250/-
[illegible]	(آسیہ مرزا کا رومانوی ناول)	800/-
دھوپ بارش اور سائے	(نکہت سیما)	1000/-
سیپ، صدف اور ساحل	(رخ چوہدری کا مکمل ناول)	450/-
خلش	(ڈاکٹر [illegible] بلگرامی)	450/-
[illegible] چاندنی کا سکوت	(نامیہ چوہدری کا خوب صورت ناول)	450/-
مہمان	(ماہ مبین)	300/-
منزل کہاں ہے	(ماہ مبین)	300/-
قیدی سانس لیتا ہے	(زاہدہ حنا کے انقلابی افسانے)	100/-
بجلی گری نشیمن پر	(نورحسین شاہ کا مکمل معاشرتی ناول)	150/-
[illegible]	(نورحسین شاہ [illegible])	150/-
گہن لگا چاند	(نورحسین شاہ کا مکمل ناول)	150/-
آدم زادی	(مظلوم عورتوں کی سچی کہانیاں)	100/-
[illegible]	[illegible]	200/-
[illegible]	(محسن رضا کا طبع زاد ناول)	200/-
مارکو پولو	(محسن رضا کے قلم سے)	200/-
[illegible]	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
[illegible]	(رضوانہ پرنس کے خوب صورت افسانے)	130/-
یہ کیسا جنون	(شمیم نازصدیقی کے خوب صورت افسانے)	125/-
خوفناک کہانیاں	(ابن حق کے قلم سے)	200/-

سسپنس ڈائجسٹ کے سلسلے

[illegible]	[illegible]	75/- فی حصہ
[illegible]	حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
[illegible]	[illegible]	75/- فی حصہ
فرعون	حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

جاسوسی ڈائجسٹ کے سلسلے

گمراہ	8 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مفرور	6 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
صندوق کا بیٹا	5 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
شکاری	20 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مجاہد	11 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
آتش فشاں	13 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

سب رنگ ڈائجسٹ کے سلسلے

بازی گر	7 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
انکا	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
اقابلا	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
سونا گھاٹ کا پجاری	(مکمل)	60/- فی حصہ
غلام روحیں	(مکمل)	60/- فی حصہ

دیگر ڈائجسٹوں کے سلسلے

چھلاوہ	صبیحہ بانو (مکمل)	500/-
جال	صبیحہ بانو (مکمل)	75/-
ہمزاد	شمیم نوید (مکمل)	75/-
شاطر (1)(2)	مسٹری میگزین کا سلسلہ (مکمل)	75/- فی حصہ
[illegible] کی چوریاں	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
انعام یافتہ کہانیاں	ڈائجسٹوں کی بہترین کہانیاں	50/-
چارلس سوبھراج کی سرگزشت		60/-
کالی کہانیاں	اے ایس صدیقی	40/-
بہترین کہانیاں	اے ایس صدیقی	75/-
شیطان صفت	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	75/-
سبز قدم	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ	75/-
اسیر ہوس	[illegible]	75/-
مست انتقام	[illegible]	75/-
ماورائی لڑکی	[illegible]	85/-
[illegible]	[illegible] کی سرگزشت	85/-

اپنا سامان اٹھا کر واپس اس ساحلی فلیٹ میں چلا گیا جو اس کی ماں کے نام تھا اور مرنے سے پہلے وہ اسے شاہ میر کے نام کر گئی تھی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے پہلے ہی اسے خبردار کر دیا تھا کہ اس کے بیٹے کو اس فلیٹ کی ضرورت پڑے گی۔

☆☆☆

لیلیٰ کو رات دیر سے نیند آئی اور وہ صبح اٹھی تو اس کا سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ کریم بلوچ اور ملاح دونوں اٹھ گئے تھے۔ اس نے ان کے لیے ناشتا بنایا اور خود صرف چائے لی۔ کریم نے اسے فکر سے دیکھا۔

”تو نے ناشتا کیوں نہیں کیا؟“

”سر میں درد ہے بابا۔“

کریم بلوچ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”ارے... تجھے تو بخار بھی ہے۔ رک جا، میں تیرے لیے پاپے لاتا ہوں۔ تو ناشتا کر پھر دوائی لینا۔“

کریم بلوچ پاپے لینے چلا گیا۔ ملاح صحن میں بیٹھا تھا۔ لیلیٰ نے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”تیرا اصل نام کیا ہے؟“

”ابھی مت پوچھو۔“ اس نے انکار کیا۔ ”تمہاری طبیعت کو کیا ہوا؟“

”سر میں درد ہے... اور تیری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں۔ زخم خشک ہو چکے ہیں۔ ایک دو دن میں بھر جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا اور شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”بس یہ زخم گہرا ہے۔ اسے بھرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

”ہر زخم بھر جاتا ہے۔“

”لیکن بعض زخم کبھی نہیں بھرتے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

لیلیٰ اس سے ایک سوال پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ”تیری بیوی بچے ہیں؟“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے جواب نہیں دیا تو لیلیٰ بے قرار ہو گئی۔ ”کیا تجھے اس سوال سے تکلیف ہوئی ہے؟“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کریم بلوچ واپس آ گیا۔ اس نے لیلیٰ کو پاپے کی تھیلی پکڑائی۔ ”ناشتا کر پھر میں دوا دیتا ہوں۔ میرے جانے سے پہلے بالکل ٹھیک ہو جانا ورنہ میرے کو پریشانی رہے گا۔“ وہ ملاح کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تیرے کپڑوں کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ ادھر گاؤں کا درزی ہے، اس کے پاس کپڑا بھی ہوتا ہے۔ میں تیرا ناپ دے آیا ہوں، شام تک وہ سوٹ تیار کر دے گا۔“

”میرا ناپ کیسے دیا؟“

”تیرا جسم میرے جیسا ہے، بس قد بڑا ہے۔ میں نے شلوار اور قمیص کی لمبائی بڑھا کر اپنا ناپ دیا ہے۔“

”تم لوگ میرے لیے بہت زحمت کر رہے ہو۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اب شرمندگی ہونے لگی ہے۔“

”ایسا بات نہ کر۔“ کریم بلوچ خود شرمندہ ہو گیا۔ ”تو مہمان ہے اور مہمان اللہ کا رحمت ہوتا ہے۔ اپنا نصیب خود لاتا ہے۔“

”اور کیا... تو کیوں ایسا سوچتا ہے؟“ لیلیٰ نے بے ساختہ کہا تو کریم بلوچ نے چونک کر اسے دیکھا۔ لیلیٰ گھر میں آنے والے مردوں سے بات نہیں کرتی تھی، گھلنے ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ ملاح سے نہ صرف بات کرتی تھی بلکہ اس کے لہجے میں ملاح کے لیے اپنائیت بھی ہوتی تھی۔ لیلیٰ نے باپ کا چونکنا محسوس کر لیا تھا اور شرمندہ ہو گئی۔ ناشتے کے بعد کریم بلوچ ملاح کو لے کر نورو بھائی کے پاس چلا گیا۔ نورو بھائی نے ملاح سے ملنے کو کہا تھا۔ لیلیٰ دوائی لے کر گھر کے کام نمٹانے لگی۔ وہ دوپہر میں واپس نہیں آئے اس لیے لیلیٰ نے روٹی نہیں پکائی اور کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ کریم بلوچ اور ملاح شام کو آئے۔ لیلیٰ نے سوتے سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ملاح اندر آیا تو اس کی نظر اس کی متورم آنکھوں اور بھیگا چہرہ دیکھ کر کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ اس کی نظریں محسوس کر کے لیلیٰ شرما گئی۔ کریم بلوچ آگے تھا اس لیے وہ یہ سب دیکھ نہیں سکا۔ لیلیٰ نے باپ سے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا۔

”نورو بھائی کے پاس کھا لیا تھا، اب تو چائے بنا دے۔ میں ملاح کے کپڑے لینے جاؤں گا۔ کل شام کو نکلنا ہے۔“

”شام کو کیوں بابا؟“

”ادھر مچھلی والی جگہ صبح سویرے پہنچنا ہے اس لیے شام کو نکلنا پڑیں گا۔“

لیلیٰ نے چائے بنائی۔ کریم بلوچ جلدی جلدی چائے ختم کر کے چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ درزی دکان بند کر کے نہ چلا جائے۔ ملاح صحن میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ لیلیٰ جھولے پر جا بیٹھی۔ وہ ملاح سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔ ”تو تھک گیا ہو گا؟“

”نہیں بلکہ اچھا لگا... دو دن سے لیٹا ہوا تھا۔“ وہ بولا۔ پہلی نظر کے بعد وہ لیلیٰ کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا

تھا۔ لیلیٰ اس سے پوچھتی رہی اور وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیتا رہا۔ اچانک لیلیٰ نے پوچھ لیا۔ ”تو میری طرف کیوں نہیں دیکھ رہا؟“

ملاح نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں اور بولا۔ ”تم لوگ میرے محسن ہو اور میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی ایسی بات ہو جس سے تمہیں تکلیف ہو۔“

”مجھے کیوں تکلیف ہونے لگی؟“ وہ سادگی سے بولی۔

”تو نے صبح بتایا نہیں کہ تیرے بیوی بچے ہیں؟“

وہ پھر چپ ہو گیا اور بہت دیر بعد اس کے منہ سے نکلا۔ ”تھے۔“

☆☆☆

اس کی دنیا اس کی نظروں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ نازیہ نے خودکشی کر لی تھی۔ نازیہ جس سے وہ جنون کی حد تک محبت کرتا تھا اور جو اسے دیوانہ وار چاہتی تھی۔ ان کی شادی کو یہ دوسرا سال تھا اور وہ ماں بننے والی تھی۔ شادی کے بعد وہ اسی اپارٹمنٹ میں تھے۔ اس کی بہت اچھی ملازمت تھی۔ کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ کوئی لڑائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خوش تھے جتنا محبت کرنے والے میاں بیوی ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود نازیہ نے خودکشی کر لی۔ وہ شپ پر تھا جب اسے یہ اطلاع ملی اور گھر آنے تک اس کا بیشتر وقت اسی سوچ میں گزرا... آخر کیوں؟ اس کے ماؤف ذہن میں رہ رہ کر یہی سوال گونج رہا تھا۔ نازیہ کی لاش سرد خانے میں اس کی منتظر تھی کہ وہ وطن آئے اور اسے منوں مٹی تلے دفنا دیا جائے۔

شاہ میر الگ ہو گیا تھا لیکن باپ اور گھر سے اس کا رشتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ جب آتا، باقاعدگی سے گھر جاتا تھا۔ وہاں منیر تھا اس کا بھائی اور نازیہ بھی۔ جب وہ بی اے میں تھی تو بھرپور جوان ہو چکی تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور شاہ میر کے اندر کہیں اس کے لیے پسندیدگی تھی۔ لیکن اس نے باپ یا کسی اور سے اس پسند کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ نازیہ منیر سے بہت بے تکلف اور قریب ہے۔ شاید وہ اسے پسند کرتی تھی اور شاہ میر کے دل میں ڈر تھا کہ اگر اس نے کسی سے کہا تو شاید پھر نازیہ اسے نہ ملے۔ وہ اپنی پسند کو ساری عمر اپنے دل میں چھپا کر رکھ سکتا تھا لیکن یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا کہ اس کی پسند ظاہر ہو کر بھی اسے نہ مل سکے۔ بی اے کے بعد نازیہ یونیورسٹی چلی گئی تھی۔

منیر انجینئر بن گیا اور شمشیر نے اسے اپنی کمپنی میں ملازمت دلوا دی جبکہ شاہ میر کے لیے اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ جب وہ یورپ سے آیا تو شاہ میر کو پتا چلا کہ منیر شراب پینے لگا ہے۔ جب وہ گھر آیا تو منیر اپنے کمرے میں بوتل اور گلاس سمیت موجود تھا۔ شاہ میر حیران رہ گیا۔

”تم پینے لگے ہو؟“

”ہاں تو کیا ہوا؟ پاپا بھی تو پیتے ہیں۔“ اس نے کمال اطمینان سے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔ ”لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم بھی شراب پینے لگو گے۔“

”جو کام باپ کرتا ہے، وہ بیٹے بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی یورپ میں رہ کر اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔“

”وہ میرے بھی باپ ہیں اور میں بھی یورپ جاتا رہا ہوں۔“ شاہ میر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”لیکن مجھے کبھی پینے کا خیال نہیں آیا۔“

منیر مسکرایا۔ ”کیونکہ تم ہمیشہ سے اچھے بچے بننے کی کوشش کرتے تھے اور تمہاری یہ کوشش اب بھی جاری ہے۔“

شاہ میر نے غور کیا تو منیر کی بات کو درست پایا۔ وہ واقعی بچپن سے پاپا کی نظر میں آنے کے لیے اچھا بچہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود وہ مقام نہیں ملا جو منیر کو بغیر کسی کوشش کے مل گیا۔ اس نے کہا۔

”پاپا جانتے ہیں؟“

منیر نے شانے اچکائے۔ ”بے بی... جب ہم اولاد ہو کر ان کے مشاغل کے بارے میں سب جانتے ہیں تو وہ باپ ہیں... ان کو ضرور پتا ہو گا۔“

”انہوں نے تمہیں روکا نہیں؟“

منیر نے تمسخرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی بات کرتے ہو... جو کام وہ خود کرتے رہے ہیں، ہمیں اس سے کیسے منع کر سکتے ہیں؟“

”منع کر سکتے ہیں... اگر وہ کام میں نے کیا ہو۔“ شاہ میر نے کہا۔

اس کے بعد اس نے گھر جانا کم کر دیا۔ شمشیر بہت کم گھر پر پایا جاتا تھا اور منیر بھی بس چھٹیوں میں آتا۔ یعنی سال میں دو تین بار۔ نازیہ سے بھی شاہ میر کی اتنی ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی اور نازیہ سے وہ خود جھجکتا تھا۔ کبھی سامنا ہوتا تو ان کے درمیان بہت رسمی سی بات ہوتی تھی۔ نازیہ سے بھی سلام اور حال احوال پوچھنے سے زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جب اس نے خاص طور سے اسے فون کر کے گھر آنے کو کہا تو شاہ میر کو حیرت ہوئی۔ منیر اور شمشیر ملک سے باہر تھے۔ نازیہ ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد وقت گزاری کے لیے فیشن

digestpkblogpost.com

ڈیزائننگ کا ایک کورس کر رہی تھی اور وہ بھی گھر پر نہیں تھی۔ شاید اسی لیے ماریہ نے اسے اس وقت بلایا تھا۔ وہ شام کو گھر آیا۔ ماریہ نے اس کے لیے چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ شاہ میر بھی سمجھ رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہے ورنہ ماریہ نے پہلے کبھی اسے اس طرح نہیں بلایا۔ چائے کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔

"شاہ میر! تم اب بڑے اور برسرِ روزگار ہو گئے ہو بلکہ تم نے بچایا بھی ہو گا۔ میرا اور شمشیر کا خیال ہے، اب تمہاری شادی کر دی جائے۔"

"پاپا نے تو ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔"

"انہوں نے مجھ سے ڈسکس کیا تھا۔ ہم تمہاری شادی تمہاری پسند سے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم کسی کو پسند کرتے ہو؟"

شاہ میر کا دل دھڑکا کہ وہ نازیہ کا نام لے دے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ "کیا آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟"

"ہے تو لیکن پہلے ہم تمہاری پسند معلوم کرنا چاہتے ہیں۔" ماریہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

شاہ میر چونکا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "اگر میں کہوں کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں ہے تب؟"

"تب میں پوچھوں گی کہ نازیہ کے لیے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"نازیہ..." وہ کہتے کہتے رکا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ منیر کو پسند کرتی ہے۔"

"ہمارا بھی یہی خیال تھا۔" ماریہ نے کہا۔ "لیکن جب میں نے اس سے بات کی تو اس نے منیر کے لیے صاف انکار کر دیا۔"

"اس لیے پاپا نے سوچا کہ نازیہ کی شادی مجھ سے کر دی جائے؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

ماریہ نے غور سے اسے دیکھا۔ "ایسا نہیں ہے لیکن یہ خود نازیہ کی خواہش ہے۔"

"نازیہ کی خواہش؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں، وہ تمہیں پسند کرتی ہے تم چاہو تو اس سے خود بات کر سکتے ہو۔" ماریہ نے رسانیت سے کہا۔ "تم سب میرے بچے ہو اور مجھے تمہاری خوشیاں چاہئیں۔"

"مجھے نازیہ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شاہ میر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھ لیں جو اس کی خواہش ہے وہی میری بھی خواہش ہے۔"

یوں نازیہ اس کی زندگی میں آ گئی۔ وہ اس وقت سے شاہ میر کو پسند کرنے لگی تھی جب اس نے کسی ایسے شخص کے لیے سوچا جو اس کا جیون ساتھی بن سکے۔ شاہ میر کو فکر تھی کہ نازیہ اب تک بہت آسودہ زندگی گزارتی آئی ہے اور اسے کھلا خرچ کرنے کی عادت ہے جبکہ اس کی تنخواہ بہت اچھی سہی لیکن محدود تھی۔ اس نے شادی کے شروع دنوں میں دبے لفظوں میں اس بات کا اظہار کیا بھی تھا لیکن نازیہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اس اپارٹمنٹ اور محدود آسائشوں میں بھی خوش تھی اور جہاں تک شاہ میر کا تعلق تھا تو نازیہ کو پا کر اسے سارے جہان کی دولت مل گئی تھی۔

شادی کے موقع پر اس نے لمبی چھٹی لی لیکن یہ چھٹیاں پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ بادلِ ناخواستہ اسے جانا پڑا۔ یہ پہلے ہی طے تھا کہ ملازمت پر جاتے ہوئے وہ نازیہ کو گھر چھوڑ جایا کرے گا، وہ اکیلے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتی تھی۔ یوں سوائے ان دس پندرہ دنوں کو چھوڑ کر جب شاہ میر یہاں ہوتا تھا، باقی وقت وہ ماں کے پاس رہتی تھی۔ شادی کے دوسرے سال وہ امید سے ہو گئی۔ اس لیے جب اس بار شاہ میر آیا تو وہ گھر پر ہی رکا کیونکہ نازیہ کو ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ شاہ میر کو یہاں آ کر رہنا اچھا نہیں لگا لیکن نازیہ اور ہونے والے بچے کی خوشی میں وہ خوش تھا۔ البتہ نازیہ چپ چپ سی تھی، اس وقت اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ پچھلی بار وہ یہ اطلاع ملتے ہی آیا تھا مگر دوسری بار اسے آنے کا موقع تین مہینے بعد ملا اور جب وہ واپس آیا تو نازیہ بہت خاموش خاموش سی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے بستر پر خاموش پڑی رہتی تھی۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور آنکھوں میں عجیب سی دہشت بھری تھی۔

شاہ میر اسے دیکھ کر حیران ہوا لیکن اس کا خیال تھا کہ نازیہ پہلی بار ماں بننے کی وجہ سے ڈر رہی ہے اور اس نے سنا تھا کہ ان دنوں عورت کی طبیعت ویسے بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ پریشان نہیں تھا کیونکہ نازیہ باقاعدگی سے ڈاکٹر کو دکھا رہی تھی اور سب ٹھیک تھا۔ اس کے آتے ہی نازیہ نے اس سے اپارٹمنٹ چلنے کی فرمائش کی۔ شاہ میر نے اسے سمجھایا۔

"ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، میں وہاں جاؤں گی۔ مجھے اب مزید یہاں نہیں رہنا ہے۔"

اس کے اصرار سے مجبور ہو کر شاہ میر اسے اپارٹمنٹ لے گیا۔ اس نے گھر کے کاموں کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی

تھی۔ یہاں آ کر بھی نازیہ کی چپ نہیں ٹوٹی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔ اس بار اسے محدود چھٹیاں ملی تھیں اور اسے دو ہفتے بعد واپس جانا تھا۔ جب اس نے نازیہ سے گھر چلنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ "نہیں، میں یہیں رہوں گی۔"

شاہ میر پریشان ہو گیا۔ "یہاں اکیلے کیسے رہو گی؟"

"رہ لوں گی۔ میں نے اس ملازمہ سے بات کر لی ہے، وہ دن رات میرے ساتھ رہنے کو تیار ہے۔"

شاہ میر اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ماریہ سے بات کی اور اس نے بھی نازیہ کو سمجھایا لیکن اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔ مجبوراً ماریہ کو اس کے پاس آ کر رہنے کا فیصلہ کرنا پڑا تب کہیں شاہ میر کو سکون ملا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نازیہ گھر جانے کے لیے کیوں تیار نہیں۔ وہ کیوں اپارٹمنٹ میں رہنا چاہتی تھی؟ اس بار بھی شاہ میر کا ٹرپ بہت طویل تھا اور اسے کوئی چار مہینے بعد گھر آنے کا موقع ملا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اس بار وہ کم سے کم دو مہینے کے لیے گھر آئے گا تاکہ ڈیلیوری اس کی موجودگی میں ہو۔ جب وہ گھر آنے کی تیاری کر رہا تھا تو نازیہ کی خودکشی کی اطلاع آ گئی۔ اس نے بالکونی سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا اور وہ اتنی آسانی سے چار فٹ اونچی بالکونی سے نہیں گر سکتی تھی۔ اس حالت میں کہیں بھی اتفاقاً چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماریہ نے چند منٹ پہلے اسے بیڈ روم میں دیکھا تھا اور اس کے لیے ناشتا بنانے گئی تھی۔ پولیس نے تفتیش کے بعد اسے خودکشی قرار دیا۔

☆☆☆

لیلیٰ کو احساس نہیں ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب وہ چپ ہو گیا تو لیلیٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں نہیں جانتا۔" اس نے سر جھکا لیا۔

لیلیٰ نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔ "میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"تم..." اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ "تم میرے لیے دعا کر سکتی ہو کہ خدا مجھے سکون عطا کرے، مجھے اس کی بہت ضرورت ہے۔"

لیلیٰ نے خلوص سے کہا۔ "آج میں نماز پڑھ کر تمہارے لیے دعا کروں گی۔"

دروازے کے باہر سے کریم بلوچ کے کھنکھارنے کی آواز آئی تو لیلیٰ جلدی سے اندر چلی گئی۔ اسے ڈر تھا کہ باپ

اس کی نم آنکھیں نہ دیکھ لے۔ وہ صحن میں ملاح کو کپڑے دے رہا تھا۔ "دیکھ لے... تیرے ناپ کے ہیں، ابھی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔"

اس نے ناپ دیکھا اور بولا۔ "ٹھیک ہیں چاچا... تمہارا بہت شکریہ۔"

"ارے نہیں، شکریہ کا کیا بات ہے۔" کریم بلوچ بولا۔ "ابھی حکیم بڈھا آنے گا اس سے پوچھ کر نہا لینا۔"

حکیم بڈھا نے اس کا معائنہ کیا اور شانے والے زخم کو پانی سے بچانے کو کہا۔ "ابھی کل تک پانی مت لگنے دینا۔"

"تو پانی کا بات کرتا ہے، یہ کل میرے ساتھ سمندر میں جا رہا ہے۔" کریم بلوچ ہنس کر بولا۔

"سمندر کا خیر ہے۔" حکیم بڈھا نے بھی دانت نکالے۔ "وہ تو مائی باپ ہے۔"

"میں شانہ بچا کر نہا لیتا ہوں۔" اس نے حکیم کے جانے کے بعد کہا۔ کریم بلوچ نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ بالٹیاں اٹھا کر پانی لینے روانہ ہوا تو لیلیٰ باہر آئی اور دبے لفظوں میں اس سے کہا۔

"ابھی مت نہاؤ، پانی لگ گیا تو زخم خراب ہو گا اور تمہیں تکلیف ہو گی۔"

اسے خود سے وحشت ہو رہی تھی کیونکہ سمندری مہک ابھی تک جسم پر تھا۔ اس نے کہا۔ "ہونے دو۔"

"تمہیں اپنی تکلیف کی پروا نہیں ہے؟"

"نہیں... اب اپنی کوئی تکلیف، تکلیف نہیں لگتی۔"

لیلیٰ نے رخ دوسری طرف کر لیا۔ "پر کسی اور کو تو تیری تکلیف لگتی ہے۔" یہ کہتے ہی وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دنگ سا رہ گیا۔ چند لمحے کے لیے تو وہ سمجھا ہی نہیں تھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ گئی ہے۔ کریم بلوچ پانی لے کر آیا تو وہ چونکا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر اس سے بھاری بالٹی لینی چاہی لیکن اس نے روک دیا۔ "نہیں، ابھی تیرا زخم ٹھیک نہیں ہے، اس پر زور مت ڈال۔"

"تمہیں زحمت ہوتی ہے چاچا۔" اس نے کن انکھیوں سے لیلیٰ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ "پر اب میں نے سوچا ہے ابھی نہیں نہاؤں گا... بلاوجہ زخم خراب ہو گیا تو ادھر سمندر میں مشکل ہو گی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تم۔" کریم بلوچ نے سر ہلایا۔ "پر ایسا کر... کپڑا پانی میں بھگو کر جسم پر پھیر لے، اس سے سکون ملے گا۔"

اس نے یہی کیا اور کپڑے بدلے تو اسے بہت اچھا

digestpk.blogspot.com

محسوس ہوا... جب وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھا تھا تو لیلیٰ باہر آئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے اس کی بات مان کر اس نے لیلیٰ کو کوئی مان دیا ہو۔ اس نے کریم بلوچ سے پوچھا۔ "بابا! کتنے دن میں آجاؤ گے؟"

"چار دن تو لگیں گے۔" کریم بلوچ نے حساب لگایا۔ "ایک دن آنے اور جانے کا اور دو دن شکار کا... پھر کبھی ادھر فشری بھی لے جاتی ہے۔"

لیلیٰ خوش ہوگئی۔ "یعنی جلدی آجاؤ گے۔"

"ہاں، بھئی آیا ہے تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔"

اس رات گرمی تھی اس لیے دونوں مرد باہر ہی سو گئے۔ اس رات لیلیٰ نے بہت اچھے خواب دیکھے جو ہر جوان لڑکی دیکھتی ہے جب اسے کوئی مرد اچھا لگتا ہے۔ ایک گھر اور خوب صورت زندگی کے خواب۔ وہ صبح اٹھی تو اس کا دل یہ سوچ کر بوجھل ہوگیا کہ کیا اس کے خواب سچ ثابت ہوں گے؟ اسے نہیں معلوم تھا کہ ملاح کون ہے اور ایک بار یہاں سے جاتا تو واپس بھی آتا یا نہیں۔ دن میں کئی بار جب وہ اکیلی ہوتی تو آنسو اس کی آنکھوں سے خود بخود نکل آتے۔ شام تک اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ کریم بلوچ روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ نورو بھائی نے کچھ سامان اس کے ذمے ڈالا تھا جو اسے لانا تھا، وہ اسی کے لیے نکلا ہوا تھا۔ ملاح گھر پر تھا۔ اب لیلیٰ اور کریم بلوچ کو اس کی عادت ہوگئی تھی اس لیے نہ تو کریم اسے گھر چھوڑ کر جاتے ہوئے گھبراتا تھا اور نہ لیلیٰ اس کی موجودگی میں جھجکتی تھی۔ جب کریم گھر پر نہیں ہوتا تھا تو وہ اندر جانے سے گریز کرتا اور صحن میں بیٹھا رہتا۔ آج لیلیٰ اس کے سامنے آنے سے گھبرا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی سرخی سے اس کے دل کا حال نہ بھانپ جائے۔ وہ اس سے چھپا رہی تھی لیکن جب لیلیٰ اسے چائے دینے آئی تو اس نے دیکھ لیا اور وجہ بھی جان لی۔

"تم رو رہی تھیں؟"

"نہیں تو۔" لیلیٰ جلدی سے بولی۔

"تم نے مجھ سے سچ اگلوا لیا لیکن خود جھوٹ بول رہی ہو۔" اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

"ہاں، رو رہی تھی۔" لیلیٰ نے اعتراف کرلیا۔

"کیوں؟"

"تم لوگ چلے جاؤ گے۔"

"ہم لوگ۔" اس نے غور کیا۔ "لیکن تمہارا بابا تو ہمیشہ جاتا ہے۔ کیا تم ہمیشہ اسی طرح روتی ہو؟"

لیلیٰ سچ بولنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لیے جھوٹ نہ بول سکی۔ "نہیں۔"

"تو ابھی کیوں رو رہی ہو؟"

"تم جو چلے جاؤ گے۔" لیلیٰ کا لہجہ پھر بھرا گیا۔

"میرے جانے سے کیا ہوگا... مجھے تو جانا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی رو رہی ہو؟"

"ہاں۔" لیلیٰ نے کہا اور بھاگ کر اندر چلی گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا وہ رو رہی تھی۔ اس کا دل بوجھل ہوگیا۔ وہ سوچتا رہا پھر اٹھ کر لیلیٰ کے کمرے کے دروازے تک آیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی اور اس کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس نے دروازہ ہلکے سے بجایا تو وہ ساکت ہوگئی مگر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"تم رو رہی ہو؟" اس نے پوچھا اور جب جواب نہیں ملا تو وہ اندر آگیا۔ "بولو... رو رہی ہو۔"

لیلیٰ کا سانس رک گیا اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "تم یہاں... بابا آگئے تو؟"

"میں ابھی چلا جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم کیوں رو رہی ہو؟"

لیلیٰ نے نظریں اٹھا کر معصومیت سے کہا۔ "میں نہیں بتا سکتی کیونکہ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "تم میرے جانے کی وجہ سے رو رہی ہو؟"

لیلیٰ نے سر جھکالیا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ تم اب گئے تو واپس نہیں آؤ گے۔"

"میں واپس آؤں گا۔" اس نے کہا تو لیلیٰ خوش ہوگئی۔

"سچ؟"

"ہاں، میں ضرور واپس آؤں گا... اگر زندہ رہا تو۔"

"اللہ نہ کرے جو تمہیں کچھ ہو۔"

"بس تم میرے لیے دعا کرنا۔" اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ معصوم لڑکی اسے پسند کر بیٹھی ہے حالانکہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا کہ کریم بلوچ آگیا۔ وہ سامان لے آیا تھا۔ لیلیٰ نے ان کے لیے کھانا بنادیا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور سامان لے کر روانہ ہوگئے۔ لیلیٰ انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اس نے بہ ظاہر کریم سے کہا۔

"بابا! جلدی آنا۔"

"اڑے چھوری... جانے تو دے۔" کریم نے ہنس کر کہا۔

وہ ساحل پر پہنچے تو پانی میں کھڑی نورو بھائی کی کشتی روانگی کے لیے تیار تھی۔ جب وہ کھلے سمندر کی طرف روانہ ہوئی تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور وہ اس کے اگلے حصے میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے لیلیٰ سے سب سچ نہیں کہا تھا۔

☆☆☆

نازیہ کو دفنانے کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ شمشیر آگیا تھا لیکن حمیر کو چھٹی نہیں ملی تھی۔ تیسرے دن شمشیر بھی واپس چلا گیا۔ ماریہ غم سے بے حال تھی۔ نازیہ اس کی ایک ہی اولاد تھی لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔ گھر جاتے ہوئے اس نے شاہ میر سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے انکار کردیا۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

ماریہ کے جانے کے بعد وہ اپارٹمنٹ میں اکیلا تھا اور سارا دن یہی سوچتا رہتا کہ نازیہ نے خودکشی کیوں کی؟ اس نے شاہ میر سے پسند کی شادی کی تھی اور وہ اس کے ساتھ خوش تھی... پھر وہ ماں بننے والی تھی۔ نازیہ کو کوئی نفسیاتی الجھن بھی نہیں تھی۔ شاہ میر نے جہاں تک اسے جانا تھا وہ سادہ مزاج لڑکی تھی۔ ایک دن وہ بالکونی میں بیٹھا سامنے سمندر کو گھورتے ہوئے انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسے خیال آیا، اس نے اب تک نازیہ کی چیزوں کو چیک نہیں کیا تھا۔ شاید ان میں سے کسی چیز سے یہ عقدہ کھلتا کہ اس نے اپنی جان لینے کا فیصلہ کیوں کیا۔ نازیہ کے مرنے کے بعد وہ بیڈروم میں نہیں سوتا تھا بلکہ اس نے لاؤنج میں سونا شروع کردیا تھا۔ بیڈروم میں جاتے ہی اسے نازیہ کی یاد آنے لگتی، اس لیے اس نے بیڈروم میں رہنا ترک کردیا تھا۔

وہ بیڈروم میں آیا تو نازیہ کی یاد اتنی شدت سے آئی کہ وہ کچھ دیر کے لیے خود سے بھی غافل ہوگیا لیکن پھر وہ چونکا۔ وہ یہاں اس لیے نہیں آیا تھا اس لیے اس نے اپنا ذہن جھٹک دیا اور سب سے پہلے الماری کھولی۔ یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا۔ الماری میں نازیہ کے کپڑے اور استعمال کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں اس کی شخصیت اور اس کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور وہ اسے کسی صورت نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ ایک لباس نکالتے ہوئے وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور لباس میں منہ چھپا کر رو پڑا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لیکن رونے سے اس کے سینے پر طاری بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ اب بہتر طور پر سوچ سکتا تھا۔ اس نے الماری کی مکمل تلاشی لی اور اسے اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے نازیہ کی خودکشی پر روشنی پڑتی۔ اس نے جیولری باکس چیک کیا، اس میں نازیہ کا سارا زیور تھا لیکن اس میں بھی کوئی نئی یا انجانی چیز نہیں تھی۔ اس نے دوسری جگہوں کی تلاشی لی۔ نازیہ کو میوزک کا شوق تھا۔ بیڈروم میں ایک ڈی وی ڈی پلیئر اور بے شمار ڈی وی ڈیز کے لیے ریک تھا۔ اس نے یہاں بھی دیکھا مگر اسے ناکامی ہوئی۔

پھر اس نے الماری کے اندر لاکر کو دیکھا۔ اس میں نازیہ کی ڈائری موجود تھی۔ اسے خیال آیا کہ اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ اسی ڈائری میں ممکن ہے۔ وہ ڈائری لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا پہلا صفحہ الٹا۔ یہ چھ سال پرانی ڈائری تھی اور نازیہ نے صرف مخصوص استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اسے ڈائری لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ شاہ میر نے اسے کبھی ڈائری لکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی ورق گردانی کرتا ہوا اس صفحے پر پہنچا جہاں اس کا نام لکھا تھا اور نیچے نازیہ کی تحریر تھی۔ شاہ میر جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے تھی۔

"شاہ میر!

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کو یہ بات کیسے بتاؤں۔ میں پہلی بار آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں اور پہلی بار مر رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی جو ہوا اس میں میرا بھی کوئی قصور ہے یا نہیں۔ ہاں میرا اتنا قصور ضرور ہے کہ میں نے آپ کو بتایا نہیں... اب بتا رہی ہوں اور بتانے کے بعد مجھ میں آپ کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہے اس لیے اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ اس بچے کو لے کر جو آپ کا نہیں ہے۔"

ڈائری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ یہ الفاظ شاہ میر کے لیے دھماکا ثابت ہوئے تھے۔ اسے لگا جیسے اس کا وجود اس دھماکے سے ریزہ ریزہ ہوگیا ہو۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نازیہ نے جو لکھا ہے وہ سچ ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاہ میر کسی صورت ان الفاظ کو سچ نہ سمجھتا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری اٹھائی اور پھر سے پڑھنے کی کوشش کی۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے۔ بڑی کوشش کرکے وہ اپنی نظروں کو مرکوز کرسکا۔ نازیہ نے لکھا تھا۔

"مجھے معلوم ہے یہ الفاظ آپ کے لیے قیامت خیز ہوں گے لیکن یہ سچ ہیں۔ میری بدبختی کا آغاز اس دن ہوا جب آپ سات مہینے پہلے گئے تھے اور آپ کے جاتے ہی حمیر آگیا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میری حمیر سے اچھی دوستی تھی لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب حمیر مجھے واقعی دوست سمجھتا تھا۔ جب میں بڑی ہوئی تو اس کی نظریں بھی بدل گئیں اور جب میں اس سے کھنچنے لگی۔ پرانی دوستی کے ناتے وہ مجھ پر حق سمجھتا تھا

digestpk.blogspot.com

اور کبھی کبھی اسے غلط طور پر استعمال کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ شروع میں تو میں نادان تھی اور اس کی حرکتیں سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ مجھے عقل آگئی اور میں نے اسے روک دیا۔ دوسری صورت میں میں نے ماما اور پاپا کو بتانے کی دھمکی دی تھی اور اس پر وہ بہت تلملایا۔ سچ کہوں تو مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی لیکن ایک ہی گھر میں رہنے والے فرد سے تعلق خراب کر کے نہیں رہا جا سکتا اس لیے میں دل پر جبر کر کے اسے برداشت بھی کرتی رہی۔ آپ کی طرح ماما اور پاپا بھی سمجھتے تھے کہ میں منیر کو پسند کرتی ہوں حالانکہ جب میں نے اپنے جیون ساتھی کے لیے سوچا تو یقین کیجیے ذہن میں صرف آپ کا خیال آیا۔ ماما نے مجھ سے منیر کے لیے پوچھا تو میں نے بلا جھجک انکار کر کے آپ کا نام لے لیا اور آپ میرے نصیب میں تھے اس لیے آپ مجھے مل گئے۔

''سات مہینے پہلے جب آپ گئے تو میں ماما کے پاس چلی گئی۔ اس دوران میں منیر وہاں آگیا تھا۔ جب سے اس نے شراب پینا شروع کی تھی میں اس سے گریز کرنے لگی تھی۔ جب وہ تنہائی میں مجھے ملتا تو مجھے اس سے خوف آنے لگتا۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ کہیں تنہائی میں اس سے میرا سامنا نہ ہو۔ مگر اس دن میری قسمت میں یہ حادثہ لکھا ہوا تھا۔ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ آرام کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں تھی کہ منیر بنا دستک دیے اندر آگیا۔ میں بوکھلا گئی۔

''تم دستک دیے بغیر کیوں اندر آئے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں پہلے بھی اس طرح آتا رہا ہوں۔'' اس نے کہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔

''تم نشے میں ہو؟''

وہ بیڈ کی طرف آیا۔ ''ارے نہیں... بس تھوڑی سی پی ہے۔''

''اس وقت مجھے اس کے عزائم کا اندازہ نہیں تھا۔ پاس آتے ہوئے اس نے اچانک ایک رومال میرے منہ پر رکھ دیا۔ جب وہ اندر آیا تو میں نے غور نہیں کیا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ پشت کی طرف ہے۔ اس میں رومال دبا تھا اور اس سے ایسی بو اٹھ رہی تھی جو سیدھی میرے دماغ کو لگی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری دنیا اندھیر ہو رہی۔ منیر نہ جانے کس بات کا بدلہ لے کر جا چکا تھا۔ اس نے مجھے آپ سے کیا، اپنے آپ کا سامنا کرنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خودکشی کرلوں لیکن نہ کر سکی۔

کاش کہ اس وقت کر لیتی۔ اب کر رہی ہوں تو ایک جان کو اور ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ سات مہینے جس طرح گزار پائی ہوں اس طرح اور نہیں جی سکتی۔ اس لیے مرنے جا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

میں اس قابل نہیں کہ خود کو آپ کی کہہ سکوں۔''

شاہ میر کتنی دیر ساکت بیٹھا رہا۔ وہ خود کو یقین دلا رہا تھا کہ اس نے جو پڑھا ہے، وہ سچ ہے؟ کیونکہ یہ خط نازیہ نے لکھا تھا اور مرنے سے ایک دن پہلے لکھا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور باپ کا جھکاؤ واضح طور پر منیر کی طرف محسوس کیا۔ وہ شروع سے صابر تھا اس لیے اس بات کو خاموشی سے برداشت کرنے لگا۔ پھر منیر کو باپ کے رویے سے شہ ملی اور وہ چھوٹا ہونے کے باوجود شاہ میر پر اور اس کی چیزوں پر اپنا حق جتانے لگا۔ وہ اپنی کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا لیکن اگر اس کی کوئی چیز پسند آجاتی تو بلا تکلف اس پر قابض ہو جاتا۔ وہ اسے برادرانہ حسد سمجھتا تھا لیکن اب منیر نے جو کیا تھا، وہ شاید شیطان بھی نہ کرتا۔ اس کے اندر کچھ جلنے لگا۔ اس نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''منیر...''

☆☆☆

ان کا تعلق دو حریف ممالک سے تھا مگر ان کا کاروبار مشترک تھا اور اسی وجہ سے وہ آپس میں دوست تھے۔ انہیں پروا نہیں تھی کہ ان کے ملک آپس میں دشمن ہیں۔ وہ اسمگلر تھے اور ہیرے اسمگل کرتے تھے۔ یہ ہیرے یورپ اور امریکا سے آتے تھے اور انہیں دوبارہ تراش اور پالش کے لیے انڈیا بھیجا جاتا تھا۔ اصل میں یہ چوری کا مال ہوتا تھا۔ مخصوص تراش کے ہیرے مارکیٹ میں شناخت کیے جا سکتے تھے اس لیے ان کی شناخت ختم کرنے کے لیے انہیں دوبارہ تراشا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہیں انڈیا بھیجا جاتا جہاں ہیرے تراشنے اور انہیں پالش کرنے کی بہت بڑی انڈسٹری کام کر رہی تھی۔

رمیش کھوجی کا سورت میں ہیرے تراشنے کا کارخانہ تھا۔ وہ قانونی طور پر بھی یہ کام کرتا تھا۔ پھر زیادہ دولت کمانے کے لیے اس نے مناسب معاوضے پر چوری شدہ ہیرے دوبارہ تراشنے کا کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس خاص کاریگر تھے جو رات کی تاریکی میں کام کرتے تھے اور اپنی زبان بند رکھنے کا بھاری معاوضہ پاتے تھے۔ پھر رمیش کھوجی نے پرویز خان کے کہنے پر چوری کا مال خریدنا شروع کر دیا۔ پرویز خان خلیج میں ہیروں کو انڈیا پہنچانے کا کام کرتا تھا کیونکہ یورپ میں کام کرنے والا گینگ

ہیرے خلیج تک پہنچاتا تھا۔ یہاں سے آگے ان کو مقامی لوگ لے جاتے تھے۔ ان میں کیریئرز بھی تھے اور براہ راست خریدار بھی جو ان کو انڈیا بھیجتے تھے۔ وہاں دوبارہ تراش کے بعد یہ مالک کو واپس مل جاتے تھے اور پھر انہیں ایشیا کی منڈیوں میں کھپا دیا جاتا تھا۔ ان کے یہاں بڑے خریدار تھے جو اپنی دولت کو بینک اور کاغذی کرنسی میں رکھنے کے قائل نہیں تھے۔

پرویز خان نے کیریئر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا اور جب اس کے پاس رقم آگئی تو اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بعد میں اس نے رمیش کھوجی کو بزنس پارٹنر بنا لیا۔ وہ مل کر سرمایہ لگاتے اور جو نفع ہوتا، وہ آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ ان کا روٹ پاکستان اور بھارت کی سمندری حدود تھیں جہاں انہوں نے حکام سے بنا کر رکھی تھی اس لیے انہیں کبھی نہیں روکا جاتا تھا۔ وہ آرام سے اپنا کام کرتے تھے۔ شروع میں انہوں نے چھوٹی شپ منٹس میں ہاتھ ڈالا تھا پھر رفتہ رفتہ ان کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے وسیع پیمانے پر ہیرے خریدنا شروع کر دیے۔ یہ کام ان کو راس آگیا تھا کیونکہ ہیروں کی مارکیٹ کبھی ٹھپ نہیں ہوتی۔

یوں تو وہ پورے خلیج و عرب میں کام کرتے تھے مگر ان کا خاص مرکز خلیج تھا۔ وہ سال میں تین چار بار ہیروں کی شپ منٹ خریدتے اور اسے اسمگل کر کے انڈیا لاتے تھے۔ اس کام میں رسک بھی بہت تھا۔ ان کو کئی ملکوں کی سمندری حدود سے گزرنا پڑتا تھا اور ایک جگہ بھی پکڑے جاتے تو ہمیشہ کے لیے جیل کی نذر ہو جاتے اس لیے وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک بار جب ان کے پیچھے ایک خلیجی ملک کی کوسٹ گارڈ کی لانچ لگ گئی تھی تو انہوں نے کشتی میں موجود کوئی دس کروڑ روپے مالیت کے ہیرے سمندر میں پھینک دیے۔ اس لیے جب کوسٹ گارڈ نے انہیں روکا اور تلاشی لی تو ان کے پاس سے کچھ نہیں نکلا۔ اس وجہ سے وہ بچ گئے۔ انہیں اپنے مال کے ضائع ہونے کا افسوس تھا۔ پرویز خان گورے رنگ اور کھرے نقوش والا شخص تھا جبکہ رمیش کا رنگ بھی صاف تھا۔ وہ گجراتی تھا اور اس کا خاندان صدیوں سے کاروبار کرتا آیا تھا۔ اتفاق سے دونوں چالیس کے آس پاس تھے۔

پرویز خان نے رمیش کو فون کیا۔ ''ایک بڑی شپ منٹ آئی ہے۔''

رمیش اس وقت ممبئی میں اپنے مالابار ہلز کے شاندار اپارٹمنٹ میں تھا۔ اس کا کام اگرچہ سورت میں تھا لیکن اس کا زیادہ وقت ممبئی میں گزرتا تھا۔ وہ اس وقت شراب اور شباب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''کہاں ہے؟''

''اس وقت ترکی میں کہیں ہے۔''

''ڈلیوری کہاں سے ملے گی اور ادائیگی کیسے ہوگی؟''

''خلیج میں کہیں سے... اور ادائیگی نقد کرنا ہوگی۔'' پرویز خان نے کہا تو رمیش کا منہ بن گیا۔

''یہ نقد کا چکا لازمی ہے؟''

''پارٹی کا مطالبہ ہے کیونکہ شپ منٹ بڑی ہے۔ ویسے اگر تم خود آ کر ملو تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''رقم کتنی ہوگی؟''

''پانچ کروڑ کی ادائیگی کرنی ہے۔''

''اوہ۔'' رمیش کے منہ سے نکلا۔ انہوں نے آج تک اتنی بڑی رقم ادا نہیں کی تھی۔ ''یہ زیادہ نہیں ہے؟''

''ہاں، زیادہ تو ہے لیکن شپ منٹ بھی خاص ہے۔ اس میں سارے اے گریڈ پیس ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اصل چیز تو باقی نہیں رہتی ہے۔''

''تمہارا شبہ ہے لیکن مجھے کام ٹھیک لگ رہا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک بار آ کر مل لو۔ پارٹی کا آدمی میرے پاس موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''نہیں، کوشش نہیں پکا بتاؤ... اسی صورت میں میں اسے روک سکتا ہوں ورنہ تم جانتے ہو کہ آج کل اس کام میں بہت سارے لوگ آگئے ہیں۔''

''مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔'' رمیش نے بدمزگی سے کہا۔ ''کل تک جو بھاشن دیا کرتے تھے، آج وہ خود یہ کام کر رہے ہیں۔''

پرویز خان کے تعلقات وسط ایشیا تک تھے۔ یہ آذر بائیجان کی پارٹی تھی کیونکہ روس میں چوری شدہ ہیروں کی بہت بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہا کرتی تھی اس لیے پرویز خان کے وہاں روابط تھے اور ان میں سے ایک رابطے نے اسے اس شپ منٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ رمیش کے پاس ایک شاندار تفریحی لانچ تھی اور وہ اسے اپنے کام کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ جب پرویز خان کوئی شپ منٹ لاتا تھا تو رمیش اسی لانچ کے ذریعے کھلے سمندر میں جا کر اس سے ہیرے وصول کرتا تھا اور وہیں پرویز خان کا حصہ اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ بار بار شپ اپنی جگہ لیکن اس لائن میں ادھار کا معاملہ نہیں چلتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔'' رمیش نے کہا۔ ''لیکن

digestpk.blogspot.com

پارٹی کو لے کر کھلے سمندر میں آ ہ... آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔"

"میں آجاؤں گا۔"

پرویز خان کے پاس بھی ایک لانچ تھی۔ بہ ظاہر یہ مال بردار لانچ تھی اور خلیج کے روٹ پر چلتی بھی تھی۔ پرویز خان دکھاوے کے لیے سال میں دو تین پھیرے بھی لگاتا تھا اور قانونی سامان لاتا اور لے جاتا تھا لیکن اس کا اصل کام یہی تھا۔ دو دن بعد وہ پارٹی کے نمائندے سمیت بحیرۂ عرب کے کھلے سمندر میں تھا۔ رمیش کی لانچ بھی آ گئی۔ نمائندے نے ان کو جو نمونے دکھائے، رمیش کو انہوں نے متاثر کیا۔ ہیروں کے بارے میں وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ کھیپ بیش قیمت ہیروں پر مشتمل تھی اور یہ سب ایک نمبر تھے۔ پارٹی پانچ کروڑ پاکستانی روپے مانگ رہی تھی اور اس میں بارگیننگ کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس اور بھی کئی خریدار تھے۔ رمیش اور پرویز خان نے آپس میں مشورہ کیا۔ پرویز خان نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ڈن کر دو کیونکہ پانچ کروڑ لگا کر کم سے کم 15 کروڑ کیے جا سکتے ہیں۔ آج کل پتھروں کی مارکیٹ ویسے ہی اوپر جا رہی ہے۔"

"مگر پانچ کروڑ چھوٹی رقم نہیں ہوتی۔"

"آدھے میں لگاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں فوری پیسے نہیں دے سکتا۔ اتنی رقم نہیں ہے میرے پاس۔"

"یہ مسئلہ ہو جائے گا۔" پرویز خان فکرمند ہو گیا۔ "اگر میں ڈھائی کروڑ لگا دوں گا تو مجھے خود بھی تو رقم کی ضرورت ہوگی۔"

"ایک کام ہو سکتا ہے۔" رمیش بولا۔ "تمہارے آدھے پیسے میں شپ منٹ کے وقت دے دوں گا اور باقی بعد میں۔"

"بعد میں کب؟"

"جب ہیروں کا کوئی گاہک مل جائے گا۔"

پرویز خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تم اسی وجہ سے سب سے زیادہ کماتے ہو لیکن میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔"

رمیش نے شانے اچکائے۔ "میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں۔"

"میں رقم لگا کر اور رسک لے کر ہیرے تم تک پہنچاؤں اور مجھے صرف لگائی ہوئی رقم ملے تو اس کا فائدہ؟"

"فائدہ تو ہوگا، ہم کوئی پہلی بار تو کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"تم منافع میں سے کم سے کم بیس فیصد مجھے فوراً دو گے تب ہی میں اس میں ہاتھ ڈالوں گا۔"

ان دونوں میں رمیش زیادہ دولت مند اور کاروباری تھا اس لیے وہ اس شپ منٹ کے لیے پرویز خان سے زیادہ بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے دولت کی خوشبو آ گئی تھی اس لیے وہ پرویز خان کی بات مان گیا۔ وہ طریقۂ کار طے کرنے لگے۔ ہیرے لینے کے لیے رمیش کی لانچ جاتی۔ اس پر عملہ بھی اسی کا ہوتا۔ ادائیگی اور نگرانی کے لیے پرویز خان جاتا۔ واپسی میں رمیش اسے اس کی طے شدہ رقم ادا کر کے لانچ اپنے ساتھ لے جاتا اور پرویز خان اپنی لانچ میں چلا جاتا۔ شپ منٹ انہیں خلیج کے آخری حصے میں واقع ایک چھوٹے جزیرے سے لینی تھی اور یہ بہت طویل اور پُرخطر سفر بن جاتا جس میں انہیں کئی ممالک کی سمندری حدود سے گزرنا پڑتا اور روک لیے جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔

☆☆☆

کریم بلوچ ایک سادہ مزاج شخص تھا اس لیے شاہ میر نے اسے جو بتایا، اس نے اعتبار کر لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کی بیٹی زیادہ چالاک ثابت ہوئی تھی اور اس نے شاہ میر سے اس کی اصلیت اگلوا لی تھی۔ پھر بھی اس نے بیٹی کو اپنا اصل نام اور بہت ساری دوسری باتیں نہیں بتائی تھیں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی بیوی کی خودکشی کی وجہ اس کا سگا بھائی تھا اور وہ کس طرح سمندر میں زخمی ہوا اور لہروں پر ڈولتا ہوا ان کے گاؤں کے ساحل تک آیا تھا۔

وہ اگلی صبح سے پہلے اس علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں مچھلیوں کے جھنڈ آئے ہوئے تھے۔ کریم بلوچ نے سورج نکلنے سے پہلے جال ڈالنا شروع کر دیا اور دوپہر تک وہ جال ڈالتا رہا۔ کریم اور نورو بھائی کے علاوہ تین افراد اور تھے۔ شاہ میر صرف ساتھ تھا، وہ ان کی طرح کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ سمندر پر بھی سورج اسی طرح تپتا تھا جیسے کسی صحرا میں تپتا ہے اور بلا کی گرمی میں وہ ان تھک کام کر رہے تھے۔ شام کو انہوں نے جال سمیٹنا شروع کر دیا اور مچھلی نکال کر سرد خانے میں ڈالنے لگے۔ اس میں برف بھری ہوئی تھی۔ پہلی ہی دفعہ مچھلی اتنی آئی کہ سرد خانہ نصف بھر گیا۔ نورو بھائی اور دوسرے خوش ہو گئے۔ اگرچہ وہ بری طرح تھک گئے تھے لیکن مچھلی دیکھ کر انہوں نے رات کو پھر جال ڈالنے کا فیصلہ کیا اور نصف رات تک

جال ڈالتے رہے۔ نورو بھائی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "کل صبح اگر خانہ بھر گیا تو ہم مچھلی بیچ کر پھر ادھر آئیں گے۔"

انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ انہیں معاوضہ زیادہ ملتا۔ جال ڈال کر وہ سب آرام کرنے لیٹ گئے۔ شاہ میر سارا دن آرام ہی کرتا رہا اس لیے وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ کریم اس کے پاس آ کر لیٹ گیا، باقی ذرا دور تھے۔ شاہ میر نے اس سے کہا۔ "چاچا! تمہارا کام تو بہت محنت والا ہے۔"

"ہاں ہے تو پر اللہ کا شکر ہے کہ حلال کا دے رہا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں اس کا کیا معاوضہ ملتا ہے؟"

"ایک پھیرے کے ہزار روپے اور گھر کے لیے مچھلی مل جاتا ہے۔"

شاہ میر حیران ہوا۔ اتنے دن کی محنت کا معاوضہ صرف ہزار روپے؟ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ ٹرپ چار دن کا تھا اور ممکن ہے ان کو اس سے بھی زیادہ دن لگتے ہوں اور اس کے بدلے کریم کو صرف ہزار روپے ملتے تھے۔ شاہ میر نے پوچھا۔ "مہینے میں کتنے پھیرے ہو جاتے ہیں؟"

"چار یا پانچ۔"

"تمہیں بس چار یا پانچ ہزار ملتے ہیں؟"

"ہاں، بس اتنا ہی ملتا ہے۔"

انہوں نے ایک ہی بار میں کم سے کم ایک ٹن مچھلی پکڑی تھی۔ یہ درمیانے سائز کی کشتی تھی۔ اس میں دو ٹن تک مچھلی آ سکتی تھی جبکہ برف والا خانہ نصف برف سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دو ٹن مچھلی بندرگاہ پر کم سے کم بھی پچاس ساٹھ ہزار کی بکتی۔ یعنی اصل کمائی نورو بھائی کی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو بس گزارے لائق دے رہا تھا۔ شاہ میر نے دور سوتے نورو بھائی کی طرف دیکھا۔ "چاچا! یہ تو بہت کم ہے۔"

"ہے تو پر کیا کرے ادھر کام کرنے والے بہت ہیں اور کام دینے والا کم ہے۔" کریم بلوچ نے سرد آہ بھری۔

"تم اپنی کشتی لے لو تو یہ جو نورو بھائی کما رہا ہے تم بھی کما سکتے ہو۔"

"کشتی کدھر سے لیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "پرانا کشتی بھی پانچ چھ لاکھ سے کم کا نہیں ملتا۔ اپنے پاس تو دس ہزار بھی نہیں ہوگا۔"

شاہ میر خاموش ہو گیا، وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگلی صبح انہوں نے جال نکالا تو اس میں اتنی مچھلی تھی کہ سرد خانہ پوری طرح بھر گیا۔ نورو بھائی اور دوسرے بہت خوش تھے۔ وہ فشری کی طرف روانہ ہو گئے جہاں مچھلی بیچی جاتی تھی۔ شاہ میر کا اندازہ درست تھا۔ نورو بھائی کی کشتی کی مچھلی کی بولی ساٹھ ہزار تک گئی کیونکہ وہ بہت اچھا شکار لایا تھا اور سیزن کا آغاز تھا اس لیے کام زوروں پر تھا۔ جب وہ دوبارہ سمندر میں جانے لگے تو شاہ میر نے کریم بلوچ سے کہا۔

"میں یہیں اتروں گا۔"

"یہاں اترے گا، پر تیرے کو کچھ یاد نہیں ہے۔"

"اسی وجہ سے میں یہاں اتر رہا ہوں۔ ممکن ہے میرا تعلق اسی شہر سے ہو اور مجھے یہاں اپنا ماضی یاد آ جائے۔"

"جیسا تیری مرضی۔" کریم بلوچ نے زیادہ زور نہیں دیا۔ "پر اگر تجھے یاد نہ آئے تو یہیں آ جانا۔ ہم دو تین دن میں پھر آئیں گے۔"

کریم نے اسے زبردستی چار سو روپے دیے کہ وہ گزارہ کیسے کرے گا۔ اس نے یہ سوچ کر لے لیے کہ اسے اپارٹمنٹ تک تو جانا تھا۔ اس شہر میں اس کا باپ اور سوتیلی ماں تھی لیکن وہ ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایک چابی بنانے والے کو پکڑا اور اپارٹمنٹ پہنچ کر اس سے تالا کھلوا لیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ پرانی یادوں کے زیر اثر کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گیا تھا پھر وہ چونکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور اسے جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ اس لیے وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو شاہ میر دروازے تک آیا۔ اسے خیال آیا کہ اتنی رات گئے کون آ سکتا ہے؟ اس نے کی ہول سے جھانکا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ اس دوران میں کال بیل دوبارہ بجی تو اس نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں منیر... دروازہ کھولو۔" باہر سے ہراساں سی آواز آئی۔

"منیر...!" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے منیر ہی تھا لیکن وہ گندے اور میلے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے اور آستین سے جھانکتے بازوؤں پر زخموں کے نشانات تھے۔ لباس ایسا ہو رہا تھا جیسے مٹی والے پانی میں بھیگا ہو۔ چند سال پہلے جب اس نے آخری بار منیر کو دیکھا تھا تو اس کا چہرہ ندامت اور غم غصے سے سیاہ ہو رہا تھا۔ شاہ میر صرف اس کام کے لیے اچانک پہنچا تھا جہاں منیر ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کا جہاز یہاں مرمت کے لیے رکا تھا۔ جیسے ہی منیر نے دستک کے جواب میں

digestpk.blogspot.com

دروازہ کھولا، شاہ میر نے اس کی گردن دبوچ لی تھی اور اسے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ منیر نشے میں تھا لیکن اس کے عزائم کو فوراً جان گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ شاہ میر نے بہ آسانی اسے بستر پر گرا دیا اور پوری قوت سے اس کی گردن دبانے لگا۔ منیر کی سانس یقیناً رک گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی مزاحمت نہیں کی اور نہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک منٹ کے اندر اس کی آنکھیں باہر آگئیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب جب میں اس کی جان نکل جائے گی۔

شاہ میر تہیہ کر کے آیا تھا کہ وہ منیر کی جان لے کر جائے گا، چاہے اس کے لیے اسے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ لیکن جب اس نے منیر کا گلا پکڑا تو نہ جانے کیوں اس کے اندر کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔ ممکن ہے منیر مزاحمت کرتا تو اس کا ارادہ کمزور نہ پڑتا۔ اس سے پہلے منیر جان ہارتا، شاہ میر اپنے اندر سے ہار گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے منیر کی گردن چھوڑ دی اور خود کرسی پر گر کر سسک سسک کر رونے لگا۔ منیر دیوانہ وار سانس لے رہا تھا اور جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ”تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ مارا کیوں نہیں؟“

شاہ میر نے سر اٹھایا اور بولا۔ ”تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ میں کسی کی جان نہیں لے سکتا... چاہے وہ تم جیسا ذلیل اور شیطان کیوں نہ ہو۔“

”میں جانتا ہوں کہ میں نے ناقابلِ معافی جرم اور گناہ کیا ہے۔ مجھ میں بھی ہمت نہیں ہے، ورنہ خود اپنی جان لے لیتا۔“

شاہ میر نے چہرہ صاف کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ منیر نے عقب سے اسے پکارا۔ ”شاہ میر۔“

”میرا نام مت لو۔“ وہ غرا کر بولا۔ ”آئندہ میرے سامنے مت آنا ورنہ ممکن ہے اس بار میں خود کو نہ روک سکوں۔“

لیکن اتنے برس بعد پھر منیر اس کے سامنے تھا۔ شاہ میر نے اسے اندر آنے کو نہیں کہا لیکن وہ اس کے برابر سے گزر کر اندر آگیا اور تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ”دروازہ بند کر دو۔“

شاہ میر نے دروازہ بند نہیں کیا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟ یاد ہے، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟“

”مجھے یاد ہے۔“ منیر کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”لیکن ابھی میں بہت مشکل میں ہوں۔“

”اگر تم مشکل میں ہو تب بھی تمہیں یاد ہونا چاہیے۔ اسی شہر میں تمہارا اصل گھر بھی ہے۔“ شاہ میر کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔

”میں وہاں نہیں جا سکتا۔ کچھ لوگ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور اگر انہوں نے مجھے پا لیا تو یقیناً قتل کر دیں گے۔“

شاہ میر کے خیال میں وہ اسی قابل تھا لیکن اس وقت اس کی حالت اور خوف دیکھ کر وہ اندر سے نرم پڑ گیا۔ منیر کانپ رہا تھا۔ شاہ میر نے دروازہ بند کر دیا اور اندر آیا۔ منیر اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ شاہ میر نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ ”یہ تم کیسے آئے... کیا تم سمندر میں گر گئے تھے؟“

منیر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر گر گیا۔ ”میں بارہ گھنٹے سمندر میں تیرتا رہا اور مرتے مرتے بچا۔ کچھ پینے کے لیے ہے؟ مجھے پیاس لگی ہے۔“

”سمندر نے بھی تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“ شاہ میر نے تلخ لہجے میں کہا اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے سامنے پٹخ دی۔ ”ویسے تم جو کام کرتے ہو، اس میں آدمی کو دشمن ہی ملتے ہیں۔“

منیر نے ایک ہی سانس میں بوتل خالی کر دی اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”نہیں، جو میرے پیچھے ہیں یہ وہ ہیں جن کے لیے میں کام کرتا ہوں۔“

شاہ میر کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ منیر کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کون لوگ اس کے پیچھے تھے لیکن اس نے خود اسے ساری کہانی سنا دی۔ اس میں لانچ ڈوبنے کا ذکر بھی تھا۔ جب منیر نے بتایا کہ لانچ میں کئی کروڑ روپے مالیت کے ہیرے تھے تو شاہ میر چونکا۔ اس نے مشکوک نظروں سے منیر کی طرف دیکھا۔ ”کیا واقعی ہیرے لانچ میں ہیں؟“

”ہاں، کیونکہ وہ لانچ کے سیف میں محفوظ ہیں۔“

”تب یہ لوگ تمہارے پیچھے کیوں ہیں؟“

منیر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ چپ رہا۔ شاہ میر کو شک ہونے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اس کا پیچھا کرنے والے بے سبب اس کے پیچھے نہیں لگے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”اوکے... کچھ لوگ تمہارے پیچھے ہیں لیکن تم کیا چاہتے ہو؟“

منیر نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”مجھے کچھ دن کے لیے پناہ چاہیے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں کہاں کہاں ہو سکتا ہوں۔“

”تب وہ میرے بارے میں بھی جانتے ہوں گے؟“

”ممکن ہے لیکن یہاں سیکیورٹی ہے اس لیے وہ آسانی سے یہاں نہیں آ سکتے۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ سیکیورٹی نام نہاد ہے اور اگر کوئی آنا چاہے تو بڑے آرام سے آ سکتا ہے۔“

منیر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرے پاس اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں اگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا تو فوراً مار دیں گے۔“

شاہ میر کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ نازیہ کے قاتل کو اس جگہ رکھے جہاں نازیہ کی یادیں اور خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اس مسئلے کا ایک ہی حل آ رہا تھا۔ اس کے پاس شہر میں ایک چھوٹا فلیٹ اور تھا۔ یہ اس نے شادی سے پہلے لیا تھا اور اب تک ایسے ہی پڑا تھا۔ اس نے منیر سے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں؟“ وہ ہراساں ہو گیا۔

”ایک اور جگہ جس کے بارے میں تمہارے دشمنوں کو تو کیا، دوستوں کو بھی علم نہیں ہے۔“

منیر ہچکچاتے ہوئے اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پرویز خان کا غصے سے برا حال تھا کیونکہ سارا الزام اس کے سر آگیا تھا۔ رمیش کی لانچ پر نامعلوم افراد نے حملہ کیا تھا اور اسے ڈبو دیا تھا۔ رمیش کا کہنا تھا... کیونکہ اسے ہیرے نہیں ملے تھے اس لیے وہ کسی قسم کی ادائیگی نہیں کرے گا۔ پرویز خان کا ڈھائی کروڑ کا تو سیدھا سیدھا نقصان ہوا تھا، اس کے علاوہ اخراجات الگ سے تھے۔ بے شک لانچ رمیش کی تھی لیکن اس ٹرپ کا خرچ پرویز خان کے ذمے تھا۔ دوسری طرف رمیش کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ نقصان میں رہا ہے۔ لگائی ہوئی رقم گئی اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی لانچ الگ ڈوب گئی۔ رمیش نے اس سے مطالبہ کیا تھا کہ یہ نقصان وہ پورا کرے گا یعنی اس کی لانچ کی قیمت پرویز خان ادا کرے گا۔ ڈیڑھ کروڑ روپے اس کے لیے بہت بڑی رقم تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اسے کاروبار میں رہنا تھا تو یہ نقصان ادا کرنا ہی تھا ورنہ رمیش سے بگاڑ کی صورت میں اسے انڈیا سے کام ملنا بند ہو جاتا۔ اس لیے اس نے ہامی بھر لی کہ وہ مستقبل میں رمیش کا یہ نقصان پورا کر دے گا۔ ابھی اسے ان دشمنوں کی تلاش تھی جنہوں نے لانچ پر حملہ کیا تھا اور ساتھ ہی وہ اس فکر میں تھا کہ ڈوبنے والی لانچ کی درست پوزیشن معلوم ہو جائے تو وہ اس میں سے ہیرے نکال سکتا تھا۔ سمندر سے کل پانچ افراد کی لاشیں ملی تھیں مگر ان میں منیر کی لاش نہیں تھی۔ ممکنہ طور پر وہ بچ گیا تھا۔ یہ جاننے کے بعد پرویز خان نے اس کے گھر کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ منیر گھر آئے گا اور تب وہ اسے پکڑ سکے گا۔ منیر سمندری راستوں کا ماہر تھا اور یہ سارا علاقہ اس کا چھانا ہوا تھا پھر وہ یورپ میں بھی رہ چکا تھا۔ ہیروں کی پہچان بھی رکھتا تھا اس لیے پرویز خان نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ وہ ہر ٹرپ سے ہونے والے نفع کا بیس فیصد لیتا تھا اس لحاظ سے وہ پرویز خان کا ملازم نہیں تھا۔ پرویز خان کو یقین تھا کہ منیر کو ڈوبنے والی لانچ کی درست جگہ کا علم ہوگا اور وہ اس کے ہاتھ آگیا تو اس کا سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔

☆☆☆

کریم بلوچ شاہ میر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بہترین پینٹ شرٹ میں بال کٹوا کر وہ ایک بالکل بدلا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ دو دن میں چہرے اور ہاتھوں کے زخم بھی بھر چکے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جسے چھ دن پہلے ساحل پر دیکھ کر انہوں نے مردہ سمجھ لیا تھا۔ کریم بوکھلا کر بولا۔

”ارے ملاح... یہ تُو ہے؟“

”ہاں چاچا۔“ شاہ میر مسکرایا۔ ”اور میرا نام ملاح نہیں، شاہ میر ہے اور مجھے سب یاد آگیا ہے۔“

”چلو، یہ تو اچھا ہے۔“ کریم خوش ہو گیا پھر اسے خیال آیا۔ ”اب تو میرے ساتھ نہیں جائے گا؟“

”کیوں نہیں جاؤں گا چاچا... اور پھر تجھ سے ایک بات بھی کرنی ہے۔“

کریم نے چونک کر اسے دیکھا اور بے ساختہ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا... لیلی کے حوالے سے لیکن پھر اس نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟ اس نے شاہ میر سے کہا۔ ”ضرور چل... آج ہی واپس گاؤں جا رہے ہیں۔“

شاہ میر اپنے ساتھ کچھ مختصر سامان لایا تھا۔ نورو بھائی اور دوسروں نے ڈبل کمائی کی تھی اس لیے سب ہی گھر والوں کے لیے چیزیں لے کر جا رہے تھے۔ بندرگاہ پر دنیا جہاں کا سامان ملتا ہے اور بہت سستا مل جاتا ہے اس لیے ماہی گیر یہیں سے خریداری کرتے تھے۔ کریم، شاہ میر کے ساتھ ہی بندرگاہ کے باہر والے حصے میں آیا جہاں لوگ دکانیں اور ٹھیلے سجائے بیٹھے تھے۔ اس نے ایک پھیرے والے سے لیلی کے لیے دو سوٹ لیے پھر کچھ اور سامان لینے لگا۔ اسے مصروف چھوڑ کر شاہ میر نے بھی کچھ خریداری کی تھی ویسے اس کے پاس مختصر سامان تھا۔ ایک چھوٹے سے بیگ میں دو جوڑے اور چند ضروری چیزیں تھیں۔ وہ شام سے ذرا پہلے

digestpk.blogspot.com

روانہ ہوئے اور سورج ڈوبنے سے پہلے گاؤں کے ساحل پر پہنچ گئے۔

☆☆☆

شجاع، پرویز کا دست راست تھا۔ پرویز خان اپنے گھر میں تھا۔ شجاع کی کال آئی۔ ”خان... شجاع بات کر رہا ہوں۔“

”کچھ پتا چلا؟“

”جی خان... وہ گھر آیا تھا اور پھر بندرگاہ کی طرف چلا گیا۔“

”کہاں گیا... تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟“ پرویز خان غرایا۔

”خان! کچھ دیر سے پتا چلا کہ وہ آیا ہوا ہے۔ وہ چھپ کر آیا تھا۔ میرے آدمی پتا چلا رہے ہیں کہ بندرگاہ میں وہ کہاں ہے کیونکہ ایک بار اندر جانے کے بعد وہ باہر نہیں آیا۔“

”شجاع! اس کا جلد از جلد معلوم کرو۔ تمہیں پتا ہے کہ کتنی بڑی شپ منٹ ہے۔ یہ ہاتھ آجائے تو مجھے ریٹش کے سہارے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔“

”صبح سے پہلے معلوم ہو جائے گا۔“ شجاع نے یقین سے کہا۔

☆☆☆

لیلیٰ، کریم اور ملاح کے جانے کے بعد اداس تھی۔ جب بھی اسے خیال آتا کہ شاید ملاح واپس نہ آئے تو اس کے دل کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ کریم چار دن کا کہہ کر گیا تھا۔ وہ روز شام کے وقت بکریاں لے کر ساحل کی طرف چلی جاتی۔ بکریوں کو جھاڑیوں میں چھوڑ کر خود ساحل کی طرف آجاتی اور اس وقت تک وہاں بیٹھی رہتی جب تک سورج ڈوبنے کے قریب نہیں ہو جاتا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے نہیں نکلتی تھی کیونکہ کریم بلوچ کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ تو اس کا بکریاں چرانا بھی پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کی ضد کی وجہ سے اجازت دے رکھی تھی۔ اسکول چھوڑنے کے بعد وہ سارا دن فارغ ہوتی تھی اور اس نے کریم کو مجبور کر کے اجازت لی تھی۔

چوتھے دن وہ اس امید کے ساتھ سمندر کے کنارے گئی تھی کہ آج ان لوگوں نے واپس آنا تھا لیکن جیسے جیسے سورج ڈوبنے کے قریب ہو رہا تھا تو ویران ساحل دیکھ کر اس کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔ پھر وہ تاریکی سے پہلے گھر لوٹ آئی۔ اس رات وہ لوگ نہیں آئے۔ اس کے دل میں وسوسے آرہے تھے۔ ساری رات بے چینی میں جاگتے اور کروٹیں لیتے گزاری۔ اگرچہ سمندر میں جانے والوں کو دیر سویر ہونا معمول کی بات تھی کیونکہ کبھی شکار طویل ہو جاتا تھا اور کبھی کشتی میں کوئی مسئلہ ہو جاتا تھا۔ اگر موسم ٹھیک ہوتا تو باقی چیزوں کے لیے سب ٹھیک ہوتا تھا۔

اگلے دن وہ سہ پہر کو ہی ساحل پر پہنچ گئی۔ بکریاں خلافِ معمول جانے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن وہ انہیں زبردستی لے گئی۔ اس کی پرامید نظریں ساحل پر مرکوز تھیں۔ وقت گزرتا گیا اور شام سر پر آگئی۔ سورج ڈوبنے والا تھا، نورو بھائی کی کشتی آج بھی نہیں آئی تھی اور جب لیلیٰ مایوس ہو کر جانے والی تھی تو اچانک ہی اسے سمندر میں ایک دھبا نظر آیا جو رفتہ رفتہ کشتی میں بدلنے لگا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا اور وہ بے ساختہ ساحل کے پاس آگئی۔ پھر کشتی پاس آئی تو اس نے پہچان لیا۔ یہ نورو بھائی کی کشتی تھی۔ اتھلے ساحل پر آنے کے بعد اس کا انجن اوپر کر دیا گیا اور مچھیرے اسے کھینچ کر ساحل پر لانے لگے۔ لیلیٰ کو کریم نظر آگیا لیکن ملاح نظر نہیں آیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ نہیں آیا تھا۔ کریم نے اسے دیکھ لیا اور وہ ساحل پر آیا تو لیلیٰ اس کے پاس آگئی۔ اس نے بے قراری سے کہا۔

”بابا! اتنی دیر لگا دی... کیسا ہے؟“

کریم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”ٹھیک ہے لیلیٰ... ادھر مچھلی بہت تھا، دو پھیرے لگ گئے۔“

لیلیٰ کی نظریں کشتی پر مرکوز تھیں مگر اسے ملاح نظر نہیں آیا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”ملاح چلا گیا بابا؟“

”ارے نہیں... آیا ہے۔ کشتی کے انجن کے ساتھ لگا ہے۔“ کریم خوشی سے بولا۔ ”اسے سب یاد آگیا ہے۔“

”اچھا۔“ لیلیٰ نے تعجب ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی کہ ملاح کو سب یاد ہے۔ ”یہ تو اچھا ہوا بابا۔“

”بہت بڑا آدمی ہے۔“ کریم نے فخر سے کہا۔ ”بڑے جہاز پر انجنیئر ہوتا ہے۔“

”انجینئر۔“ لیلیٰ نے تصحیح کی۔

”ہاں... ہاں وہی... ابھی آتے ہوئے کشتی کا انجن خراب ہو گیا تو اس نے ایک منٹ میں ٹھیک کر دیا اور ابھی اسے پکا کر رہا ہے۔“

اسی لمحے شاہ میر کشتی سے ہاتھ صاف کرتا ہوا ساحل پر اترا۔ اس نے پتلون کے ساتھ صرف بنیان پہن رکھی تھی جس پر جا بجا آئل کے دھبے لگے تھے۔ اس نے نیچے اتر کر نورو بھائی سے کہا۔ ”ابھی اس کے دو پرزے بدلنے ہیں لیکن ایک

digestpk.blogspot.com

دو پھیرے نکل جائیں گے۔“

شاہ میر کو دیکھ کر لیلیٰ کے دل کے دھڑکنے کا انداز ہی بدل گیا۔ وہ ہاتھ صاف کر کے قمیص پہن رہا تھا اور اس کا سامان کریم بلوچ نے اندر رکھا تھا۔ وہ پاس آیا تو لیلیٰ نے جھجک کر پوچھا۔ ”ملاح! تو کیسا ہے؟“

”چھوری! تمیز سے بات کر۔“ کریم بلوچ نے اسے ڈانٹا۔

لیلیٰ نے خفگی سے باپ کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی جھاڑیوں کی طرف جانے لگی۔ اسے بکریوں کو اکٹھا کرنا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے گھر تک پہنچی اور تالا کھولا۔ کریم بلوچ بھی تھکا ہوا تھا لیکن شاہ میر کے لیے پانی لینے چلا گیا۔ اسے نہانا تھا۔ کریم کے جاتے ہی شاہ میر نے مسکرا کر لیلیٰ کو دیکھا جس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ ”ناراض ہے؟“

”میں کیوں ناراض ہونے لگی؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تو تو ویسے بھی بڑا صاحب ہے نا۔“

”بڑا صاحب تو نہیں ہوں اور تمہارے لیے تو بالکل نہیں ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔ ”دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ اس نے ایک شاپر اسے تھما دیا۔ لیلیٰ خوش ہو گئی۔

”میرے لیے؟“ اس نے کہا اور جلدی سے اسے کھول کر دیکھا۔ اندر ایک خوب صورت سوٹ تھا۔ اس سے میچ کرتی چوڑیاں، ہار اور بندوں کا سیٹ تھا۔ کچھ میک اپ کا سامان اور ایک رسٹ واچ تھی۔ لیلیٰ نے خوشی سے کہا۔ ”یہ سب میرے لیے لایا ہے؟“

”تو اور کون ہے یہاں جس کے لیے لاتا۔“ شاہ میر بولا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب تو نہیں آئے گا۔“

”ایسا ممکن نہیں تھا، مجھے آنا ہی تھا۔ میں نے چاچا سے کہہ دیا کہ مجھے سب یاد آگیا ہے۔“

لیلیٰ نے اسے شوخی سے دیکھا۔ ”یاد تو تجھے سب تھا، پر بن رہا تھا۔ لیکن اپنا اصل نام تو اب تک نہیں بتایا ہے۔“

”شاہ میر۔“

”شاہ میر۔“ لیلیٰ نے زیر لب کہا۔ ”تو نے بابا سے کیا کہا کہ واپس کیوں آرہا ہے؟“

”کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟“ شاہ میر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا اور مجھے چاچا سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔“

لیلیٰ کا دل دھڑک اٹھا۔ ”کک... کیا بات کرنی ہے؟“

”بس کرنی ہے۔“ شاہ میر نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے؟ کیا میں اس گھر میں نہیں رہتی ہوں؟“ لیلیٰ بحث پر آمادہ تھی لیکن دروازے پر باپ کی آمد محسوس کر کے تیزی سے شاپر لے کر کمرے میں چلی گئی۔ کریم بلوچ بالٹیوں میں پانی بھر کر لے آیا تھا۔ غسل خانہ چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ شاہ میر نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر آیا۔ تاریکی چھا چکی تھی اور لائٹ بھی نہیں تھی لیکن اس سے ان لوگوں کو خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ اس کے بغیر رہنے کے بھی عادی تھے۔ لیلیٰ نے جلدی سے دو لالٹین جلا کر ایک صحن میں برآمدے سے لگے ہک سے لٹکا دی اور دوسری لے کر کھانا بنانے لگی۔ کریم مچھلی لایا تھا۔ ان کے پاس مچھلی محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے سکھا کر رکھنے کے لیکن سوکھی ہوئی مچھلی بدذائقہ ہو جاتی تھی اس لیے تازہ مچھلی کے لیے یہ طریقہ نکالا ہوا تھا کہ اپنے استعمال کی مچھلی زندہ لاتے تھے۔ کشتیوں میں اس کے لیے ایک چھوٹا ڈرم رکھ لیتے تھے اور مچھلی اس میں ڈال لیتے۔ یہ زندہ رہتی تھی اور اسے گھر میں لاکر اسی طرح ڈرم میں ڈال دیتے تھے اور جب پکانی ہوتی تو اس سے نکال لیتے۔ اس طرح انہیں پورا ہفتہ تازہ مچھلی ملتی رہتی تھی۔ لیلیٰ نے مچھلی اور سادہ چاول بنائے تھے۔

کھانے کے بعد لیلیٰ کچھ دیر ان دونوں کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ کریم سے سفر کا احوال سن رہی تھی۔ کریم جو اس کے لیے چیزیں لایا تھا، وہ اسے دے دیں۔ لیلیٰ نے اسے نہیں بتایا تھا کہ شاہ میر بھی اس کے لیے چیزیں اور سوٹ لایا ہے۔ حالانکہ شاہ میر کریم کے سامنے ہی شاپر لایا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی یا پھر انجان بن گیا تھا۔ وہ ایک جوان بیٹی کا باپ تھا جو ابھی تک گھر بیٹھی تھی۔ گاؤں میں لڑکیوں کی جلد شادی کا رواج تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں لڑکی بیاہ دی جاتی تھی اور بیس سال اس کے لیے بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ لیلیٰ نے انہیں چائے بنا کر دی۔

”میں کمرے میں جا رہی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“

”ٹھیک ہے، اب تو آرام کر۔“ کریم نے کہا تو لیلیٰ اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کریم، شاہ میر کی طرف متوجہ ہوا جو چائے پیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ کریم منتظر تھا کہ وہ بات کرے۔ اس نے راستے میں بھی ایک بار اس خاص بات کے بارے میں کریدا تھا جو وہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن شاہ میر اسے ٹال گیا تھا۔

"چاچا! بات سب کے سامنے کرنے والی نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر کریم کا شبہ پختہ ہونے لگا۔ وہ سادہ شخص ضرور تھا لیکن عقل سے پیدل نہیں تھا۔ اس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ لیلیٰ کی شاہ میر میں دلچسپی اور پھر شاہ میر کی طرف سے بھی کسی قدر دلچسپی اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس لیے وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید شاہ میر اس سے لیلیٰ کے لیے بات کرے گا۔ اگرچہ وہ اس کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا۔ شاہ میر نے اسے سفر میں اپنے بارے میں مختصر بتایا تھا کہ اس کا باپ ہے، ماں سوتیلی ہے اور اس کی بیوی مر چکی ہے۔ وہ بحری جہاز کے انجن کا انجینئر تھا۔ ابھی وہ فارغ تھا لیکن اسے اچھی ملازمتوں کی کمی نہیں تھی۔ کریم بلوچ کے خیال میں پہلے سے شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا شخص تھا اور اگر وہ اس سے لیلیٰ کا رشتہ مانگتا تو اس بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ مگر وہ اس سے بات کرنے کے بجائے کسی سوچ میں گم تھا۔ آخر کریم کھنکھارا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر خفت سے بولا۔

"معاف کرنا چاچا... میں سوچ رہا تھا کہ تم سے بات کیسے کروں؟"

"اس میں سوچنا کا کیا بات ہے، تم نے جو بات کرنی ہے کھل کر کرو۔"

"چاچا... تمہاری ایک... لڑکی ہے۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"ہاں، ہے تو۔" کریم نے جواب دیا۔

"تم نے اس کی شادی بھی کرنی ہے؟"

"ہاں ڑے... لڑکی گھر بٹھانے کا واسطے تو نہیں ہوتا ہے۔"

"چاچا!" شاہ میر بول کر رکا تو کریم کے ساتھ ساتھ اندر کمرے میں دروازے سے لگی لیلیٰ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔ شاہ میر نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ "تمہیں اس کی شادی کرنی ہے اور اس کے لیے تمہیں رقم چاہیے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" کریم نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

"پھر تم کب تک اتنے سے معاوضے پر کام کرتے رہو گے۔ اگر تمہارے پاس رقم ہو تو تم اپنی کشتی لے سکتے ہو، خود شکار کر کے تم کہیں زیادہ کما سکتے ہو۔"

"یہ بھی ہے، پر پیسا کہاں سے آئے گا؟" کریم کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاہ میر شاید اس سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہے۔ "یہاں تو دو ٹیم کا روٹی بھی مشکل سے ملتا ہے۔"

"چاچا پیسا بھی ہو سکتا ہے اگر تم ہمت کرو۔"

کریم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اڑے... ہمت کرنے سے کس کو پیسا ملتا ہے؟"

"ملتا ہے چاچا... اگر تم کو موقع ملے کہیں سے دولت حاصل کرنے کا اور اس کے لیے ہمت چاہیے ہو تو کیا تم ہمت نہیں کرو گے؟"

"ہمت تو کرے گا، پر میں کوئی غلط کام نہیں کر سکتا ہوں۔" کریم بلوچ نے سادگی سے کہہ دیا۔

"دولت اگر غلط کام کیے بغیر مل رہی ہو، تب تو ہمت کر سکتے ہو نا؟"

کریم نے اسے غور سے دیکھا۔ "اڑے صاحب... جو بولنا ہے صاف صاف بولو... یہ گھما پھرا کا بات ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔"

شاہ میر نے گہری سانس لی۔ "چاچا! تم جاننا چاہتے ہو کہ میں سمندر میں کیسے گرا اور مجھے کس نے پھینکا تھا؟"

"یہ سوال تو پہلے دن سے ادھر ہے۔" اس نے کنپٹی پر انگلی ماری۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن میں تمہیں سناؤں گا۔ اس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں کیسا آدمی ہوں اور ہمیں دولت کہاں سے مل سکتی ہے۔"

شاہ میر اسے بتانے لگا اور وہ غور سے سن رہا تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ کمرے میں دروازے سے لگی لیلیٰ بھی ایک ایک لفظ سن رہی تھی اور اندر ہی اندر مرجھاتی جا رہی تھی۔ جب شاہ میر بات ختم کر کے چپ ہوا تو لیلیٰ پلٹ کر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ آنسو اس کے رخساروں پر گر رہے تھے۔ باہر کریم بھی خاموش تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"تو تمہارے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔"

"میں نے تمہیں سب سچ سچ بتا دیا ہے، اگر ہم کوشش کریں تو ڈوبی ہوئی کشتی سے ہیرے نکال سکتے ہیں۔"

کریم نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ کام آسان نہیں ہے، پتا نہیں ادھر سمندر کتنا گہرا ہے؟"

"وہاں سمندر کی گہرائی ڈیڑھ سو فٹ ہے۔"

"اتنا گہرا غوطہ کون مار سکتا ہے؟ میرے کو تو غوطہ مارنا آتا ہی نہیں ہے۔"

"میں کر سکتا ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔ ملائیشیا میں تعلیم کے دوران اس نے شوقیہ اسکوبا ڈائیونگ سیکھی تھی۔ "لیکن اس کے لیے ایک کشتی اور اسکوبا ڈائیونگ کا سامان چاہیے۔"

"کیا... کس چیز کا سامان؟"

شاہ میر نے اسے سمجھایا کہ اسے کیا چاہیے تو وہ سمجھ گیا۔ "میں سمجھ گیا پر یہ ادھر ہاربر پر ملے گا۔ ادھر ایک جاننے والا ہے۔"

کریم بلوچ بھی اپنے اندازے کی غلطی پر افسردہ تھا۔ اگرچہ دولت اسے بری نہیں لگی تھی لیکن اس سے زیادہ اہم اس کے لیے اپنی بیٹی کی خوشیاں تھیں۔ شاہ میر نے اس کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی اور وہ خود سے کیسے کر سکتا تھا بیٹی کا باپ جو تھا۔ سونے سے پہلے انہوں نے طے کیا کہ اگلے روز وہ ہاربر جائیں گے اور وہاں اس شخص سے ملیں گے جو ان کی مدد کر سکتا تھا۔ کریم بلوچ ناشتا کرتے ہی باہر نکل گیا۔ وہ معلوم کرنے گیا تھا کہ آج کوئی کشتی ہاربر جانے کی ہے کہ نہیں ورنہ بس سے سفر بہت طویل اور جھٹکوں سے بھرپور ہوتا۔ لیلیٰ انہیں ناشتا دے کر باورچی خانے میں مصروف تھی لیکن جیسے ہی کریم روانہ ہوا، وہ باہر آ گئی۔ اس نے بلاتمہید کہا۔

"تو بابا کو کیا خواب دکھا رہا ہے؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

شاہ میر نے گہری سانس لی۔ "تو تم نے ہماری باتیں سن لیں؟"

"ہاں اور تو غلط کر رہا ہے... ہمیں دولت نہیں چاہیے۔ ہم ایسے بھی خوش ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اگر آدمی کو موقع مل رہا ہو تو اسے فائدہ اٹھانا چاہیے جبکہ اس میں کسی کا نقصان بھی نہیں ہے۔"

"تو بھول رہا ہے، ان کا نقصان ہو رہا ہے جنہوں نے تجھے مارنے کے لیے سمندر میں پھینکا تھا۔" لیلیٰ نے تیز لہجے میں کہا اور ناشتے کے برتن اٹھا کر اندر چلی گئی۔ شاہ میر اس کے پیچھے آیا۔

"تمہارے بابا کو تمہاری شادی بھی کرنی ہے۔ اس کے پاس رقم ہوگی تو وہ اچھی طرح..."

"تجھے کیا ہے کہ میری شادی کیسے ہوتی ہے۔" لیلیٰ نے تڑپ کر کہا اور برتن پٹخ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ یہ شاہ میر کے لیے اشارہ تھا کہ وہ مزید اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے چند منٹ بعد ہی کریم عجلت میں آیا اور اس نے شاہ میر سے کہا۔ "تیار ہو جاؤ... ایک کشتی جانے والی ہے، دیر کی تو وہ نکل جائے گی۔"

شاہ میر تیار تھا بس اسے اپنا بیگ لینا تھا۔

☆☆☆

جانی کا اصل نام جان شیر تھا مگر وہ جانی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی کشتی تھی۔ وہ بچپن سے چرس کی لائن پر لگ گیا تھا۔ پہلے خود پیتا تھا پھر بیچنے لگا۔ اس کا باپ مچھیرا تھا۔ وہ مرا تو جانی اس کی کشتی میں مچھلی پکڑنے کے بجائے چرس لے جا کر بحری جہازوں پر بیچنے لگا۔ اس کام میں اسے اتنا مل جاتا تھا کہ مزے سے زندگی گزار رہا تھا۔ پولیس اور کوسٹ گارڈ کے لیے مخبری بھی کرتا تھا اس لیے کوئی اسے نہیں پکڑتا تھا۔ ویسے بھی وہ جرم کی دنیا کی چھوٹی مچھلی تھا اور اسے عام طور سے نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ لالچ نہیں کرتا تھا بس گزارے لائق کما لیتا تھا۔ اس کا گھر اس کی کشتی تھی اور سب کچھ تھا کہ وہ کہاں ملتا ہے۔

کریم بلوچ کو اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کی کشتی ہاربر پر ایک گوشے میں لنگرانداز تھی۔ اس تک جانے کے لیے انہیں کوئی درجن بھر کشتیاں پھلانگنی پڑیں۔ یہاں سب اس کے عادی تھے اس لیے اگر کوئی اجنبی بھی ان کی کشتی سے گزرتا تھا تو وہ اسے کچھ نہیں کہتے تھے کیونکہ وہ خود بھی دوسروں کی کشتیوں سے گزرتے رہتے تھے۔ اکثر کشتیوں پر پورے پورے خاندان تھے۔ کہیں کہیں شاہ میر جھجک جاتا مگر کریم بلوچ آرام سے کشتی پر چڑھ جاتا۔ بالآخر وہ جانی کی کشتی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ وہ اپنی کشتی کا انجن بنا رہا تھا۔ پرزے بکھرے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ اور کپڑے کالے تھے مگر وہ ان کی پروا کیے بغیر کریم بلوچ سے لپٹ گیا۔ "چاچا کریم! کدھر ہوتا ہے؟"

"ادھر ہی ہوتا ہے اور تو کدھر ہوتا ہے؟ اب تو گاؤں میں تیری صورت نہیں دکھائی دیتی۔"

"بس چاچا! ادھر مصروفیت بوت ہے... اللہ کا مہربانی سے کام ٹھیک چل رہا ہے۔" اس نے آنکھ ماری اور شاہ میر کو دیکھا۔ "یہ کون ہے چاچا؟"

"میں اسے تجھ سے ملانے لایا ہوں۔ یہ رحیم خان ہے۔" کریم نے اس کا غلط نام بتایا۔ "اسے تجھ سے کام ہے۔"

"کیا کام ہے چاچا... حکم کرو۔"

"اسے سمندر میں لے جانا ہے۔"

"لے جائے گا... کیوں نہیں لے جائے گا؟"

"اور اسے غوطہ لگانے والا سامان چاہیے۔"

"تمہارا مطلب ہے اسکوبا ڈائیو کا سامان؟"

"وہی۔" شاہ میر نے پہلی بار کہا۔ "تمہارے پاس

digestpk.blogspot.com

ہے؟''

''سب ملتا ہے بابا۔ پیسا دو تو ادھر سب ملتا ہے۔'' جانی نے ہوشیاری سے مطلب کی بات کی۔

''تیرے کو پیسا مل جائے گا۔'' کریم بلوچ نے کہا۔ ''ابھی تو اس سے بات کر۔''

''کدھر جانا ہے؟'' جانی نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔

''ادھر سے کوئی پچاس میل جنوب مغرب کی طرف۔ تمہاری کشتی میں جی پی ایس ہے؟''

''وہ جو لوکیشن بتاتا ہے؟''

''ہاں وہی... اگر نہیں ہے تو دستی سائز والا کسی سے پکڑ لو۔''

''ادھر بہت ملتا ہے۔ چوری کا بھی آتا ہے۔ ہزار پندرہ سو میں مل جائے گا۔'' جانی نے بتایا تو شاہ میر کو حیرت نہیں ہوئی۔ اسے معلوم تھا بندرگاہ میں جتنے قانونی کام ہوتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ غیر قانونی کام ہوتے ہیں۔

''ٹھیک ہے لے لو۔''

''اور کیا چاہیے؟'' اس نے پوچھا۔

''دو عدد اسکوبا ڈائیونگ ٹینک... کم سے کم ایک گھنٹے کی گیس کے ساتھ۔''

''مل جائیں گے... کیا اور؟''

''ایک ہاتھ سے چلنے والا لیور جیک چاہیے۔'' شاہ میر نے کہا۔

''معاملہ کیا ہے... کیا سمندر سے کچھ نکالنا ہے؟'' جانی نے بیڑی کا ٹکڑا سلگایا تو وہاں چرس کی بو پھیل گئی۔ کریم بلوچ نے اسے گھورا۔

''اڑے کیا مر کر چھوڑے گا؟''

اس نے دانت نکالے۔ ''ہاں چاچا! اپن کا فاتحہ بھی اسی پر دلوانا۔''

جانی بجرے چہرے اور چھوٹے جسم والا چست و چالاک شخص تھا۔ وہ چرسی ضرور تھا مگر اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے ان سے کہا۔ ''تم ابھی ادھر رکو... ہم سارا سامان لے کے آتا ہے۔''

وہ بندر کی طرح کشتی سے کودا اور غائب ہو گیا۔ شاہ میر نے کریم بلوچ کی طرف دیکھا۔ ''چاچا! تمہیں یقین ہے کہ یہ دھوکا نہیں دے گا؟''

اس نے اپنی داڑھی کھجائی۔ ''ابھی کیا کہہ سکتا ہے کہ کون دھوکا دے گا اور کون نہیں۔ پر یہ اچھا لڑکا ہے۔''

شاہ میر نے اس کے کھلے انجن کا جائزہ لیا اور اس کا نقص پکڑ لیا۔ اس کا ائر پمپ مسئلہ کر رہا تھا۔ معمولی سا نقص تھا۔ اس نے قمیص کی آستینیں اوپر کیں اور کام میں لگ گیا۔ ایک گھنٹے میں اس نے انجن بند کر کے اسے سیٹ کر دیا تھا۔ جب اس نے ڈوری کھینچ کر اسے چلایا تو وہ فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔

''تو ماہر آدمی ہے۔'' کریم بلوچ نے تعجب سے کہا۔ ''نورو بھائی کی کشتی کا انجن بھی فافٹ ٹھیک کر دیا تھا۔''

''یہ تو کھلونا ہے۔'' اس نے کپڑے سے ہاتھ صاف کیے۔

اس کے کچھ دیر بعد جانی آ گیا۔ اس نے انجن بند دیکھا تو حیرت سے بولا۔ ''اسے کس نے بند کیا؟''

''اس نے۔'' کریم بلوچ نے فخر سے کہا۔ ''ایک دم فٹ کر دیا ہے۔''

جانی نے انجن چلا کر دیکھا تو خوش ہو گیا۔ ''استاد! کام کر دیا ہے۔ اپن دو دن سے لگا تھا۔''

''تم نے اسے اور خراب کر دیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ کام کا کیا ہوا؟''

''ادھر آگے جیٹی پر سامان آئے گا۔ ادھر سے چلنا ہے۔'' اس نے سیٹ سنبھالی اور کشتی کو وہاں سے نکالنے لگا۔ وہاں کشتیاں اتنے بے ہنگم طریقے سے لگی تھیں کہ شاہ میر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کشتی کیسے نکالے گا؟ مگر اس نے کشتی نکال لی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک برتھ پر لگے اور جانی کشتی سے اتر کر پھر غائب ہو گیا۔ اس بار وہ جلدی نمودار ہوا۔ اس نے دو عدد اسکوبا ڈائیونگ ٹینک اٹھا رکھے تھے اور اس کے پیچھے ایک آدمی باقی سامان لے کر آ رہا تھا۔ کشتی میں آ کر جانی نے اسے پانچ سو کا نوٹ دیا تو اس نے احتجاج کیا۔

''پندرہ سو کا بات ہوا تھا۔''

''پندرہ سو کا بچہ ابھی پانچ سو ملے گا، باقی کل لے لینا۔'' جانی نے اسے پھرتی سے کشتی سے باہر دھکیل دیا۔ اس کے انداز پر شاہ میر کو ہنسی آ گئی۔ اس نے سامان کا معائنہ کیا اور جانی سے پوچھا۔

''جی پی ایس کہاں ہے؟''

اس نے جیب سے ایک دستی سائز جی پی ایس ریسیور نکال کر شاہ میر کو دے دیا۔ ''ابھی اس کا پیسا بھی دینا ہے۔''

''تو بار بار پیسا کا بات کیوں کرتا ہے؟'' کریم بلوچ نے خفگی سے کہا۔ ''ابھی تیرا سارا پیسا تیرے کو مل جائے گا۔''

''چاچا! ناراض کیوں ہوتا ہے؟'' جانی نے دانت نکالے۔ ''ابھی اپن نے بتایا ہے، مانگا نہیں۔''

شام کے چار بج رہے تھے۔ کریم بلوچ نے جانی سے کہا۔ ''رات ادھر ہی رکے گا... کھانے کا ہے نا؟''

''ادھر بہت کچھ ہے۔'' اس نے بتایا۔ کشتی کے نچلے حصے میں پورا باورچی خانہ تھا۔ ''ابھی ادھر سے نکل کر کھلے سمندر میں جائے گا تو کھانا بنائے گا۔ ہم بہت مزے کا دال چاول بناتا ہے۔''

جانی آتے ہوئے کپڑوں کا ایک شاپر بھی لے آیا تھا۔ یہ لنڈے کا مال تھا مگر بہت اچھی حالت میں اور صاف ستھرا تھا۔ اس نے شاہ میر سے کہا۔ ''ابھی ادھر یہ کپڑا نہیں چلے گا، اس کو بدلو۔''

شاہ میر واقعی اپنی پینٹ شرٹ میں الگ نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاپر لیا اور نیچے جا کر کپڑے بدل لیے۔ اس دوران میں جانی نے کشتی ہجوم سے نکال لی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بندرگاہ سے نکل کر شاہ میر نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اسے ہر لمحے دھڑکا سا لگا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے نہ آ جائے جن سے وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ جانی نے کشتی کھلے سمندر میں لانے کے بعد اس کے بادبان کھول دیے۔ اب کشتی ہوا کی مدد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ میر جی پی ایس کی آزمائش کرتا رہا۔ وہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے جانی سے کہا۔ ''کشتی مغرب کی طرف موڑ لو۔''

''ادھر ابھی ہوا بند ہے۔ رات کو ہوا چلے گا۔''

''ٹھیک ہے، تب تک یہیں رک جاؤ۔'' شاہ میر نے اسے حکم دیا۔ ''اس سمت میں جاتے ہوئے ہم اپنی منزل سے دور جا رہے ہیں۔''

''تمہارا مرضی باس۔'' جانی نے بادبان گرا دیے۔ اب کشتی رک کر لہروں پر ہلکورے کھا رہی تھی۔ اس نے کریم بلوچ سے کہا۔ ''چاچا! خیال رکھنا... ادھر جہاز چڑھ جاتا ہے کشتی پر۔''

''جا جا... تو اپنا کام کر۔'' کریم بلوچ نے اسے جھڑک دیا۔

شاہ میر اسکوبا ٹینک کا معائنہ کر رہا تھا۔ دونوں میں گیس پوری تھی اور ان کی مدد سے وہ دو گھنٹے زیر آب رہ سکتا تھا۔ سامان پرانا تھا مگر اچھی حالت میں تھا۔ ''پانی میں تو جائے گا؟'' کریم بلوچ نے سوال کیا۔

''ہاں، مجھے اس کا تجربہ ہے۔''

''پر یہ خطرناک کام ہے۔'' کریم بلوچ کے لہجے میں فکر تھی۔

''چاچا! تم فکر مت کرو... میرے لیے یہ کام اتنا ہی آسان ہے جتنا تمہارے لیے مچھلی پکڑنا۔''

''تو یہ سب کچھ صرف دولت کے لیے کر رہا ہے؟''

''نہیں چاچا! اگر صرف دولت کے لیے کر رہا ہوتا تو تمہیں کیوں شامل کرتا؟ یہ سب تو میں خود بھی کر سکتا تھا۔ مجھے یہاں سے واپس جانے اور اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے دولت کی ضرورت ہے۔''

بات کریم کی سمجھ میں آ گئی پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ ویسے بھی کشتی چھوٹی سی تھی اور امکان تھا کہ ان کی گفتگو جانی کے کان میں نہ پڑ جائے۔ تاریکی چھانے کے بعد جانی ان کے لیے کھانا اوپر لے آیا تھا۔ بقول اس کے وہ بہت مزے کے دال چاول بناتا تھا اور یہ پتلی جیسی دال اور ابلے چاولوں پر مشتمل ایک شوربا تھا جس میں نمک اور مرچ ڈالا گیا تھا۔ شاہ میر نے اسے غور سے دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''دال چاول باس۔'' جانی نے شوربا اپنے حلق میں اتارنا شروع کر دیا۔ ''بہت مزے کا ہے۔''

بادل ناخواستہ ان لوگوں نے بھی کھانا شروع کیا۔ اسے حلق سے اتارنا بڑے دل گردے کا کام تھا مگر بھوک لگ رہی تھی اس لیے جیسے تیسے اتار ہی لیا۔ البتہ اس کے بعد جانی نے چائے بہت اچھی بنائی۔ کھانے کا کسی حد تک ازالہ ہو گیا تھا۔ رات دس بجے ہوا نے رخ بدلا تو جانی نے دوبارہ بادبان چڑھائے اور کشتی کا رخ جنوب کی طرف موڑ دیا۔ شاہ میر مستقل جی پی ایس پر دیکھ رہا تھا۔ جانی نے اسے پکار کر کہا۔

''اتنا استعمال کرے گا تو سیل جلد ختم ہو جائیں گے۔''

شاہ میر کو اس کی بات درست لگی۔ اس نے جی پی ایس بند کر دیا اور جانی سے کہا۔ ''مغرب میں کوئی پچاس میل نکلنے کے بعد مجھے بتانا... اور ہاں، انجن کے لیے ڈیزل ہے؟''

''ڈیزل بہت... دو ڈرم پڑا ہے۔'' اس نے کشتی کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ شاہ میر لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ سونے کا نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر اسی جگہ جا رہا ہے جہاں وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ کیا وہ ٹھیک کر رہا تھا؟

☆☆☆

شاہ میر گھر سے نکلا۔ اسے کچھ سامان لینا تھا وہ پھر منیر کے پاس جانا تھا کیونکہ منیر کوئی چیز لینے کے لیے گھر سے نہیں

digestpk.blogspot.com

نکل سکتا تھا۔ اس نے سامان خریدا اور فلیٹ پہنچ گیا۔ اس نے کال بیل بجائی تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ منیر کی جگہ کوئی اور دروازہ کھولے گا۔ یہ ایک تنومند شخص تھا اور اس نے شاہ میر کو گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ مزاحمت کا موقع نہیں تھا کیونکہ اس شخص نے اس کے سینے پر پستول بھی رکھ دیا تھا۔ منیر صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ سامنے رسی سے بندھے تھے۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ شاہ میر سمجھ گیا کہ وہ جن لوگوں سے چھپتا پھر رہا تھا وہ اس تک پہنچ گئے ہیں۔ اس نے منیر کی طرف دیکھا۔

"یہ یہاں تک کیسے آئے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" تنومند آدمی نے کہا۔ "یہ پیسے کے چکر میں نکلا تھا اور ہم پہلے ہی اس کی تاک میں تھے۔ یہ سمجھتا تھا کہ ہمیں دھوکا دے جائے گا۔" اس کے لہجے میں حقارت آگئی۔ اس کے ساتھ دوسرا شخص اس کا ماتحت لگ رہا تھا کیونکہ وہ خاموش اور مستعد تھا۔ انہوں نے منیر پر تشدد کیا تھا۔ اس کے چہرے پر نشانات نظر آرہے تھے۔ شاہ میر نے اسے ملامت سے دیکھا۔ اس نے صرف اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالی تھی بلکہ اسے بھی مروا دیا تھا۔ اس نے تنومند آدمی سے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہمیں وہ ہیرے واپس چاہئیں جو کشتی میں تھے۔"

"ہیرے ابھی تک کشتی میں ہیں۔" منیر بولا۔ "یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کیونکہ تم آخر وقت تک کشتی میں رہے تھے۔"

"یہ درست ہے لیکن ہمیں کشتی کی درست لوکیشن کا علم نہیں ہے۔ اس کا علم صرف تمہیں ہے۔" تنومند آدمی نے کہا جو پرویز کا دست راست شجاع تھا۔

"میں نہیں جانتا۔" منیر بولا۔

شجاع نے سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم اس طرح نہیں بتاؤ گے۔ لیکن فکر مت کرو، ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

وہ ان دونوں کو گن پوائنٹ پر فلیٹ سے نیچے لائے اور ایک کار میں بٹھا کر ساحل سمندر پر لے آئے۔ یہاں شجاع نے موبائل پر کال کی۔ "باس! ان دونوں کو لے آیا ہوں۔"

"دوسرا کون ہے؟"

"منیر کا بھائی ہے۔"

"اس کا کیا کرنا ہے؟"

"ہوسکتا ہے باس کسی کام آجائے۔ منیر زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے۔" شجاع کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، میں بوٹ بھیج رہا ہوں۔۔۔ ان کو لے آؤ۔"

کوئی نصف گھنٹے بعد ایک ربر کی ہوا والی موٹر بوٹ ساحل سے لگی۔ اس میں ایک شخص سوار تھا۔ شجاع نے اپنے ساتھی کو واپس بھیج دیا اور ان دونوں کو لے کر موٹر بوٹ میں سوار ہو گیا۔ اس نے شاہ میر اور منیر کے ہاتھ بندھوا دیے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کھلے سمندر میں پرویز خان کی لانچ پر تھے۔ منیر کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "شکر ہے تم زندہ ہو ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ ہیرے گئے۔"

"مجھے نہیں معلوم لانچ کہاں ڈوبی تھی۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی تمہیں یاد آجائے گا۔" اس نے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "انہیں نیچے لے آؤ۔"

لانچ کے نچلے حصے میں ایک بڑا ہال نما خانہ تھا۔ وہ اس میں اترے تو ایک درمیانے سائز کے ٹب پر نظر پڑتے ہی شاہ میر رک گیا۔ اس میں سیاہ رنگ کی چھوٹے سائز کی مچھلیاں تیر رہی تھیں اور ان کے منہ پر بلی جیسی مونچھیں تھیں۔ اسی وجہ سے یہ کیٹ فش کہلاتی ہیں۔ منیر شاید ان کے بارے میں نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا۔ پرویز خان نے کہا۔ "یہ کیٹ فش ہیں۔۔۔ میں نے خاص طور سے جنوبی امریکا سے منگوائی ہیں۔ اسے ذرا نمونہ دکھاؤ۔"

پرویز خان کی بات سنتے ہی اس کے آدمیوں نے پھرتی سے منیر کو جکڑ لیا اور پھر اس کا ایک ہاتھ ٹب کے پانی میں ڈال دیا۔ فوراً ہی کیٹ فش اس کے ہاتھ سے چمٹ گئیں اور اس کے منہ سے فلک شگاف چیخیں نکلیں پھر وہ چیختا ہی چلا گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ٹب کا پانی اس کے خون سے سرخ ہو گیا۔ منیر ہاتھ نکالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر ان لوگوں نے اسے اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ کسی صورت ہاتھ نہیں نکال سکتا تھا۔ پھر پرویز خان کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے منیر کو پیچھے کھینچ لیا۔ ایک مچھلی اس کے ہاتھ سے چمٹی ہوئی تھی اور اس کا منہ منیر کی کلائی میں گھسا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے کھینچ کر مچھلی کا منہ نکالا اور اسے ٹب میں پھینک دیا۔ منیر کے منہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ اور کلائی میں سوراخ ہو گئے تھے۔ پرویز خان اطمینان سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ چھوٹی سی مچھلی پانی کی خوفناک ترین مخلوق ہے کیونکہ یہ جسم کے اندر تک گھس جاتی ہے اور ایک بار یہ گھس جائے تو پھر اسے نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔" اس نے کہتے

ہوئے اچانک منیر کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر پیچھے کھینچ لیا۔ "تم بتاتے ہو کہ لانچ کہاں ہے یا تمہارا دوسرا ہاتھ بھی ٹب میں ڈلوا دوں؟"

"نہیں۔۔۔ خدا کے لیے۔" منیر چلایا۔ "میں بتاتا ہوں۔"

"بتاؤ۔" پرویز خان خاموش ہو گیا۔

"ایسے نہیں بتا سکتا۔ مجھے ڈگری یاد ہے اور پھر اس جگہ پہنچ کر بتا سکتا ہوں۔"

"بکومت۔۔۔ تمہیں جی پی ایس پوزیشن یاد نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ کشتی ڈوبنے والی تھی۔ میں لائف جیکٹ پہن کر کود گیا تھا۔"

"تم میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

"مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔"

"وہ تو میں اب بھی نہیں کروں گا۔ ہم اس طرف چل رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا، اگر مجھے ہیرے نہیں ملے تو تم دونوں بھائیوں کو کیٹ فش کی خوراک بنا دوں گا۔"

نصف گھنٹے بعد وہ کھلے سمندر میں اس طرف جا رہے تھے جہاں ریشم کی لانچ سمندر کی تہ میں موجود تھی۔ شاہ میر اور منیر لانچ کے نچلے حصے میں بندھے بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر پرویز خان کا ایک مسلح آدمی موجود تھا۔ منیر کی زخمی کلائی پر خون روکنے کے لیے ایک پرانے کپڑے کی دھجی باندھ دی گئی تھی۔ مسلح آدمی ان کے پاس رہتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ ٹہلتا ہوا ان سے دور سیڑھیوں تک چلا جاتا تھا۔ ایسے میں منیر جلدی جلدی شاہ میر کو ایک نمبر بتاتا تھا۔ پہلی بار اس نے کہا تو شاہ میر نے پوچھا۔

"یہ کس چیز کا نمبر ہے؟"

"جی پی ایس پوزیشن ہے جہاں لانچ ڈوبی تھی۔ مجھے زبانی یاد ہے، اب تم بھی یاد کرلو۔"

اس کے کہنے پر شاہ میر یاد کرنے لگا اور پھر اس نے اتنی بار دہرایا کہ اسے زبانی یاد ہو گیا۔ منیر سخت تکلیف میں تھا اور اس کا زخمی ہاتھ تقریباً بیکار ہو گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کا یہ ہاتھ نہیں باندھا گیا تھا۔ شاہ میر پریشان تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لوگ انہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے منیر سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"یہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔" منیر کراہ کر بولا۔ "جب ان کو لانچ مل جائے گی تو یہ ہمیں سمندر میں ڈبو دیں گے۔"

شاہ میر لرز گیا۔ وہ بندھے ہوئے تھے ورنہ آزاد بھی ہوتے تب بھی فرار کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے منیر سے کہا۔ "ہمیں آزادی کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"مشکل ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انہوں نے ایک شخص اس حالت میں بھی ہمارے سروں پر چھوڑا ہوا ہے۔ پھر میں فرار نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ ہاتھ ناکارہ ہو گیا ہے۔ شاہ میر! تم نہیں جانتے۔۔۔ یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔"

"یہ بات تم پہلے بھی جانتے تھے۔" شاہ میر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم نے جو بویا، وہ کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں بھی مارا جاؤں گا۔"

"ہاں۔" منیر کا چہرہ ستّ گیا۔ "میں ہمیشہ تمہیں تکلیف دینے کا باعث بنا ہوں۔"

"وہ جگہ کتنی دور ہے؟"

"کوئی پچاس میل مغرب میں ہے۔ اس کشتی کی رفتار بتا رہی ہے کہ یہ دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ہمیں اس سے پہلے کچھ کرنا ہوگا۔" شاہ میر کسمسایا۔

اسی وقت ان کے نگران کو کسی نے اوپر سے آواز دی اور وہ اوپر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی منیر نے آہستہ سے کہا۔ "میں تمہیں آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کیا کرو گے تم؟"

"تمہاری رسی کھولتا ہوں۔ اگر رسی کھل گئی تو تم سمندر میں کود کر فرار ہو سکتے ہو۔" منیر نے کہا اور اپنے آزاد زخمی ہاتھ سے اس کی بندش کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ آسان نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بری طرح زخمی تھا اور اسے ہلانا بھی دشوار تھا۔ ضبط کے باوجود اس کی کراہیں نکل رہی تھیں۔ بنیادی طور پر وہ کم حوصلہ آدمی تھا لیکن اس وقت حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید موت کو سامنے پا کر اس کے اندر حوصلہ ابھر آیا تھا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور رفتہ رفتہ شاہ میر کے پشت پر بندھے ہاتھوں کی رسی ڈھیلی ہونے لگی۔ آخر وہ اتنی ڈھیلی ہو گئی کہ شاہ میر نے خود کوشش کر کے ہاتھ آزاد کرا لیے۔ پھر اس نے منیر کی رسی کھولنا چاہی تو اس نے منع کر دیا۔

"نہیں، وقت ضائع مت کرو۔ میں فرار نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تمہیں مار دیں گے۔"

"تم نکل جاؤ۔۔۔ اگر تم نکل گئے تو یہ مجھے نہیں ماریں گے جب تک تم نہیں مل جاؤ گے۔" منیر نے جھوٹ بولا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بات شاہ میر بھی جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ منیر اس حالت میں واقعی فرار نہیں ہو سکے گا۔

digestpk.blogspot.com

"ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے مجھے مدد مل جائے اور میں تمہیں ان سے آزاد کرا سکوں۔"

"شاید ایسا ہو جائے لیکن شاہ میر... اگر میں اس دنیا میں نہ رہوں تو تم مجھے معاف کر دینا۔ میں کیسا ہی سہی، ہوں تو تمہارا بھائی۔" منیر کی آواز بھرا گئی۔

"اب جاؤ... اس سے پہلے کہ وہ پھر آ جائے۔"

شاہ میر تہ خانے سے نکل کر باہر عرشے پر آیا۔ سمندر بپھرا ہوا تھا اور اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ایسے میں تیرنا آسان کام نہیں تھا لیکن کشتی میں یقینی موت تھی اور سمندر میں بچ جانے کا امکان تھا۔ وہ پانی میں کود گیا اور لانچ سے دور جانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

کریم بلوچ کو اچانک خیال آیا۔ اس نے جانی سے کہا۔ "اڑے، تو اتنے دن سے گاؤں نہیں آیا ہے... گاؤں نہ چلیں؟"

جانی کو بھی یہ بات اچھی لگی۔ گاؤں کا ساحل یہاں سے مشکل سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ رات وہاں سکون سے گزار کر وہ صبح پھر واپس آ سکتے تھے۔ یہاں سمندر میں لہریں بہت اٹھ رہی تھیں اور سونا بھی مشکل تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا تو شور سے شاہ میر اٹھ گیا۔ اس نے جانی سے پوچھا۔ "انجن کیوں چلایا ہے؟"

"چاچا کریم بولتا ہے کہ رات ادھر گاؤں میں گزارتے ہیں۔"

شاہ میر کو بھی یہ خیال اچھا لگا۔ شاید اس لیے کہ اسے لیلیٰ کو دیکھنے کا موقع ملتا۔ "پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ اب تک گاؤں پہنچ چکے ہوتے۔"

"بس ابھی چاچا نے بولا۔ رات کو ادھر سمندر میں رکو تو کوسٹ گارڈ والا پریشان کرتا ہے۔ پھر سمندر بھی خراب ہے۔"

جانی نے کشتی کا رخ ساحل کی طرف کر دیا۔ وہ اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا اور اندھیرے میں بھی راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ گاؤں کے ساحل پر تھے۔ جانی نے کشتی پر ہی رکنے کا بولا۔ اسے چھوڑ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کریم بلوچ نے دروازہ بجایا تو اندر سے لیلیٰ کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں تیرا باپ۔" کریم بلوچ نے کہا۔

"بابا۔" لیلیٰ نے خوش ہو کر دروازہ کھول دیا اور پھر کریم کے ساتھ شاہ میر کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ اندر آئے۔ لیلیٰ نے کھانے کا پوچھا۔ "کھانا بناؤں؟"

"میں نے تو کھا لیا ہے، پر اس نے صبح سے نہیں کھایا تھا۔ کچھ ہے تو اس کے لیے لے آ۔" کریم بلوچ بولا۔

"میں نے دال چاول بنائے تھے، وہ لے آؤں؟"

"وہی لے آؤ۔" شاہ میر نے کہا۔ اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ لیلیٰ نے دال چاول واقعی بہت مزے کے بنائے تھے۔ کریم بلوچ تھکا ہوا تھا، وہ سونے کا کہہ کر اندر چلا گیا۔ لیلیٰ، شاہ میر کو کھانا دے رہی تھی۔ کریم اندر جاتے ہی سو گیا۔ شاہ میر کھانے کے دوران میں لیلیٰ کو اب تک کی روداد سناتا رہا۔ وہ یہ سن کر فکرمند ہو گئی تھی کہ کل وہ پانی میں جائے گا۔

"پانی میں جانا ٹھیک نہیں ہوتا... اللہ نہ کرے اگر تجھے کچھ ہو گیا تو؟"

"وہ تو ادھر بیٹھے ہوئے بھی ہو سکتا ہے۔" شاہ میر نے کہا۔ "تم فکر مت کرو، مجھے اس کام کا تجربہ ہے۔"

"پھر بھی تو اتنے گہرے پانی میں جائے گا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"پانی میں میں جا رہا ہوں اور ڈر تمہیں لگ رہا ہے؟" شاہ میر نے اسے چھیڑا تو وہ غصے میں آ گئی۔

"ہاں، پاگل ہوں... پانی میں تو جا رہا ہے اور میں فکر بھی نہ کروں۔" اس نے کہا اور برتن اٹھا کر اندر لے گئی۔ شاہ میر ہاتھ دھو کر واپس آیا تو لیلیٰ پھر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہ میر نے اسے غور سے دیکھا اور سمجھایا۔

"تم پریشان مت ہو، جا کر سو جاؤ۔"

لیلیٰ کھڑی ہو گئی۔ "تو یہاں کیوں آیا تھا؟ کاش تو نہ آتا۔"

اس سے پہلے کہ شاہ میر کچھ کہتا، وہ تیزی سے اندر چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ شاہ میر ٹھنڈی سانس لے کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ وہ تھکا ہوا تھا، اس کے باوجود نیند بہت دیر سے آئی۔ صبح لیلیٰ نے اسے جگایا۔

"اٹھ جا... کب تک پڑا سوتا رہے گا؟"

شاہ میر نیند میں بولا۔ "ناز... سونے دو۔"

لیلیٰ ساکت ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے شاہ میر کو دوبارہ آواز دی۔ "اٹھ جا... بابا بول کر گیا ہے کہ تو ناشتا کر کے تیار ہو جا۔"

اس بار وہ جاگ گیا۔ اس نے انگڑائی لی۔ "چاچا کہاں گیا ہے؟"

"کشتی پر ناشتا دینے گیا ہے۔" لیلیٰ آہستہ سے بولی۔ "ابھی سوتے ہوئے تو نے ناز کا نام لیا تھا!"

شاہ میر نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو لیلیٰ ناشتا لے آئی۔ شاہ میر نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ لیلیٰ جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے وہیں سے کہا۔

"تجھے میری بات اچھی نہیں لگی؟"

شاہ میر نے گہری سانس لی۔ "نہیں، ایسی بات نہیں۔"

"تو پھر چپ کیوں ہو گیا؟"

"بس پرانا وقت یاد آ گیا تھا۔"

لیلیٰ کچھ سوچ رہی تھی، اس نے کہا۔ "میں بھی تیرے ساتھ چلوں؟"

"تم کیا کرو گی؟" شاہ میر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں کروں گی، پر گھر میں رہ کر صرف پریشان ہوں گی اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ساتھ لے چلو۔"

شاہ میر اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہاں خطرہ تھا۔ اگرچہ اس نے سارے کام بہت احتیاط سے اور چھپ کر کیے تھے لیکن پھر بھی دشمنوں کی جانب سے خطرہ تھا۔ انہوں نے میر کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ میر گھر پر نہیں تھا۔ اس نے گھر کال کی تھی مگر میر وہاں نہیں تھا۔ اس دوران میں کریم آ گیا۔ شاہ میر نے اس سے کہا۔ "چاچا! لیلیٰ بھی چلنے کو کہہ رہی ہے۔"

"اڑے یہ تو پاگل ہے... لڑکی کا ادھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ بات میں بھی کہہ رہا ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔ "وہاں اس کا کوئی کام نہیں ہے۔"

"تو گھر بیٹھ کر ہمارا انتظار کر۔" کریم نے اسے حکم دیا تو وہ خفا نظر آنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھا تم لوگوں کے ساتھ کنارے تک تو جا سکتی ہوں؟"

جانی ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے آتے ہی اس نے کشتی کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا۔ لیلیٰ ساحل پر کھڑی رہی۔ کریم اور شاہ میر جانی کے ساتھ لگ گئے اور جیسے ہی کشتی ذرا گہرے پانی میں آئی، وہ بھی اس پر سوار ہو گئے۔ جانی نے انجن چلا دیا۔ کھلے سمندر میں آنے کے بعد شاہ میر نے جی پی ایس سنبھال لیا اور جانی کی راہنمائی کرنے لگا کہ انہیں کس جگہ جانا ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ ٹھیک اس جگہ پر تھے۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے اور سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ کریم بلوچ نے اپنے تجربے کی مدد سے بتایا۔ "ادھر سمندر ایک سو سے ڈیڑھ سو فٹ گہرا ہے۔"

شاہ میر تیار ہونے لگا۔ اس نے جانی کی مدد سے آکسیجن ٹینک اپنی پشت پر لٹکایا اور اس کا ریگولیٹر منہ پر باندھ لیا۔ ابھی اس نے آکسیجن نہیں کھولی تھی۔ اس نے قمیص اتار دی تھی اور صرف پینٹ میں تھا۔ وہ پانی میں اترنے لگا تو کریم بے تابی سے بولا۔ "سنبھل کر جانا... اگر سمندر گہرا ہو تو نیچے مت جانا۔"

"تم فکر مت کرو۔" شاہ میر نے کہا اور کشتی سے نیچے اتر گیا۔ اس نے پانی میں جانے سے پہلے ریگولیٹر کھول لیا تھا اور آکسیجن آنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے سطح سے نیچے جانے کے لیے الٹی ڈائیو لگائی۔ پانی اتنی آسانی سے کسی کو اپنے اندر آنے کی اجازت نہیں دیتا اور غوطہ خور کو بڑی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غوطہ خوری، تیراکی سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس نے پہلے بھی غوطہ خوری کی تھی مگر ایک تو وہ کام شوقیہ تھا، دوسرے وہ بھی چالیس پچاس فٹ سے زیادہ گہرے سمندر میں نہیں گیا تھا۔ یہاں تو کم سے کم بھی ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی تھی اور جیسے جیسے سمندر میں گہرائی بڑھتی ہے، اسی تناسب سے پانی کے دباؤ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ سو فٹ کی گہرائی کے بعد پانی کے دباؤ میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم کے خلیات میں نائٹروجن گیس داخل کرنا پڑتی ہے تاکہ دباؤ برابر ہو جائے۔ لیکن اسی کی وجہ سے اگر غوطہ خور کو تیزی سے اوپر آنا پڑے تو پانی کا دباؤ اچانک کم ہونے سے گیس خلیات کو پھاڑ دیتی ہے اور آدمی مر بھی سکتا ہے۔ اسے بہت سست روی سے اوپر آنا پڑتا ہے۔ کوئی چالیس فٹ مزید نیچے آنے کے بعد اسے تہ نظر آنے لگی تھی۔ البتہ اسے کشتی نظر نہیں آئی۔ وہ واپس اوپر آیا۔ اس نے کشتی پر چڑھ کر آکسیجن ٹینک اور ریگولیٹر اتار دیا۔

"کیا ہوا؟" کریم بلوچ نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں چاچا۔ یہاں سو فٹ ہے مگر کشتی نظر نہیں آئی۔ پہلے مجھے کشتی تلاش کرنی پڑے گی۔"

"کون سی کشتی؟" جانی نے پوچھا۔

کریم بلوچ نے اسے گھورا۔ "اپنے کام سے کام رکھ۔"

مگر شاہ میر کچھ اور سوچ رہا تھا، اس نے جانی سے پوچھا۔ "تمہیں غوطہ خوری آتی ہے؟"

جانی نے دانت نکالے۔ "اپن سمندر کا کیڑا ہے جی۔"

"بغیر آکسیجن کے کتنی گہرائی میں جا سکتے ہو؟"

"تیس چالیس فٹ تک جا سکتا ہے اور تین منٹ رک

digestpk.blogspot.com

سکتا ہے۔" جانی نے فخر سے کہا۔ شاہ میر کو حیرت ہوئی، چربی ہونے کے باوجود اس میں اتنا اسٹیمنا تھا کہ وہ اتنی دیر سمندر میں رک سکتا تھا۔ شاید سمندر میں رہنے والوں کی قوتِ برداشت زیادہ ہو جاتی ہے۔

"میرے ساتھ آؤ۔" شاہ میر نے سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے کہا۔ "ہمیں پہلے زیرِ آب ایک کشتی تلاش کرنی ہے۔"

"کیسی کشتی ہے؟" جانی اس کے ساتھ سمندر میں کود گیا۔

"کوئی پچاس فٹ لمبی اور بڑی کشتی ہے۔"

شاہ میر نے جانی کو ایک طرف جانے کو کہا اور خود دوسری طرف جانے لگا۔ اس نے غوطہ لگایا اور زیرِ آب آکر کشتی تلاش کرنے لگا۔ اس نے بغیر آکسیجن کے سمندر میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر آکسیجن ختم ہو جاتی تو انہیں پھر واپس جانا پڑتا اس لیے وہ آکسیجن صرف کشتی میں جاتے وقت استعمال کرتا۔ چار پانچ غوطے لگانے کے باوجود انہیں کشتی نظر نہیں آئی۔ ڈوبنے کے دوران میں کشتی کہیں دور چلی گئی تھی یا زیرِ آب چلنے والی لہریں دھارے اسے کہیں لے گئی تھیں۔ اس کے باوجود ایک مربع کلومیٹر کے دائرے میں کشتی کا ملنا یقینی تھا۔ شاہ میر نے پانچواں غوطہ لگایا اور جب اس کا سانس اکھڑنے لگا تو اسے نیچے گہرائی میں ایک جگہ کشتی نما کوئی شے دکھائی دی۔ اسی لمحے اسے اوپر بڑا سا سایہ محسوس ہوا۔ اس نے اوپر دیکھا، اسے ایک اور بڑی کشتی کا پیندا دکھائی دیا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے اوپر آیا۔ اسے اپنی کشتی کے پاس ایک بڑی لانچ نظر آئی۔ وہ کشتی کی طرف آیا تو اس نے ایک مسلح شخص کو جانی کی کشتی پر دیکھا۔

"کون ہو تم؟" شاہ میر نے پوچھا۔

"اوپر آؤ۔" کشتی پر موجود سیاہ رو مسلح شخص نے اسے حکم دیا۔ شاہ میر اوپر چڑھ آیا۔ اسی لمحے جانی بھی سمندر سے نکل کر کشتی میں آ گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔

"اڑے کون ہے... تم جانی کو جانتا نہیں ہے۔" پھر اس نے آدمی کو غور سے دیکھا اور حیرت سے بولا۔ "اڑے تم پرویز خان کا آدمی ہے؟"

"ہاں جانی... تو نے ٹھیک پہچانا۔" سیاہ رو شخص معنی خیز انداز میں بولا۔ "ہم تجھ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہے۔"

"پر تم ادھر کیوں آیا ہے؟"

"یہ جانتا ہے۔" اس نے شاہ میر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم لوگ سمندر میں کیا کر رہے تھے؟"

"ہم ذرا تیر رہا تھا۔" جانی نے دانت نکالے۔

"اس کے ساتھ۔" سیاہ رو نے آکسیجن ٹینکس کی طرف دیکھا جو کشتی میں ایک طرف پڑے تھے اور طنزیہ انداز میں بولا۔

"اگر ہم کسی اور مقصد کے تحت آئے بھی ہیں تو تم کو کیا ہے؟" شاہ میر نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔" سیاہ رو شخص غرایا۔ "ایک دفعہ تم بچ کر بھاگ گیا تھا، پر بار بار نہیں بچے گا۔"

جانی چونکا۔ اس نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ "کیا... کیا کہتا ہے یہ؟"

اسی لمحے بڑی کشتی پر پرویز خان اور اس کا خاص آدمی شجاع نمودار ہوئے۔ ان کو دیکھ کر شاہ میر کے چہرے پر مایوسی آ گئی۔ وہ جن لوگوں سے بچ کر بھاگا تھا، آج پھر ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ شاید اس کے دل میں لالچ آ گیا تھا اور یہ اس کی سزا تھی۔ پرویز خان نے حکم دیا۔ "تم تینوں اس کشتی پر آ جاؤ۔"

وہ دونوں بھی مسلح تھے اور ان کے پاس حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پرویز خان نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ "کشتی ملی؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر نہیں ملی تو تلاش کرو۔" وہ مسکرایا۔

"تم خود کیوں نہیں تلاش کرتے؟" جانی نے کہا۔

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" پرویز خان بولا۔ "کشتی تم لوگوں کو تلاش کرنی پڑے گی اور اگر تم یہ کام نہیں کرو گے تو ہم سب کو مار دیں گے۔"

"یہ ظلم ہے۔" کریم بلوچ نے گھبرا کر کہا۔ "اگر تم کو ہمارا ادھر آنا پسند نہیں ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم چلے جاؤ لیکن وہ یہیں رہے گی۔"

"کون؟" شاہ میر کا دل دھڑک اٹھا۔ "کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" پرویز خان نے کہا اور ان کو کشتی کے اسی تہ خانے میں لایا جہاں شاہ میر اور منیر قید تھے۔ وہاں لیلیٰ کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ اسی پائپ سے رسی سے بندھی تھی جس سے شاہ میر اور منیر کو باندھا گیا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ پرویز خان نے لیلیٰ کی طرف اشارہ کیا۔ "تم بے شک جاؤ، پر یہ ادھر رہے گی۔"

کریم بیٹی کی طرف لپکا تو شجاع اس کے راستے میں آ گیا۔ "چاچا پیچھے رہو..."

"پرویز خان! یہ کیا حرکت ہے؟ تم عورت کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو؟" شاہ میر نے کہا۔ اس دوران میں کریم، شجاع کو دھکا دے کر لیلیٰ کے پاس چلا گیا۔ وہ اسے کھول رہا تھا۔ شجاع نے اس کی طرف پستول اٹھایا لیکن پرویز خان کے اشارے پر رک گیا۔ کریم نے لیلیٰ کو کھولا تو وہ سسکیاں لیتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ کریم اسے چمکارنے لگا۔

"اڑے بابا کا جان روتا کیوں ہے... میں آ گیا ہے۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے بابا۔" وہ بولی۔ "یہ گندے لوگ ہیں۔"

پرویز خان بولا۔ "شاہ میر! تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھ سے چھپ جاؤ گے؟ منیر کو تو ہم نے سمندر میں ڈال دیا تھا، اس نے تعاون سے انکار کر دیا تھا۔ اب تمہاری باری ہے۔ اگر مجھے میرے سکے نہیں ملے تو تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔"

"تم نے اسے مار دیا۔" شاہ میر آہستہ سے بولا۔

"وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے ایسی باتیں کیں کہ میں نے غصے میں آکر اسے گولی مار دی۔"

شاہ میر جانتا تھا کہ منیر نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ وہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ میر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

"تم نے ہمیں کیسے تلاش کیا؟"

"بہت آسانی سے... میرے آدمی تمہارے فلیٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب تم بندرگاہ کی طرف گئے تو تمہارا سراغ کھو دیا مگر جلد پتا چل گیا کہ تم نورو بھائی نامی مچھیرے کی کشتی میں دیکھے گئے تھے اور پھر معلوم ہوا کہ جانی کی کشتی میں نکلے ہو۔ نورو بھائی اور جانی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ میرے آدمی تمہیں تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو اس کا پتا چلا۔" پرویز خان نے کریم بلوچ کی طرف اشارہ کیا۔ "گھر پر صرف اس کی لڑکی تھی اور اس نے بتایا کہ تم کہاں ہو۔ میرے آدمی اسے بھی لے آئے۔"

"ٹھیک ہے پرویز خان... میں تمہارے لیے کشتی تلاش کروں گا لیکن ان لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں جانے دو۔" اس نے لیلیٰ اور کریم کی طرف اشارہ کیا۔

"میں انہیں جانے دوں گا، اگر کشتی اور اس میں میرے سکے مل گئے۔" پرویز خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "دوسری صورت میں تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا کروں گا۔"

کریم بلوچ اور لیلیٰ کو تہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ شاہ میر اور جانی کو اوپر لایا گیا۔ انہیں غوطہ لگا کر کشتی تلاش کرنا

تھی۔ پرویز خان نے ایک بار پھر واضح کیا کہ اگر انہوں نے کشتی تلاش نہ کی تو ان سب کو عبرت ناک نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ شاہ میر پریشان ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے اور شاید کشتی ملنے پر بھی ان کی گلوخلاصی نہیں ہوگی بلکہ شاید انہیں مار دیا جائے۔ اس نے سمندر میں چھلانگ لگائی اور پہلے سے پانی کی سطح پر تیرتے جانی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں زیرِ آب کچھ نظر آیا؟"

"نہیں۔" جانی نے کہا۔

"اگر تم نے ایک بار پھر فرار ہونے کی کوشش کی تو جانتے ہو اس لڑکی کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔" اوپر کھڑے شجاع نے شاہ میر کو دھمکی دی۔

"یہ بہت خطرناک لوگ ہے۔" جانی نے آہستہ سے بتایا۔ "بردہ فروش ہے۔ آدمی کو ایسے مار دیتا ہے جیسے ہم مچھلی مارتا ہے۔"

انہوں نے کریم بلوچ اور لیلیٰ کو یرغمال بنا کر شاہ میر کو بے بس کر دیا تھا۔ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرتے تو اس کا نتیجہ ان دونوں کو بھگتنا پڑتا۔ لیلیٰ کے بارے میں ان کی نیت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ شاہ میر کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر ہم نے کشتی تلاش کر لی تو یہ ہمیں تو مار ہی دیں گے۔"

"کشتی نہ ملی تب بھی تو مار دیں گے۔"

"نہیں، اس صورت میں امید ہے ہم بچ سکتے ہیں۔" شاہ میر نے کہا۔ "تم اس طرف دیکھو۔"

جانی کو دوسری طرف بھیج کر شاہ میر نے غوطہ لگایا۔ وہ اس طرف بڑھا جہاں اس نے کوئی کشتی نما چیز دیکھی تھی۔ جب وہ کوئی تیس فٹ نیچے آیا تو اسے کشتی ریت میں دھنسی دکھائی دی۔ اس کا صرف اوپری حصہ ریت سے باہر تھا۔ وہ کوئی ستر فٹ کی گہرائی میں تھی اور اس کا اوپری حصہ بھی ریت کی طرح سفید تھا اس لیے سمندر کے اوپر سے نظر آنا مشکل تھا۔ وہ اوپر آیا۔ شجاع عرشے پر کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"تیرے پاس صرف ایک گھنٹا ہے، اگر کشتی نہیں ملی تو اس لڑکی کو لے جائیں گے اور تم تینوں ہمیشہ کے لیے سمندر میں رہو گے۔"

"کشتی تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں ایک یا دو دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔ اب تمہارے پاس صرف پچپن منٹ رہ گئے ہیں۔ کشتی ادھر ہی رہے گی، ہم بعد میں آکر تلاش کر سکتے ہیں۔"

شاہ میر نے غوطہ لگایا اور کچھ دیر زیرِ آب رہ کر جانی کو

digestpk.blogspot.com

تلاش کیا۔ وہ اس سے دور تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بولا۔ ''جانی! ہمارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''کشتی میں دو رے کا پستول ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

شاہ میر نے لانچ کی طرف دیکھا۔ ''ان لوگوں کی نظر سے بچ کر کشتی تک کیسے جائیں؟''

واقعی یہ ممکن نہیں تھا۔ شجاع اور پرویز خان عرشے پر موجود تھے اور پوری طرح ان کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کی نظروں سے بچ کر جانی کی کشتی پر جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ فوراً اسے گولی مار دیتے۔ اچانک شاہ میر کو ایک خیال آیا۔ اس نے جانی سے کہا۔ ''تم اسی جگہ غوطے لگاتے رہو۔''

''ٹھیک ہے، ہم اور کیا کر رہا ہے۔''

''اب سے دس منٹ بعد تم اچانک کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگنا۔''

''ہم سمجھ گیا تاکہ یہ اپن کی طرف متوجہ رہے۔'' جانی بولا۔

''تم ویسے کچھ دار آدمی ہو۔'' شاہ میر نے کہا اور پانی میں غوطہ لگا گیا۔ وہ کشتیوں کے ذرا قریب نکلا اور اسے غوطے میں وہ لانچ کے پیندے کے پاس نکلا۔ اب شجاع اور پرویز خان اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ گھوم کر پرویز خان کی کشتی کے عقبی حصے میں آیا جہاں انجن کے ساتھ اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھی لگی تھی۔ اب اسے انتظار تھا کہ کب ہنگامہ شروع ہو اور اسے اوپر چڑھنے کا موقع ملے۔ کچھ دیر بعد اسے پرویز خان کے چلانے کی آواز آئی۔ ''وہ شیدی بھاگ رہا ہے۔''

''دوسرا کہاں ہے؟'' شجاع بولا۔

''وہ جہاں کہیں بھی ہے؟'' پرویز خان نے کہا۔ ''فائر مت کرنا ورنہ آواز دور تک جائے گی۔ اس پر لانچ چڑھا دو۔''

شجاع کیبن کی طرف بھاگا۔ پرویز خان کی کشتی میں سیاہ رو شخص سمیت کل تین افراد تھے۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور جیسے ہی لانچ حرکت میں آئی، شاہ میر اوپر چڑھ گیا۔ کشتی پر آتے ہی وہ ایک بڑے ڈرم کے عقب میں چھپ گیا جس میں شاید ڈیزل رکھا تھا۔ اس نے ڈھکن کھول کر دیکھا۔ واقعی اس میں ڈیزل تھا۔ اس نے کچھ ڈیزل گرا دیا۔ وہ فرش پر پھیل گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پرویز خان کہاں ہے مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جانی کی جان خطرے میں ہے۔ شجاع اس پر کشتی چڑھا کر اسے مار ڈالتا۔ اس نے ڈرم سے مزید ڈیزل عرشے پر گرایا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ ڈرم چار سو لیٹر والا تھا اور اسے زور سے ہلایا جاتا تو یہ بے قابو ہو کر گر بھی سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں عقبی عرشے پر ڈیزل پھیل چکا تھا۔ لانچ اب تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ جانی پر چڑھائی کرتی، اسے کچھ کرنا تھا۔

شاہ میر کے پاس ماچس یا لائٹر نام کی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ اب تک ڈیزل کو آگ دکھا چکا ہوتا۔ وہ پچھلی طرف نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اوپری عرشے سے پرویز خان نمودار ہوا۔ اس نے شاہ میر کو دیکھتے ہی گولی چلا دی مگر عجلت میں کیا ہوا فائر ضائع گیا اور شاہ میر دوڑ کر اوپری کیبن کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس نے پرویز خان کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ یہ کشتی کا اندرونی حصہ تھا مگر لیلی اور کریم بلوچ نیچے والے حصے میں تھے۔ یہاں اسے کسی ہتھیار کی تلاش تھی۔ وہ بالکل نہتا تھا اور پرویز خان مسلح تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔ وہ کیبن میں دیوانہ وار کوئی ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ تب اس نے دیکھا کہ فرش میں ایک تختہ لگا ہوا ہے اور وہ اس کی کنڈی سے ٹکرایا تھا۔ اس نے کنڈی کھولی اور نیچے جھانکا۔ نیچے کشتی کا تہ خانہ تھا۔ اسی لمحے دروازے سے پرویز خان نمودار ہوا اور اس نے شاہ میر کو دیکھتے ہی گولی چلائی۔ ساتھ ہی وہ چلا رہا تھا اور گالیاں بھی دے رہا تھا۔ غصے میں اس کا نشانہ خطا گیا اور گولی فرش میں لگی۔ شاہ میر اندر کود گیا اور گرتے ہوئے اس نے تختہ بھی کھینچ لیا۔ اس کے اندر والے حصے میں بھی کنڈی تھی۔ وہ اس نے کھینچ کر بند کر دی۔ لیلی اور کریم بلوچ ایک کونے میں بندھے ہوئے تھے۔ شاہ میر جلدی سے ان کو کھولنے لگا۔ سیاہ رو شخص بھی شاید اوپر چلا گیا تھا۔

''شاہ میر تم ٹھیک ہے نا؟'' لیلی چلائی۔

''اڑے اوپر کیا ہو رہا ہے؟'' کریم بلوچ ہانپتے ہوئے بولا۔

''وہ لوگ جانی کو لانچ سے کچل کر قتل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں موقع دیکھ کر اوپر آ گیا۔ پرویز خان مجھے مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اوپر شور بلند ہوا اور گولی چلایا۔ ''یہ آگ کیسے لگی؟''

''اسی حرامزادے نے لگائی ہے۔'' پرویز خان نے گالی دی۔ ''نیچے تہ خانے میں گھس گیا ہے۔''

''نکو کشتی سے... یہ تو جلنے والی ہے۔'' شجاع چلایا۔

''بکواس مت کرو آگ بجھاؤ۔'' پرویز خان نے غصے سے کہا۔ لانچ کا انجن بند ہو چکا تھا اس لیے سب صاف سنائی دے رہا تھا۔

''لانچ میں آگ لگ گئی ہے۔'' لیلی کا رنگ سفید پڑ گیا۔

شاہ میر بھی نہیں سمجھ سکا کہ آگ کیسے لگ گئی۔ اس نے تو صرف ڈیزل گرایا تھا پھر اسے خیال آیا۔ ''پرویز خان نے مجھ پر فائر کیا تھا، ممکن ہے گولی سے آگ لگ گئی ہو۔''

''نکلو ادھر سے... اگر آگ پھیل گئی تو ہم ادھر ہی جل کر مر جائیں گے۔'' کریم بلوچ گھبرا کر بولا۔ تہ خانے سے باہر جانے والا دروازہ پہلے ہی باہر سے بند تھا۔ اور جب شاہ میر نے اوپر والے کیبن کا تختہ اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اوپر سے بند کیا جا چکا تھا۔ وہ واقعی اس جگہ محصور ہو کر رہ گئے تھے اور اب کشتی جلتی یا ڈوبتی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ اچانک ہی ایک زوردار دھماکا ہوا۔ کشتی میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ لیلی نے چیخ ماری اور شاہ میر سے لپٹ گئی۔ کریم بلوچ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ڈیزل کا ڈرم پھٹ گیا تھا اور اب کشتی کا بچنا محال تھا۔ اوپری تختے ٹرالی سے صرف ساڑھے چار فٹ اوپر تھا۔ شاہ میر نے پوری [illegible] کر لی لیکن تختہ بہت مضبوط تھا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ پھر کریم بلوچ بھی اس کے ساتھ مل کر زور لگانے لگا مگر تختے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بہت مضبوط لکڑی کا تھا۔ اوپر آگ بہت تیزی سے پھیل چکی تھی کیونکہ انہیں تپش بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اوپر موجود پرویز خان اور اس کے آدمی پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے۔ شاید آگ ان کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ پھر انہوں نے شجاع کے چلانے کی آواز سنی۔

''شیدی کشتی لے کر بھاگ رہا ہے۔''

جانی کی کشتی کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے دور جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آواز آئی مگر جانی کی کشتی دور جا چکی تھی۔ وہ کسی طرح اپنی کشتی تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ پھر پرویز خان نے کہا۔

''کشتی سے نکلو... سب تباہ ہو گیا۔'' اس کے لہجے میں اشتعال تھا۔

''ان قیدیوں کا کیا کرنا ہے؟'' سیاہ رو شخص نے پوچھا۔

''اچھا ہے، وہ بھی اسی میں جل کر اور ڈوب کر مریں۔''

''بابا... ہم مر جائیں گے؟'' لیلی سہم کر بولی۔

''اڑے تو کیا کرے۔'' کریم بلوچ نے بے بسی سے کہا۔ ''ہم جانور کا اتفاق ادھر قید ہے۔''

شاہ میر کا ذہن تیزی سے بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اس نے چل پھر کر چھت کا جائزہ لیا اور ایک جگہ اسے محسوس ہوا کہ یہاں صرف پائی یا تختی لکڑی ہے۔ اس نے کریم بلوچ کو آواز دی۔ ''چاچا! ادھر آنا۔ یہاں مجھے لکڑی کھوکھلی لگ رہی ہے۔''

کریم بلوچ نے دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ''ہاں، ادھر تو واقعی لکڑی ہلکا ہے۔''

''ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔'' شاہ میر اس جگہ مکے مارنے لگا۔ شروع میں تو کچھ نہیں ہوا مگر کچھ دیر بعد لکڑی دبنے لگی۔ یہ دیکھ کر کریم بلوچ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہاں واقعی کارڈ بورڈ تھا مگر اس پر رنگ پھیر کر اسے بہ ظاہر لکڑی کا ہم رنگ بنا دیا گیا تھا۔ یہ حصہ اوپر ایک کیبن میں نکلتا تھا۔ ان کی مشترکہ کوشش جلد رنگ لائی اور ایک سوراخ ہو گیا۔ اب اسے اتنا بڑا کرنا تھا کہ اس سے باہر نکلا جا سکے۔ اچانک لیلی نے چیخ ماری۔

''ادھر پانی آ رہا ہے۔''

واقعی فرش پر پانی جمع ہو رہا تھا۔ کشتی ڈوب رہی تھی۔ انہوں نے تیزی سے کوشش کی اور کسی نہ کسی طرح اتنا بڑا سوراخ کر لیا کہ اس سے ایک آدمی باہر نکل سکے۔ سب سے پہلے کریم بلوچ اوپر گیا [illegible] کشتی کا اوپری حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا [illegible] کی بہت تیزی سے پانی میں جا رہی تھی۔ کشتی پچھلی طرف جھک رہی تھی مگر اچھی بات یہ تھی کہ کشتی پر کوئی نہیں تھا کیونکہ پرویز خان اور اس کے ساتھیوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ سامنے والے عرشے پر نکلے۔ اچانک ہی کشتی کا عقبی حصہ پانی میں گیا اور وہ سب پھسلتے ہوئے اس طرف جانے لگے۔ لیلی نے شاہ میر کو پکڑ لیا۔ اس نے لوہے کی ایک راڈ پکڑ لی تھی۔ کریم بلوچ دوسری راڈ سے چمٹا ہوا تھا۔ شاہ میر چلایا۔ ''یہاں سے نکلو ورنہ کشتی کے ساتھ ہی پانی میں چلے جائیں گے۔''

''پر کیسے بابا... اسے چھوڑے گا تو پیچھے جا کر گرے گا۔'' کریم بلوچ ہانپتے ہوئے بولا۔ کشتی کا نصف حصہ پانی میں جا چکا تھا اور پانی ان سے کچھ دور تھا۔ کشتی کے پانی کے اندر جانے سے پہلے اس سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ شاہ میر نے سوچا اور بولا۔ ''ہاتھ چھوڑ دو پانی... بس ہے۔''

انہوں نے ہاتھ چھوڑے تو پھسلتے ہوئے پانی میں جا گرے۔ لیلی کی گرفت ختم ہوئی تھی اور وہ پانی میں جا گری مگر اسے تیرنا آتا تھا۔ کریم بلوچ نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی اور شاہ میر سب سے پیچھے تھا۔ کشتی تیزی سے پانی میں جا رہی تھی اور اس میں کہیں کہیں آگ بھڑک رہی تھی۔ کوئی بھاری چیز جب پانی میں ڈوبتی ہے تو وہ اپنے ساتھ ایک ایسا بھنور بناتی

ہے جو دوسری ہلکی چیزوں کو بھی پانی میں کھینچ لیتا ہے۔ شاہ میر نے چلّا کر کہا۔

”کشتی سے جلدی دور نکلو، ورنہ یہ ہم سب کو بھی لے جائے گی۔“

وہ ہر ممکن تیزی سے کشتی سے دور جانے لگے۔ پرویز خان، شجاع اور سیاہ رو شخص کشتی کے دوسری طرف تھے۔ ان میں سے کسی نے انہیں دیکھ لیا اور دوسروں کو خبردار کیا کہ ان کے قیدی بچ گئے ہیں۔ وہ تیزی سے ڈوبتی کشتی سے بچ کر ان کے قریب آنے لگے۔ ان کے عزائم ان کی بگڑی صورتوں سے واضح تھے۔ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ انہیں مارنے کی پوری کوشش کرتے۔ پرویز خان کی کشتی شاہ میر کی وجہ سے تباہ ہوئی تھی اور اس سے بھی بڑا نقصان اسے ہیروں کی محرومی سے ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو انہیں ختم کرنے کو کہہ رہا تھا۔

”تیزی سے تیرو... ان لوگوں سے دور رہنا ہے۔“ شاہ میر بولا۔ اس نے لیلیٰ کو سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تیرنا جانتی تھی لیکن بہت اچھی تیراک نہیں تھی۔

”میں ان کو روکتا ہوں۔“ کریم بلوچ نے کہا۔

”نہیں چاچا... روک نہیں سکتے۔ جو ان کے ہاتھ آیا مارا جائے گا۔“ شاہ میر نے منع کیا۔ پرویز خان اور اس کے ساتھیوں کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ ان تک پہنچنے کے لیے وہ ڈوبتی کشتی کے پاس سے گزرنے کا خطرہ بھی مول لے رہے تھے اور اب ان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ وہ تینوں مشاق تیراک تھے اور طاقتور بھی تھے جبکہ ان کے ساتھ لیلیٰ تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی رفتار سست تھی۔ سب سے آگے پرویز خان تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

”میں تم سب کو اسی سمندر میں غرق کر دوں گا۔“

شاہ میر نے محسوس کیا کہ اب اس کا ان سے مقابلہ کرنا ناگزیر تھا ورنہ وہ ان سب کو مار دیتے۔ اس نے لیلیٰ کو آگے دھکیلا اور کریم بلوچ سے کہا۔

”اسے دور لے جاؤ، میں ان لوگوں کو روکتا ہوں۔“

”نہیں، تم بھی چلو۔“ لیلیٰ اس سے لپٹ گئی۔ ”میں تیرے بغیر نہیں جاؤں گی۔“

اس لمحے شاہ میر نے لیلیٰ کی آنکھوں میں اپنے لیے وہ سارے جذبے دیکھ لیے جنہیں وہ اب تک خود سے بھی چھپاتی آئی تھی۔ ”لیلیٰ جاؤ... تمہیں میری قسم۔“ شاہ میر نے آہستہ سے کہا اور اسے آگے دھکیل دیا۔ ”جاؤ۔“

وہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئے تھے اور پرویز کو ان کے پاس آنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے آتے ہی شاہ میر کو مکا مارا۔ وہ بے ساختہ پیچھے گیا۔ لیلیٰ نے چیخ ماری اور پرویز خان کو مارنے لگی مگر اس کے نازک ہاتھوں کا اس کے سانڈ جیسے جسم پر کیا اثر ہوتا۔ کریم بلوچ بھی پلٹ آیا تھا۔ اس دوران میں شجاع اور سیاہ رو شخص بھی آ گئے تھے اور انہوں نے ان کو گھیر لیا۔ پرویز خان نے لیلیٰ کے سر پر مکا مارا تو وہ چکرا گئی۔ اس کی چیخ پر شاہ میر نے عقب سے پرویز خان کی گردن پر ہاتھ مارا۔ ذرا سی دیر میں وہاں ایک میدانِ جنگ کا سا سماں ہو گیا تھا۔ پانی کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی صحیح سے لڑ نہیں پا رہا تھا اور نہ ہی ان کو فرار کا موقع مل رہا تھا۔

کریم بیٹی کو چھڑانے کے لیے پرویز خان سے لپٹ گیا اور اس نے لیلیٰ کو چھوڑ کر کریم بلوچ کو گردن سے پکڑ کر پانی میں ڈبو دیا۔ وہ سانس لینے کے لیے پھڑپھڑانے لگا۔ وہ بوڑھا تھا اور پرویز خان ادھیڑ عمر... مگر کریم بلوچ بھی لڑائی کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے پانی کے اندر ہی پرویز خان کے ایک نازک مقام کو ایسا قابو کیا کہ وہ اسے بھول کر اپنی فکر میں پڑ گیا۔ پانی سے نکلتے ہی کریم بلوچ نے تاک کر اس کی ناک پر ٹکر ماری۔ وہ بلبلا کر پیچھے ہٹ گیا مگر صاف لگ رہا تھا کہ اس جنگ میں ہار ان کا مقدر ہے کیونکہ وہ تین تھے۔ ایک لڑکی اور ایک بوڑھا جبکہ ان کے سامنے تین ہٹے کٹے مرد تھے۔

شاہ میر سے بیک وقت سیاہ رو شخص اور شجاع چمٹے ہوئے تھے اور اسے پانی میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرویز خان کریم بلوچ کو روک رہا تھا۔ لیلیٰ ایک طرف ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور انہوں نے مل کر شاہ میر کو پانی میں کر دیا۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اور ایک منٹ کے اندر اسے لگنے لگا کہ اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ سانس کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اچانک اس پر موجود بوجھ ہٹ گیا اور وہ پانی سے باہر نکلا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیونکر ہوا۔ وہ اگر ایک دو سیکنڈ اور پانی میں رہتا تو اس کا دم گھٹ جاتا۔ پھر اس نے جانی کی آواز سنی۔

”ارے نامرد کا بچوں... ایک سے تین تین چمٹا ہے۔“

جتنی تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی، اتنی ہی تیزی سے اس کے ہاتھ بھی چل رہے تھے اور وہ کشتی پر کھڑے کھڑے ایک لمبے بانس سے ان تینوں پر اتنی پھرتی سے وار کر رہا تھا کہ ان کے لیے اپنا دفاع کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جانی کا ایک بھرپور وار پرویز خان کے سر پر لگا اور وہ غشی کے عالم میں غوطے بھی کھانے لگا۔ کریم بلوچ لیلیٰ کو سہارا دے کر دوسری طرف سے کشتی پر سوار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر لیلیٰ خود ہی اوپر چڑھ گئی۔ شاہ میر نے سانس درست ہوتے ہی پرویز خان کا سر پکڑ کر پانی میں کر دیا اور وہ اب سانس کے لیے تڑپ رہا تھا۔ باقی دو بھی بانس کھا کر بے دم ہو چکے تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے باس کی مدد کرتے۔ اس لیے شاہ میر کے سامنے مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جوشِ غضب میں پرویز خان کو مار ہی دیتا مگر کریم بلوچ کی آواز سن کر اسے ہوش آ گیا۔ وہ بھی کشتی پر چڑھ گیا تھا۔ ”ارے چھوڑ اسے... مر جائے گا۔“

شاہ میر چونکا۔ اس کا غصہ کم ہوا۔ اس نے پرویز خان کو چھوڑ دیا اور خود کشتی کی طرف بڑھا۔ لیلیٰ اور کریم بلوچ نے سہارا دے کر اسے بھی اوپر کر لیا۔ وہ تینوں سمندر میں تھے اور جانی ایک پستول کے ساتھ ان کی نگرانی کر رہا تھا کہ کوئی کشتی پر چڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ کریم بلوچ نے اس سے کہا۔ ”نکل ادھر سے۔“

سیاہ رو شخص نے التجا کی۔ ”ہمیں بھی لے چلو۔“

”چپ کر۔“ جانی نے پستول ہلا کر کہا۔ ”ابھی تیرے کو ادھر مار کر چھوڑ جائے گا... مچھلی تجھے کھائے گا۔“

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

”میں ادھر سے بھاگا تھا، پر جب کشتی میں دھماکا ہوا تو میں واپس آ گیا۔“ جانی نے بتایا۔ ”ادھر تو کشتی کلاس تھا پھر تم نظر آیا۔“

”تم بروقت آئے۔“ شاہ میر نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تھینک یو۔“

جانی کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا۔ ”کسی نے پہلی بار ہم کو تھینک یو بولا ورنہ سب کام کرا کے گالی دیتا ہے۔“

”ان کا کیا کرنا ہے؟“ کریم بلوچ نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا جو بے بسی سے لہروں پر ڈول رہے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ زیادہ دیر نہیں تیر سکتے تھے۔ جانی نے انہیں بہت بے دردی سے مارا تھا اور ان سب کے سر پھاڑ دیے تھے۔

”مرنے دو چاچا۔“ جانی بولا۔ ”اچھا ہے سمندر کا گند کم ہوگا۔“

”اگر یہ بچ گئے تو پھر ہمارے پیچھے آئیں گے۔“ شاہ میر سوچ کر بولا۔ ”معاملہ بہت بڑی دولت کا ہے۔ جب تک یہ اسے حاصل نہیں کر لیں گے، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

پرویز خان کو دم خم اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ ”تم نے ٹھیک کہا لیکن اب مجھے دولت کی پروا نہیں ہے۔ میں بچ گیا تو تم چاروں کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”خان! کیا کہتے ہو؟ یہ ہمیں مار دیں گے۔“ شجاع بوکھلا کر بولا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔“ شاہ میر نے جانی سے پستول لے لیا۔ ”تم بچ گئے تو ہماری جان نہیں چھوڑو گے۔“ اس نے پستول پرویز خان کی طرف سیدھا کیا تو وہ بوکھلا گیا۔

”ایک منٹ رکو...“

”رکو مت اڑا دو ذلیلوں کو۔“ جانی بولا۔

شاہ میر نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔ سب کی سانس رک گئی اور وہ گولی چلنے کے منتظر تھے مگر پھر شاہ میر کی انگلی کا دباؤ ختم ہو گیا اور اس نے پستول نیچے کر لیا۔ ”میں کسی کو نہیں مار سکتا۔“ اس لمحے اسے خیال آیا کہ اگر وہ کسی کو مار سکتا تو منیر کو نہ چھوڑتا۔ اس نے جھکتے ہوئے انداز میں پستول جانی کی طرف بڑھا دیا۔ لیلیٰ نے باپ کی پروا کیے بغیر شاہ میر کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم نے اچھا کیا... ایسے لوگوں کو خدا خود سزا دے گا۔“

اسی لمحے لگاتار فائرز ہوئے اور وہ بری طرح چونکے۔ جانی کے پستول سے دھواں اٹھ رہا تھا اور سمندر میں پرویز خان اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں غوطے کھا رہی تھیں۔ جانی نے ان کے سروں میں گولیاں ماری تھیں۔ کریم بلوچ نے جانی سے پستول چھین لیا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”پاگل کا بچہ، ایسے کیسے مار دیا... اب تو قاتل بن گیا ہے۔“

”میرے کو پتا ہے۔“ جانی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”پر اپن کیا کرتا؟ تم لوگ نہیں اور جا سکتا ہے پر جانی کو تو ادھر ہی رہنا ہے۔ یہ میرے کو نہیں چھوڑتا۔ میرے کو مار دیتا اس لیے میں نے پہلے ان کو مار دیا۔“

شاہ میر نے ان تینوں کی لاشوں کو دیکھا اور کریم بلوچ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”چاچا! جانی نے ٹھیک کیا ہے۔ اس نے قتل نہیں کیا ہے، اپنے دفاع میں ان لوگوں کو مارا ہے۔ اگر یہ انہیں نہیں مارتا تو یہ اسے تلاش کر کے مار دیتے۔“

”پر اب لاش کا کیا کرے۔ یہ ملے گا تو پولیس اسے پکڑ

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

digestpk.blogspot.com

سکتا ہے اور یہ پکڑا جائے گا تو ہمارے بارے میں بھی بک دے گا۔"

"نہیں بکے گا کریم چاچا۔" جانی نے کہا۔ "ابھی ان کا لاش سے وزن باندھتا ہے۔ یہ قیامت تک ادھر پڑا رہے گا۔"

☆☆☆

شاہ میر خاموشی سے جوتے پہن رہا تھا۔ لیلیٰ سو رہی تھی مگر جیسے ہی وہ اٹھنے لگا، لیلیٰ نے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "جا رہا ہے؟" وہ پُرخمار لہجے میں بولی۔

"تم جاگ رہی تھیں۔" وہ مسکرایا۔ "میں تو سمجھا سو رہی ہو۔"

"تو جا رہا ہو تو میری آنکھ خود کھل جاتی ہے۔"

"مجھ پر اب تک اعتبار نہیں آیا؟"

لیلیٰ نے اٹھ کر اپنا سر اس کے شانے سے لگا دیا۔ "نہیں... لگتا ہے تو کوئی خواب ہے، ابھی آنکھ کھلے گی اور تو چلا جائے گا۔"

"میں ایک حقیقت ہوں۔ اور لو اب تیاری کر لو میں شہر سے اگلی بار آؤں گا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اور بابا؟"

"تم جانتی ہو وہ تیار نہیں ہوتا۔ اب تو اسے اپنی کشتی بھی مل گئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ خوش ہے۔" شاہ میر نے کہا۔

اس نے اپنا دوسرا اقیمت بیچ کر رقم کریم بلوچ کو ادھار دے دی تھی اور اس نے اپنی کشتی خریدی تھی اور داماد کا قرض اتارنے کے لیے تن دہی سے کام کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ سمندر میں گیا ہوا تھا کیونکہ لیلیٰ شادی کے بعد بھی اس کے ساتھ رہ رہی تھی اس لیے جب شاہ میر آتا تو وہ بہانہ کر کے سمندر میں چلا جاتا تھا۔ شاہ میر کو دبئی کی ایک میرین کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔

"تیرے کاغذات کا کیا ہوا؟"

"آج مل سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "مگر باہر جانے کا کام دو تین ہفتے سے پہلے نہیں ہوگا۔"

"تب میں شہر جا کر کیا کروں گی... ادھر برا ہے کیا؟"

"ادھر سے آنا جانا مشکل ہے۔ کشتی نہ ہو تو آدمی کیسے جائے۔" شاہ میر نے اسے سمجھایا۔

"میں بابا سے دور نہیں رہ سکتی۔" لیلیٰ ٹھنک کر بولی۔ "بابا بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ٹھیک ہے، جب تم اپنے بابا کے پاس رہو، میں باہر جا کر تیسری شادی کر لوں گا۔ ویسے بھی مجھے بہت تجربہ ہو گیا ہے۔" شاہ میر نے اسے چھیڑا۔

"تجھے اور اسے قتل کر دوں گی۔" لیلیٰ کو غصہ آ گیا۔ "تو ذرا کر کے تو دیکھ۔"

"اچھا! اتنی ہمت ہے؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"ہاں، اتنی ہمت ہے، تبھی تو تجھ سے شادی کی۔"

"کیوں، مجھ میں کیا برائی تھی؟"

"تو جانتا ہے نا، میں نے خود بابا سے کہہ دیا تھا تیری محبت میں... کوئی اور ہوتا تو بھی بات نہ کرتی بابا سے۔" وہ غرور سے بولی۔ "میرا احسان مان۔"

"رات کو مانا تو تھا۔" شاہ میر کے لہجے میں شرارت آ گئی۔

"بدتمیز۔" لیلیٰ نے اس کے شانے پر مکا مارا پھر اداس ہو گئی۔ "اب تو دور چلا جائے گا، مہینوں بعد آیا کرے گا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تجھے بتایا تھا نا کہ میں نے کشتی دیکھ لی تھی۔ بس قسمت کی بات ہے ورنہ دولت ہم سے کتنی دور تھی۔" شاہ میر نے سرد آہ بھری۔ "اگر ہیرے مل جاتے تو ہم مزے سے ساتھ رہتے۔"

لیلیٰ اٹھ بیٹھی اور سنجیدگی سے بولی۔ "شاہ میر! بہت اچھا ہوا کہ وہ گندی دولت ہمیں نہیں ملی۔ تو نے دیکھا نہیں، اس کے لیے کتنے لوگ جان سے گئے۔"

"یہ تو ہے۔" شاہ میر نے سر ہلایا۔ "کیا تمہیں دولت اچھی نہیں لگتی؟"

"اب تو اپنی محنت کی کمائی لا کر دے گا تو میرے لیے یہ دنیا کی ہر دولت سے بڑھ کر ہوگی۔ مجھے بس یہی چاہیے۔"

"اگر تمہیں میرے ساتھ روکھی سوکھی کھانی پڑے تو کھا لے گی؟"

"ہاں، بہت دل سے کھاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھ سے ایک وعدہ کر، کبھی بھی حرام کا ایک پیسا گھر نہیں لائے گا۔"

"یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" شاہ میر نے کہا۔ "اب مجھے الوداع تو کہہ دو۔" اس نے لیلیٰ کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ جھکائی دے کر نکل گئی اور دروازے کے پاس جا کر بولی۔

"ناشتا نہیں کرے گا؟"

"شکریہ، میں وہیں جا کر کر لوں گا۔" شاہ میر نے منہ بنا کر کہا تو لیلیٰ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ بھی مسکرانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے ناشتے کے بغیر جانے نہیں دے گی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جس نے اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں پھر لوٹا دی تھیں۔

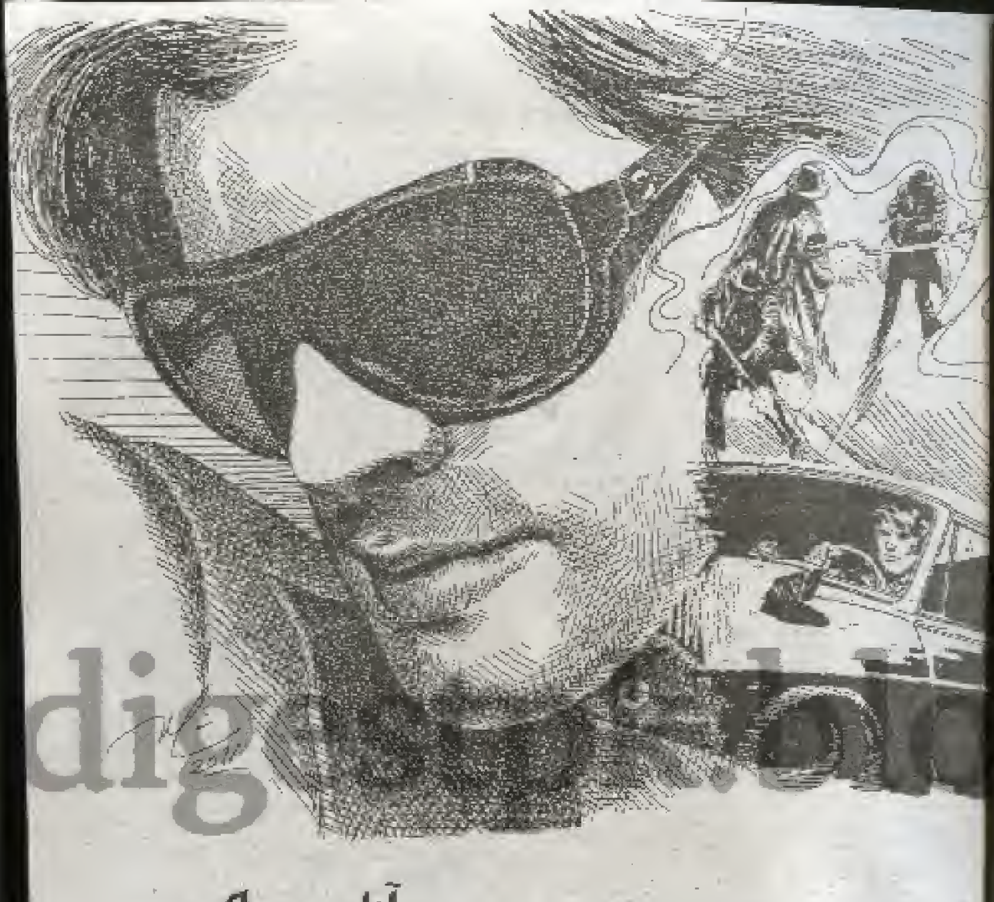

آزادیِ جرم

مسز ریم کے خان

ہر ملک کے اپنے قوانین ہوتے ہیں... جرم کی دنیا سے جڑے افراد سمجھتے ہیں کہ جس شہر میں کالے قوانین یعنی لاقانونیت کا راج ہوگا... وہاں وہ فائدے میں رہیں گے... لیکن ہر شے کا جرم کی دسترس میں ہونا فائدہ مند نہیں بلکہ تباہ کن نقصان کا باعث بنتا ہے... جرم کے راستوں پر گامزن مجرموں کا سنسنی خیز ٹکراؤ

غیر قانونی کاموں کی انجام دہی کے لیے قانون کی سند حاصل کرنے والے خواہش مند کا عبرت انگیز ماجرا

موڈی جرم کے معاملے میں لبرل خیالات رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب معاشرے میں ہر طبقے کو آزادی حاصل تھی کہ وہ جو چاہے کرے، جیسے ہم جنس پرستی کی اجازت تھی، شراب پینے کی اجازت تھی اور اسی طرح اور بھی کئی طرح کی آزادیاں تھیں... تو مجرموں کو بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی سے جرم کریں۔ میں اس سے متفق نہیں تھا اور ایک بار بحث کے دوران میں نے اس سے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اول تو جرم کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا نام ہے۔ چاہے یہ نقصان مالی ہو، ذہنی یا جسمانی... دوسرے اس سلسلے میں قوانین موجود ہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ دوسری آزادیوں میں بھی فریقین کو نقصان ہوتا ہے یعنی ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہوتا ہے۔" موڈی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "جیسے شراب بیچنے والے کو فائدہ ہوتا ہے اور خرید کر پینے والے کو مالی اور جسمانی نقصان ہوتا ہے۔"

"اس کی قانون نے اجازت دی ہے۔"

"اگر قانون چوری کرنے اور ڈاکا مارنے کی اجازت دے دے تو تمہارے خیال میں یہ ٹھیک ہوگا؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اصل مسئلہ قانون کا تھا۔ اگر ملک کا قانون ایک چیز کی اجازت دیتا ہے تو وہ قانونی ہو جائے گی، چاہے وہ چوری ہو، ڈکیتی ہو یا قتل۔ قتل کی اجازت تو قانون بھی دیتا ہے۔۔۔ جیسے اگر کوئی کسی کی جان لینے کی کوشش کرے تو فریق ثانی اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت اپنی عزت پر حملہ کرنے والے کو قتل کرے تو قانون نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ عورت کے اقدام کو تحسین کی نظر سے بھی دیکھتا ہے۔ لیکن چوری اور ڈکیتی بہرحال ایک الگ معاملہ تھا۔

میں اور موڈی دونوں جرائم پیشہ ہیں اور ہماری گزر اوقات جرم سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ہوتی ہے۔ میرا نام شون مارین ہے۔ دو افراد پر مشتمل اس گروہ میں موڈی کو ایک باس کی حیثیت حاصل ہے اور میں اس کا دستِ راست یا دستِ ناراست ہوں۔ جہاں تک جرم کا تعلق ہے تو ہم دونوں اس پر متفق ہیں کہ یہی ہماری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے اور ہم کوئی اور کام نہیں کر سکتے لیکن موڈی کی یہ منطق میرے حلق سے کبھی نہیں اتری کہ معاشرے میں جس طرح بہت سارے انسانوں کو ضرر رساں کاموں کی اجازت ہے، اسی طرح جرائم پیشہ افراد کو بھی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جرم کریں اور قانون ان کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ کھڑی کرے۔ میرے خیال میں یہ فضول بات تھی۔ معاشرہ کبھی اس چیز کی اجازت نہیں دے گا کہ جرائم کرنے والوں کو جرم کرنے کی آزادی دی جائے۔

مجھے قانون اور اس قسم کے معاملات کی زیادہ سمجھ نہیں ہے جیسا کہ موڈی کو سمجھتا ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ باس بھی ہے لیکن میں اندر سے محسوس کرتا تھا کہ موڈی کی بات درست نہیں ہے اور ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کسی جگہ مجرموں کی حکومت ہو اور وہ جرم کو قانونی قرار دے دیں۔ میرا خیال تھا کہ طاقت کا اصول صرف جنگل میں چلتا ہے، انسانوں کے معاشرے میں اس کی قطعی گنجائش نہیں۔

موڈی اور میں ہیوسٹن کے باسی تھے اور میرا بچپن اسی شہر کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے گزرا۔ جب میں نے ساتویں کلاس کے بعد اسکول چھوڑا تو موڈی میرا ساتھی بن گیا۔ موڈی نے پانچویں کلاس سے آگے جانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے خیال میں اسکول کی تعلیم سوائے وقت کے زیاں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر آدمی نے علم حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے مطالعہ بہترین چیز ہے۔ یہی وجہ ہے موڈی کتابیں پڑھتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کی وجہ سے موڈی کے سوچنے کا انداز ذرا مختلف ہے اور وہ آئے دن مجھے اس قسم کی بحث میں الجھاتا رہتا ہے۔ میں صرف اس لیے اس کی بات سن لیتا ہوں کہ وہ بہرحال میرا باس ہے۔

جہاں تک جرائم کا تعلق ہے تو موڈی اس کام میں ماہر ہے۔ خاص طور سے پلاننگ میں اس کا دماغ خوب چلتا ہے۔ کسی بھی کام کی پلاننگ وہی کرتا اور میرا کام اس کے ساتھ مل کر عمل کرنا ہوتا ہے۔

ان دنوں موڈی کا موڈ بہت خراب تھا کیونکہ ایک مہینے سے ہم نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور دونوں ہی خالی ہاتھ تھے۔ میں انتظار میں تھا کہ موڈی کوئی کام پکڑے اور جیب میں کچھ نوٹ آئیں۔ بہت دنوں سے نہ کسی نائٹ کلب میں گئے تھے اور نہ ڈھنگ کی شراب پی تھی۔ میں نے موڈی سے کہا۔

"کوئی کام پکڑو، اس سے پہلے کہ فاقوں کی نوبت آ جائے۔"

اس نے بدمزگی سے میری طرف دیکھا۔ "کوئی اچھا کام ملے تو پکڑوں نا۔۔۔ یہاں کیا ہے، وہی گیس اسٹیشن جہاں چند سو ڈالرز سے زیادہ رقم نہیں ہوتی۔۔۔ یا پھر شاپنگ سینٹرز ہیں جن میں سامان سے زیادہ کیمرے ہوتے ہیں اور ہم چہرہ چھپا کر بھی جائیں، تب بھی پولیس فوراً ہمیں آ لے گی۔"

پولیس کے سیدھا ہمارے ٹھکانے پر آنے کی ایک وجہ تھی۔ میں چھوٹا اور موٹا تھا جبکہ موڈی دبلا اور لمبا تھا۔ جب کسی واردات میں ہم دونوں ساتھ ہوتے تو پولیس کو ہمیں شناخت کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی اس لیے ہمیں کام ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا پڑتا تھا۔ مگر کام تو کرنا تھا ورنہ سچ مچ فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ میں نے موڈی کی بدمزگی کی پروا کیے بغیر کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یاد رہے کہ میری جیب میں صرف دس ڈالرز رہ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اتنے بھی نہیں ہوں گے۔"

یہ سن کر موڈی بھی متفکر ہو گیا۔ میں نے درست کہا تھا، اس کے پاس دس ڈالرز بھی نہیں تھے۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے گہری سانس لی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"تو کرو۔" میں نے بےتابی سے کہا۔

"ایک موقع ہے لیکن میں نے اس کا سروے نہیں کیا ہے۔" وہ بولا۔ "شہر سے باہر جانے والی ایک شاہراہ پر ایک اسٹور ہے اور خاصا بڑا ہے۔ شہر کے گرد و نواح میں رہنے والے شاپنگ کرنے۔۔۔ وہیں آتے ہیں اور دوپہر سے شام تک بہت رش رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس ہزار ڈالرز تو یقیناً ہوتے ہوں گے۔"

پندرہ بیس ہزار ڈالرز کا سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ بہت بڑی رقم تھی اور ہمیں مل جاتی تو ہم چھ مہینے تو بہت آرام سے گزار سکتے تھے۔ "تو تم نے اب تک کچھ کیا کیوں نہیں؟"

"کیونکہ مجھے وہاں کے حفاظتی انتظامات کا علم نہیں ہے۔" موڈی نے سکون سے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں پوری طرح اطمینان کیے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بھاڑ میں گیا تمہارا اطمینان، ہمیں رقم کی ضرورت ہے اور منہ سے بولا۔ "اطمینان کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم وہاں جائیں گے تو حفاظتی انتظامات کا خود پتا چل جائے گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "آنکھیں بند کر کے کچھ کرنے کا مطلب ہے پولیس کو دعوت دینا۔"

"پھر کیا کریں؟"

"آج شام چل کر پہلے اس اسٹور کا معائنہ کریں گے اور اس کے بعد طے کریں گے کہ ہمیں کیا اور کیسے کرنا چاہیے۔"

ہم شام کو اس اسٹور میں داخل ہوئے تو وہاں سامان اور گاہکوں کی ریل پیل دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ لوگ دھڑا دھڑ خریداری کر رہے تھے اور دو عدد کیش کاؤنٹرز پر موجود لڑکیوں کو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک کینڈی خریدی اور ادائیگی کے لیے قطار میں لگ گیا۔ مجھ سے آگے چھ افراد تھے اور ان چھ افراد نے مجموعی طور پر کوئی ہزار ڈالرز کی خریداری کی تھی۔ صرف پندرہ منٹ میں کیش کاؤنٹر پر موجود کیش میں ہزار ڈالرز کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اسٹور میں کُل پانچ افراد کام کرتے تھے۔ ان میں ایک اسٹور کا مالک بھی تھا۔ مالک کا ہونا لازمی تھا کیونکہ کیش وہی سنبھالتا ہوگا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس قسم کے اسٹورز میں مالک ہر گھنٹے بعد کیش نکال کر [illegible] رکھ دیتے ہیں تاکہ ہم جیسے حضرات آ جائیں تو انہیں ایک گھنٹے سے زیادہ کی کمائی کا نقصان نہ ہو۔ لیکن ہماری برادری کے لوگ اب ان ہتھکنڈوں سے واقف ہو گئے ہیں اس لیے وہ سامنے موجود کیش کے علاوہ مالک سے خفیہ سیف میں چھپایا جانے والا کیش بھی نکلوا لیتے ہیں۔

میں نے باہر آتے ہی موڈی سے کہا۔ "ہمیں کل ہی یہاں آنا چاہیے۔"

"اتنی جلدی مناسب نہیں ہوگی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کچھ چھپے ہوئے کیمرے بھی ہیں۔"

"وہ تو ہر اسٹور میں ہوتے ہیں۔" میں نے اصرار کیا۔ "ہم اپنا حلیہ بدل کر اور چہرے پر ماسک لگا کر آئیں گے اس طرح پہچانے نہیں جائیں گے۔"

"ہمارا قد اور وزن؟" اس نے نکتہ اٹھایا۔

"میں ذرا تنگ کپڑے اور ہائی ہیل کا جوتا پہن لوں گا۔ تم چپٹے تلے والے جوتے کے ساتھ زیادہ کپڑے پہن لینا۔ اس طرح ہماری شناخت چھپ جائے گی۔ دوسرے کل اتوار ہے۔ لوگ خریداری کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں۔ کل یقیناً زیادہ سیل ہوگی۔"

موڈی میری تجویز سے متفق نہیں تھا لیکن زندگی میں پہلی بار میں نے اسے کسی کام کے لیے مجبور کر دیا۔ طے پایا کہ ہم سورج ڈوبتے ہی اسٹور کے سامنے سڑک کی دوسری جانب پہنچ جائیں گے اور موقع دیکھ کر اسٹور کا صفایا کر دیں گے۔ ہمارے پاس ایک پرانی۔۔۔ کار تھی لیکن اس کے بجائے ہم نے ایک نسبتاً نئی اور طاقت ور انجن والی کار چرائی تاکہ فرار کے وقت کسی مسئلے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سورج ڈوبتے ہی ہم اسٹور کے سامنے پہنچ گئے جہاں اس وقت بھی خاصا رش تھا۔ میں نے موڈی سے کہا۔

"لگتا ہے آج سیل لاکھ سے اوپر جائے گی۔"

"زیادہ خوش فہمی میں مت رہو۔ آج کل لوگ زیادہ تر ادائیگی کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈ کی مدد سے کرتے ہیں۔"

"اس کے باوجود بہت سے لوگ نقد ادائیگی کرتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے، کل بھی زیادہ تر لوگ نقد رقم دے رہے تھے۔"

digestpk.blogspot.com

"دیکھتے ہیں۔" موڈی نے اپنا انسانی چہرے جیسا ماسک نکال کر دیکھا اور بولا۔ "یہ بالکل کارٹون لگ رہا ہے۔"

"اس لیے تم پر بہت جچے گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا اور پھر بوکھلا گیا۔ ہمارے پاس اس قسم کے ماسک تھے جنہیں جب تک غور سے نہ دیکھا جائے، ان کے ماسک ہونے... کا پتا نہیں چلتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ اسٹور میں داخل ہوتے یا فرار ہوتے وقت کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ پھر اس سے ہماری شناخت بھی چھپ جاتی۔ جب موڈی نے مجھے گھورا تو میں نے بوکھلا کر کہا۔ "یہ رش کب ختم ہوگا؟"

رش کوئی ایک گھنٹے بعد جا کر ختم ہوا اور اسٹور میں اب نصف درجن گاہک رہ گئے تھے۔ ہمارا تجربہ تھا جن اسٹورز میں کچھ گاہک ہوں تو ان کے مالکان کم مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ کسی گاہک کو جانی نقصان کا مطلب ان کی مکمل تباہی ہو سکتا ہے۔ گاہکوں کی موجودگی میں وہ ممکنہ حد تک تعاون کرتے ہیں۔ میں نے ماسک پہنا اور کار اسٹارٹ کی۔ سڑک پار کر کے میں نے کار عین اسٹور کے سامنے روکی تاکہ فرار میں وقت نہ ہو۔ ہم کار سے اتر کر دوڑتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے تو سب پہلے ہی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ موڈی نے ایک ہوائی فائر کیا اور پاس کھڑی ایک لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی گن اس کی پشت پر رکھ دی اور دہاڑا۔

"خبردار... کوئی حرکت نہ کرے ورنہ یہ لڑکی ماری جائے گی۔"

لڑکی نے اپنی وفات کا سن کر قبل از وقت ہی رونا شروع کر دیا۔ میں نے لپک کر کاؤنٹر پر موجود لڑکی پر گن تان لی۔ ایک تھیلا اس کی طرف پھینکا اور پیار سے بولا۔

"سارا کیش نکال کر اس میں ڈال دو بچی۔"

لڑکی نے کانپتے ہاتھوں سے رقم نکال کر تھیلے میں بھرنا شروع کر دی۔ موڈی اس دوران میں سب کو فرش پر اوندھے منہ لٹا رہا تھا۔ اس نے اسٹور کے مالک کو الگ کر لیا تھا اور اب اس سے چھپائی جانے والی رقم کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر وہ انکار کر رہا تھا۔ اسی دوران میں میں نے دوسری لڑکی کو بھی تھیلا دے دیا اور وہ تھر تھر کانپتے ہوئے اس میں نوٹ بھرنے لگی۔ اچانک فائر ہوا تو ان دونوں کے ساتھ میں بھی اچھل پڑا... موڈی نے اسٹور کے مالک کے پاؤں میں گولی اتار دی تھی اور وہ پاؤں پکڑ کر رو رہا تھا۔ موڈی نے اسے بتایا کہ اس بار گولی اس کے گھٹنے میں مارے گا اور وہ ساری عمر لنگڑا کر چلے گا... اگر اس کا پاؤں کٹنے سے بچ گیا تو۔

دونوں لڑکیوں نے بدحواسی میں خاصی دیر کی تھی، ان سے نوٹ گر رہے تھے اور کیش بکس کی درازیں نہیں کھل رہی تھیں۔ ایک تو فائر کی آواز پر نیم بے ہوش ہو گئی۔ بہ مشکل انہوں نے تھیلوں میں نوٹ ڈالے۔ میں نے خود کاؤنٹر کے دوسری طرف جا کر دیکھ لیا تھا، اب کیش بکس میں رقم نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں اسٹور کا مالک خفیہ جگہ چھپائی رقم دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاؤں میں گولی لگی تھی اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میرے پاس تھیلوں میں کوئی بیس ہزار ڈالرز کے قریب رقم آ گئی تھی۔ میں نے موڈی سے کہا۔

"لعنت بھیجو اور نکلو یہاں سے۔"

"نہیں، اس کمینے نے خاصی رقم چھپا رکھی ہے۔ میں وہ لے کر جاؤں گا۔"

ہمیں اسٹور میں داخل ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور یہ خاصا وقت تھا۔ اگر پولیس کو اطلاع مل چکی تھی تو وہ کسی وقت بھی آ سکتی تھی۔ اطلاع کوئی بھی دے سکتا تھا۔ یہاں کسی الارم کا خفیہ بٹن بھی ہو سکتا تھا یا پھر کوئی صورتِ حال دیکھ کر پولیس کو کال کر سکتا تھا۔ موڈی جو کل تک سخت احتیاط کے موڈ میں تھا، اس وقت ساری احتیاط بھول کر لالچ میں دیر کر رہا تھا۔ اسٹور کا مالک شاید جان بوجھ کر آرام آرام سے جا رہا تھا اور میں بار بار موڈی کو جلد نکلنے کو کہہ رہا تھا۔ کیش کاؤنٹر والی لڑکیاں اور دوسرے ملازم بھی اب گاہکوں کے ساتھ فرش پر اوندھے منہ پڑے تھے۔ خدا خدا کر کے اسٹور کا مالک خفیہ تجوری تک پہنچا اور اس نے اسے کھولا۔ موڈی نے پستول اس کے سر پر لگا رکھا تھا تاکہ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو اس کی کھوپڑی اڑا دے۔ لیکن اس نے شرافت سے تجوری میں موجود باقی ماندہ رقم نکال کر ہمارے حوالے کر دی اور یہ واقعی خاصی بڑی رقم تھی۔ ہم خوش ہو گئے۔ موڈی نے اسٹور کے مالک سے کہا۔

"ہمارے جانے تک آرام سے رہنا اور اس کے بعد بے شک پولیس کو کال کرتے رہنا۔"

ہم احتیاط سے باہر آئے، گاڑی میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اتنی آسانی سے اتنی بڑی رقم لے کر نکل آئے ہیں۔ پولیس کا ابھی تک دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہم اس جگہ آئے، جہاں ہم نے اپنی کار چھپا رکھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر ہم اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے لیکن اچانک ہی مجھے خیال آیا اور میں نے

موڈی سے کہا۔ "ہمیں احتیاط کے طور پر آج گھر کا رخ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"ممکن ہے پولیس احتیاطاً ہمارے گھر کا چکر لگا لے۔"

"اور اگر ہم اسے نہیں ملے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ کام ہم ہی نے کیا ہے۔" اس نے طنز کیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں کھسیا گیا۔ "لیکن یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنے ہتھیار اور رقم کہیں اور چھپا دیں تاکہ پولیس چھاپا مارے تو اسے کچھ نہ ملے۔"

موڈی نے اس بات سے اتفاق کیا اور ہم نے گھر جانے سے پہلے رقم اور ہتھیار ایک محفوظ جگہ چھپا دیے... اس جگہ کے بارے میں صرف میں اور موڈی جانتے تھے۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بارہ سال سے ایک ساتھ رہتے ہوئے ہم یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا، جب صبح سویرے پولیس نے دروازہ بجایا اور عملاً اسے توڑنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی موڈی نے دروازہ کھولا تو وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ انہوں نے وارنٹ لانے کا تکلف نہیں کیا تھا کیونکہ ہم مستند جرائم پیشہ تھے اس لیے ایسے مواقع پر ہم بھی وارنٹ نہیں مانگتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے ہمارے ایک کمرے اور ایک باتھ روم کے ٹھکانے کی تلاشی لی۔ یہاں چھپانے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ اگر رقم اور اسلحہ ہمارے پاس ہوتا تو ایک منٹ میں ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ چکی ہوتیں۔ میں نے اور موڈی نے سکون کا سانس لیا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن یہ ہماری غلط فہمی تھی کہ پولیس محض شک کی وجہ سے آئی تھی۔ تلاشی کا کام مکمل کرنے کے بعد پولیس والے ہمیں نیچے لائے اور گاڑی میں بٹھا کر پولیس ہیڈ کوارٹر لے آئے جہاں موقع پاتے ہی میں نے موڈی کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ کیا چکر ہے... ہمیں پکڑ کر کیوں لائے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا؟" وہ بھی پریشان تھا۔ "شاید ہم سے کہیں غلطی ہوئی ہے۔"

کچھ دیر بعد پولیس والوں نے ہمیں الگ الگ کر کے پوچھ گچھ کی۔ اس کے لیے ہم پہلے سے تیار تھے اس لیے طے شدہ بیان دیا کہ کل شام کو ہم ایک بار میں بیٹھے رہے تھے جہاں بہت ہجوم ہوتا ہے اور پھر رات گئے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد گھر... آ کر سو گئے تھے۔ پھر صبح سویرے پولیس نے اٹھا دیا۔ مجھ سے سوال کرنے والے پولیس افسر نے مسکرا کر کہا۔

"یہ کہانی تم جیوری کے سامنے کرنا، یہ بتاؤ کہ کل پھر اسٹور میں ڈاکا مارتے وقت تم لوگوں نے جو کار استعمال کی تھی، اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے تھے؟"

یہ سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے کیونکہ ہم نے واقعی اس چیز کا خیال نہیں رکھا تھا اور پولیس کو ثبوت مل گیا تھا۔ لیکن اسے لوٹ کی رقم اور اسلحہ نہیں ملا تھا۔ اسی طرح اسٹور کے مالک اور دوسرے افراد نے جو اس وقت اسٹور میں موجود تھے، ہمیں حتمی طور پر شناخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم نے ماسک اور کپڑے تک وہیں چھپا دیے تھے جہاں رقم تھی۔ سرکاری وکیل ہم پر اسٹور میں ڈکیتی کا الزام ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود کار چوری اور ڈکیتی کے مضبوط شبہے میں جیوری نے ہمیں مجرم قرار دے دیا اور جج نے ہمیں بالترتیب دو اور سوا دو سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ سوا دو سال کی سزا مجھے ہوئی تھی کیونکہ چوری کی کار کے اسٹیئرنگ پر میری انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ ہمیں جیل میں ایک ہی وارڈ اور ایک ہی کوٹھری میں جگہ ملی تھی اس لیے ہم خوش بھی تھے اور کبھی کبھی ہمارے درمیان لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔

اتنے طویل عرصے کے لیے جیل جانے کا ہمارے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ اس سے پہلے میں دو بار چند مہینے کے لیے اور موڈی ایک بار چھ مہینے کے لیے جیل جا چکا تھا۔ شروع میں وقت بڑی مشکل سے کٹا لیکن آخر میں ہم عادی ہو گئے۔ جیل میں موڈی کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا اس لیے وہ مجھ سے اور دوسرے قیدیوں سے اپنے پسندیدہ موضوع پر بات کرتا تھا کہ مجرموں کو بھی جرم کی آزادی ہونی چاہیے لیکن اس سے مجرم بھی متفق نہیں تھے۔ اکثر کا کہنا تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ انسانوں کی اتنی طویل تاریخ میں کسی ایک معاشرے میں بھی جرم کرنے کی قانونی اجازت نہیں رہی ہے اور بعض کا کہنا تھا کہ اگر جرم کرنے کی آزادی دے دی جائے تو جرم کرنے کا سارا مزہ ہی ختم ہو جائے گا۔

جیل میں ہمارا چال چلن درست تھا اس لیے ہمیں وقت سے پہلے رہائی مل گئی۔ پہلے موڈی انیس مہینے کی سزا کاٹ کر رہا ہوا اور اس کے تین مہینے بعد میں بھی جیل سے نکل آیا کیونکہ رہا ہونے کے بعد موڈی ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا اس لیے میرے دل میں خدشہ تھا کہ کہیں وہ الگ تو نہیں ہو گیا ہے۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ وہ

digestpk.blogspot.com

میرا حصہ رکھے گا اور جب میں رہا ہو جاؤں گا تو میرے حوالے کر دے گا۔ لیکن خلافِ توقع وہ جیل سے باہر میرا منتظر تھا اور ان تین مہینوں میں اس نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ اس کے سر پر لمبے بال لہرا رہے تھے اور اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی تھی۔ اس کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے رشک سے اسے دیکھا۔

"لگتا ہے تم مزے کر رہے ہو؟"

"مزے۔" وہ ہنسا۔ "نہیں یار! مزے تو اب کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے اس منحوس ملک سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے جہاں آدمی کو جرم کرنے کی آزادی بھی نہیں ہے۔"

میں چونک گیا۔ "کیا تم نے کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی ہے جہاں جرم کی آزادی ہے؟"

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لو اور وہاں جانے سے پہلے صحت بنا لو۔" اس نے میرا جائزہ لیا۔ "جیل میں رہ کر تم خاصے کمزور ہو گئے ہو۔"

"ہاں، تمہارے جانے کے بعد کسی چیز میں مزہ نہیں آتا تھا۔" میں نے آہ بھری۔ "تم نے کون سی جگہ دریافت کی ہے؟"

"لگتا ہے تمہیں کچھ زیادہ ہی تجسس ہو رہا ہے۔" اس نے کہا اور اپنی کار کی طرف آیا۔ اس نے پندرہ سال پرانی کیڈی لاک لے لی تھی لیکن یہ کار آج بھی روزِ اوّل کی طرح مضبوط تھی۔ ہم کار میں آئے تو موڈی نے ڈیش بورڈ کے خانے سے شمالی امریکا کا نقشہ نکال کر میرے سامنے کیا اور ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ "یہ دیکھ رہے ہو... مونیٹرے نامی شہر؟"

"ہاں لیکن یہ میکسیکو میں ہے۔"

"یہی تو اس کی خاص بات ہے۔" موڈی نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ "یہ اس خطے کا واحد شہر ہے جہاں مجرموں کو سب کر گزرنے کی آزادی ہے۔"

"قانونی آزادی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں، قانونی تو نہیں ہے۔" موڈی ہچکچایا۔ "لیکن تم اسے قانونی ہی سمجھو کیونکہ یہاں پولیس یا قانون مجرموں کے معاملے میں قطعی مداخلت نہیں کرتے۔"

میں اب تک شک میں تھا۔ "چاہے وہ کچھ بھی کرتے رہیں؟"

"تقریباً۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے وہاں جانے کا فیصلہ اور انتظام کر لیا ہے۔"

"مجھ سے پوچھے بغیر؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "جبکہ ہم دونوں پارٹنر ہیں۔"

"ہاں، تم سے پوچھے بغیر کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔ میرے دوست! وہاں ہم چند سالوں میں کروڑ پتی بن جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس شہر کے آس پاس سونے اور چاندی کی کانیں ہیں اور ان کی وجہ سے وہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ وہاں بے شمار امرا ہیں اور بہت سارے بینک ہیں۔ اکثر دولت غیر قانونی ہے اس لیے کیش کی صورت میں رہتی ہے۔"

"تو ہم دو اجنبی وہاں جا کر یہ دولت لوٹ لیں گے؟" موڈی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ "نہیں، وہاں ہم اکیلے نہیں ہوں گے۔ تمہیں یاد ہے، جیل میں ایک میکسیکن البرٹو بھی تھا؟"

"ہاں، یاد ہے۔"

"اس نے مجھے اس شہر کے بارے میں بتایا تھا۔ وہاں اس کا مضبوط گروہ ہے اور اس نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی تھی۔ جیل سے باہر آنے کے بعد میں نے اس سے رابطہ کیا اور پھر اس کی دعوت پر مونیٹرے بھی ہو آیا۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مجرموں کو کس قدر آزادی حاصل ہے۔ وہاں کتنی دولت ہے اور اسے لوٹنے کی کتنی آزادی ہے۔"

"لیکن اس صورت میں وہاں لازمی بہت زیادہ قتل و غارت گری ہوتی ہوگی۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہوگی، وہ اس کی حفاظت کا بھی پورا انتظام کرتے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے لیکن اس میں فکر کی زیادہ بات نہیں ہے۔ اصل اہمیت اس چیز کی ہے کہ وہاں ہمیں پولیس سے کوئی خطرہ نہیں ہے... نہ قانون ہمیں سزا دے گا۔"

مجھے موڈی کی بات پر شبہ تھا۔ میکسیکو ایک ایسا ملک تھا جہاں جرائم کی بھرمار تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں کسی جگہ اتنی زیادہ لاقانونیت ہو۔ مگر موڈی کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ خود سب دیکھ کر آیا تھا جو مجھے بتا رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنے سے پہلے میں نے کہا۔ "میرا حصہ کہاں ہے؟"

اس نے اپنے کوٹ سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "کل رقم ستتر ہزار سات سو دس ڈالرز تھی۔ اس میں تمہارا حصہ چالیس فی صد کے حساب سے تیس ہزار آٹھ سو چار ڈالرز بنتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔"

میں نے رقم دیکھے بغیر رکھ لی۔ مجھے یقین تھا کہ لفافے میں اتنی ہی رقم ہوگی۔ باس ہونے کی وجہ سے موڈی ساٹھ فی صد لیتا تھا۔ موڈی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "شون! صرف چند سال کی بات ہے، ہم اتنی دولت کما لیں گے کہ پھر کچھ کیے بغیر آرام سے زندگی گزار سکتے ہیں۔"

"موڈی! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اگر وہاں اتنی ہی لاقانونیت ہے تو ہم دوسروں سے اپنا بچاؤ کیسے کریں گے؟"

"طاقت کے ذریعے۔" اس نے جواب دیا۔ "دیکھو، دولت سے طاقت حاصل کی جا سکتی ہے اور طاقت سے اپنا بچاؤ ممکن ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ موڈی نے مجھے سوچ میں دیکھا تو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب میں کسی بات پر سوچ میں پڑ جاؤں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ میں مان سکتا ہوں۔ وہ پہلے بھی اس چیز سے فائدہ اٹھاتا رہا تھا اور اس بار بھی کامیاب رہا۔ ایک بہترین قسم کے ریستوران میں لنچ کرتے ہوئے اس نے مجھے قائل کر لیا کہ مجھے ایک بار چل کر ضرور دیکھنا چاہیے۔ مونیٹرے میں بے شمار دولت ہے، بس اسے حاصل کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے اور وہ ہم میں تھا۔ جب میں مان گیا تو اس نے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم مان جاؤ گے اس لیے میں نے مونیٹرے میں ایک ایسا اپارٹمنٹ حاصل کر لیا ہے جہاں ہم دونوں آرام سے رہ سکیں... اور یہ اس کوٹھری کے مقابلے میں محل ہے جہاں اب تک ہم زندگی گزارتے آئے ہیں۔"

"کیا وہ مہنگا نہیں پڑا ہوگا؟"

"بالکل نہیں... امریکی حساب سے تو وہاں مہنگائی نام کی چیز ہی نہیں ہے۔ گھر، گاڑیاں اور عورتیں اتنی سستی ہیں کہ سمجھ لو مفت میں مل رہی ہیں۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔ "ایک بار چل کر مزے کر لو تو کبھی واپس آنے کا سوچو گے بھی نہیں۔"

موڈی غیر قانونی طریقے سے سرحد عبور کر کے میکسیکو گیا تھا۔ یعنی اس کا میکسیکو میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اس کا یہ فائدہ ہے کہ وہاں سے کما کر ہم یہاں واپس آ کر مزے سے عیش کر سکتے ہیں۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ مزے بھی وہاں زیادہ ہیں؟"

"ہاں، وہ تو ہیں لیکن امریکا کی بات الگ ہے۔" اس نے کھسیا کر جواب دیا۔

موڈی اور میں نے اس کی کار میں سرحد تک کا سفر کیا تھا۔ وہاں موڈی نے کار ایک شخص کے حوالے کر دی جو اس کی واپسی تک کار کی دیکھ بھال کا پابند تھا۔ اس کے بعد ہم نے پیدل سفر شروع کیا اور بالآخر ایک سرنگ کے ذریعے میکسیکو میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک آدمی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ مجھے سرنگ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ کیا دونوں طرف کے سرحدی حکام کو اس سرنگ کا علم نہیں تھا؟ بعد میں موڈی نے مجھے بتایا کہ سرنگ کا مالک اس کو استعمال کرنے کے عوض خاصی بھاری فیس وصول کرتا ہے۔ استقبال کے لیے آنے والا آدمی ہمیں گاڑی میں بٹھا کر مونیٹرے لے آیا۔ یہ چھوٹا شہر سرحد سے صرف سو کلومیٹر دور ہے اور دیکھنے میں صحرائی شہر لگتا ہے لیکن اندر سے یہ خاصا جدید اور عالی شان قسم کا ہے جس میں بے شمار جدید عمارتیں بنی ہیں۔ یہاں امرا نے شان دار مکانات بنا رکھے ہیں۔ موڈی نے مجھے بتایا کہ ان میں سے اکثر کا ذریعہ معاش غیر قانونی ہے۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ شہر کی کون کون سے بڑی عمارتیں کس مجرم کی ملکیت ہیں اور کون سے علاقے کن جرائم پیشہ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کی باتیں سن کر میں پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"کیا یہاں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو جرائم پیشہ افراد کی ملکیت نہ ہو یا ان کے اثر سے باہر ہو؟"

موڈی نے قہقہہ مارا۔ "کوئی نہیں ہے، یہاں ہر شے اور ہر انسان جرم کی دسترس میں ہے۔"

موڈی کا اپارٹمنٹ واقعی خاصا شان دار تھا۔ اس میں دو بڑے بیڈ روم تھے جن میں ٹی وی اور فریج سمیت ہر سہولت تھی۔ فریج میں اتنی اقسام کی شرابیں تھیں جو اس سے پہلے میں نے صرف بارز میں دیکھی تھیں۔ وہاں ایک عدد قیامت خیز میکسیکن حسینہ بھی موجود تھی۔ موڈی نے مجھے بتا کر حیران کر دیا کہ وہ خادمہ ہے جبکہ وہ اس قابل تھی کہ اسے دل کی رانی بنا کر رکھا جاتا۔ موڈی نے کہا۔

"یہ دل کی رانی بھی ہے لیکن اسی تنخواہ میں گھر کا کام بھی کرتی ہے۔ فکر مت کرو، جلد تمہارے لیے بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مستقل ملازمہ کا قائل نہیں ہوں۔"

موڈی نے چند دن میں مجھے پورا شہر دکھا دیا۔ اگرچہ

digestpk.blogspot.com

جیسا کہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس شہر میں جرم کرنے کی پوری آزادی ہے لیکن یہ آزادی اتنی زیادہ بھی نہیں تھی۔ وہاں پولیس اور عدالتیں تھیں مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ جرائم پیشہ گروہوں کے معاملات میں ایک حد سے زیادہ مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ البتہ جرائم پیشہ گروہوں کو جس کام کی کھلی آزادی تھی، وہ آپس میں محاذ آرائی تھی۔ اس میں انتظامیہ کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی، چاہے ان میں تصادم اس کی ناک تلے کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ہاں، اس تصادم میں کسی عام شہری کو نقصان ہوتا تو انتظامیہ حرکت میں آجاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایسے جرائم سے بھی صرفِ نظر کیا جاتا تھا جس میں عام افراد کا نقصان نہ ہو... جیسے بینکوں اور شاپنگ سینٹرز میں ڈاکا زنی وغیرہ۔

میرا خیال تھا کہ موڈی مجھے ایسے ہی یہاں نہیں لایا ہے بلکہ اس کے پس پشت کوئی خاص مقصد ہے جو اس نے ابھی تک مجھے بتایا نہیں ہے۔ کئی دن تک وہ مجھے شہر کی قابلِ دید جگہیں دکھاتا رہا۔ یہاں شاندار قسم کے نائٹ کلب بھی تھے اور بارز بھی۔ یہ جگہ سمندر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک دن میں اور موڈی ساحلِ سمندر کی سیر بھی کر آئے۔ یہ ساحل معیار میں کسی طرح امریکن ساحلوں سے کم نہیں تھا اور یہاں مہنگائی کا وہ طوفان بھی نہیں جو امریکا میں نظر آتا ہے۔ سہولتوں اور تفریحات کی فراہمی کے نام پر لوگوں کی کھال کھینچی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے موڈی کا دعویٰ درست ثابت ہوا تھا کہ یہاں چیزیں بہت سستی ہیں۔

ایک دن موڈی نے مجھ سے صبح سویرے چلنے کو کہا۔ حالانکہ وہ رات کو ملازمہ کے ساتھ دیر تک مصروف رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ صبح دیر سے اٹھے گا لیکن اس نے مجھے اٹھا دیا تھا۔ ”جلدی کرو، ایک جگہ چلنا ہے اور تمہیں ایک چیز دکھانی ہے۔“

”ناشتا؟“

”وہ باہر کریں گے۔“ اس نے عجلت میں کہا اور تیار ہونے چلا گیا۔ دس منٹ بعد ہم تیار ہو کر نیچے آئے اور موڈی کی نئے ماڈل کی کرائسلر کار میں روانہ ہوئے۔ موڈی نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ اس نے یہ کار کہاں سے لی کیونکہ اس کی قیمت تیس ہزار امریکی ڈالرز سے کسی طرح کم نہیں تھی اور اس کا حصہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ یوں بے دھوک اتنی قیمتی کار خرید لیتا۔ یقیناً اس کا ذریعۂ آمدنی کچھ اور بھی رہا تھا۔ پہلے ہم نے ایک ریستوران میں ناشتا کیا۔ وہاں موڈی نے کسی موضوع پر بات کرنے سے گریز کیا۔ جب ہم ناشتا کر کے دوبارہ روانہ ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ”اب زیادہ سسپنس مت پھیلاؤ، مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”بس کچھ دور ہے بلکہ یہ لو... ہم پہنچ گئے۔“ موڈی نے کار ایک پیزا شاپ کے سامنے روکی جہاں ابھی سناٹا تھا۔ اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے پیزا شاپ کی مخالف سمت میں بینک کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ بینک دیکھ رہے ہو؟“

”بالکل دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اسے لوٹنا ہے؟“ یہ بات میں نے مذاق میں کہی تھی کیونکہ باہر سے پتا چل رہا تھا کہ بینک کے حفاظتی انتظامات خاصے سخت ہیں۔ سامنے ہی دو مسلح گارڈز اپنی خودکار رائفلوں کے ساتھ چوکنا کھڑے تھے۔ اندر یقیناً اس سے زیادہ ہی گارڈز ہوتے۔

”ہاں، اسے لوٹنا ہے۔“ موڈی نے جب یہ کہا تو میں اچھل پڑا۔

”تمہارا دماغ درست ہے، یہاں حفاظتی انتظامات دیکھ رہے ہو؟ ہم دو تو اندر بھی نہیں گھس سکتے۔“

”ہم دو نہیں ہیں... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اب الپاتو کے لیے کام کرنے لگا ہوں۔ لیکن یہ منصوبہ میرا ہے۔ وہ میرا ساتھ دے گا اور جو ملے گا، اس میں سے آدھا ہمارا ہوگا۔“

یہاں آنے کے بعد میں نے اس الپاتو نامی شخص کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ ”کیا تمہیں اس پر اعتبار ہے؟“

”ہاں، وہ دھوکا کرنے والا آدمی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تو وہ مزید کتنے آدمی دے گا؟“

”الپاتو سمیت چار افراد ہوں گے۔“

”چار افراد اور ہم دو ہیں تو کیا وہ نصف پر راضی ہو گیا ہے؟“

”بالکل... میں نے کہا نا یہ منصوبہ میرا ہے۔ اس کی ساری پلاننگ میں نے کی ہے۔“

”تم نے اسی بینک کا انتخاب کیوں کیا ہے؟“

”کیونکہ یہاں زرِ مبادلہ موجود ہوتا ہے۔ ساری دنیا سے سونے کے غیر قانونی خریدار یہاں آتے ہیں اور وہ ڈالرز، پاؤنڈز اور یورو میں ادائیگی کرتے ہیں۔ یہ ساری کرنسی اسی بینک کے توسط سے آف شور بینکوں کے بے نام اکاؤنٹس میں منتقل کی جاتی ہے۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یعنی یہاں لاکھوں کی رقم موجود ہوتی ہے؟“

”لاکھوں نہیں کروڑوں کی بات کرو۔“ موڈی کی باچھیں کھل گئیں۔ ”ہم نے کام کر لیا تو پھر کسی اور کام کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہم خود اپنا گروہ بنا کر مزے سے رہیں گے۔“

مجھے موڈی کی باتوں میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی نظر آ رہی تھی۔ اگر اس بینک میں ڈاکا مارنا اتنا ہی آسان تھا تو یہ اب تک لٹنے سے کیسے بچا ہوا تھا؟ یہ بات میں نے موڈی سے کہی تو وہ بولا۔ ”کیونکہ اس سے پہلے کسی نے ایسا پلان بھی نہیں بنایا ہوگا جو میں نے بنایا ہے۔“

”اور وہ پلان کیا ہے؟“

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے ہم چل کر بینک کا اندر سے معائنہ کرتے ہیں۔“ وہ کار سے اترتے ہوئے بولا۔

”یہ ہمیں اندر جانے دیں گے؟“ میں نے گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کوئی عام بینک نہیں ہے جہاں ہر کوئی جا سکے۔“

”ہم جا سکتے ہیں۔“ اس نے آنکھ ماری۔ ”کیونکہ مجھے یہاں سے کرنسی تبدیل کرانی ہے۔“

ہم بینک تک آئے۔ ایک گارڈ نے ہمیں روک لیا۔ حالانکہ ہم دونوں شریفانہ حلیوں میں تھے۔ ”کس لیے آئے ہو؟“

”کرنسی چینج کرانی ہے۔“ موڈی نے جواب دیا۔

اس پر ہمیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ بینک اندر سے ویسا ہی تھا جیسا کہ اس قسم کے بینکوں کو ہونا چاہیے۔ وہاں اعلیٰ درجے کا ماربل لگا تھا اور جہاں ماربل نہیں تھا، وہاں برمالیک سے کام کیا ہوا تھا۔ فرنیچر اعلیٰ درجے کا تھا اور اسٹاف بہت مستعد اور مہذب تھا۔ موڈی شاید پہلے بھی یہاں آ چکا تھا اس لیے وہ کرنسی چینج والے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے منیجر کی میز پر بریف کیس رکھا اور بولا۔ ”مجھے کچھ کرنسی چینج کرانی ہے۔“

”کیوں نہیں جناب۔“ منیجر نے خوش خلقی سے کہا۔ موڈی اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں بینک کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہاں اندر بھی سخت حفاظتی انتظامات تھے۔ مجھے کم سے کم نصف درجن گارڈز نظر آ رہے تھے۔ یہ تین منزلہ عمارت پوری کی پوری بینک پر مشتمل تھی اور یہاں پر صرف پہلی منزل ہی گاہکوں کے لیے مخصوص تھی۔ انہیں اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلی منزل پر مشتمل تھی جہاں یقیناً کرنسی نہیں رکھی جاتی تھی۔ پھر میں

نہلے پہ دہلا

بیگم منتظر نے مسٹر منتظر کو دفتر میں فون کیا۔ مسٹر منتظر موجود نہیں تھے۔

کلرک نے بتایا۔ ”منتظر صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ضروری شاپنگ کے لیے گئے ہیں۔“

بیگم منتظر نے کہا۔ ”جب وہ واپس آئیں تو انہیں بتا دیں کہ ان کی اسٹینوگرافر کا فون آیا تھا۔“

چونیاں سے جویریہ کا تعاون

نے ایک لفٹ کھلتے اور اس میں سے کرنسی کی مخصوص ٹرالی باہر آتے دیکھی۔ اسے کیش کاؤنٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو عدد مسلح گارڈز موجود تھے۔ یہ نیچے موجود مسلح گارڈز کے علاوہ تھے اور اوپر سے ٹرالی کے ساتھ آئے تھے۔ کیش کاؤنٹر میں جا کر ٹرالی سے کرنسی نکالی گئی کا کام کیا جانے لگا۔ جس کرنسی کی ضرورت تھی وہ لے لی گئی اور جس کی ضرورت نہیں تھی، وہ واپس سیف میں رکھنے کے لیے ٹرالی میں بار کر دی گئی اور اسی طرح دو گارڈز کی نگرانی میں اسے واپس اوپر کی منزل کی طرف لے جایا گیا۔ اس دوران میں موڈی نے اپنا کام کر لیا تھا۔ اس نے امریکن ڈالرز کو مقامی کرنسی میں تبدیل کرایا تھا۔ میں نے باہر آ کر کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”موڈی! یہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ عام بینک نہیں ہے اور اسے لوٹنا ہمارے بس سے باہر ہے۔“

”ایسا نہیں ہے، ہم اسے لوٹ سکتے ہیں۔“

”کیسے؟ تم نے دیکھا ہوگا، کرنسی نیچے نہیں رکھی جاتی اور کسی کو اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”دوست... اتنا پریشان مت ہو۔“ موڈی نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”گھر چلو تو میں تمہیں تفصیل سے پلان بتاتا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد میں ایک مہینے تک اس پلان پر کام کرتا رہا ہوں اور میرے پاس تمام ضروری معلومات ہیں۔“

”صرف معلومات سے کام نہیں چلتا۔“

موڈی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ گھر پہنچ کر آنے کے بعد اس نے میرے سامنے ایک نقشہ پھیلایا۔ یہ بینک کی عمارت کا مکمل اور تفصیلی نقشہ تھا۔ میں نے حیرت سے

digestpk.blogspot.com

کہا۔ ”یہ تمہیں کیسے مل گیا؟“

”رقم خرچ کرنے سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”صرف یہی نہیں بلکہ میں نے بینک میں کام کرنے والے ایک آدمی سے معلومات بھی حاصل کی ہیں۔“

میں نے نقشے کا جائزہ لیا۔ اس میں سیف روم کی وضاحت بھی کی گئی۔ یہ دوسری منزل پر لفٹ کے ساتھ ہی تھا۔ اس فلور پر درمیانی درجے کے اسٹاف کے دفاتر تھے اور یہیں بینک کا حفاظتی کنٹرول سینٹر تھا۔ تیسرا فلور بینک کے اعلیٰ اسٹاف کے لیے مخصوص تھا لیکن وہاں تک جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ موڈی نے کہا۔ ”بینک میں اندر باہر گارڈز کی کل تعداد دس ہے۔ ان میں سے دو باہر ہوتے ہیں اور چھ اندر ہال میں ہوتے ہیں جبکہ دو سیف روم پر ہوتے ہیں اور وہی کرنسی کی ٹرالی کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔“

”دس محافظ۔“ میں نے فکرمندی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ بینک کے افسران بھی مسلح ہوں گے۔ کیا صرف چھ آدمیوں کے ساتھ اتنے مسلح لوگوں سے نمٹنا آسان ہوگا؟“

”ہاں ہوگا... ہم ان کو سرپرائز دیں گے تو بالکل آسان ہوگا۔“

”اور سرپرائز کیسے دیں گے؟“

اس پر موڈی نے مجھے اپنا پورا پلان بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں کہ موڈی اتنی ذہانت سے اتنے بڑے درجے کا کوئی منصوبہ بنا سکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ہم نے کبھی اتنا بڑا کام نہیں کیا تھا۔ جب اس نے بات ختم کی تو میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”موڈی! مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اتنا اچھا پلان بنا سکتے ہو۔“

اس نے ناراضی سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مم... میرا مطلب ہے تم نے کبھی اس قسم کا منصوبہ بنایا نہیں نا۔“

”تو اب بنا لیا ہے اور تم دیکھنا اس پر کامیابی سے عمل درآمد بھی ہوگا۔“

”کیا الپانو کو اس منصوبے کے بارے میں بتایا ہے؟“

”کیا تم نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے۔ اگر میں نے اسے کچھ بتا دیا تو یہ منصوبہ میرا کہاں رہے گا۔ میں آخری لمحے تک اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بعد میں ڈبل کراس نہیں کرے گا؟ ایک تو اس کے ساتھ لوگ زیادہ ہوں گے اور دوسرے وہ مقامی ہیں اور ہم باہر سے آئے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو۔ وہ ہمیں ڈبل کراس نہیں کر سکے گا۔“ موڈی نے یقین سے کہا لیکن میری پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ موڈی ایک بہت اچھے منصوبے کے ساتھ ایک اندھا قدم اٹھانے جارہا تھا۔ اول تو جرائم پیشہ لوگوں میں اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... یہاں تو ہر صورت اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے، چاہے اس کے لیے کسی کو دھوکا دینا پڑے یا کسی کی جان لینی پڑے۔ اگر ہم کامیابی سے ڈاکا مار کر واپس آ بھی جاتے تو الپانو سے نصف رقم نکلوانا بھی آسان کام نہ ہوتا۔ اس معاملے میں موڈی اتنا پُرامید کیوں تھا؟ میں یہ بات نہیں جان سکا۔ شاید اس بارے میں اس کے پاس کوئی ضمانت تھی لیکن اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

دو دن بعد موڈی اور الپانو میں ملاقات طے تھی۔ اس ملاقات میں پہلی بار میں اس سے میکسیکو میں ملا۔ جیل میں اسے متعدد بار دیکھا تھا لیکن کبھی بات نہیں ہوئی تھی اور موڈی نے مجھے بتا کر حیران کر دیا تھا کہ وہ جیل میں ہی الپانو سے دوستی بڑھا چکا تھا جبکہ میں نے اسے کبھی الپانو سے ملتے نہیں دیکھا تھا۔ الپانو ایک طویل قامت اور کھردرے نقوش والا ہسپانوی تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ساتھی بھی تھے۔ وہ موڈی سے اس کا منصوبہ جاننے کے لیے بے تاب تھا لیکن موڈی اسے ٹال رہا تھا۔ میں نے الپانو کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اس میں ذہانت برائے نام تھی اور وہ صرف طاقتور آدمی تھا۔ شاید وہ گائیڈ لائن پر بہتر عمل کر سکتا تھا۔ موڈی نے اس کا تعارف کرایا اور بولا۔

”شون تمہارا ہم نسل ہے لیکن اس کی ماں انگریز تھی اس لیے اسے ہسپانوی کا ایک لفظ نہیں آتا۔“

”میں اس کے لیے اپنی ماں کا شکرگزار ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے ہسپانوی لوگوں سے نفرت ہے۔“

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“ الپانو نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کیا تم اس کام کے لیے راضی ہو؟“

میں نے شانے اچکائے۔ ”صرف اس لیے کہ مجھے موڈی نے کہا ہے۔“

”تم دونوں برسوں پرانے ساتھی ہو۔“ الپانو کا لہجہ عجیب سا ہوگیا۔ ”اگر تم یہاں نہ آتے تو یہ پرانا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا۔ اب تم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہو گے۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات میں کوئی پیغام پوشیدہ تھا لیکن میں نے اس وقت اس پر توجہ نہیں دی۔ موڈی اس

digestpk.blogspot.com

بینک کے اندر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتا رہا تھا اور وہ اس سے بہت متاثر لگ رہے تھے۔ ان کے خیال میں اس قسم کی معلومات حاصل کر لینا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ موڈی بھی ان کا یہ انداز محسوس کر کے پھول گیا اور اس نے باس کی حیثیت سے بات کرنا شروع کر دی۔

جب ہم الپانو کے ٹھکانے سے نکلے تو میں نے موڈی سے صاف کہہ دیا۔ ”مجھے یہ شخص ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ تم نے سنی اس کی بات کہ ہم یہاں ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔ آخر اسے کیسے پتا کہ ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے؟“

”اس نے ایسے ہی کہا ہوگا۔“ موڈی نے میری تشویش پر غور کیے بغیر کہا۔ ”اب سب طے ہو گیا ہے اس لیے تم فضول خیالات ذہن سے نکال کر صرف یہ سوچو کہ ہمیں کامیابی حاصل کرنی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں کتنی رقم مل سکے گی؟“

”کم سے کم دو ملین ڈالرز... اس سے زیادہ بھی مل سکتے ہیں اور ہم ایک ملین ڈالرز میں دنیا کے کسی اور حصے میں جا کر مزے سے رہ سکتے ہیں۔“

”ایک ملین ڈالرز۔“ میں نے سیٹی بجا کر کہا۔ یہ میرے اندازے سے زیادہ بڑی رقم تھی۔ ”تمہیں یقین ہے؟“

”اتنا ہی یقین ہے جتنا یقین اپنی جیب میں موجود رقم کے بارے میں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ موڈی کے انداز نے مجھے بھی پرجوش کر دیا۔ ایک ملین ڈالرز اتنی بڑی رقم تھی کہ ہم امریکا اور میکسیکو دونوں پر لعنت بھیج کر کسی اور ملک میں جا کر آباد ہو سکتے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”منصوبے پر عمل کب کرنا ہے؟“

”کچھ سامان چاہیے اور تقریباً ایک لاکھ امریکی ڈالرز کا خرچہ بھی ہے۔ سامان اور ایک لاکھ ڈالرز الپانو نے دینے کو کہا ہے کیونکہ یہاں میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔“

میرا ذہن ایک بار پھر الپانو کی طرف چلا گیا اور مجھے اس کا انداز یاد آنے لگا۔ وہ دھوکا کر سکتا تھا۔ ایک تو ہم اجنبی تھے اور میکسیکو میں غیر قانونی طور پر مقیم تھے۔ وہ سارا الزام ہمارے سر بھی ڈال سکتا تھا اور آرام سے نکل جاتا۔ وہ ہمیں رقم چھپا کر مار بھی سکتا تھا۔ دو افراد پانچ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک بار ہم کامیابی سے ڈاکا مار کر وہاں سے نکل آتے تو ان کے رحم و کرم پر ہوتے۔ میں نے سوچا اور ایک بار پھر موڈی سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی لیکن اس نے مجھے ٹال دیا۔

”میں نے کہا نا... تم اس بارے میں بالکل فکر نہیں کرو۔ وہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔“

دو دن ہم آرام کرتے رہے۔ اس دوران میں موڈی نے سوائے کھل کر عیاشی کرنے کے اور کچھ نہیں کیا لیکن تیسرے دن وہ چاق و چوبند تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اب منصوبے پر عمل کا وقت آ گیا ہے۔ الپانو نے سامان منگوا لیا ہے اور رقم کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔“

”سامان کیا ہے؟“

”ہم وہیں چل رہے ہیں، تم دیکھ لینا۔“ اس نے کہا۔

الپانو موٹیرے سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی سی سفید عمارت میں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے اس بار بھی دو افراد دیکھے۔ اس نے موڈی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”سامان آ گیا ہے۔“

سامان ایک کمرے میں رکھا تھا۔ اس میں چھوٹے ساخت کی جدید ترین رائفلیں، بے ہوش کرنے والے گیس کے کین، گیس ماسک، جدید ترین چھوٹا سا گیس کٹر جو سخت سے سخت دھات کو بھی سیکنڈوں میں کاٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ڈرل مشین اور اس قسم کے اوزار تھے۔ یہ خاصا سامان تھا۔

پھر الپانو نے ایک چھوٹا سا بریف کیس موڈی کی طرف بڑھایا اور جب اس نے اسے لینے کی کوشش کی تو الپانو نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اس نے کہا۔ ”یاد رکھنا... میں دھوکا کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔“

”یہی الفاظ میری طرف سے سمجھ لو۔“ موڈی نے سرد لہجے میں جواب دیا اور بریف کیس اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”میں دو دن بعد آؤں گا، اپنے آدمیوں سے کہو کہ ان اوزاروں کے استعمال پر مکمل عبور حاصل کر لیں۔ وہاں سیکنڈ کا مطلب جان بھی ہو سکتا ہے۔“

میں اور موڈی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ موڈی نے ایک مارکیٹ سے کچھ مخصوص وضع کے لباس خریدے۔ اس کے ساتھ اس نے سوٹ کیس اور ایسے سامان کی اعلیٰ اشیا کی دل کھول کر خریداری کی جو آدمی سفر کے دوران میں استعمال کرتا ہے۔ اب میں کسی حد تک اس کا منصوبہ سمجھ رہا تھا۔ سارا سامان لے کر اس نے گھر کا رخ کیا۔ سامان میں کچھ حلیہ بدلنے والی اشیا بھی شامل تھیں۔ میں نے اس سے راستے میں پوچھا۔

”ہم حلیہ بدل کر چلیں گے؟“

”بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ میرے منصوبے کا اصل حصہ ہے۔“

☆☆☆

بینک بند ہونے میں چند منٹ باقی تھے کہ اس کے سامنے ایک شاندار لمبی لیموزین کار رکی اور اس میں سے تین شیخ... شیخ نظر آنے والے افراد، ایک مقامی اسپینش نوجوان اور ان کے دو مسلح وردی پوش محافظ اترے جنہوں نے سرکاری ایلیٹ فورس کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ... شیخ سرکاری مہمان ہیں جن کی حفاظت کے لیے سرکاری گارڈز مہیا کیے گئے تھے۔ مسلح افراد کے اترنے پر بینک کے گارڈز چوکنا ہوئے لیکن جب انہوں نے ایلیٹ فورس کی وردی دیکھی تو پرسکون ہو گئے۔ ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے مہذب لہجے میں کہا۔

”اگر آپ بینک آئے ہیں تو میں بتا دوں اندر کسی مسلح شخص کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

شیخوں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھ اسپینش نوجوان کی طرف دیکھا تو اس نے عربی میں ان کو بتایا کہ گارڈز کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک شیخ نے سر ہلا کر کچھ کہا۔ نوجوان نے ترجمہ پیش کیا۔ ”شیخ کہہ رہے ہیں کہ یہ گارڈز باہر رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے، یہ یہاں رک سکتے ہیں۔“

تینوں شیخ نوجوان ترجمان کے ساتھ اندر داخل ہوئے... ان کی لیموزین کار ڈرائیور نے بینک کے دروازے سے ذرا دور روک دی تھی۔ شیخ بینک منیجر کے شیشے کے کمرے کی طرف بڑھے تو... وہ خود باہر نکل آیا۔ اس نے تپاک سے استقبال کیا اور انہیں اندر لے گیا۔ ان کا حلیہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ بینک کے لیے بڑی اسامی تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، ایک شیخ نے چوغے کے نیچے سے چھوٹی سی مشین گن نکال لی۔ منیجر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ اپنی میز سے دور تھا اس لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

”ہلنا مت۔“ شیخ نظر آنے والے شخص نے صاف اسپینش میں کہا۔ وہ موڈی تھا۔ ہم نے بڑی محنت اور ریہرسل کے بعد یہ حلیہ اپنایا تھا۔ الپانو اور اس کے نوجوان ساتھی نے تیزی سے گیس کے کین بم بیک وقت ہال میں اچھال دیے اور سب نے گیس ماسک پہن لیے۔ ایک ماسک انہوں نے منیجر کو بھی پہنا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہال میں موجود افراد صورت حال کو سمجھتے، گیس نے ان پر اثر کرنا شروع کر دیا اور وہ ایک ایک کر کے گرتے چلے گئے۔ باہر موجود الپانو کے آدمیوں نے اندر کی صورت حال دیکھتے ہی دونوں محافظوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ پھر ان کے ہتھیار چھین لیے اور خود گیس ماسک پہن کر انہیں اندر لے آئے۔ اندر آتے ہی گیس نے ان پر بھی اثر کیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کو ایک طرف ڈال کر انہوں نے دروازے کے شیشے سے ڈرائیور کو اشارہ کیا تو وہ لیموزین سے بڑے سائز کے بیگ اتار کر بینک کے دروازے پر لے آیا۔ دونوں نے یہ بیگ اٹھائے اور اندر کی طرف بڑھے۔ اس دوران میں ہال میں موجود ہر فرد بے ہوش ہو گیا تھا۔ موڈی نے منیجر سے کہا۔

”ہمیں اوپر سیف روم تک لے چلو۔“

”وہ بند ہو گیا ہے اور اب کل صبح سے پہلے کوئی اسے نہیں کھول سکتا۔“ منیجر نے کہا۔

”ہمیں معلوم ہے۔“ موڈی بولا۔ ”تم اس کی فکر مت کرو کہ ہم اسے کیسے کھولیں گے۔“

الپانو کے ایک آدمی کو چھوڑ کر ہم سب اوپر آ گئے اور اوپر کی دونوں منزلوں پر بھی گیس بم پھینک دیے۔ اب یہاں موجود کسی فرد کا ہوش میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ الپانو نے منیجر سے کہا۔ ”پولیس کو [illegible] کیا جا چکا ہوگا، وہ کتنی دیر میں آ سکے گی؟“

”تقریباً نصف گھنٹے میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کام شروع کر دو۔“ موڈی نے حکم دیا۔ گیس کٹر لانے والوں نے پھرتی سے اسے بیگ سے نکالا اور اس کی مدد سے سیف روم کا دروازہ کاٹنے لگے۔ یہ کوئی چھ انچ موٹی اسٹیل کی چادر سے بنا ہوا تھا اور اس میں سوراخ کرنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگ جاتے۔ ہم سب بے تابی سے دروازے میں سوراخ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ آکسی ٹیلین کا بے حد گرم شعلہ آہنی چادر کو کاٹ رہا تھا لیکن اس کی رفتار سست تھی۔ موڈی کی نظر اپنی گھڑی پر مرکوز تھی۔ نصف گھنٹا پورا ہونے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا ورنہ پولیس آ جاتی تو ہمیں بلاوجہ اس سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا۔

”پندرہ منٹ ہو گئے ہیں۔“

”بس ایک منٹ کا کام باقی ہے۔“ گیس کٹر استعمال کرنے والے نے کہا۔ ”کام مکمل ہو گیا ہے۔“

اس کے الفاظ کے ساتھ ہی کٹ جانے والا حصہ ایک دھماکے سے اندر جا گرا اور فوراً ہی دروازے کے دہکتے حصے پر پیرو گیس کا اسپرے کر کے اسے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ الپانو کے ساتھی نے سوراخ میں سے ایک آلہ اندر ڈالا اور اسکرین پر اندر کی ویڈیو دیکھتے ہوئے ایک آنکڑے کی مدد سے [illegible] کر دروازہ کھول دیا۔ اندر سے یہ ایسے ہی کھل جاتا تھا۔ لازمی بات ہے، سیف روم کا الارم بھی کہیں بج رہا ہوگا۔

digestpk.blogspot.com

دروازہ کھلتے ہی ہم اندر گھسے۔ اسی دوران میں البانو نے منیجر کے منہ سے گیس ماسک کھینچ لیا تھا، وہ بھی بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ ویسے گیس کا اثر کم ہو رہا تھا لیکن ابھی بھی اتنا تھا کہ اس میں سانس لینے کا مطلب ہوش و حواس سے بے گانہ ہونا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے البانو کے ساتھیوں نے کلاکاری ماری اور اندر شیلف میں رکھے نوٹوں کی گڈیاں بیگوں میں بھرنا شروع کر دیں۔ گڈیوں کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ میں بھی نوٹ جمع کر رہا تھا، نوٹ جمع کرنے کے عمل میں سب ہی شامل تھے۔ موزی ساتھ ساتھ وقت کا اعلان کرتا جا رہا تھا۔ ہمیں بینک میں داخل ہوئے تین منٹ ہونے کو آئے تھے۔ پانچ منٹ میں ہم نے سو کلوگرام سے زیادہ کرنسی جمع کر لی تھی۔ دونوں بیگ بھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ سب اپنے لباس میں بھی نوٹوں کی گڈیاں بھر رہے تھے۔ خود میں نے اپنے چوغے کے نیچے موجود ٹی شرٹ میں دو تین درجن گڈیاں ڈال لی تھیں۔ وہاں اتنی زیادہ مقدار میں نوٹ تھے کہ ہم سب بھی کم پڑ گئے تھے۔ اصل کرنسی دونوں بیگوں میں جمع کی گئی تھی۔ جیسے ہی چھ منٹ پورے ہوئے موزی نے واپسی کا اشارہ کیا اور ہم سب پیچھے کی طرف لپکے۔ دونوں بیگز البانو کے آدمیوں نے اٹھا رکھے تھے۔ موزی سب سے آگے تھا۔ جیسے ہی ہم ہال میں داخل ہوئے، موزی نے اچانک ہی مڑ کر البانو کو شوٹ کر دیا۔ اس کے ساتھیوں کے ساتھ میں بھی دم بخود رہ گیا۔ البانو کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ زمین پر گرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ البانو کا ایک ساتھی چلایا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

لیکن موزی نے جواب دینے کے بجائے البانو کے گارڈز بنے والے ساتھیوں کو بھی اپنی مشین گن سے چھلنی کر دیا۔ بیگ اٹھانے والے خوف زدہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب اگلی باری ان کی ہے۔ ہال میں موجود شخص پر میں نے گن تان لی تھی اس نے شرافت سے اپنی رائفل نیچے ڈال دی۔ موزی نے کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھے اور تم سب کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر میں انہیں نہیں مارتا تو یہ ہم سب کو مار کر رقم لے کر خود نکل جاتے۔''

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو؟'' ایک آدمی بولا۔

''اگر میں جھوٹا ہوتا تو تم سب کو بھی مار دیتا لیکن میں نے صرف ان کو مارا ہے جو ہمارے دشمن تھے۔ تم لوگ اطمینان رکھو، میں تمہیں تمہارا حصہ ضرور دوں گا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' البانو کا ایک اور ساتھی بولا۔

''اگر یہ چاہتا تو ہمیں بھی مار دیتا۔''

اسی اثنا میں مجھے بینک کے دروازے کے باہر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا اور میں اس طرف لپکا۔ میں نے دیکھا کہ لیموزین کے پاس دو افراد ڈرائیور سے لپٹے ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے جسم میں کئی گولیاں اتار دیں۔ وہ نیچے گرا اور اسے مارنے والے گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ یہ کرائے کی لیموزین تھی اور اس علاقے میں قیمتی گاڑیاں چھینے کا رواج عام تھا۔ وہ ہماری گاڑی بھی چھین کر لے گئے تھے۔ میں نے مڑ کر موزی کو اطلاع دی۔ ''وہ لوگ ہماری گاڑی لے گئے ہیں۔ انہوں نے ڈرائیور کو گولی مار دی ہے۔''

''نہیں۔'' موزی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے باہر جھانکا اور چلا کر گالی دی۔ ''کمینے سالے۔''

''کمینے تو تم ہو۔'' البانو کا ایک ساتھی چلایا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میری اور موزی کی توجہ اس طرف نہیں رہی تھی اس لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے رائفل کا رخ ہماری طرف کیا تھا کہ میں دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے پورا برسٹ مارا تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ میں کس طرح بچ نکلا لیکن موزی وہیں مارا گیا۔ اسی دوران میں پولیس کا سائرن سنائی دیا، وہاں ٹھہرنا حماقت ہوتی اس لیے میں نے پولیس اور البانو کے خون کے پیاسے ساتھیوں سے جان بچانے کے لیے دوڑ لگا دی۔ صرف اس لیے بچ گیا کہ میں مونٹرے میں تھا۔ اگر میں ہیوسٹن میں ہوتا تو پولیس مجھے لازمی پکڑ لیتی۔ پھر کسی نہ کسی طرح میں میکسیکو سے بھی نکل آیا۔ وہاں سے نکلنے میں اس نے مدد دی تھی جو میں نے بینک سے اٹھائی تھی۔ موزی کے بعد البانو کے باقی ساتھی پولیس سے جھڑپ میں مارے گئے اور ڈکیتی مکمل طور پر ناکام رہی تھی۔ موزی کا خیال ثابت ہوا تھا کہ وہاں مجرموں کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔

اب میں امریکا میں ہوں اور میرا پیشہ بھی وہی ہے۔ میں یہاں خوش ہوں کیونکہ یہاں بہر حال اتنی لاقانونیت نہیں ہے کہ جرائم کرنے والے ہی لٹ جائیں۔ یہاں جب جرم کر کے بھاگنا چاہتا ہوں تو مجھے پتا ہوتا ہے کہ میری گاڑی باہر کھڑی ہوگی، کوئی اسے چرا کر نہیں لے گیا ہوگا۔ مجھے موزی کے ساتھ نہ ہونے کا افسوس ہے لیکن وہ اپنے نظریات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اس کہانی کو آپ تک پہنچانے میں تعاون کیا ہے
ZONG
سب کہہ دو

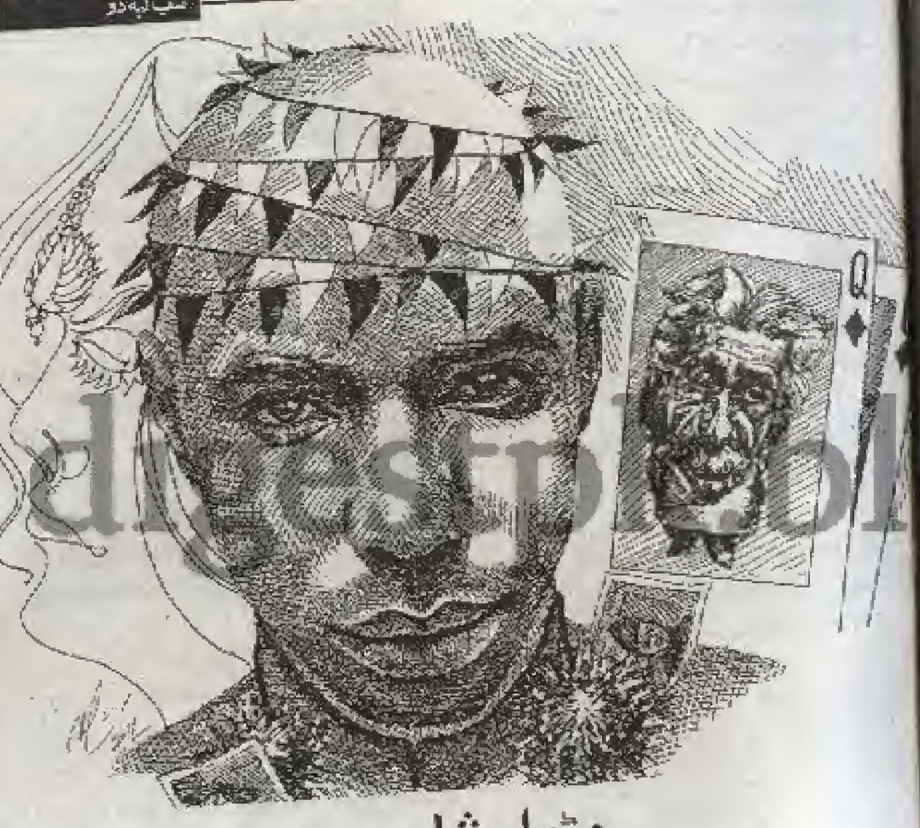

جڑواں شادی

منظر امام

ہر شخص کی زندگی میں ایک بار شادی کا موقع ضرور آتا ہے.... لیکن چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کی زندگی میں یہ خوش نصیبی کسی انوکھے انداز سے آتی ہے.... ایسے ہی ایک خوش نصیب کا دلچسپ احوال۔

لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دینے والی پر مزاح و شگفتہ تحریر

میں نے ایم بی اے کر کے ملازمت کیا کی کہ میری شامت آ گئی۔ ابا نے سامنے بٹھا کر کہا۔ ''اب اپنے باپ کا کوئی خیال ہے تجھے۔''

''کیا ہوا ابا؟ ہر وقت تمہارا ہی تو خیال رکھتا ہوں۔''

''کیا خاک خیال رکھتا ہے۔ اس گھر میں شادی تک تو ہوتی نہیں۔''

''کچھ شرم کرو ابا۔ اب کیا اس عمر میں شادی کرو گے؟''

"ابے میں اپنی نہیں، تیری شادی کی بات کر رہا ہوں۔" ابا زچ ہو کر بولے۔

"ابا ابھی تو میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ ابھی نوکری شروع کی ہے۔ اب اتنی جلدی شادی کیسے کرلوں؟"

"کیا پاگل ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھ، میں نے آٹھویں پاس ہونے کا بھی خیال نہیں کیا اور تیری اماں سے شادی کر لی تھی۔"

"وہ زمانہ اور تھا ابا۔" میں نے کہا۔ "اس زمانے میں لوگ اپنی بیٹیوں کو اسی طرح چولھے میں جھونک دیتے تھے۔"

"تیرا کیا خیال ہے کہ میں تیری ماں کے لیے چولھا بن گیا ہوں۔" ابا غرائے۔

"میں نے تو ایک مثال دی تھی ابا۔" میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"ابے وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔" ابا نے کہا۔ "کم عمری میں شادی ہوتی تھی تو باپ اور بیٹے، بھائی بھائی لگتے تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا ہوتے تھے... اور... آج یہ حال ہے کہ پچاس سال کا بندہ چھ مہینے کے بچے کو گود میں اٹھائے چلا جا رہا ہے... پتا چلا کہ اس کی پہلی اولاد ہے۔ خود سوچ... جس بندے کی پہلی اولاد ہی پچاس سال کی عمر میں ہوگی اس کی آخری اولاد کیا ڈیڑھ سو سال میں ہوگی۔ اسی لیے تو اس معاشرے میں بیوائیں زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔"

"وہ کس طرح ابا؟"

"خود دیکھ بندہ خود تو چالیس پینتالیس کا ہوتا ہے اور بیوی جوان ہوتی ہے اور جب بیوی چالیس پینتالیس کی ہوتی ہے تو بندہ بوڑھا ہو کر نکل لیتا ہے۔ رونے کے لیے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیوی رہ جاتے ہیں۔"

ابا نے ایک بہت بڑے معاشرتی مسئلے کی طرف اپنے انداز سے توجہ مبذول کرائی تھی۔

پھر ابا کی ذہنی رو بہک گئی۔ "ابے کوئی تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہو تو میرے لیے بھی دیکھ لینا۔"

"ابا تم شادی تو کرو بیوہ تو وہ ہو ہی جائے گی۔"

"ابے دس دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ پرانے لطیفے مت سنایا کر۔" ابا نے کہا۔

"ابا... اگر تم نے شادی کرلی تو اماں کا کیا ہوگا؟"

"ابے کون شادی کر رہا ہے۔ ایسی باتیں کر کے کبھی کبھی دل بہلا لیتا ہوں۔ اچھا یہ بتا پھر تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

"فیصلہ تو ہو چکا ہے ابا۔ میں وہی فرم جوائن کر رہا ہوں جس کی آفر آئی ہے۔"

"بے وقوف، میں نوکری کی نہیں، شادی کی بات کر رہا ہوں۔" ابا نے کہا۔

"ابا شادی کے لیے اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟"

"بیٹا زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔"

"خدا نہ کرے ابا، اللہ تم کو صحت مند رکھے۔ تمہارا سایا ہمارے سر پر قائم رہے۔"

"ابے میں اپنے لیے نہیں کہہ رہا تیرے لیے کہہ رہا ہوں۔ آج کل جوان جلدی جلدی جا رہے ہیں۔ دیکھتا نہیں گھر سے نکلے اور کسی گولی کا نشانہ بن گئے، بم بلاسٹ میں مارے گئے اور کچھ نہیں تو ایکسیڈنٹ ہی ہو گیا۔"

"کمال کرتے ہو ابا۔ اپنی اولاد کو موت کی دعا دے رہے ہو۔"

"دعا نہیں دے رہا بے وقوف، امکان ظاہر کر رہا ہوں۔" ابا نے کہا۔ "بس ایک ہفتے میں شادی کا فیصلہ کر لے بیٹا... ہے۔"

پتا نہیں ابا کو میری شادی میں کیا دلچسپی ہو گئی تھی حالانکہ میں ابھی پوری طرح اس موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی تو میں نے نوکری شروع کی تھی ویسے اس سلسلے میں میری پلاننگ بہت لمبی چوڑی تھی۔

نوکری کرتے ہوئے ترقی کرتا۔ اس دوران میں کسی لڑکی سے دوستی پھر محبت اس کے بعد شادی لیکن ابا ڈائریکٹ شادی کی بات کر رہے تھے جب کہ ابھی تک تو میری کسی لڑکی سے دوستی بھی نہیں ہو سکی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ بھی کرنا تھا، وہ جلدی ہی کرنا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ ایسی کون سی لڑکی تھی جو اتنی ایمرجنسی میں مجھ سے دوستی پھر محبت پھر شادی کر سکتی تھی۔

میرے دفتر میں دو لڑکیاں تھیں۔

دونوں بس گزارے لائق تھیں لیکن دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں ماڈرن قسم کی تھیں۔ ان میں ایک کا نام لیلیٰ اور دوسری کا شیریں تھا۔

ناموں کی مناسبت سے دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ ابا نے چونکہ ایمرجنسی لاگو کر دی تھی اس لیے فوری طور پر ان میں سے کسی ایک سے دوستی بہت ضروری ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے لیلیٰ سے بات کی۔ کہانیوں کی تاریخ کے مطابق پہلے نمبر پر لیلیٰ ہی تھی۔

میں نے بغیر کسی تکلف کے اس سے کہا۔ "لیلیٰ، مجھے تم سے دوستی کرنی ہے۔"

"کیوں؟"

"تاکہ دوستی کے بعد محبت کر سکوں... اس کے بعد شادی کرلوں۔"

"پوری پلاننگ کر کے بیٹھے ہو۔"

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔ یہ میری اور ابا کی شروع سے آرزو رہی ہے کہ کسی لڑکی سے دوستی پھر محبت پھر شادی کی جائے۔"

"لیکن میں بیک وقت باپ اور بیٹے کے ساتھ محبت نہیں کر سکتی۔"

"بے وقوف صرف میرے ساتھ۔ ابا کا نام تو ان کی ضد کی وجہ سے لے رہا ہوں۔"

"لیکن میرا اسٹائل کچھ اور ہے۔" لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اپنا اسٹائل بھی بتا دو۔"

"میں نہ تو دوستی کرتی ہوں نہ محبت اور نہ ہی شادی۔" اس نے بتایا۔

"کمال ہے تو پھر کیا کرتی ہو؟"

"میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور وہ ہے منگنی۔ تم مجھ سے منگنی کرلو اس سے دونوں کام نکل جائیں گے یعنی دوستی بھی اور محبت بھی۔"

"اور شادی؟"

"وہ بعد میں سوچیں گے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں منگنی کے لیے تیار ہوں۔"

"تو کل انگوٹھی لے کر آ جاؤ۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اور مجھے پہنا دینا۔"

"بھئی اس طرح کیسے ہوگا۔ گھر والوں کی شرکت بھی تو ضروری ہوتی ہے۔"

"تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو شریک کر سکتے ہو۔ میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں نے ابھی تک اپنی کسی منگنی کے بارے میں گھر والوں کو نہیں بتایا۔"

"کیا مطلب، کیا تمہاری اور منگنیاں بھی ہو چکی ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، تم سے میری ساتویں منگنی ہوگی۔" اس نے بتایا۔ "میں منگنی کے بارے میں بہت فراخ دل ہوں۔"

"تمہارے ساتھ چھ منگیتر کہاں ہیں؟"

"کہاں ہوں گے۔ وہ بھی اسی شہر میں ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور وہ سب کے سب میرے منگیتر ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو یعنی وہ سب ابھی تک منگیتر چلے آ رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی اپنا تو اسٹائل ہی یہی ہے۔" اس نے کہا۔ "اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ، کیا منگنی کے بعد دوستی ہو جائے گی؟"

"ہاں وہ تو ہوتی ہی ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "اب یہ تمہاری صلاحیت ہے کہ تم اس کے بعد محبت کرو پھر شادی کرو۔"

میں نے گھر جا کر ابا سے کہا۔ "ابا مجھے ایک قیمتی اور اچھی سی انگوٹھی چاہیے۔"

"وہ کیوں؟ کیا تیری کسی کا [illegible] جائے گا؟"

"نہیں ابا مجھے منگنی کرنی ہے۔" میں نے بتایا۔

"شادی ہوئی نہیں اور چلا ہے منگنی کرنے۔"

"ابا تمہاری جنرل نالج بہت کمزور ہے۔ منگنی شادی سے پہلے ہوتی ہے۔"

"ابے تو مجھے کیا معلوم۔ میں نے تو ڈائریکٹ شادی کرلی تھی۔" ابا نے کہا۔ "خیر یہ بتا وہ کون ہے جس سے منگنی کا ارادہ ہے؟"

میں نے لیلیٰ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ یہ ہوش ربا تفصیل سن کر ابا نے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ "ابے بے وقوف وہ اس بہانے انگوٹھیاں جمع کر کے مارکیٹ میں بیچ آتی ہے۔ تو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

"تو پھر کیا کروں ابا۔ تم ہی نے تو شادی کے لیے کہا تھا؟"

"ابے میں نے تیرے لیے انوری کا سوچ لیا ہے۔" ابا نے بتایا۔

"کون انوری...؟"

"ابے اصغری کی چھوٹی بہن۔" ابا نے بتایا۔

"ابا میں تو اصغری کو بھی نہیں جانتا۔ انوری کو کہاں سے جانوں گا۔"

"ابے نالائق کیا اپنی پھوپی حمیدہ کو بھول گیا؟"

digestpk.blogspot.com

نہیں تو ابا، انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''اب یاد آ گیا۔ انوری ان ہی کی بیٹی ہے۔''
''ہاں۔'' ابا خوش ہو گئے۔ ''اس سے تیری شادی کرنی ہے۔''
''لیکن ابا، یہ تو سوچو میں اتنا ماڈرن انسان اور وہ ایک دقیانوسی لڑکی۔ نام ہی دیکھو کیسا ہے..... انوری۔''
''ابے نام میں کیا رکھا ہے... تو چاہے تو اس کا نام روزی یا مونا رکھ لے کچھ بھی رکھ لے۔''
''ابا میں سمجھ گیا تم انگوٹھی نہیں دینا چاہتے۔''
''جس لڑکی نے یہ پٹی پڑھائی ہے، اس سے بول کر بغیر انگوٹھی کے منہ زبانی منگنی کر لے۔''
میں سمجھ گیا کہ ابا انگوٹھی نہیں دینا چاہتے اور میری تنخواہ ابھی ملی نہیں تھی پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ پھوپی حمیدہ کے یہاں جا کر انوری سے ملوں۔
یہ بات نہیں ہے کہ انوری سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ چند ایک بار ہوئی تھی لیکن میں اس انکشاف کے بعد اس کا اور دوسروں کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے میں پھوپی کے گھر پہنچ گیا۔
ردعمل بہت زبردست تھا یعنی پھوپی نے بہت کھلے دل سے میرا استقبال کیا تھا ورنہ عام طور پر مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنا لیتی تھیں۔ انوری کی بڑی بہن اصغری بھی مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھے جا رہی تھی.. انوری کے بارے میں پتا چلا کہ وہ میری آمد کی خبر سن کر کمرے میں چھپ گئی ہے۔
''پھوپی، یہ انوری کمرے میں کیوں چلی گئی ہے؟'' میں نے کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی۔
کوشش میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صرف کوشش ہی کر سکا تھا، بیٹھ نہیں پایا تھا کیونکہ اصغری نے پیچھے سے کرسی کھسکائی تھی اور میں فرش پر چت لیٹ گیا تھا۔
عجیب بے ہودگی تھی اور کمال یہ کہ نہ صرف پھوپی اور اصغری ہنس... رہی تھیں بلکہ اندر سے انوری کی ہنسی کھی کھی کی آوازیں آ رہی تھیں۔
''پھوپی یہ کیا مذاق ہے؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔
''بیٹا یہ تو ہماری پرانی روایت ہے۔'' پھوپی نے پیار سے بتایا۔ ''ہونے والی سالیاں اسی قسم کے کھیل کرتی ہیں۔ اس میں برا ماننے والی بات نہیں ہوتی۔''
''نہیں پھوپی۔'' میں اپنی خفت چھپاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے برا نہیں مانا۔''

''تو پھر نکالو سو روپے۔'' اصغری نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔
''سو روپے، وہ کس خوشی میں؟''
''بیٹے یہ خوشی کا سودا ہے۔'' پھوپی نے دخل اندازی کی۔ ''ہر مذاق پر ہونے والا دولہا سو روپے دیتا ہے۔ بیٹا نہیں تم یہ سب کیوں بھول گئے۔''
''یہ لو بھئی۔'' میں نے سو روپے کا ایک نوٹ اصغری کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
''جا بیٹی چائے بنا کر لے آ۔'' پھوپی نے کہا۔
اصغری مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پھوپی سے پوچھا۔ ''پھوپی جو کچھ میں سن رہا ہوں، کیا یہ سچ ہے؟''
''ہاں بیٹا، سچ نہیں ہوتا تو اصغری تم سے مذاق کیوں کرتی؟''
''لیکن مجھے تو کچھ نہیں معلوم...''
''یہ رشتہ خود بھائی انتقال نے دیا ہے۔'' پھوپی نے بتایا۔ ''وہ تو بہت پہلے سے کہتے تھے کہ انہیں انوری کو اپنی بہو بنا کر بہت خوشی ہوگی۔ انوری کو وہ بہت بھی بہت مانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے پچھلی سے پچھلی عید کو انہوں نے انوری کو دس روپے عیدی بھی دی تھی۔''
اصغری اتنی دیر میں چائے بنا کر لے آئی اور پہلے گھونٹ ہی نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے، کم بخت بجائے چینی کے نمک گھول کر لے آئی تھی۔
دونوں ماں بیٹی مجھے برا سا منہ بناتے دیکھ کر ہنسے جا رہی تھیں۔
''پھوپی اب یہ کیا ہے؟'' میرا تو دماغ ہی گھوم گیا۔
''بچے یہ بھی بہت پرانے مذاق کی ایک روایت ہے۔'' پھوپی نے بتایا۔ ''لڑکیاں اس طرح ہونے والے دولہا کو چھیڑتی ہیں۔''
''لاؤ نکالو سو روپے۔'' اصغری نے پھر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔
''کیا بکواس ہے پھر سو روپے دوں؟''
''اور کیا... جتنے مذاق اتنے سو روپے۔'' اصغری نے کہا۔
''پھوپی یہ بتاؤ اب کتنا مذاق رہ گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''بس بیٹے یہ آخری تھا۔ اصغری کو سو روپے دے

فارغ کرو۔''
مجبوراً سو روپے اور دینے پڑ گئے۔ عجیب بے ہودہ روایات تھیں۔ انوری بھی سامنے نہیں آئی کیونکہ وہ روایت کے مطابق مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی۔ میں بہت جھنجلایا ہوا گھر واپس آیا۔
''ابے مبارک ہو۔'' ابا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''حمیدہ کا فون آیا تھا۔ تو اس کے یہاں گیا تھا نا؟''
''ہاں ابا میں وہیں گیا تھا اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں بتا نہیں سکتا۔''
''بتا کیا ہوا ہے؟''
میں نے ساری کہانی سنا دی۔ ابا خوش ہو گئے۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں نے تجھے قبول کر لیا ہے۔ اب ایک آخری رسم رہ گئی ہے، پانی میں مرچ والی۔''
''ابا کا خوف کروا دیا ہے۔ اب وہ مجھے پانی میں مرچ بھی کھلائے گی؟'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔
''ہاں بیٹا۔ یہی سب تو وہ خوبصورت روایات ہیں جو آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہیں لیکن ہمارے خاندان نے انہیں زندہ رکھا ہوا ہے۔''
ابا کو سمجھانا بے کار تھا۔ اماں بھی ان کی ہم نوا تھیں۔ میں نے جب اماں سے بات کی تو ایک نئی کہانی سامنے آئی۔ ''بیٹا میں تیری شادی فرزانہ سے کروں گی۔''
''اور یہ فرزانہ کون ہے اماں؟''
''ارے اپنی خالہ زاد فرزانہ کو بھول گیا؟'' اماں نے غصے سے پوچھا۔
''لیکن اماں، ابا تو میری شادی انوری سے طے کر چکے ہیں۔''
''واہ یہ کیا بات ہوئی۔ جب وہ تیری شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کر سکتے ہیں تو کیا میں تیری شادی اپنی بہن کی بیٹی سے نہیں کر سکتی۔ آخر اس میں کیا برائی ہے؟''
''اماں تم دونوں مل کر مجھے کیوں برباد کرنے کے چکر میں ہو۔''
''ارے کچھ نہیں ہوتا، فرزانہ بہت اچھی ہے۔ تو تو جانتا ہے کتنی پڑھی لکھی ہے۔''
''جانتا ہوں اماں، میٹرک میں اس نے تین سال لگا دیے تھے۔''
اب اماں سے کون بحث کرتا... اماں کا یہ اصرار تھا کہ میں جا کر فرزانہ سے ملوں۔ ان کا کہنا تھا کہ اب وہ

ZONG

ایشوریا رائے جیسی ہوگئی ہے۔
میں بھی سن کر پھڑک اٹھا کیونکہ میں نے پچھلے چھ مہینوں سے فرزانہ کو نہیں دیکھا تھا، ہو سکتا تھا کہ وہ گزشتہ چھ مہینوں میں ایشوریا بن ہی گئی ہو۔
میں اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے چکر میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں بھی میرا استقبال بہت گرم جوشی سے ہوا لیکن میں دودھ کا جلا ہوا تھا اسی لیے میں نے بیٹھنے سے پہلے کرسی کو اچھی طرح پکڑ لیا۔
یہاں ویسی کوئی بات نہیں ہوئی جیسی حمیدہ پھوپی کے گھر میں ہوئی تھی۔ نہ تو میری کرسی کھینچی گئی اور نہ ہی چائے میں نمک ملایا گیا اور نہ ہی پانی میں مرچ دینے کی کوشش کی گئی۔
صرف اتنا ہوا کہ میرے جوتے چھپا دیے گئے۔ یہ شرارت فرزانہ کی چھوٹی بہن شبانہ نے کی تھی۔ ''خالہ'' میں نے خالہ کی طرف دیکھا۔ ''میرے جوتے نہیں مل رہے۔''
''بیٹا شبانہ کا بھی تو حق ہے نا۔'' خالہ نے کہا۔
''اس کا حق میرے جوتوں پر کیسے ہو گیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''بیٹا جوتا چھپائی تو ایک پیار بھری رسم ہے۔'' خالہ نے کہا۔ ''یہ تو خوشی کا سودا ہوتا ہے۔''
''لائیں پانچ سو روپے۔'' شبانہ نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔
''پانچ سو، یہ تو بہت ہیں شبانہ۔'' میں بلبلانے لگا۔ ''میرے جوتے اتنے قیمتی نہیں ہیں۔ اتوار بازار سے اسّی روپے کے لیے تھے۔''
''کچھ بھی ہو اصل قیمت تو اسی رسم کی ہے۔'' شبانہ نے کہا۔ ''کیوں اماں؟''
اور اماں نے بھی گردن ہلا دی۔ بہت تنگ ہو کر میں نے پانچ سو روپے دیے، اس کے بعد جوتے واپس ہوئے۔ میں بہت جھنجلایا ہوا اماں کے پاس پہنچ گیا۔ ''اماں کیا مذاق ہے یہ؟'' میں نے کہا۔ ''خوامخواہ میرے پانچ سو روپے خرچ ہو گئے۔ شبانہ نے میرے جوتے چھپا لیے تھے۔''
''بیٹا یہ تو پیار کا سودا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ

digestpk.blogpost.com

ان لوگوں نے تیری نئی حیثیت سے تجھے قبول کرلیا ہے۔"
اس کے بعد دونوں کے درمیان پانی پت کی چوتھی لڑائی شروع ہوگئی۔

یعنی اماں اور ابا کے درمیان۔ ابا کا یہ کہنا تھا کہ میری شادی حمیدہ کی بیٹی انوری سے ہوگی جب کہ اماں کی یہ ضد تھی کہ میری شادی رضوانہ کی بیٹی فرزانہ سے ہوگی۔ دو دن تک گھر میں یہ چکر چلتا رہا۔

ہاں میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس دوران میں دفتر والی لیلیٰ کا کیا ہوا۔ میں نے جب اس سے منگنی کرنے سے انکار کیا تو اس نے خدا کا شکر ادا کرنا شروع کردیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اچھا ہوا کہ میں نے منگنی سے انکار کردیا ورنہ خود اس کے لیے سات سات منگیتروں کو ایک ساتھ بھگتنا بہت مشکل ہو جاتا۔

میرا خیال تھا کہ ابا اور اماں کے اس چکر کے دو نتیجے نکلیں گے۔ یا تو یہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنی بار مان لے گا یا پھر دونوں ہی سے چھٹکارا مل جائے گا۔
لیکن جو تیسرا نتیجہ سامنے آیا وہ تو بہت ہی ہولناک تھا۔

ان دونوں نے مجھے سامنے بٹھا کر مجھ سے بات کی "بیٹا تیرے لیے ہم نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔" اماں مسکراتے ہوئے بولیں۔

ان کی مسکراہٹ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ان ہی کی جیت ہوئی ہوگی۔

لیکن دوسری طرف ابا بھی مسکرائے جا رہے تھے۔ "بیٹا ہم دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ تیری شادی اب ان دونوں سے ہوگی۔" ابا نے کہا۔

"کیا...!" میں اچھل پڑا۔ "کیا کہہ رہے ہو ابا۔ دونوں سے شادی...؟"

"ہاں۔" اماں نے ابا کی تائید کی۔ "پہلے دن انوری سے اور دوسرے دن فرزانہ سے۔ ولیمہ پھر تیسرے دن ہو گا۔"

"یہ کیا مذاق ہے... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"
"ساری بات ہوگئی ہے پاگل... سب راضی ہیں۔"
"لیکن مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ یہ تو کباڑا کروانے والی بات ہے۔" میں نے کہا۔
"کچھ نہیں ہوگا۔" ابا نے کہا۔ "اپنے پوری برادری اور پورے شہر میں ہمارا نام ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ تو اپنی اولاد کی ایک شادی بھی نہیں کرپاتے اور ہم دو دو کر کے بیٹھ جائیں گے۔"

"چاہے اس کے بعد اولاد کا جو بھی حشر ہو...؟"
"سب ٹھیک رہے گا۔ انوری اور فرزانہ دونوں ہی اس فیصلے سے بہت خوش ہیں۔"
"کیا ان دونوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ارے نہیں، وہ دونوں اس لیے خوش ہیں کہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ان کے نام آئیں گے۔ اخبارات میں تصویریں آئیں گی اور چینل والے ان کے انٹرویوز لیں گے۔"

"یہ خوشی تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ دونوں کیا کریں گی؟" میں نے پوچھا۔
"دیکھ یہ تیرا کام نہیں ہے۔" ابا نے کہا۔ "یہ تیرے ماں باپ کے سوچنے والی بات ہے۔"
"اچھا ایک کام کرو۔ ان دونوں سے میری ملاقات کا بندوبست کروا دو لیکن دونوں ایک ساتھ ہوں۔"
"اس میں کون سی مشکل ہے۔" اماں نے کہا۔ "میں کل ہی دونوں کو بلا لیتی ہوں لیکن ہوگا وہی جو ہم نے سوچا ہے۔"

"ہاں، ہاں وہی ہوگا۔ تم بے فکر رہو بس ان دونوں کو آنے تو دو۔"

اماں نے ان دنوں زونگ کا نیا کنکشن لیا ہوا تھا۔ انہوں نے جھٹ فون اٹھایا اور نمبر ملانے شروع کردیے۔
دوسری شام واقعی دونوں ہی آگئیں۔ ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئیں اور ایک دوسرے کو سراہتی ہوئیں۔ "ہائے انوری، آج تو تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"فرزانہ تم بھی تو کم نہیں ہو۔ تمہارا رنگ تو اور بھی نکھر گیا ہے۔"

میں جب کمرے میں پہنچا تو دونوں خاموش ہوگئیں۔
"لڑکیو!" میں نے دونوں کو مخاطب کیا۔ "ایک بات بتاؤ، کیا تم دونوں پاگل ہوگئی ہو؟"
"کیوں فرحان بھائی، اس میں پاگل ہونے والی کون سی بات ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔
"دیکھو فرزانہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے پھر تم مجھے بھائی کیوں کہہ رہی ہو؟"

digestpk.blogspot.com

"برسوں کی عادت ہے ایک دم تو نہیں جائے گی نا۔"
"اور ہم دونوں نے یہی سوچا ہے کہ شادی کے بعد آپ کو سرتاج کہا کریں گے۔" انوری نے بتایا۔
"لیکن سوال تو یہی ہے کہ تم دونوں اس شادی پر راضی کیوں ہو گئیں؟"
"اس لیے کہ ہم ورلڈ ریکارڈ بنانے جا رہے تھا۔" انوری نے کہا۔
میں نے ان دونوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں اپنے ارادے پر قائم رہیں۔ تنگ آ کر میں نے ان سے کہا۔ "فرض کرو اگر میں تم دونوں سے شادی کے لیے انکار کر دوں پھر کیا کرو گی؟"
"پھر ہم دونوں ہی اپنی جان دے دیں گی۔" فرزانہ نے بتایا۔
"میری محبت کے لیے؟"
"محبت کے لیے نہیں بلکہ اس غم میں کہ ورلڈ ریکارڈ نہیں بن سکا۔"
"کیا تم دونوں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہیں کرو گی؟"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" انوری نے کہا۔ "ہم پاگل نہیں ہیں جو خوامخواہ لڑتے رہیں۔"
"یعنی تم دونوں سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے؟"
تنگ آ کر میں نے اماں ابا کو بتا دیا کہ میں اس انوکھی شادی کے لیے تیار ہوں یعنی پہلے دن انوری سے شادی ہوئی تھی اور دوسرے دن فرزانہ سے۔
میرے دفتر والے میرا مذاق اڑانے لگے کیونکہ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی تھی کہ فرحان نام کا ایک نوجوان دو دو شادیاں کر رہا ہے۔
ویسے لوگ دو شادیاں تو کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوتی لیکن ایک ہی وقت میں دو شادیاں شاید ہی کسی نے کی ہوں گی... کچھ لوگ تو اس قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔ "بیٹا تیرے تو مزے آ گئے۔ یہاں یہ حال ہے کہ ایک بھی نہیں ہو رہی اور تو دو دو شادیاں کر رہا ہے۔"
"اسے دونوں کو سنبھالے گا کیسے۔ لگتا ہے ہمارے شہر کی کہیں لاٹری نکل آئی ہے ورنہ دو دو بیویوں کا خرچ برداشت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

لوگوں کی باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دو، دو دلہنیں آ رہی تھیں۔ تیاریاں بھی اسی مناسبت سے تھیں۔ میری شادی کے چکر میں ابا نے اپنی ایک دکان بھی بیچ دی تھی۔
نہ جانے انہیں دو دو بہوئیں لانے کا کیا شوق ہو گیا تھا۔
بہرحال وہ دن بھی آ گیا جب میری پہلی شادی تھی۔ یعنی انوری کے ساتھ پوری شان سے برات گئی اور دلہن لے کر واپس آ گئی۔
دوسرے دن فرزانہ کے ساتھ شادی تھی۔ اس شادی میں خود انوری نے فرزانہ کا میک اپ کیا۔ آس پاس کی عورتیں اور لڑکیاں بڑی حیرت سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔
ملنے جلنے والے بھی طرح طرح کی مبارک باد دے رہے تھے پھر ولیمہ بھی خیر و خوبی کے ساتھ ہو گیا۔ اسٹیج پر دو دلہنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان دونوں کا اکلوتا دولہا پورے لان میں چکراتا پھر رہا تھا۔
یہاں تک تو خیریت رہی۔
اصل تماشا شادی کے ایک مہینے کے بعد شروع ہوا۔ جب انوری ابا کی اور فرزانہ اماں کی لاڈلی ہو گئی کیونکہ انوری ابا کی بھتیجی تھی اور فرزانہ اماں کی بھانجی۔
انوری ابا کی خدمت میں لگی رہتی اور فرزانہ اماں کی اور میں ان دونوں کے درمیان اپنی تقدیر کو روتا رہتا کیونکہ سوائے اپنا سر پیٹنے کے میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔
ایک بار تنگ آ کر میں نے ان دونوں میں سے ایک کو چھوڑنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ کس کو... اگر انوری کو چھوڑتا تو ابا گلے پڑ جاتے۔ فرزانہ کی صورت میں اماں جان کو آ جاتیں۔
لہٰذا دونوں اب گھر پر ہی ہیں لیکن میں گھر پر نہیں ہوں۔ میں کہیں اور رہتا ہوں جانتے ہیں کہاں... جی ہاں میں نے تیسری شادی کر لی ہے پنکی کے ساتھ اور اسے لے کر الگ رہ رہا ہوں کیونکہ وہ کسی کی بھتیجی نہیں ہے۔

☆☆☆

سب کہہ دو
ZONG

دلوں کے لین دین کا انوکھا اور عبرت اثر احوال

سونے کی کان

سلیم انور

عام زندگی میں دل دینا اور دل لینا رومانوی باتیں سمجھی جاتی ہیں... اور یہ شاعری اسی محور کے گرد گھومتی ہے لیکن حقیقت میں دل لینا... دل گردے کا کام ہے... اعداد و شمار کے تناظر میں لکھی گئی ایک تلخ تحریر۔

میں اپنے کارڈیالوجسٹ کے کلینک میں گزرا ہوا وہ دن کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔
"زاہد، تمہیں سانچ، تمباکو نوشی، فرائیڈ فوڈ، ڈنگ ڈونگز، نمک سب چیزیں ترک کرنا ہوں گی۔" میرے کارڈیالوجسٹ نے کہا۔
"ڈاکٹر، تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے اسی وقت ایک جان لیوا انجکشن لگا دو؟" اس کی تنبیہی گفتگو کے جواب میں، میں نے کہا۔
اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک بھتر حل بھی ہے۔ "ہارٹ آف گولڈ کلینک!"
"میں نے سنا ہے کہ وہ وہاں تجربے کیا کرتے ہیں۔"
ہارٹ آف گولڈ! نام ہی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں بہت قابل اور دھیان رکھنے والے ڈاکٹرز ہوں گے۔
"لیکن وہ بہت مہنگے ہیں۔"
"میں جو رقم ہو گی، ادا کر دوں گا ڈاکٹر... البتہ میں لڑکوں کے ساتھ پوکر کی شب گزارنے کو ترک نہیں کروں گا۔ اعلیٰ اور مہنگی ترین شرابیں... سگار پینا اور ناشائستہ لطیفے سننا یہ سب میرے پسندیدہ مشاغل ہیں..."
بہرحال بھاری رقم کی ادائی کے عوض میں نے ہارٹ آف گولڈ کلینک سے اپنے لیے اپائنٹ منٹ لے لیا۔ سیکریٹری نے مجھ سے کہا کہ میں رجسٹریشن کرانے کے لیے وہاں جلدی پہنچ جاؤں۔
نو پرابلم! میں نے سوچا کہ یہ لوگ میری میڈیکل ہسٹری، انشورنس اور ملازمت کے بارے میں معمول کے سوالات

پوچھیں گے۔

لیکن وہاں پر مجھے مختلف فارمز کا کلپ بورڈ تھمانے کے بجائے سیکریٹری سیدھا فنانس کے دفتر میں لے گیا اور مجھے بل کی ادائی کا طریقہ کار سمجھانے لگا۔

"اس علاج پر کل کتنی رقم خرچ ہوگی؟" میں نے جاننا چاہا۔

جب اس شخص نے رقم بتائی تو میرے خیال سے میرے دل کی دھڑکن حقیقت میں تھم گئی تھی... شاید تین یا چار سیکنڈ کے لیے!

"لیکن فکرمند مت ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "ہمارے پاس ہر ضرورت مند کے لیے فنانس پلان ہے۔ ہمارے بہت کم کسٹمرز کیش میں ادائی کرتے ہیں۔"

اس نے "کسٹمرز" کہا۔ کیا اسے "مریض" نہیں کہنا چاہیے تھا؟ مجھے عین اسی وقت احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ ہارٹ آف گولڈ کلینک کا معاملہ کچھ ناقابلِ فہم سا ہے۔ لیکن یہی میری واحد امید بھی تھا...

"آپ ماہانہ کتنی رقم ادا کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟" اس شخص نے مجھ سے سوال کیا تو میں چونک پڑا۔

اب بات مجھ پر بالکل واضح ہوگئی تھی۔ مجھے یہ بات اسی وقت نوٹ کرلینی چاہیے تھی۔ اس شخص کا انداز کسی کار سیلزمین کی طرح کا تھا۔ وہ اصل حقیقت کے بارے میں تو بات بھی نہیں کرتے۔ بس باتوں میں گھماتے رہتے ہیں۔ وہ اسی بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ آپ ماہانہ ادائی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ بعد میں چاہے آپ سر پیٹتے رہ جائیں کہ آپ نے پانچ ہزار ڈالرز زیادہ کی ادائی کیوں بھر لی تھی۔

چونکہ معاملہ زندگی اور موت کا تھا اس لیے میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کوئی جوابی آفر بھی نہیں کی۔ بالآخر مجھے کہنا پڑا۔ "میں شاید 300 ڈالرز ماہانہ تک کی رقم ادا کرسکتا ہوں۔"

"ہوں!" یہ کہہ کر وہ اپنے کمپیوٹر میں مصروف ہوگیا۔ اس نے اتنی زیادہ دیر لگا دی کہ میں نروس ہونے لگا۔

میں شاید اس سے زیادہ رقم کی پیشکش کر دیتا۔ میں نے ابھی اپنا منہ کھولنا چاہا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔ "میرا خیال ہے ہم اس سے کام چلا سکتے ہیں۔"

پھر اس کے کمپیوٹر سے منسلک پرنٹر نے صفحات کا ایک ڈھیر اگلنا شروع کر دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش دستخط کرنے سے پہلے میں نے انہیں ایک بار پڑھ لیا ہوتا۔

ڈاکٹر ملکاہو ایک ایشیائی عورت تھی۔ وہ خاصی خوب صورت تھی۔ اگر میرے طلاق کا معاملہ فائنل ہوگیا ہوتا تو میں اسے باہر لے جانے کی پیشکش ضرور کرتا۔ وہ خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ جانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ میرا نیا دل اسٹینلیس اسٹیل پلاسٹک اور الیکٹرانکس کا بنا ہوا ہوگا۔ اس کے اندر چار کمپیوٹرز ہوں گے۔ لیکن مجھ سے کمپیوٹرز کے بارے میں کوئی سوال مت کرنا۔ مجھے ان کی بابت کچھ معلوم نہیں ہے۔

میری سرجری مکمل طور پر کامیاب رہی۔ میں خود کو ایک نیا آدمی محسوس کر رہا تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ مجھے اپنی بری عادتوں میں سے کسی ایک کو بھی ترک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا انوکھا اور مہنگا دل میری تمام شریانوں کو صاف رکھتا تھا۔

لہٰذا یہ نرالا دل جس قیمت کا بھی تھا، میرے خیال سے اس کی پائی پائی کی قیمت وصول ہوگئی تھی۔

اور سب سے اہم چیز اس کا ریموٹ کنٹرول تھا جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تھا تو میں اسے سلیپ موڈ پر سیٹ کر دیتا تھا اور مجھے کسی معصوم بے بی کی طرح گہری نیند آجاتی تھی۔

جب مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے کے لیے اضافی انرجی درکار ہوتی تھی تو میں بس اس کی رفتار بڑھا دیتا تھا۔ پھر میں کسی چھوٹی کی طرح کھیل سکتا تھا۔ یہ میرے اصل دل کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر دل تھا۔

لیکن وہ 300 ڈالر ماہانہ ادائی کا تحریری اقرار میرے لیے ایک مسئلہ بن سکتا تھا۔ خاص طور پر جب میں نے اپنی پرانی پک اپ سمیت کچھ رقم دے کر نئے ماڈل کی پک اپ لی تو میرے لیے مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ اس پک اپ ٹرک کا نیا ماڈل بے حد شاندار تھا اور میں کسی بھی طرح اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لیکن اس نئے پک اپ ٹرک کی ماہانہ قسط 895 ڈالر تھی۔

یہیں سے میرے بلوں کی ادائی میں مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کرلی لیکن میں ہر شے کو نہیں کرسکتا تھا۔ سب سے پہلی ترجیح میرا گھر تھا اور میں بے گھر نہیں ہونا چاہتا تھا اور یقینی طور پر مجھے اپنے نئے ٹرک سے بھی محروم ہونا گوارا نہیں تھا۔

سو میں نے اپنی ہارٹ آف گولڈ کی دو ماہ کی قسط گول کر دی۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ کیا کرلیں گے؟ میرے دل کو دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیں گے؟

پھر ایک روز مجھے ایک ٹیکسٹ میسج ملا جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے خبردار کیا گیا تھا کہ میرے اکاؤنٹ کی تاریخ ادائی گزر چکی ہے۔ مجھے اس پیغام میں تاکید کی گئی تھی کہ میں اپنے معاہدے کو دوبارہ پڑھ لوں۔

مجھے اپنا اکاؤنٹ اپ ڈیٹ کرنے کے لیے دو دن کی مہلت دی گئی تھی۔

میں نے سوچا کہ وہ اس معاملے میں میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ کیا کسی کو بھیج کر میری ٹانگیں تڑوا دیں گے؟

اگلے روز مجھے ایک اور ٹیکسٹ میسج موصول ہوا۔

"آپ کا اکاؤنٹ 60 دن زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ نصف شب کو معاہدے کا آپشن بروئے کار لایا جائے گا۔"

"کیا تم لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ اب تو میں ایک پائی بھی نہیں دوں گا چاہے میرے پاس رقم موجود ہو تب بھی..." میں نے دل ہی دل میں تہیہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن جب نصف شب قریب آنے لگی تو میری بے چینی شروع ہوگئی۔ کیا کوئی دروازے پر دستک دے گا؟ یہ ایک دھونس بھی ہو سکتی ہے۔

اس کے باوجود میں اپنے کچن میں کلاک پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ ان اٹامک کلاکس میں سے ایک تھا اس لیے اس کے غلط وقت بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جب کلاک کے سیکنڈ کی سوئی بارہ کے ہندسے کی جانب بڑھنا شروع ہوئی تو مجھے پسینا آنے لگا۔

نصف شب ہونے میں صرف پندرہ سیکنڈ باقی رہ گئے تھے!

دس سیکنڈ!

مجھے اپنے دل کی رفتار تیز محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے ہارٹ ریموٹ پر نبض کی رفتار چیک کی جو کہ 92 تھی۔ یہ میری معمول کی رفتار سے زیادہ تھی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

پانچ سیکنڈ!

نبض کی رفتار: 104

چار سیکنڈ... تین سیکنڈ... دو سیکنڈ...

نبض کی رفتار: 127

نصف شب ہوگئی۔

نبض کی رفتار؟ ہارٹ ریموٹ پر ڈسپلے تاریک ہوگیا!

میں نے اپنی انگلیوں سے گردن کے سائڈ میں نبض چیک کرنے کے لیے ٹٹولی تو نبض وہاں موجود نہیں تھی۔

کیا وہ لوگ اس لمحے پر مجھے ہلاک کر رہے ہیں؟

میں نے کلاک کو چیک کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس چیز کی توقع کر رہا تھا۔

پھر نصف شب کے پانچ سیکنڈ بعد میرے دل نے دوبارہ دھڑکنا شروع کردیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ شاید یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ یقینی طور پر سافٹ ویئر میں اچانک کوئی معمولی سی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ میں کل ہی اسے چیک کراؤں گا۔

پھر جب مجھے اطمینان ہونا شروع ہوا تو میں اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔ میں کس سوچ میں پڑ گیا تھا؟ یہ کہ میرے دل کو کلینک میں بیٹھا کوئی فرد ریموٹ سے کنٹرول کر رہا ہے؟

کیا بکواس ہے؟ ان کے پراسرار تحکمی پیغامات نے مجھے بدحواس کر دیا ہے۔

پھر نصف شب کے تیس سیکنڈ بعد میرا دل دوبارہ دھڑکنا بند ہوگیا۔

چھ سیکنڈ بعد دوبارہ دھڑکنے لگا۔

میں بوکھلا گیا۔ کیا یہ کوئی طے شدہ ترتیب ہے؟

پہلے میرا دل پانچ سیکنڈ کے لیے بند ہوگیا، پھر چھ سیکنڈ، پھر سات سیکنڈ... اگر دل کی دھڑکن بند ہونے کی یہی رفتار رہی تو اس سے قبل کہ ایمبولینس مجھے کلینک تک پہنچائے، میری موت واقع ہو جائے گی۔

اتنے میں میرے فون پر بیپ ہوئی۔ یہ ایک نیا ٹیکسٹ میسج تھا۔

"کل نصف شب تک قسط ادا کر دو ورنہ دل ری اسٹارٹ نہیں ہوگا۔"

میں پاگل سا ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ میں یہ تمام پیغامات پولیس کو دکھاؤں گا۔

تب وہ پیغام غائب ہوگیا۔ میں نے اس میسج کو ڈیلیٹ نہیں کیا تھا۔ وہ خود ہی غائب ہوگیا تھا۔ ان کے پہلے بھیجے ہوئے تمام پیغامات بھی غائب ہو چکے تھے۔

اگلے روز میں نے اپنا اکاؤنٹ اپ ڈیٹ کرنے کے لیے رقم کا بندوبست کرلیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی ماہانہ قسط ادا کرنے میں کبھی تاخیر نہیں کی۔

مجھے چاہیے کہ میں دوسرے لوگوں کو ہارٹ آف گولڈ کے بارے میں ہوشیار کر دوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ میری نہیں سنیں گے۔ وہ اپنی صحت کی دیکھ بھال نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اپنے جسموں کو متوازن رکھنے کے لیے کام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ بس آسان روٹی چاہتے ہیں۔ بس ان کا دل ٹھیک کام کرنے لگے۔

وہ احمق ہیں۔ بالکل میری طرح...

لیکن اب کم از کم میں سمجھ گیا ہوں کہ ہارٹ آف گولڈ کا حقیقت میں کیا مطلب ہے...

آپ ان سے دل لیتے ہی ان کے لیے سونے کی کان بن جاتے ہیں... رقم ادا کرتے رہیں آپ کا دل دھڑکتا رہے گا... دھڑکنوں کا یہ کرایہ رکا اور دھڑکن بند!

■■■

digestpk.blogspot.com

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں مصروف رہتا ہے۔۔۔ مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی۔۔۔ وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔۔۔ جس نے
عشق کا منظرنامہ بدل ڈالا ہے۔۔۔ کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے۔ سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھار لیا ہے جو
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور چاہت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے۔۔۔ عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے۔۔۔ جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر۔۔۔ عقل و
شعور اور جذبۂ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے۔
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر۔۔۔ ایک للکار ہے

چودھویں قسط

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

[illegible]

digestpk.blogspot.com

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آفتاب خاں سیڑھیاں اتر کر سیدھا میری طرف آیا اور بھاری بھاری آواز میں بولا۔ "پُت، کیا ام نے آپ کو پریشان کیا۔ دراصل ام عمران بھائی کو ڈھونڈ رہا ہے۔"

"وہ ابھی کچھ دیر پہلے سویا ہے۔ پچھلے کمرے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"باہر حالات کچھ اچھا نہیں ہے جی۔ ام کو خون خرابے کا ڈر آرہا ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"استھان کے لوگوں نے جنگل میں سے وہ تینوں لاشیں ڈھونڈ لیا ہے جن کو آپ گڑھے میں چھپا آیا تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا ہے کہ آپ فتح پور کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتح پور کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو... ایک دوسری وجہ سے بھی ان کو اندازہ ہوا ہے کہ جنگل والی فائرنگ کے بعد آپ پھر فتح پور کی طرف پلٹا ہے۔"

"فتح پور کے آس پاس تو ہمارا گھرا نہیں ملا؟"

"نہیں جی... لیکن وہ لوگ شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوا ہے کہ استھان والوں کو پتا چل گیا ہے کہ آپ تینوں ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ عمران بھائی اور اقبال بھائی کے بارے میں تو بستی والوں نے بتا دیا ہے اور آپ کے بارے میں اس خبیث موٹے نے گواہی دی ہے۔ اس نے استھان والوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے اور سلطانہ بی بی کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ یہ بات جان کر کہ آپ تینوں مسلمان ہیں، وہ لوگ بہت بھڑکا ہوا ہے۔ فتح پور کے سارے مسلمانوں کا کم بختی آگیا ہے۔ ان کو بری طرح مارا پیٹا جا رہا ہے۔ افسوس کا بات یہ ہے کہ مکھیا رشید مسلمان ہونے کے باوجود استھان والوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے کی فکر میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"عمران بھائی نے یہاں فتح پور میں اس کی بدمعاشی کا راستہ روکا تھا اور تاؤ افضل کو خاص طور سے سہارا دیا تھا۔ اب رشید اور اس کے بیٹوں کا سارا غصہ تاؤ افضل کے رشتے داروں پر اتر رہا ہے۔ تاؤ افضل کا چچیرا بھائی حسن دین ساتھ والی بستی میں رہتا ہے۔ مکھیا کے لوگ اس کو پکڑنے گئے تھے۔ وہ تو نہیں ملا۔ مکھیا کے لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ان میں مکھیا کی دو بہوئیں، ایک بیٹی اور تین چھوٹے بچے بھی شامل ہیں۔ ان سب کو مکھیا کی حویلی میں رکھا گیا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو گا۔"

اس قسم کے اندیشے پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا۔ "تاؤ افضل یا اس کی بیٹیوں کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی

پریشان تھی۔"

"ٹھیک ہے جی... ام نہیں بتائے گا... لیکن... ہمارا خون مسلسل ابال کھا رہا ہے جی۔ ام کو ڈر ہے کہ ام غصے میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ ام کو سب سے زیادہ غصہ اس حرامی کھیا پر آ رہا ہے۔ وہ کافروں سے بڑھ کر کافر ہو گیا ہے۔ کھیا کا کام تو اپنے لوگوں کا حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ وہ باہر والے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کا دشمن بن گیا ہے۔"

میں نے آفتاب خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو عمران بھائی نے کل بھی تم سے یہی کہا تھا کہ برداشت کرنا ہے۔ ایسے موقع پر تمہاری کوئی بھی غلطی تمہیں اور ہم سب کو سخت مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ اس وقت بہادری یہی ہے کہ اپنے غصے کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا جائے۔"

آفتاب خان نے کہا۔ "دوپہر سے ایک بڑھیا بھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے الگ ناٹک رچا رکھا ہے۔ گاؤں کے سارے ہندوؤں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے سامنے واویلا کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ جس لڑکی کو استھان سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے، وہ بہت بڑی اپرادھن ہے۔ اس کا اپرادھ اتنا بڑا ہے کہ وہ اب کسی کی نہیں رہی، بد آتما بن گئی ہے۔ وہ اگر آزاد رہے گی تو اس پورے علاقے پر بہت بڑا آفت آئے گا اور جو جو شخص اس بد آتما کی مدد کرنے یا اس پر ترس کھانے کا پاپ کرے گا، اس کا جیون اس دنیا میں ہی نرگ کا نمونہ بن جائے گا۔ اس بڑھیا کے ساتھ ایک بوڑھا پنڈت بھی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے دو کبوتر چھوڑ رکھا ہے اور وہ دونوں مسلسل گاؤں کے اوپر چکر کاٹ رہا ہے۔ پنڈت کا کہنا ہے کہ ان کبوتروں کی وجہ سے وہ اپرادھن کھنچ کر گاؤں کی طرف چلی آئے گی اور اگر گاؤں میں ہے تو سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے آفتاب خان سے بڑھیا کا حلیہ وغیرہ پوچھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بڑھیا کون ہو سکتی ہے۔ یہ انتہا پسند سشیلا کی دادی تھی جس سے میری ملاقات تل پانی میں ہوئی تھی۔ یہ عمر رسیدہ دقیانوسی عورت اپنے فرسودہ عقیدوں کو پوری شدت سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے گھرانے پر بھی کڑی نظر رکھتی تھی اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت نہیں تھی۔ مجھے اس کی بہو مالا یاد آئی جو روشن خیال تھی اور اپنی دادی ساس سے اختلاف رکھتی تھی۔

"یہ بڑھیا یہاں کیسے آن پہنچی ہے؟" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا آپ اس کو جانتا ہے؟" آفتاب خان نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟"

"ہاں جی، بیٹا ہے جس کا نام رام پرشاد ہے۔ اس کا عمر بھی پچاس پچپن تو ہوگا جی۔ ساتھ میں اس کا بہو ہے اور ایک دو بچہ لوگ بھی ہے۔ یہ سب لوگ رات کو مندر میں پوجا پاٹ کرتا رہا ہے... اور رو رو کر اشلوک پڑھتا رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپرادھن لڑکی کے بھاگ جانے کی وجہ سے یہ سب لوگ پاپی بلکہ مہا پاپی ہو گیا ہے۔"

"مہا پاپی تو یہ لوگ ہیں ہی لیکن کسی اور معنی میں۔" میں نے کہا۔

میری بات آفتاب خان کی سمجھ میں نہیں آئی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے آفتاب خان سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور چوکس ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کچھ دیر وہاں رک کر آفتاب خان جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے پوری تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں اور کسی کے سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ مندر کے نیچے تہ خانوں میں کوئی چھپ سکتا ہے۔ جاتے جاتے آفتاب خان نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن ہم سب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

آفتاب خان ایک سیدھا سادہ غیور پٹھان تھا۔ جی داری کے حوالے سے دیکھا جاتا تو وہ کسی طرح بھی انور خان سے کم نہیں تھا۔ میری سوچ کا رخ انور خان اور چوہان وغیرہ کی طرف ہو گیا۔ میں کئی روز پہلے انہیں بغیر کچھ بتائے تل پانی کے ویرانے سے نکل آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے۔ میں کسی بھی طرح انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے نیکی کی سوگوار محبوبہ شگفتا کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ یقیناً نعم جی کے جاسوسوں اور ہرکاروں سے جس طرح مجھے اور سلطانہ کو خطرہ تھا، اسی طرح شگفتا کو بھی خطرات لاحق تھے۔

میری اور آفتاب خان کی گفتگو کے دوران میں سلطانہ ایک گوشے میں سمٹی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے سر پر اوڑھنی تھی اور چہرہ نیم وا تھا۔ یقیناً اس نے بھی وہ ساری باتیں سنی تھیں جو آفتاب خان نے کی تھیں۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ہولے سے بولی۔ "مہروج! میں تم سے ٹھیک ادھ کہتی ہوں نا کہ یہ لوگ اب مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ بڑے پنڈت کے داماد موہن کمار کو مار کر میں نے اپنے بہت سے دشمن بنا لیے ہیں۔ اب دیکھو، یہ لوگ مجھے بد آتما کہہ رہے ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کے لیے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔"

"جو لوگ تمہیں ایسا کہہ رہے ہیں وہ خود جھوٹی بدروحیں ہیں۔ وہ اپنی آگ میں خود جلیں گے۔ تمہیں ان کی وجہ سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور جہاں تک تم اپنے دشمنوں کی بات کر رہی ہو تو وہ اکیلے تمہارے ہی دشمن نہیں ہیں، میرے بھی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی طرح کے خطرے لاحق ہیں لیکن ان خطروں کا سامنا کرنے کی بات کی جائے تو پھر میرا حق زیادہ ہے کیونکہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اور اللہ کے فضل سے اب اتنا حوصلہ بھی ہے کہ ان خطروں کا منہ موڑ سکوں۔"

"تم... کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟"

میں نے اس کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں سلطانہ کہ تم اب کسی بھی صورت کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے تم کسی مشکل میں پڑو۔ ایک اچھی بیوی کی طرح تم میری دی ہوئی محفوظ چار دیواری میں رہو گی اور چار دیواری سے باہر کے سارے معاملے مجھے نمٹانے دو گی۔ ہاں اگر... خدانخواستہ... خدانخواستہ میں ناکام ہوا اور تمہارے لیے زندہ نہ رہا تو پھر تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو گی۔"

اس نے بے تاب ہو کر اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ "خدا کے لیے ایسا مت بولو مہروج۔ آپ میرے مجازی خدا ہو۔ آپ نہ ہوں گے تو پھر میں بھی نہ ہوں گی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے گھما کر اپنے ہونٹ ہاتھ کی پشت سے لگا دیے۔ وہ سر تا پا لرز گئی۔ اس نے سر جھکایا اور اس کے گندمی چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی نظر آنے لگی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔ وہ اب جس طرح سکڑی سمٹی گٹھری سی بنی بیٹھی تھی، کوئی اسے دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ زرگاں میں چندراؤ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار چکی ہے لیکن اس نے یہ سب کیا تھا۔ بے شک جواں سال عثمان بھی اس کے ساتھ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان خونی واقعات میں زیادہ اہم کردار سلطانہ کا ہی رہا ہے۔ چند ہفتے پہلے وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح تل پانی سے نکلی تھی اور تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر دیوانہ وار زرگاں میں گھس گئی تھی۔ وہ بہادر راجپوت ماں کی بے خوف بیٹی تھی۔ اس کی ماں نے سنگین ترین صورتِ حال میں نعم جی کی جان بچائی تھی اور اب کئی برس بعد سلطانہ نے ثابت کیا تھا کہ جو لوگ وفاداری نبھانے کے لیے جان بچا سکتے ہیں اور جان دے سکتے ہیں، وہ وقت پڑنے پر جان لے بھی سکتے ہیں۔

سلطانہ کے چہرے پر حیا کی سرخی موجود رہی۔ پھر اس کا دھیان ایک دم اس صورتِ حال کی طرف چلا گیا جو آفتاب خان کے آنے سے پہلے یہاں موجود تھی۔ اس نے اس ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے نوری کھسک کر غائب ہوئی تھی۔ حیا کی سرخی کی جگہ غصے کی ہلکی سی سرخی نے لے لی۔ وہ بولی۔ "مہروج! مجھے لگتا ہے... یہ نیکی... کسی دن میرے ہاتھوں سے بری طرح پٹے گی۔ میں بہت برداشت کر چکی ہوں اسے۔"

"برداشت تو میں بھی بہت کر چکا ہوں۔ دراصل اس طرح کی خبیث عورتیں کسی "منجا گٹی" کے چکر میں رہتی ہیں۔"

"تم... کس منجا گٹی کی بات کر رہے ہو مہروج؟"

"میری اور تمہاری دوری۔ نوری کو پتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ناراضی ہے۔ وہ اس ناراضی اور دوری کے درمیان گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھی، میں آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان صلح کرا سکتی ہوں۔ ایسی صلح کرانے والیاں صلح کراتے کراتے خود ہی کچھ بن بیٹھتی ہیں۔" میں نے سخت بیزار لہجہ بنا کر کہا۔

سلطانہ کا چہرہ تمتما گیا اور سانس کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ اگر واقعی عمران نے ہی نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا تو پھر اس کی عقل کو داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ واقعی ایک تیز طرار ونود کا کردار ادا کر رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ شیطان کو یاد کیا جائے تو وہ آن موجود ہوتا ہے۔ دروازہ کھلا اور عمران سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں حلوے کی پلیٹ تھی اور وہ اس میں سے کھاتا ہوا آ رہا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں بھابی! میں نے آپ دونوں کو ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے باتوں کی آواز آ رہی تھی اس لیے سمجھ گیا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟"

"نہیں... ایسی بات نہیں۔" سلطانہ ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"دراصل آج کل وقت بے وقت بھوک لگ جاتی

digestpk.blogspot.com

ہے۔ یہ تھوڑا سا حلوہ پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسی سے کام چلا لیتا ہوں۔ ویسے یار! یہ نوری جیسی بھی اوٹ پٹانگ ہے لیکن حلوہ خوب پکاتی ہے۔ کل تم اس کی تعریف ٹھیک ہی کر رہے تھے۔''

''میں تعریف کر رہا تھا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

عمران نے فوراً سلطانہ کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔

''ہاں... کل دوپہر جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔ اور کھانے کی تعریف کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ تم تو پریشان ہو گئے ہو... بھابی آپ بھی چکھ کر دیکھیں۔''

''نا جی... اس وقت نا ہیں۔'' سلطانہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے عمران کو غصیلی نظروں سے گھورا... پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ لکڑی کی قدیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے تہ خانے میں آ گئے۔ ''یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو تم؟'' میں نے اس سے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہاری مدد کر رہا ہوں، تم اسے حماقت کہہ رہے ہو؟''

''خاک مدد کر رہے ہو۔ وہ پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی ہے، تم اوپر سے اسے یہ بتا رہے ہو کہ میں نوری کے حلوے کی تعریفیں کر رہا تھا۔''

''یار! ابھی بھی مریض کا درد دور کرنے کے لیے اسے تھوڑا سا اور درد دینا پڑتا ہے۔ انجکشن لگانا پڑتا ہے۔ تم اسے انجکشن ہی کہہ سکتے ہو۔''

''تم اپنی یہ ڈاکٹریاں اپنے پاس رکھو تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے... اور ہاں... ایک بات مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ۔ یہ نوری والا چکر تم نے ہی چلایا ہوا ہے نا؟''

''کیا مطلب؟''

''ڈرامے مت کرو۔ تم کہہ رہے تھے کہ یہ نوری ویسی نہیں ہے جیسی نظر آ رہی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے تم نے ہی میرے پیچھے لگایا ہوا ہے۔''

عمران کے ہونٹوں کے گوشوں پر بے ساختہ ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً سنجیدگی میں چھپا لیا۔ ''دیکھو جگر! اب تم الزام تراشیاں کر رہے ہو اور یہ بھی نہیں سوچ رہے کہ ایسی الزام تراشیوں سے خود تمہاری ہی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو گی۔''

''مارکیٹ ویلیو؟''

''ہاں بھئی... اب دیکھو، نوری تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہے تو سب تمہیں رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں تمہاری کشش اور مردانہ وجاہت کے معترف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھابی بھی ضرور متاثر ہوتی ہوں گی۔ اب جب تم یہ کہو گے کہ کسی نے زبردستی نوری جیسی حسینہ کو تمہارے پیچھے لگایا ہوا ہے تو پھر ویلیو تو ڈاؤن ہو گی نا۔ گج پور کی اور بہت سی لڑکیاں جنہوں نے ابھی تم پر عاشق ہونا ہے اور تمہارے لیے ٹھنڈی آہیں بھرنی ہیں، وہ سب کی سب اپنے ارادے بدل لیں گی۔''

''تم بکواس نہ کرو۔ میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھسا ہوا ہے کہ نوری اس طرح میرے آگے پیچھے رہے گی تو سلطانہ میں جلاپا پیدا ہو گا اور وہ میرے قریب آ جائے گی... لیکن وہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ تمہاری اس حماقت سے کوئی الٹا اثر بھی لے سکتی ہے۔''

''تم صنف نازک کے بارے میں میرے تجربے اور علم کی توہین کر رہے ہو۔ میں نے عرق النسا نکالا ہوا ہے شہزادے۔ نفسیات الخواتین کے اندر اتنی گہرائی میں اترا ہوا ہوں کہ [illegible] تم دیکھنا، چند دنوں کے اندر بھابی سلطانہ میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آ جائیں گی۔''

''تو تم یہ تسلیم کر رہے ہو کہ نوری کو تم نے ہی میرے پیچھے چھوڑا ہے؟''

''وہ بڑی بھلی مانس لڑکی ہے یار... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

''اسے شیطان ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ تم اسے بھلا مانس کہہ رہے ہو۔''

''دیکھو، تم نیوز چینل والے سے متاثر رہے ہو اور شاید تمہیں پتا نہیں کہ ہمارا گہرا واسطہ روم تک بندے کا پیچھا کرتا ہے۔''

ہمارے درمیان یہ نوک جھونک شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں جھجک جھجک کر تاڈا افضل وہاں آ گیا۔ عمران بولا۔ ''اب ہم یہاں بیٹھے ہیں چھوٹا سا بریک۔'' تاڈا افضل کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح نادیدہ خوف کے سائے تھے۔ لٹھ حسب معمول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں نم تھیں۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے دوسرے لوگن کو نقصان پہنچ جاوے۔ گھیا رشید دل کا بڑا کھوٹا ہے۔ میرے رشتے داروں کی جان عذاب میں ڈال سکت ہے۔''

شہزادے کیسے پتا تا کہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ایک چچیرا بھائی مصیبت میں آ گیا ہے۔

عمران نے تاڈا افضل کو تسلی تشفی دی۔ ابھی تاڈا پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا کہ گرو کی پتنی رادھا بھی وہاں آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے گمشدہ شوہر کے لیے پریشان تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور خوب صورت آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے شوہر سے محبت نہیں ہے۔ وہ صرف ڈر کی وجہ سے اس کے ساتھ بندھی ہے یا یوں کہا جائے کہ صرف دھرم کا پالن کر رہی ہے۔ اسے یہ خوف ہے کہ اگر اس کی وجہ سے اس کے پتی دیو پر کوئی مصیبت آئی تو بھگوان بھی اس سے ناراض ہو جائے گا... اور وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

وہ عمران سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پتی دیو کہاں اور کس حال میں ہیں۔

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو رادھا! تمہیں اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ہے [illegible]''

''لیکن سب کچھ میری وجہ سے ہی شروع ہوا تھا۔ تم لوگن نے میری کمر سے بارود باندھا۔ میرا جیون بچانے کے لیے ہی گروجی نے تاڑی میں بے ہوشی کی دوا ملائی۔ اچھا ہوتا کہ انہوں نے میری ہتھیا ہو جانے دی ہوتی۔ مر جانے دیا ہوتا مجھ ابھاگن کو۔''

''اب اس نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ تمہیں مرنے کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ صرف اپنی جان بچا کر بھاگا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم زندہ ہو اور وہ بھگوان کی پکڑ میں آ گیا ہے۔''

عمران کی اس بات نے رادھا کو خاموش کر دیا مگر اس کے شفاف رخساروں پر آنسو بدستور پھسلتے رہے۔ وہ ہولے سے بولی۔ ''اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہووے گی۔ کوئی کارن ہووے گا۔ گروجی کا کوئی کرم بھگوان کی منشا سے خالی ناہیں ہوتا۔''

''ہاں، کوئی نہ کوئی بہانہ تو اس کے پاس ضرور ہو گا۔ اس کے دماغ میں بہانہ ساز فیکٹری لگی ہوئی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ہر بہانہ دھرم کے عین مطابق بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بہانے سے تاڑی پی لیتا ہے۔ کسی بہانے تم جیسی لڑکی سے بیاہ رچا لیتا ہے۔ کسی بہانے جاپ کے ٹھنڈے پانی کو گرم کر لیتا ہے۔ بڑا کمال کا بندہ ہے تمہارا پتی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔''

رادھا نے کانپ کر نفی میں سر ہلایا اور سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی ملائم شفاف کمر پر ابھی تک بیلٹ کے فیتوں کے سینکڑوں نشان موجود تھے۔ وہ واقعی نازک اندام اور معصوم تھی۔ گرو اس کی معصومیت سے خاطر خواہ ''تراج'' وصول کرتا رہا تھا۔

رادھا اور تاڈا افضل کے جانے کے بعد میں نے عمران کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آفتاب خان کیا کچھ بتا کر گیا ہے۔ تاڈا افضل کے چچیرے بھائی کی مصیبت کا سن کر عمران کے ماتھے پر بھی شکن آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے بستی والوں سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ان کا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔ یہ جان کر کہ بستی میں مسلم گھرانوں پر مصیبت آئی ہوئی ہے، وہ بے چین سا نظر آنے لگا۔ تاہم میری طرح وہ بھی جانتا تھا کہ بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے اس چھوٹی مصیبت کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب میں سلطانہ کے پاس بیٹھا تھا اور دلجوئی کی باتیں کر کے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک بالائی سیڑھیوں پر آفتاب نمودار ہوا۔ وہ رات کے وقت آتا تھا۔ اس کا سہ پہر کے وقت آنا خلاف معمول تھا۔ میں اور عمران سب سے نچلے تہ خانے میں قیام پذیر تھے۔ آفتاب سیدھا ہمارے پاس ہی آیا۔ وہ سرگوشیوں میں عمران سے باتیں کرنے لگا۔ میں بھی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بڑا عجیب سین ہے جی۔ ام تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ایسے رو رہا ہے اور بین کر رہا ہے جیسے ان کا پورا فیملی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔''

''وہ بڑھیا بھی ہے؟''

''جی ہاں، وہی کھوسٹ تو سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ کبھی دیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر بیٹا اور بہو بھی ساتھ ہیں۔ ساتھ میں چودہ پندرہ سال کا ایک بچہ بھی ہے جس نے سادھوؤں جیسا حلیہ بنایا ہوا ہے۔''

''بچہ کون ہے؟''

''ہمارے اندازے کے مطابق یہ بھی بڑھیا کا نواسا ہے۔ یہ سب لوگ کل ایک ساتھ ہی گل پانی سے یہاں آیا ہے۔''

digestpk.blogspot.com

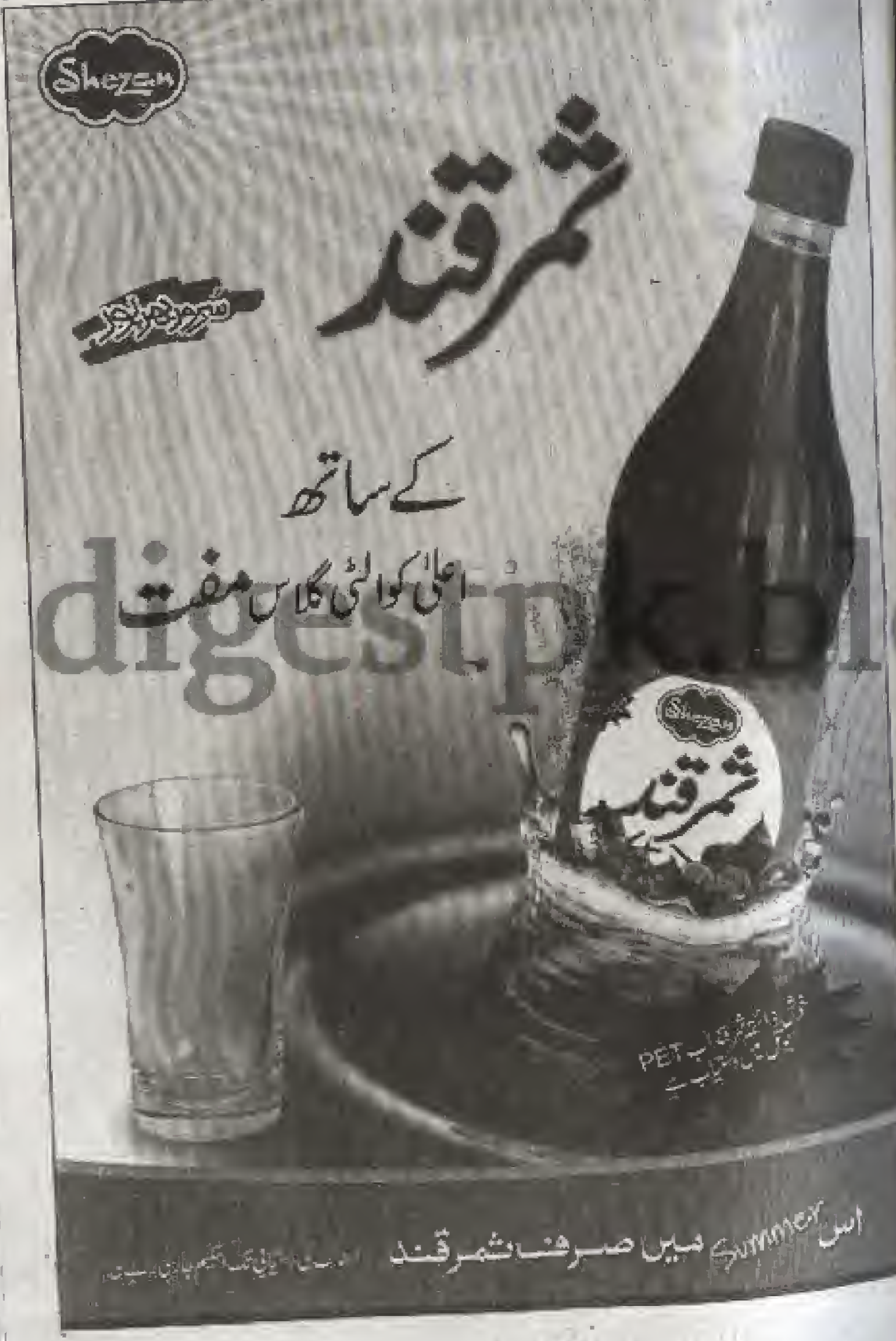

بچے کا سن کر میرے ذہن میں فوراً وہ لڑکا آ گیا جس نے رام پرشاد کے گھر سے مجھے نیلے پتھروں والا ہار پہنا کر اور خوشبو لگا کر رخصت کیا تھا۔

آفتاب خان سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”اگر آپ لوگ یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو ام آپ کو دکھا سکتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہاں اوپر والے تہ خانے کی بغل سے ایک تنگ زینہ اوپر مندر تک جاتا ہے۔ اس کا کچھ سیڑھیاں گر چکا ہے لیکن پھر بھی ام تھوڑا سا کوشش کر کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ مندر میں کالی کی مورتی کے پیچھے دیوار میں ایک چھوٹا سا ہوادان ہے۔ یہ ہوادان فرش سے بس ڈیڑھ دو فٹ اونچا ہے۔ اس میں لال پتھر کا جالی لگا ہوا ہے۔ ام اس جالی میں سے پوجا والے کمرے کا نظارہ کر سکتا ہے۔“

ہمارے اور آفتاب کے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بات چیت مزید ہوئی پھر ہم آفتاب کے ساتھ ان تاریک، تنگ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ آفتاب کی ہدایت پر ہم نے اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹ لیے۔ آفتاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ خود کو چھپانے کے لیے نہیں تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہ تنگ زینے نامعلوم عرصے سے بند پڑے تھے اور گرد آلود جالوں سے اٹے ہوئے تھے۔ چہروں کو ڈھانپنے کی وجہ سے ہم ان جالوں سے محفوظ ہو گئے۔

آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور وہ سب سے آگے تھا۔ اس نے لالٹین اس طریقے سے پکڑ رکھی تھی کہ ہمیں بھی روشنی میسر ہوتی رہے۔ نانک چندی اینٹوں کے زینے دو تین جگہوں پر بالکل مسمار ہو چکے تھے۔ ہمیں یہاں احتیاط سے اوپر چڑھنا پڑا۔

ایک موڑ کاٹنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی۔ ذرا دیر بعد ہم ایک مستطیل روشن دان کے سامنے تھے۔ آفتاب نے اسے ہوادان کا نام دیا تھا۔ اس کی چوڑائی بمشکل ڈھائی تین فٹ اور اونچائی ڈیڑھ فٹ ہو گی۔ اس میں سرخ پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ ہم تاریکی میں تھے لیکن جالی کی دوسری طرف شمع دانوں اور چراغوں وغیرہ کی روشنی تھی۔ ایک طرف لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ہمیں پوجا پاٹ کے ایک وسیع کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ مجھے اس منظر میں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب سے اہم چہرہ تو سرخ آنکھوں اور عقابی ناک والے برہمن زادے ستیش کا تھا۔ ستیش مجھے استھان میں لے کر گیا تھا اور ستیش سے میری آخری ملاقات بھی استھان کے ہنگامے میں ہوئی تھی۔ تب وہ رائفل تانے قدم قدم ہماری طرف بڑھ رہا تھا... اور ہم قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اب وہی ستیش سر جھکائے پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اس کا پتا یعنی گھر کا سربراہ رام پرشاد اپنی فربہ جوئی سمیت نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف ستیش کی عمر رسیدہ دادی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ایک بڑی مالا پکڑ رکھی تھی اور جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں گرو کی پہلوان نما ملازمہ بھاگ متی موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے نہایت وزنی کڑے سونے شمعوں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ سب کے چہروں سے گریہ زاری ظاہر ہو رہی تھی۔ رام پرشاد کی جوان سال بہو بھی مجھے وہیں پر نظر آئی۔ تاہم وہ سب سے پیچھے بیٹھی تھی اور اس گریہ زاری کے ماحول سے قدرے الگ دکھائی دیتی تھی۔

بہت سے اور لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے اور اپنے اپنے انداز سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ پوجا کے کمرے کے ماحول میں عجیب سی سوگواری اور گمبھیرتا رچی ہوئی تھی۔ اتنی بوجھل فضا تھی کہ اس کے بوجھ کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”ام کو یہ لوگ عام ہندوؤں سے کچھ مختلف لگتا ہے۔ یہ دیکھو اس بڑھیا نے اور اس کے بیٹے نے کس طرح اپنا حلیہ بگاڑا ہوا ہے۔ ام کو تو یہ خون لگتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے بھی جواباً سرگوشی کی۔

”پتا نہیں کیوں امارے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ یہ لوگ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ ان کا نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

شاید آفتاب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ پوجا کے کمرے کا ماحول سخت گمبھیر ہونے کے ساتھ ساتھ پُراسرار بھی تھا۔ شاما پوجا کے اس کمرے میں اس بستی کا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ یہ سب لوگ باہر سے ہی آئے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ تر استھان ہی کے تھے۔ ان میں سے سات آٹھ چہروں کو تو میں اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ، امری اور چنچل جس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی لوگ۔ ایک طرف کونے میں مجھے وہ لڑکا بھی نظر آیا جس کے بارے میں آفتاب نے بھی بتایا تھا کہ وہ رام پرشاد کا بیٹا اور ستیش کا چھوٹا بھائی ہے۔ تاہم ستیش کا ایک خاص ساتھی مہندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آیا۔

رام پرشاد کی لرزتی کانپتی ہوئی آواز ابھری اور پوجا کے کمرے میں پھیل گئی۔ ”بھگوان! ہمرا اور استھان نہ لو۔ ہمیں شما کر دو، بس ہمیں شما کر دو۔ ہمیں دکھا دو کہ تم نے ہمری پرارتھنا سویکار کی ہے۔ ہمیں دکھا دو بھگوان۔“

”ہمیں دکھا دو بھگوان... دکھا دو۔“ کئی گڑگڑاتی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

”ہم نے پراچھت کیا ہے بھگوان۔ لیکن ہم کمزور ہیں۔ ہمرا پراچھت بھی کمزور ہے مگر جیسا بھی ہے تو اسے قبول کر لے۔ ہم پر سے اپنا قہر ہٹا لے۔“ رام پرشاد کی آواز دوبارہ ابھری۔

”ہم پر سے قہر ہٹا لے۔“ باقی آوازوں نے تائید کی۔

کچھ دیر تک رونے گڑگڑانے کا سلسلہ جاری رہا پھر رام پرشاد کے گھر نظر آنے والا سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس اپنی جگہ سے اٹھا اور دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوجا کے کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ پیالے کو اوپر سے ایک تھالی کے ساتھ ڈھکا گیا تھا۔ پنڈت بھگوان داس نے یہ پیالہ بڑی احتیاط سے دیوی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے چبوترے پر رکھ دیا۔ یہاں دیے پہلے سے روشن تھے۔

رام پرشاد نے اپنی عمر رسیدہ ماں کو سہارا دے کر اٹھایا اور پیالے کے قریب لے آیا۔ اس نے پیالہ اٹھا کر بڑھیا کے پاس کیا۔ پیالے میں یقیناً کوئی سیال تھا۔ بڑھیا نے یہ چلو بھر سیال لیا اور دیوی کے قدموں میں چھڑک دیا۔ ہم دنگ رہ گئے۔ یہ سیال کچھ اور نہیں، خون تھا... بڑھیا کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔ خون چھڑک کر وہ لرزتی کانپتی پیچھے ہٹ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

اس کے بعد بڑھیا کے بیٹے رام پرشاد نے یہی عمل کیا پھر جواں سال ستیش کی باری آئی۔ خاندان کے بھی افراد نے باری باری یہ رسم پوری کی۔ آخر میں رام پرشاد کی بہو مالا کی باری تھی۔ وہ اپنی جگہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ رام پرشاد ہاتھ میں پیتل کا پیالہ لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑھیا نے قہر آلود نظروں سے مالا کو گھورا اور پھر مالا کے شوہر ستیش سے کچھ کہا۔

ستیش کے چہرے پر بھی طیش تھا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں مالا کو پکارا۔ ”اٹھو، ادھر آؤ۔“

وہ جیسے تھرا کر رہ گئی۔ ستیش نے دوبارہ کہا تو وہ چار و ناچار اٹھی اور پیالے کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری تھی اور وہ پیالے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے لرز رہی تھی۔ بڑی کراہت کے ساتھ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو ذرا سا تر کیا اور دیوی کے قدموں پر جھٹک دیا۔

اس کا انداز دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ عام خون نہیں ہے۔ اس میں کوئی خاص بات ہے۔

”کہیں یہ کسی انسان کا خون تو نہیں تھا؟“ یہ سوال تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا اور سنسنی بن کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

میں نے کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے پر بھی سنسنی آمیز الجھن کے آثار تھے۔

سوچنے کی بات تھی... اگر یہ کسی انسان کا خون ہے تو پھر کس کا ہے؟ کیا اس کے جیتے جاگتے جسم سے یہ خون کشید کیا گیا ہے یا پھر اسے مار ہی ڈالا گیا ہے... ان گنت سوال ذہن میں کھلبلی مچانے لگے۔ اندر کی فضا مزید بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے صاف دیکھا کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس جاتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی بیوی اور بہو مالا بھی اٹھ گئیں۔ وہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھی [illegible] گیا جس کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔ تیرہ [illegible] بھی ان سب کے پیچھے جھومتی [illegible] ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بازوؤں کے گجرے کھڑکھڑا رہے تھے اور ماحول کی پراسراریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

اب پوجا کے وسیع و عریض کمرے میں صرف مرد رہ گئے۔ سوکھے سڑے پنڈت کے دو تین ساتھیوں نے بلند آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیے۔ رام پرشاد جیسے وجد کے عالم میں تھا اور پیتل کی ایک بڑی گھنٹی کو مسلسل حرکت دیے چلا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز در و دیوار میں سرایت کر رہی تھی۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی چلی گئی۔ اشلوک بھی ہیجان خیز ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت پہلے کی طرح اٹھا اور باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پنڈت واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا گول تھال تھا۔ اس تھال میں کوئی تربوز جیسی شے اروی کے پتوں سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھال کے کناروں پر پھول سجائے گئے تھے۔ پنڈت نے یہ تھال بہ مشکل [illegible] رکھا تھا۔

چند قدم آگے بڑھ کر پنڈت نے یہ تھال دیوی کے قدموں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ رام پرشاد عجیب انداز میں گھنٹی کو حرکت دیتا گیا۔ اشلوکوں کی آواز بلند ہو گئی۔ ہر چہرہ مجسم ہیجان تھا۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر اپنا منحنی جسم پیتل کے تھال پر جھکایا اور تربوز نما شے کے اوپر سے اروی کے بڑے بڑے پتے جدا کر دیے۔ شمع دانوں اور چراغوں کی مدھم روشنی میں جو منظر ہمیں دکھائی دیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔

سب کچھ ہمارے سامنے تھا مگر ہمیں اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ پیتل کے گول تھال میں ایک خون آلود انسانی سر رکھا تھا... اور... یہ گرو سوبھاش کا سر تھا۔ ہاں، یہ گرو سوبھاش ہی تھا۔ اس کا منڈا ہوا سر، اس کا صفا چٹ چہرہ، اس کی پھولی ہوئی ناک سب کچھ ہمارے سامنے تھا۔ گرو کی گردن، تھوڑی کے بالکل پاس سے کاٹی گئی تھی اور گردن کے زخم کو پتوں سے ڈھکا دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ منظر سینہ شق کر دینے والا تھا۔

”او خدایا!“ آفتاب خاں نے سرسراتی سرگوشی کی۔ ”یہ تو وہی موٹا ہے جو اتوار رات یہاں سے بھاگ گیا تھا۔“

”ہاں وہی ہے۔“ عمران نے نہایت تاسف سے تائید کی۔

”میرا خیال ہے کہ پیالے میں لہو بھی گرو ہی کا تھا۔“ میں نے [illegible] آواز میں کہا۔

ہم سب [illegible] میں تھے۔ اندر پوجا کا منظر قابل دید تھا۔ سب [illegible] کے [illegible] تھے اور گریہ و زاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ تھے۔ پھر بھی ان میں سے کئی ایسے تھے جو یہ دل دوز منظر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ پیتل کے تھال میں رکھا ہوا انسانی سر جس کے گرد پھولوں کا گھیرا تھا، فربہ چہرہ خون آلود تھا اور نقوش پر آخری وقت کی دہشت اور اذیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ گرو کی پچکی ہوئی تھوڑی اور ایک رخسار پر چوٹوں کے نشان تھے جو اس امر کے گواہ تھے کہ مرنے سے پہلے ان ہی لوگوں نے تشدد بھی کیا ہے۔

رام پرشاد نے فرش پر اوندھے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا۔ ”دیوی! یہ بلیدان سویکار کرو۔ ہمیں آنے والی آفت سے بچا لو۔ ہمیں شما کر دو۔“

اسی طرح کی گریہ و زاری دوسرے لوگ بھی کر رہے تھے۔ مندر میں ان کی پوجا کا انداز بالکل جدا تھا۔ یہ کوئی [illegible] نہیں بلکہ ایک خاص فرقے کا انداز تھا۔

مہا گرو استھان کے تیرہ سیوکوں کا قاتل تھا۔ ہم نے اس کی سزائے موت کا منظر اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر چشم تصور سے یہ منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گرو کو جان بہت پیاری تھی۔ یقیناً اس نے زندہ رہنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کو من گھڑت دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں زور آزمائی بھی کی ہو۔ ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپا پھڑکا بھی ہو لیکن اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔

اس کے انجام پر کچھ ترس تو آ رہا تھا لیکن وہ قابل ترس ہرگز نہیں تھا۔ اسی کی زیر ہدایت و نگرانی میں شکیلہ جیسی بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا... کچھ دیر بعد یہ خصوصی پوجا ختم ہو گئی اور خون آلود سر کو دوبارہ پتوں سے ڈھانپ کر دیوی کے سامنے سے اٹھا لیا گیا۔

ہم بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اتر کر زیریں تہ خانے میں واپس پہنچ گئے۔ سب خاموش تھے۔ واقعے کی سنگینی نے چہروں کو گمبھیر کر رکھا تھا۔ رادھا اپنے کمرے میں لوری کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے پتی دیو کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ جتنی دیر تک بے خبر رہتی، اتنا ہی اچھا تھا۔

”مٹی کم جہاں پاک۔“ آخر اقبال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی تھوڑی کو کھجایا [illegible] بولا۔ ”[illegible] تھوڑا سا غلط ہو گیا ہے۔ [illegible] جاتا ہے اور گرو کافی بھاری بھرکم چیز تھا۔“

میں نے کہا۔ ”جتنا بھاری بھرکم تھا، اتنا ہی خطرناک بھی تھا۔ جو لوگ اپنے مذہب کو اپنی من مانیوں کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ گولہ بارود چلانے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔“

”لیکن گرو کو مارنے والے شاید گرو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو لوگ اپنے ایک ساتھی کو اتنی بے دردی سے قتل کر سکتے ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔“

”بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ اقبال نے عمران کی تائید کی۔

آفتاب خاں پہلی بار تھوڑا سا نروس نظر آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آفتاب کا یوں بار بار یہاں تہ خانے میں آنا جانا کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔“

آفتاب بولا۔ ”ہم کو اپنا فکر نہیں ہے جی۔ ہم تو اکیلا ہے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہم کو آپ کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔ آپ کے ساتھ باجی جیسی عورتیں بھی ہے اور [illegible] ہے۔ عورتوں کے لیے ایک دم خطرناک ہے۔“ پھر اس نے اپنی آواز کو مزید دھیمی کر لی اور بولا۔ ”ہم نے رات کو

digestpk.blogspot.com

تاؤ کے چچازاد بھائی کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ذلیل لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر یہاں لایا ہے۔ آج سویرے باقی عورتوں کو تو چھوڑ دیا ہے مگر ایک کوراچٹا جوان لڑکی ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بے چاری کی عزت بچا رہے گا۔"

آفتاب خاں نے ہمیں کلثوم نامی اس لڑکی کے بارے میں تفصیل بتائی۔ اس نے کہا کہ کل شام لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس جرم میں کھیا نے اسے بری طرح مارا پیٹا بھی تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکی بہت کچھ جانتی ہے اسی لیے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔

آفتاب خاں نے کہا۔ "آپ سچ پوچھتا ہے تو مجھے تو یہ استھان والا لوگ ایک دم دیوانہ لگتا ہے۔ اتنا غصہ ہے ان لوگوں میں کہ ام آپ کو کیا بتائے۔ آپس میں بھی لڑ جھگڑ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ یہاں آ کر دو دھڑوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک تو وہ کھڑی ناک والا ستیش ہے جس کو ابھی ام نے مندر میں دیکھا ہے۔ دوسرا اس کا ساتھی مہندر ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ گرو کو مارنے کے بارے میں بھی ان دونوں میں جھگڑا رہا ہے۔ ستیش شاید گرو کو مار دینا چاہتا تھا اور مہندر اس کا چیلا ہونے کی وجہ سے اس سے تھوڑا بہت رعایت کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ مندر میں مہندر نام کا وہ بندہ پجار تھا میں موجود نہیں تھا۔ ام کو گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔"

ہمارے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ آفتاب خاں ہمارے لیے بڑا کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ وہ باہر کی ساری صورت حال کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مہندر اور گرو کے چار پانچ چیلے مستقل طور پر کھیا رشید کی حویلی میں ہیں جبکہ ستیش، اس کا پکا رام پرشاد وادی اور چند ساتھی ایک دوسرے زمیندار کے گھر میں قیام پذیر تھے۔

جو خوفناک واقعہ ہم نے مندر میں دیکھا تھا، اس کے بارے میں اپنے دیگر ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ تاؤ افضل، رادھا، نوری، سلطانہ اور طلال وغیرہ اس واقعے سے بالکل بےخبر رہے۔

سلطانہ کے حوالے سے میں شام تک سخت کشمکش میں تھا۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہم شام کے بعد کچھ بہتری کے آثار نظر آئے اور مجھے لگا کہ سلطانہ کے بارے میں عمران جو "ماہرانہ" پیش گوئیاں کر رہا ہے، وہ شاید درست ہیں۔ شام کے وقت سلطانہ کا موڈ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ آج اس کے بال کچھ سنورے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا تھا۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل بھی لگایا تھا۔ اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ اچھی بھلی دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تو اس میں ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی بھی تھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حلوہ... تمہارے لیے مہروج۔"

میں نے دیکھا، یہ سوجی کا حلوہ تھا۔ اس پر تھوڑا سا خشک میوہ بھی ڈالا گیا تھا۔ یہ اسی طرز کا حلوہ تھا جو نوری نے بنایا تھا۔

"یہ تم نے بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہوں۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے حلوہ چکھا۔ وہ واقعی نوری کے حلوے سے کہیں بہتر تھا۔ بہرحال میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"کیسا ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں... ٹھیک ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرا گیا اور وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ "زبردست سلطانہ... تم نے واقعی کمال کا بنایا ہے۔"

وہ جیسے اندر سے کھل اٹھی پھر اپنے تاثرات چھپانے کے لیے پانی لینے کے بہانے اندر چلی گئی۔

کتنا فرق تھا اس کی شخصیت کے دو رخوں میں۔ وہ ایک خونی قاتلہ کے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن اب بھی اس کے اندر ایک عورت مکمل طور پر مری نہیں تھی... وہی عورت جو اپنے شریک حیات کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نہال ہوتی ہے۔ اپنے شیرخوار کو اپنے سینے سے لپٹا کر اس سے اٹکھیلیاں کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ ہاں، ابھی وہ عورت کسی نہ کسی درجے میں زندہ تھی اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس زخم زخم عورت کو زندہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی۔ میرے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس کی ممتا بیدار ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد بالو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی چھاتی سے لپٹانا چاہتی تھی۔ یہ صورت حال امید افزا تھی۔ اگر ممتا اس کے اندر زندہ ہو گئی تھی تو پھر امید تھی کہ مکمل عورت بھی زندہ ہو جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں حسرتوں کے قبرستان نہیں ہوں گے۔

میرے چھونے سے سرتاپا لرز سی گئی تھی۔

جب ہم اپنے اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹے تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ہولے ہولے اس کے بالوں میں چلاتا رہا۔ بالوں کا یہ لمس میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ماضی میں، میں ان بالوں کے اندر چہرہ چھپاتا رہا ہوں۔ ان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اتارتا رہا ہوں... یہ دھندلی سی گواہی تھی مگر موجود تھی۔ میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ وہ اپنے تمام تر پیار بھرے اثر کے ساتھ میرے دل میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں رات کی اس تنہائی میں اس کی طرف بڑھتا تو شاید... شاید وہ مجھے راستہ دینے پر آمادہ ہو جاتی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی آزادی اور رضا بھی اس کی زندگی ہی کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اپنی ذات کا دروازہ اس کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پوری آزادی اور پوری عزت نفس کے ساتھ اس دروازے میں خود قدم رکھے۔

وہ سو گئی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی دو سوئی لٹیں اس کے گندمی چہرے پر تھیں۔ مجھے اس کے چہرے پر جارح کردار کے نشتر سے زخموں کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نظر نہیں آیا۔ وہ چاندنی، شبنم اور سورج کی روپہلی کرنوں کی طرح شفاف اور پاک تھی۔

سلطانہ کو دیکھتے دیکھتے میرا دھیان اس کلثوم نامی لڑکی کی طرف چلا گیا جو بقول آفتاب خاں اس وقت اپنی آبرو کے خطرے سے دوچار تھی... میں سہ پہر سے اس لڑکی کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔ کیا ایک اور سلطانہ ایک اور جورج گورا کے پنجے ہوں میں جکڑی جانے والی تھی؟ کیا اس مرتبہ بھی میں کچھ نہیں کر سکوں گا یا پھر اس مرتبہ بھی مجھے تاخیر ہو جائے گی... جیسے شکیلہ والے معاملے میں ہوئی تھی؟ استھان میں اپنی آبرو کے بعد وہ اپنی زندگی بھی نہیں بچا سکی تھی اور اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن ہو گئی تھی۔ میں اور عمران سوچتے ہی رہ گئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ عمران بھی اس کلثوم نامی لڑکی کے سلسلے میں بےچین ہے لیکن میری بےچینی شاید اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس بےچینی میں میرے اندر کی بےچینی اور وحشت بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا... کسی مشکل سے ٹکرانا چاہتا تھا... خود کو کسی بےپناہ صورت حال کے روبرو کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ مجھے درد درکار تھا۔ اذیت چاہیے تھی۔ میری کسی کی ہوئی اذیت سے اگر کچھ لوگوں کے لیے آسانیوں کے در کھل جاتے تو یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

میں نے سلطانہ کو سوتے چھوڑا اور بےچین سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ آفتاب خاں باہر کی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے یہاں آئے گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے اپنا پسٹل جیکٹ کے نیچے لگایا اور خاموشی سے زینوں کی طرف آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کچھ دیر کے لیے سو گیا ہے اور اقبال اوپر والے تہ خانے پر تاؤ افضل اور رادھا کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ میں خاموشی سے زینے چڑھ کر بالائی تہ خانے پر آ گیا۔ یہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور تاریکی تھی۔ میں خاموشی سے لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے گرد آلود بینچ پر بیرونی دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ چار پانچ دن پہلے ہم اسی دروازے سے گزر کر ان تہ خانوں میں داخل ہوئے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر عمران وغیرہ کو معلوم ہوتا کہ میں باہر جانا چاہ رہا ہوں تو وہ مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ ان کی سب سے وزنی دلیل یہی ہوتی کہ اگر خدانخواستہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔ وہ لوگ مجھے تشدد کے شکنجے میں جکڑ لیں گے اور مندر کے تہ خانوں تک پہنچ جائیں گے۔ یہ بہت وزنی دلیل تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اذیت برداشت کرنے کے حوالے سے میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ ناقابل برداشت اذیت کو جھیلنا میری فطرت بنتا جا رہا ہے۔ برداشت کی حد آتی تھی تو میں رک جاتا تھا اور اگلی دفعہ اس حد کو بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔

دروازے سے باہر مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ پھر تالا کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اور آفتاب خاں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آفتاب خاں مجھے وہاں تاریکی میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہم نہایت مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ آفتاب خاں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میں اس وقت مندر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تابش بھائی! ام کو آپ کا بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔ باہر آپ کے لیے بہت خطرہ ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو..."

"دیکھو، میں جو بات کہہ رہا ہوں، پوری طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے برے بھلے کا خود ذمہ دار ہوں اور تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔"

digestpk.blogspot.com

"مگر..."

"آفتاب! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تم بس یہ کردو کہ مجھے کھیا رشید کے گھر کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام..."

"مگر... پھر وہاں آپ کرے گا کیا؟"

"یہ سب کچھ میں تمہیں واپس آکر بتاؤں گا... کل رات۔"

"کیا مطلب؟ آپ آج واپس نہیں آئے گا؟"

"میں تو انشاء اللہ آجاؤں گا مگر تم آج پیچھے نہیں جاؤ گے۔ تم سے ہماری ملاقات اب کل رات ہی ہوگی۔"

"ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ آپ ہم کو ذرا تفصیل سے بتائیں، شاید ہمارے کھوپڑے میں کچھ آجائے۔" آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

اگلے چار پانچ منٹ میں وہیں سیڑھیوں کی تاریکی میں سب کچھ طے ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے اور آفتاب خاں کو آگے پیچھے مندر میں سے نکلنا تھا۔ ہمارے درمیان کم و بیش تیس قدم کا فاصلہ رہنا تھا۔ آفتاب نے مجھے کھیا کے مکان تک پہنچانا تھا اور پھر سیدھا آگے نکل جانا تھا۔ اس نے مجھے کھیا کے مکان کا سارا محل وقوع بھی بتا دیا اور اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ وہاں اندازاً کتنے لوگ اور کہاں کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں آفتاب خاں کی سمجھ میں یہ بات تقریباً آگئی کہ میں کھیا کے گھر سے ام کلثوم نامی لڑکی کو نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اس ارادے نے اسے حیران تو بہت کیا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

باہر نکل کر آفتاب نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر میں بھی باہر آگیا۔ آفتاب نے میری ہدایت کے مطابق دروازہ بند کیا اور تالا دوبارہ لگا دیا۔ اس نے تالے کو بند نہیں کیا لیکن بظاہر وہ بند ہی نظر آتا تھا۔ رات بہت ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے، مدھم ہوا چل رہی تھی۔ میں اور آفتاب آگے پیچھے گاؤں کی گلیوں میں جارہے تھے۔ آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین اور لاٹھی تھی۔ ایک پرانا ناوزر بھی اس کے لباس کے اندر موجود تھا۔ چلتے چلتے وہ گاہے بگاہے آواز بلند کر دیتا تھا۔ "جاگتے رہو۔"

وہ کہہ تو رہا تھا کہ "جاگتے رہو" لیکن فی الوقت وہ خواہش یہی کر رہا تھا کہ "سوتے رہو" اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دو۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ جنگلی جانوروں سے تحفظ کے لیے اکثر گھروں کے گرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی باڑیں لگائی گئی تھیں۔ میرے سینے میں عجیب سا جوش بھر گیا تھا اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

چھوٹے بڑے گھروں کے درمیان مجھے ایک نیم پختہ اور کشادہ مکان نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی کھیا کا گھر ہے۔ گھر کا احاطہ وسیع تھا۔ پھاٹک سے باہر دو تین خالی چھکڑے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آرہا تھا۔ آفتاب نے بتایا تھا کہ کھیا کے مویشی اور گھوڑے وغیرہ احاطے کے اندر ہی ایک اصطبل میں ہوتے ہیں۔ حسب پروگرام کھیا کے گھر کی نشاندہی کرنے کے بعد آفتاب سیدھا آگے نکلتا چلا گیا۔

آفتاب نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ کھیا کے مکان کی دیوار کہاں سے بہ آسانی پھاندی جاسکتی ہے اور کس طرف سے احاطہ پار کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نے آفتاب کی ہدایت کے مطابق ایک جگہ سے چھ فٹ اونچی کچی دیوار پھاندی اور احاطے میں چلا گیا۔ مجھے ایک طویل برآمدے میں داخل ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں چکیں لگی تھیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی بوریاں [illegible] تھیں۔ [illegible] اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں [illegible] ایک [illegible] بھاری آواز میں گانے کی مدھم صدا ابھر رہی تھی۔ کوئی شخص بھرائی ہوئی نشہ زدہ آواز میں بار بار یہ بول دہرا رہا تھا۔ "تنز لالا پن گھٹ پر چھیڑ گیو رے... میری چولی کے بٹنے ادھیڑ گیو رے... میری چولی... میری چولی..."

میں کچھ دیر تک یہ بھونڈی آواز سنتا رہا اور سمت کا تعین کرتا رہا پھر پستول نکال کر ایک تنگ راہداری کی طرف بڑھا۔ لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک ہٹا کٹا شخص فرش کی دری پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس ولیی بوتل کی ساخت سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں تاڑی ہے۔ ویسے بھی اب میں تاڑی کی بو اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ یہ شخص دری پر اینٹھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ خمار کے عالم میں گاتا جا رہا تھا۔ تنز لالا پن گھٹ پر... تنز لالا...

مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں اپنے سائے کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ سامنے دیوار پر میرے سائے کی مدھم حرکت دیکھ کر ہٹا کٹا شخص بے طرح چونک گیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس پر جھپٹ پڑوں۔ میں نے ڈیڑھ کلو وزنی پستول کا دستہ پورے زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ کراہ کر ایک طرف لڑھک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر چلاتا اور کسی کو اپنی مدد کے لیے بلاتا، میں اس پر سوار ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ اس کی آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ وہ خاصا زورآور تھا۔ غالباً نشے نے اس کے زور میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اس نے غیر معمولی طاقت کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلائے اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے میں نے اس کی زخمی کنپٹی پر پستول کا ایک اور وار کیا۔ وہ نڈھال سا ہو گیا۔ میں نے اس کے ادھ کھلے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا اور پھر اسی کپڑے کا بچا کھچا حصہ سے ڈھانپ لیا۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ غالباً اس مکان کے مکین بند کمروں میں لحاف اور کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

میں نڈھال شخص کو بے آواز گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔ برآمدے کے آخری سرے پر جہاں بہت سی چارپائیاں افقی رخ پر کھڑی تھیں، ایک چھوٹا دروازہ نظر آرہا تھا۔ میں اس وزنی شخص کو گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا اس دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا، اس میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرا مکان کے وسیع احاطے میں تھا۔ اس کے دو دروازے تھے، ایک برآمدے میں اور دوسرا احاطے میں کھلتا تھا۔ دروازے کھول کر میں اپنے شکار سمیت کمرے میں آگیا اور دونوں دروازے اندر سے بند کر دیے۔ یہ میری خوش قسمتی رہی تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران میں گھر کے باقی مکین بے خبر رہے تھے۔

میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی اور روشنی اپنے شکار کے چہرے پر پھینکی۔ اس کی کنپٹی لہولہان تھی اور وہ ناک کے راستے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ بہرحال، وہ ہوش میں تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اسی بستی کا رہائشی لگتا تھا۔ تاڑی کے نشے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے پستول اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم جتنا بھی سوچ رہے ہو، میں اس سے زیادہ بے رحم ہوں۔ تمہاری گردن توڑ کر تمہیں اس بھوسے کے ڈھیر میں پھینک جاؤں گا، کل کا سورج تم نہیں دیکھ سکو گے..."

وہ دیکھ چکا تھا کہ میں نے کتنی بے دردی سے اسے پستول کی دو نشان دار چوٹیں لگائی تھیں۔ وہ سخت جان نہ ہوتا تو شاید یہ چوٹیں ہی اسے عدم آباد روانہ کر دیتیں۔ وہ میری جسمانی مضبوطی کا بھی اندازہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی اندھا دھند مزاحمت کو بے اثر کر دیا تھا اور اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میری گردن کے عقب میں گہرا زخم بھی موجود تھا۔ اس زورآزمائی کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور میں ایک بار پھر اپنی پشت پر لہو کی ہلکی سی نمی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم واویلا نہ کرو اور میرے دو تین سوالوں کے جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ میں سے کپڑا نکال سکتا ہوں۔"

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رنگ جلدی جلدی بدل رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پستول کی نال اس کی چوڑی پیشانی پر رکھے رکھے اس کی جامہ تلاشی لی... اس کے کوٹ کی جیبوں سے کچھ نقدی، سگریٹ کا پیکٹ اور چھوٹی موٹی اشیا نکلیں... یہ اشیا میں نے دوبارہ اس کی جیبوں میں ٹھونس دیں۔ ایک چیز میرے علم میں نہیں آسکی اور وہ اس شخص کی قمیص کے نیچے رہی۔

میں نے اس کے منہ میں بری طرح ٹھنسا ہوا کپڑا نکال لیا اور اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ تم کون ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شاید تم عمران اور اقبال کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔"

"میں تمہارے سوال کا جواب ہاں میں دیتا ہوں... اور دیکھو یہ آخری سوال ہے اور اسے آخری ہی رہنا چاہیے۔ نہیں تو گولی دماغ میں جائے گی اور تمہارا یہ گندہ بھیجا ناک کے راستے باہر آجائے گا۔" میں نے پستول کا دباؤ اس کی پیشانی پر اتنا بڑھایا کہ وہاں گہری خراش آگئی اور خون رسنے لگا۔

"پپ... پوچھو۔"

"تمہارا نام؟"

"سس... سلمان... سلو۔"

"او... ہو... تو تم کھیا عبدالرشید کے نورچشم ہو؟"

"ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" وہ ہکلایا۔

"پھر سوال۔ میں نے کہا تھا کہ سوال نہیں پوچھنا۔" میں نے پستول کا بے رحم دباؤ پیشانی پر بڑھا دیا۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے میں غور سے اس کا صحت مند چہرہ دیکھا۔ تو یہ تھا وہ عیاش چودھری زادہ جس نے نوری کو رکھیل کی حیثیت سے رکھا ہوا تھا اور اسی نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ماسٹر فضل کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آج

digestpk.blogspot.com

جاسوسی ڈائجسٹ 102 اپریل 2011ء

رات اس طرح اچانک اس شخص سے ملاقات ہو جائے گی۔ بہرحال، میں یہاں اس کے جرائم اور گناہوں کا حساب کتاب کرنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور تھا اور میری خواہش تھی کہ میں فی الحال اسی مقصد تک محدود رہوں۔

میں نے سلمان سلو نامی اس جواں سال شخص سے پوچھا کہ وہ لڑکی کلثوم کہاں ہے جسے اس گھر میں بند کیا گیا ہے اور مارا پیٹا جا رہا ہے۔

اس نے صاف انکار کر دیا کہ یہاں کوئی لڑکی موجود ہے۔ اس نے کہا کہ تاڑی کی رشتے دار ساری عورتوں کو کل ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور اسے کہا کہ میں صرف دس تک گنوں گا، اس کے بعد ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر گولی چلا دوں گا۔

اس نے میرے لہجے کی بے پناہ تپش محسوس کی اور اس کی تاڑی زدہ آنکھوں میں خوف جم گیا۔ میں نے چھ تک ہی گنا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا... پسینے سے تر پیشانی کے ساتھ بولا۔ "میں تم سے جھوٹ نا ہیں بول رہا۔ وہ لونڈیا یہاں نا ہیں ہے۔ میں قسم کھاوت ہوں۔"

"تو پھر کہاں ہے؟"

"وہ... وہ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کے پاس ہے۔ وہ اسے آج شام ہی ہمارے گھر سے لے گئے تھے۔"

"پھر جھوٹ؟"

"میں قسم کھاوت ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ستیش اسے خود لینے کے لیے آیا تھا۔ اس کی چچی مالا بھی اس کے ساتھ تھی۔"

"وہ کیوں لے گئے تھے؟"

"مجھے... ٹھیک... ٹھیک سے تو پتا نا ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کو ڈر تھا۔ خاص طور سے ستیش کی چچی مالا کو ڈر تھا۔"

"کیسا ڈر؟"

"شاید... وہ سمجھت تھی کہ یہاں اس لونڈیا کے ساتھ اچھا برتاؤ نا ہیں ہووے گا۔ وہ کہوت تھی کہ ہم خود اس سے پوچھ گچھ کر لیویں گے۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے سلمان کو دیکھا... شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"ہمارے... ساتھ والے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں۔ زمیندار پردیپ کے مکان میں۔ ستیش اور اس کے گھر والے بھی وہیں ہیں۔ عورتیں زنانے میں ہیں، مرد دوسرے حصے میں۔"

میں نے تھوڑی سی مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں زنانہ حصہ مکان کی بالائی منزل پر ہے... اور امکان ہے کہ لڑکی کلثوم ستیش کی چچی مالا کے ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں ہو گی... یہ تفصیل میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے مکان کا حدود اربعہ بھی سلمان سے دریافت کیا اور وہاں پہرے وغیرہ کی صورت حال بھی دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں داخل ہونے کے لیے مجھے کھیا کے مکان سے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو چھتوں کے اوپر سے ہی اس چھت پر پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ "تم نے مجھے سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھے دائیں طرف والے تین گھر چھوڑنے ہیں یا بائیں طرف والے؟"

"دائیں طرف والے۔" سلمان نے ہکلا کر کہا۔

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کمینگی کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید وہ مجھے غلط معلومات فراہم کر رہا ہے لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ دوسرا معاملہ ہے اور میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک بھی۔

سلمان کی قمیص کے نیچے ایک تیز دھار چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو اس نے چمڑے کی بیلٹ کے ذریعے پیٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جو تلاشی لی تھی اس میں یہ چاقو میرے علم میں نہیں آ سکا تھا۔ غیر محسوس طور پر سلمان سلو اپنے ہاتھ کو کھسکاتا ہوا اس چاقو تک پہنچا چکا تھا۔ یکا یک وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ یہ اتنا برق رفتار وار تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ چاقو سیدھا میری گردن کی طرف آیا۔ میری اضطراری حرکت ہی تھی جس نے میری گردن کو چاقو کی مہلک نوک سے بچایا۔ موت جیسے مجھے چھو کر نکل گئی تھی۔ میں نے اندھا دھند ایک طوفانی مکا مدمقابل کے سر پر رسید کیا۔ سینڈ بیگ کے ساتھ جنگی نے مجھے جو لگاتار مشقیں کرائی تھیں انھوں نے میرے ہاتھوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ خاص طور سے ہاتھ کی ہڈیوں، کلائی اور کہنی کے جوڑ میں غیر معمولی سختی پیدا ہو چکی تھی۔ سلمان سلو نامی اس بدمعاش کے سر پر میں نے جو مکا رسید کیا، اس سے پہلی مرتبہ مجھے اس وار کی اصلی طاقت اور اثر کا اندازہ ہوا۔ اس وار نے مدمقابل کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر ایک اور زوردار ضرب اس کے

لگائی۔ ایک دم اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ تیسری ضرب کے لیے میں نے ہاتھ اٹھائے لیکن ضرب لگائی نہیں۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ تیسری ضرب کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک خفیف جھرجھری کے ساتھ مدمقابل کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ چاقو ابھی تک اس کے ادھ کھلے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چاقو اس کے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ اگر سلمان یہ اچانک حملے والی حرکت نہ کرتا تو میں اسے زندہ چھوڑتا یا نہیں۔ بہرحال اپنی اس حرکت سے اس نے میری ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے اپنے دفاع میں اس پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں لگنے والی چوٹ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک چھپر تلے دو بیلیاں بندھی تھیں اور چر رہی تھیں۔ چھپر کے پاس ہی ایک چھوٹا کنواں نظر آ رہا تھا۔ اس کے اوپر پانی نکالنے کے لیے لکڑی کی چرخی لگی ہوئی تھی۔ غالباً یہ کنواں خشک تھا۔ ایسے کنوئیں کو دیہات میں "کھوئی" کہا جاتا ہے۔ پنجاب میں تو جہاں زیر زمین پانی کی سطح بلند ہے، ایسی کھوئیاں عام نظر آتی ہیں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے سلمان قالین نما دری پر لیٹا تاڑی پی رہا تھا اور تند لالا... گنگنا رہا تھا۔ تاڑی کی نصف بوتل ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ میں نے بوتل اٹھائی اور جا کر کنوئیں میں پھینک دی۔ بوتل کے گرنے سے اندازہ ہوا کہ کنواں واقعی خشک ہے۔ بوتل کے بعد میں نے سلمان کی لاش بھی کنوئیں میں دھکیل دی۔ یہ قدرے گونج دار آواز سے گری۔ میں تھوڑی دیر تک ایک تاریک گوشے میں رک کر ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ حسب توقع ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے مجرے والے کمرے میں جا کر چھوٹی ٹارچ روشن کی اور تین چار منٹ کے اندر وہ سارے آثار مٹا دیے جن سے یہاں کسی کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میں سیڑھیاں چڑھ کر کھیا کے مکان کی چھت پر آ گیا۔

سلمان سلو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں طرف کچھ چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہاں سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم میں چبھ رہی تھی اور یہ چبھن مجھے مزہ دے رہی تھی۔ گردن کے زخم سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی اسی مزے دار کیفیت کا ایک حصہ تھیں۔ آہستہ آہستہ مزہ دوبالا ہوتا جا رہا تھا اور یہ میرے اندر کی بڑی انقلاب آفریں کیفیت تھی۔

مجھے چھتیں پھلانگنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی۔ ایک منڈیر پر میں پھسلتے پھسلتے بچا، تاہم تین چار منٹ کے اندر میں زمیندار پردیپ کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ چار پانچ سیڑھیاں اتر کر میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جس کی نشان دہی کھیا کے بیٹے سلمان سلو نے کی تھی۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر مجھے چند مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان دروازے سے لگا دیا۔ کوئی لڑکی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ پھر نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک اور نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "اچھا، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔"

"ہم... مجھے اکیلا ناہیں چھوڑو دیدی۔" وہ کراہتی ہوئی آواز نے کہا۔

"یہاں کوئی ناہیں آسکت۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بس دو منٹ میں آوت ہوں۔" دوسری آواز ابھری۔

میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کی چٹخنی گری اور ایک سایہ نظر آیا۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ رام پرشاد کی بہو اور ستیش کی چچی مالا تھی۔ وہ حسب سابق زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ کانوں میں طلائی جھمکوں کی چمک بھی نظر آئی۔ وہ اپنی گرم چادر سنبھالتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔ اندر سے ہولے ہولے کراہنے کی آواز بدستور آتی رہی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کمرے میں اب ایک لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دو پلنگ، لکڑی کی الماری اور جستی صندوق وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں ادھ بجھی انگیٹھی بھی سلگ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک لڑکی بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ اس کا بالائی جسم تقریباً عریاں تھا۔ شاید انگیٹھی کی حرارت کے سبب وہ لحاف کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سفید شفاف کمر پر چھڑیوں کے کئی نیلگوں نشان تھے۔ کہیں کہیں سے خون بھی رس آیا تھا۔ ان نشانات پر کوئی دوا لگائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ کان پر رکھا ہوا تھا اور کراہ رہی تھی۔

یقیناً میرے اندر داخل ہونے سے مدھم آہٹ پیدا ہوئی ہو گی مگر لڑکی چونکی نہیں اور نہ ہی اس نے بستر پر سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ غالباً وہ یہی سمجھی تھی کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس آ گئی ہے۔

میں نے قریب پہنچ کر اچانک لڑکی کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگادی۔ وہ بری طرح تلملائی مگر میں نے اسے اپنے بوجھ تلے دبا لیا تھا۔ میری سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود آواز نہ نکال سکی۔ اس کا منہ میری ہتھیلی سے پوری طرح ڈھک چکا تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''کلثوم! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تاؤ افضل نے بھیجا ہے۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر تڑپ پھڑک دکھائی اور غوں غاں کی آوازیں نکالیں۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا لیا اور نرمی سے کہا۔ ''دیکھو... اگر شور کروگی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ میں پکڑا جاؤں گا اور تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

اس کا جسم قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ چہرہ گھما کر مجھے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور کہا۔ ''اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں اور... تمہیں بتاتا ہوں کہ میں یہاں سے [illegible]''

اسے پرسکون کرنے کے لیے مجھے دو تین فقرے مزید بولنے پڑے۔ آخر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے پلٹے گی اور میرا چہرہ دیکھے گی لیکن وہ اوندھی پڑی رہی۔ اس نے فقط اپنا چہرہ گھمانے پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس اور بے یقینی کی کیفیت موجود تھی تاہم شکر کا مقام تھا کہ اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔

''کک... کون ہو تم؟'' وہ بری طرح ہکلائی۔

''فی الحال تم صرف اتنا جانو کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور مجھے تاؤ افضل نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کریں گے۔''

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی بے لباسی کی وجہ سے سیدھی نہیں ہو رہی۔ میں نے اسے ایک گرم چادر دی تاکہ وہ اپنا جسم ڈھانپ لے۔ وہ چادر لپیٹ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور سفید رنگ بالکل لٹھے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اکیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ اچھے نین نقش کی ایک غریب دیہاتن نظر آتی تھی۔ شاید عام حالات میں اسے خوب صورت بھی کہا جا سکتا ہو مگر فی الوقت دہشت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

''تت... تاؤ... خود کہاں ہیں؟''

''اگر تم مجھ پر بھروسا کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے آدھ گھنٹے میں تم اپنے تاؤ اور تاؤ زاد بھنوں سے مل سکو گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

اس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بھروسے کی طرف آ رہی ہے۔

''لیکن... تم نکلو گے کیسے؟'' وہ منمنائی۔

''یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس یہ کرو کہ قمیص اور جوتا وغیرہ پہن لو۔''

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آئیں۔ کلثوم کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''میرا خیال ہے... وہ یہی آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے آوازوں پر بغور کان لگائے۔ کوئی واقعی سیڑھیوں کے پاس موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ باہر نکلنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر مجھے چھپنا تھا تو کمرے کے اندر ہی چھپنا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بہترین جگہ الماری کا عقبی خلا تھا۔ اب قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دے رہی تھی۔ میں کلثوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے الماری کے پیچھے چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور مالا اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ ''یہ دیکھو، سرسوں کے تیل میں لہسن پھلی جلا کر لائی ہوں۔ یہ بہترین دوا ہے کان کے درد کے لیے۔''

کلثوم اب بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ اسی طرح اوندھی لیٹی تھی جیسے میرے آنے سے قبل تھی۔ مالا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل یا تانبے کی چھوٹی سی پیالی اور چمچ تھا۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا سا گرم تیل کلثوم کے کان میں انڈیلا پھر کان کو ہاتھ سے ہولے ہولے ہلانے لگی۔ کلثوم آنکھیں بند کر چکی تھی۔

''دیکھنا، ابھی پانچ دس منٹ میں آرام آ جاوے گا۔ بڑا پرانا نسخہ ہے۔'' وہ غنودگی بھری آواز میں بولی۔

اس کے حلیے سے پتا چلتا تھا کہ کلثوم کی کراہیں وغیرہ سن کر وہ نیند سے بیدار ہوئی ہے۔

وہ دو چار منٹ کلثوم کے سرہانے بیٹھی رہی۔ پھر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ کلثوم بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے اوندھی لیٹی رہی۔ لالٹین کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رخسار ہلکا نیلا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مار پیٹ کے دوران میں اسے زوردار تھپڑ مارا گیا ہے۔ غالباً اسی تھپڑ کے سبب اس کے کان میں ہوا بھر گئی تھی اور درد شروع ہو گیا تھا۔

کلثوم کی حالت دیکھ کر وہ تمام اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے جو ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ اسے یہ لوگ جسمانی تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے... پہلے وہ مہندر، چھیل اور کھیو وغیرہ کے پاس تھی۔ اب یہاں آ گئی تھی مگر یہاں بھی کون سے فرشتے تھے۔ ستیش، بھولا ناتھ اور اروان وغیرہ بے رحم انتہا پسند تھے۔ وہ کسی بھی وقت اس لڑکی کو بدترین حالات سے دوچار کر سکتے تھے۔ اکیلی مالا کہاں تک اس کے آگے ڈھال بن سکتی تھی۔ غالباً اس صورت حال کو کلثوم بھی سمجھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب تک مالا کو میری موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں الماری کے عقب میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ میری گردن کے زخم سے درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ بارہا [illegible] تھا... درد اتنا کٹھن نہیں ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہم درد کے ساتھ اپنی طرف سے بہت کچھ شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ درد کے اصل حجم اور شدت کو سمجھنا چاہیے... اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔

چند منٹ بعد مالا نے نیند بھری آواز میں کلثوم سے پوچھا۔ ''کچھ فرق پڑا؟''

''ہاں، کچھ پڑا ہے۔'' کلثوم نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مالا اپنے پلنگ پر سو چکی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور بغیر آواز پیدا کیے کلثوم تک پہنچ گیا۔ تب تک کلثوم قمیص پہن کر گرم چادر اپنے گرد لپیٹ چکی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک پلنگ پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر تذبذب میں نظر آئی مگر جب میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈری ہوئی نظروں سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کی آمادگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مالا کی موجودگی کے باوجود وہ باقی لوگوں سے سخت خوف زدہ ہے۔

سب سے مشکل مرحلہ یہ لگ رہا تھا کہ بغیر آواز پیدا کیے چٹخنی گرائی جا سکے اور دروازہ کھولا جا سکے۔ میں نے پستول پھر ہاتھ میں لے لیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھولا تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ مالا ذرا کسمسائی مگر بیدار نہیں ہوئی۔ میں کلثوم کو لے کر کمرے سے باہر آیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

اگلا آدھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔ اس آدھ گھنٹے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے احاطے میں اترنے کے بجائے چھتوں کے راستے واپس جانا مناسب سمجھا۔ دو چھتیں پار کرنے کے بعد وہی خطرناک منڈیر آ گئی جہاں سے میں پھسلتے پھسلتے بچا تھا مگر میں اس مرحلے کو طے کرنے کا انتظام پہلے سے سوچ چکا تھا۔ یہاں پچھواڑے کی طرف گلی میں پرالی کا ایک بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ پہلے میں نے کلثوم کو چھلانگ لگانے پر آمادہ کیا۔ وہ قریباً چھ فٹ نیچے پرالی پر بے آواز گری۔ میں نے بھی کلثوم کے پیچھے چھلانگ لگائی۔ ہمیں قریب موجود دو پہرے داروں کو کچھ خبر ہوئی۔ [illegible] دوڑتے ہوئے پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتے رہے اور ایک ٹارچ کی روشنی [illegible] پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہم پرالی کے ڈھیر سے نکلے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے مندر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

آدھ گھنٹے بعد میں کلثوم کے ساتھ مندر کے سب سے نچلے تہ خانے کی خوش گوار حرارت میں موجود تھا۔ عمران، اقبال، تاؤ افضل، سلطانہ سب ہمارے گرد جمع تھے۔ تمام چہرے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں، میں نے جو کچھ کیا تھا... وہ میری توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ سب کچھ جذباتی اور کسی حد تک غیر دانش مندانہ بھی تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا، کامیابی سے ہو گیا تھا اور کامیابی ایک ایسی دلیل ہے جو ہر بڑی سے بڑی دلیل پر حاوی آ جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فتح اور کامرانی کو منطق درکار نہیں ہوتی۔

تاؤ افضل نے کلثوم کو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ تاؤ افضل کو بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوتا رہا ہے۔ پہلے کھیا اور مہندر وغیرہ نے اس سے بری طرح مار پیٹ کی تھی۔ پھر اسے ستیش اور اروان وغیرہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں بھی

digestpk.blogspot.com

اس سے تحت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ طیش میں آکر ستیش نے اسے زوردار تھپڑ بھی رسید کیا تھا جس سے اس کا کان اب تک سُن تھا اور اندر سے درد بھی کر رہا تھا۔

کلثوم نے تاؤ کو بتایا۔ ''یہ لوگ مجھ سے آپ کے بارے میں اور آپ کے مہمانوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اس بارے میں جانتی ہوں کیونکہ میں نے کھیا کے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟'' تاؤ نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کی گردن جھک گئی۔ وہ دکھ آمیز شرم کے ساتھ بولی۔ ''کھیا بہت برا بندہ ہے۔ مجھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔ وہ شراب پی کر مجھ کو لال لال آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ بے شرمی کی باتیں کرتا تھا۔''

عمران اور اقبال یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ میں کس طرح مندر سے نکلا اور کیسے کلثوم کو استھان والوں کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے انہیں تفصیل بتائی۔ بہرحال اس تفصیل میں، میں نے سلطان سلو کی موت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات میں عمران کو اکیلے میں بتانا چاہتا تھا۔ عمران مجھے مصنوعی ناراضی سے گھورتا رہا۔ اس کے گھورنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے میری اس دیدہ دلیری پر خوش بھی ہے... اس نے کہا۔ ''کام تو تم نے دلیری کا کیا ہے اور بڑا اقدام اٹھایا ہے... لیکن تہ خانے سے نکلتے ہوئے تم شاید اپنی ''چیپ'' کے بارے میں بھول گئے تھے۔''

''نہیں... یہ درست ہے مجھے یاد تھی مگر میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا ہوں۔''

''پھر بھی رسک تو رسک ہی ہوتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''تم نے کئی دفعہ تین گولیاں ریوالور میں رکھ کر اپنے اوپر ٹریگر دبایا ہے۔ اس سے تو کم رسک ہی تھا۔''

''اچھا، اکیلے میں تم سے بات کروں گا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔

میری کارروائی کے حوالے سے سلطانہ کی حیرت سب سے زیادہ تھی۔ وہ ماضی میں مجھے ایسی حالت میں دیکھتی رہی تھی جب میں اپنا بوجھ بھی سہار نہیں سکتا تھا... لیکن اب میں بدترین حالات میں بڑی بے خوفی سے دوسروں کا سہارا بن رہا تھا۔

وہ میری قمیص پر گردن کے پاس خون کے داغ بھی دیکھ چکی تھی۔ ان نشانات نے اسے سمجھا دیا تھا۔ میرا زخم پھر خون اُگلنے لگا ہے۔ وہ بے چین تھی کہ میں اپنی بات چیت ختم کروں تو وہ مجھے کمرے میں لے جائے اور میرا زخم دیکھے۔

عمران نے بھی میرے زخم سے خون کا رساؤ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں جانے اور قمیص بدلنے کا کہا... وہ رات آخری پہر تک سلطانہ میری دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ وہ اندر سے خوش بھی تھی۔ وہ مجھ سے اس سارے واقعے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل پوچھ رہی تھی۔ آخر میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''تم نے بہت خطرناک کام کیا ہے میروج! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا پھر...؟''

''تو کیا تمہاری دعا میرے ساتھ نہیں تھی؟''

''وہ تو ساتھ ہی ہوتی ہے۔''

''کیا آئندہ بھی ساتھ رہے گی؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو میروج؟''

''جب میں جارج گورا کو لاش کی شکل دینے کے لیے اس کی طرف جاؤں گا... اس وقت بھی تمہاری دعا میرے ساتھ ہوگی نا؟''

وہ سسک کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ میرے ہاتھ اس کے شانوں پر متحرک تھے۔ یہ شانے... یہ شانے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں انہیں جانتا تھا، بہت اچھی طرح۔ اور قریب سے... اور ان شانوں کو ہی نہیں، شاید اس پورے جسم کو جانتا تھا۔ ہاں، یہ ایک بے پناہ جسم تھا۔ یہ اپنی سادگی، رعنائی اور پُرجوش محبت کے ساتھ میرے بہت قریب رہا تھا۔ مجھے اس جسم کے تمام تر لمس یاد آ رہے تھے۔ یہ کسی گم خزانے کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ اس جسم کے لیے، ان شانوں کے لیے، اس نہایت چمکیلی اور پتلی کمر کے لیے ان گھنے بالوں کے لیے میرے اندر ایک بہت بڑا خلا ہے... مجھے یہ سب درکار تھا۔ پوری شدت اور چاہت درکار تھا۔ مجھے لگا کہ میں سلطانہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ کیا یہ محبت اب شروع ہوئی تھی یا پھر بہت پہلے سے شروع جب وہ اس جسم کے ساتھ میری خواہشوں کی ساتھی بنی تھی؟

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا شفاف چوما تو... پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ کوئی جیسے ایک جھٹکے سے سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ اس کے میں لرزش نمودار ہوئی اور وہ اپنا آپ سمیٹنے لگی۔ اس کے میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل گئے۔ جیسے سوکھی ریت سے نکل جاتی ہے۔ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

digestpk.blogspot.com

میں ایک دم اکیلا ہو گیا۔ میرے قریب ہونے کے باوجود وہ قریب نہ رہی۔ پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ میرے قریب آتے آتے دور چلی جاتی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیسی دیوار تھی جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو سلطانہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے اپنے اردگرد نہ پا کر مجھے شاک سا محسوس ہوتا تھا۔ یہ خوف برق کی طرح ذہن میں لہرا جاتا تھا کہ کہیں وہ پھر تو کسی طرف رخ نہیں کر گئی۔

''سلطانہ... سلطانہ۔'' میں اسے پکارتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف گیا... وہ نانک چیدی اینٹوں کے بنے ہوئے قدیم غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ لگتا تھا کہ آج وہ پھر اس کیفیت سے دوچار ہوئی ہے جس سے تل پانی میں ہوتی رہی تھی۔ وہ پہروں تک نہاتی تھی اور پتھر سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر سرخ کر لیتی تھی۔ میں نے دیکھا، آج بھی اس کی کلائیاں، ہاتھ اور گردن وغیرہ پتھر کی رگڑ سے سرخ دکھائی دے رہے تھے... میرا دل رو دیا۔ اس کا ذہنی صدمہ اس کے اندر بہت گہرائی تک اتر گیا تھا۔ وہ کسی طور اس سے چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ کوشش کرتی تھی مگر ناکام ہو جاتی تھی۔ دو تین دن پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ خود کو بدل رہی ہے مگر اب پھر صورتِ حال جوں کی توں تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سلطانہ کو اس کی نارمل زندگی کی طرف واپس لانا آسان نہیں ہے۔ میرے اندر سے طیش کی ایک لہر اٹھی۔ یہ لہر اس شخص کے لیے تھی جو کسی مجبور عورت کو اپنے مردانہ اختیار تلے روندتا ہے۔ تھوڑی دیر کی مسرت کے لیے اس کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیتا ہے... اور وہ عشرت بھی کیا عشرت ہوتی ہے۔ وہ کھوکھلی خوشی اکثر مہیب پچھتاوؤں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ میرے اندر جارج گورا کے لیے بھڑکنے والی آگ کچھ اور بھی شعلہ فشاں ہو گئی۔

اگلے روز میں نے عمران کو اس سنگین ترین واقعے کے بارے میں بتا دیا جو کھیا عبدالرشید کے مکان میں پیش آیا تھا۔ کھیا کا بیٹا سلطان سلو اتفاقیہ مجھ سے ملا تھا اور پھر جہنم واصل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احاطے کے خشک کنوئیں میں پھینک دی تھی۔

ہم سارا دن اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ اصل حالات کا علم تو آفتاب خان کی آمد کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس موت نے فتح پور میں زبردست ہلچل مچائی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس واقعے کو کوئی خاص رخ دیا جا رہا ہو۔ آفتاب خان کی آمد رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہی ہو گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ آج بھی اس کے پاس ہمارے لیے اہم خبریں موجود تھیں۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ فتح پور میں زبردست ہلچل تو ہے مگر یہ ہلچل سلطان سلو کی موت کی وجہ سے نہیں، لڑکی کلثوم کی وجہ سے ہے۔ آفتاب خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''تو سلو کی موت کو سب نے اتفاقی ہی سمجھا ہے جی۔ سب کا خیال ہے کہ وہ تاڑی کے زوردار نشے میں تھا۔ باہر نکلا اور کنوئیں میں گر گیا۔ اس کا بوتل بھی کنوئیں سے ہی ملا ہے۔''

پھر آفتاب میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کیا کہتا ہے جابش بھائی، ایسا اتفاقیہ تھا یا پھر...؟''

''تمہارے سوال کا جواب وہی ہے جو تمہارے ذہن میں بھی ہے۔'' عمران نے معنی خیز انداز میں کہا۔

آفتاب خان نے تفہیم میں سر ہلایا اور کچھ مزید پُرجوش نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''عمران بھائی! آپ سب کے لیے ایک اچھا اطلاع ہے۔ کلثوم بی بی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے استھان والا آپس میں جھگڑا کر رہا ہے۔ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ بڑا زوردار تماشا لگا ہوا ہے۔''

''کیسا تماشا؟'' عمران نے پوچھا۔

''مہندر اور کھیا وغیرہ نے رام پرشاد پر الزام لگایا ہے کہ اس کی بہو بالا نے لڑکی کو جان بوجھ کر بھگا دیا ہے۔ اس طرح اس نے دھرم کو بری طرح نشٹ کیا ہے۔ وہ اس کو سزا دینے کا بات کر رہا ہے۔''

یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ عمران نے کہا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

آفتاب بولا۔ ''ہم نے اندازہ لگایا ہے جی کہ یہ سب جنونی لوگ ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کی آنکھوں سے شعلہ نکلنے لگتا ہے۔ پرسوں رام پرشاد کا بہو بالا اور بیٹا ستیش اس لڑکی کلثوم کو کھیا کے پاس سے لے آیا تھا۔ دراصل یہ سب بالا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لڑکی کھیا اور مہندر وغیرہ کے پاس رہا تو اس کا عزت خراب ہو جائے گا۔ کھیا اور مہندر نے سب کے کہنے پر کلثوم کو بھیج تو دیا تھا، پر ان کو یہ سب بہت برا لگا تھا۔ سلو کی موت کی وجہ سے بھی ان لوگوں میں تھوڑا بہت چپقلش موجود تھا۔ کل سویرے سے جب یہ پتا چلا کہ کلثوم زمیندار پردیپ کمار کے گھر سے غائب ہے تو

مہندر اور ان کا سسر تھی لوگ ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے رائفلیں اور تلواریں تان لیا اور کوئی ایک سو ہندو پردیپ کمار کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ رام پرشاد کی بہو مالا مجرم ہے۔ اس نے لڑکی کو بھگا دیا ہے، حالانکہ وہ لڑکی اپنے تاؤ اور سلطانہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔"

"رام پرشاد کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی بہو کو بالکل بے گناہ بتا رہا ہے۔ سنتوش بھی یہی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اس کی بیوی کو کچھ پتا نہیں۔ وہ کلثوم کے ساتھ اوپر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر پہرے دار تھے۔ گھر کی نگرانی ان پہرے داروں کا ذمے داری تھا، میری بیوی کا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کسی نے ستو کے مرنے اور کلثوم کے غائب ہونے والے معاملے کو آپس میں جوڑا تو نہیں؟"

"ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا جی۔ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا اور ہمارا خیال ہے کہ جائے گا بھی نہیں۔"

"اب یہ واردات کس کروٹ بیٹھے گی؟" اقبال بولا۔

"کون سا واردات جی؟" آفتاب خان نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب صورت حال کس طرف جاتی نظر آتی ہے؟"

"ام ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا جی... معاملہ گڑبڑ ہے۔ دونوں طرف سے بہت سخت باتیں ہو رہا ہے... ام نے سنا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی یہاں پہنچ رہا ہے۔ مکھیا کی حویلی پر کوئی بہت بڑا پنچایت ہوگا۔ اگر اس پنچایت میں فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر جھگڑا اور بڑھ سکتا ہے۔ اب بھی دو چار لوگ ایسا ہے جو غصے میں جھگڑا بڑھ جانے والا باتیں کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ام نے ابھی شام کو سنا ہے۔ مہندر کا ایک ساتھی چوپال میں کہہ رہا تھا کہ اگر رام پرشاد کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ مہندر صاحب کے پاس اس لڑکی کا عزت محفوظ نہیں تھا تو ام بھی رام پرشاد اور اس کے بیٹے پر اس طرح کا شک کر سکتا ہے۔ کیا پتا وہاں زمیندار کے گھر میں اس لڑکی کا عزت لوٹا گیا ہو اور اسے مار کر کہیں گاڑ دیا گیا ہو۔ بس جی اس طرح کا بہت سا باتیں گاؤں میں چل رہا ہے۔"

یہ بالکل نئی صورت حال سامنے آئی تھی۔ دنیا بھر کے انتہا پسندوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دور بدور تند و تیز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے بے لچک رویوں کی وجہ سے وہ گروہ در گروہ تقسیم ہوتے ہیں۔ ان میں فرسٹریشن بڑھتی ہے اور وہ زیادہ سفاک اور بداخلاق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے عجیب کشمکش و بے چینی میں گزرے۔ ہمیں دیکھنا تھا کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ گو کہ بے رحمانہ قتل کے بعد تو ان لوگوں کی سفاکی میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ آفتاب خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ ارد گرد سے اور بہت سے لوگ بھی یہاں رانج پور میں جمع ہو رہے تھے... وہ ہر صورت اپرادھن یعنی سلطانہ کو اس کے انجام تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

اس علاقے میں جاہلیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا... اور اب یہ جادو دھیرے دھیرے اس بگھیرا بستی کو اپنے پنجوں میں جکڑ رہا تھا۔

میں سلطانہ کی طرف سے بھی بہت پریشان تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک حصہ میری طرف آنا چاہتا ہے اور دوسرا اپنے شیر خوار بچے کی طرف۔ دوسرا حصہ اسے ہم دونوں سے دور لے جا رہا ہے۔ ... کشش کر رہا ہے۔ ... جہاں اس کی عزت کا قاتل ... اپنی پوری نحوست اور نجاست کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرح کی من مانیاں کرتا ہوا اور اپنی من پسند ... میں گھرا ہوا۔ جنھیں وہ ... قرار دیتے تھے۔

اب پچھلے تقریباً چھتیس گھنٹے سے سلطانہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔ رات کو میری بار بار کی ضد کے بعد اس نے چند نوالے لیے اور کلثوم کے ساتھ تھوڑی بہت باتیں کیں۔ رات کو ہم اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے مگر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ زمین کی اس گہرائی میں باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اندھیری رات ہے یا چاندنی۔ بارش ہو رہی ہے یا کڑکتی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارے رابطے کا واحد ذریعہ آفتاب تھا اور اسے آج پتا نہیں آنا تھا یا نہیں۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ "مہروج!" اچانک سلطانہ کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح اپنے بستر پر چت لیٹی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مہروج..." وہ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"ہاں ہاں... کہو۔"

"مہروج! میں تمھیں بہت دکھ دے رہی ہوں نا؟ تمھیں دن رات پریشان کر رہی ہوں۔"

"میں صرف اس وجہ سے دکھی ہوں کہ تم دکھی ہو۔ تم خود کو سنبھال نہیں پا رہی ہو۔"

"مہروج! کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

"کیا مطلب؟"

"مہروج! تم مجھ کو بھول جاؤ۔ سمجھو... کہ... میں تم پالی سے جانے کے بعد دوبارہ کبھی ملی ہی نہیں تھی۔"

"اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ سو جاؤ۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "مہروج! میں جانتی ہوں کہ تم کسی سے پیار کرتے تھے، بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ تم سے دور چلی گئی اور میں تم دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے۔"

"یہ تم کیا کہے جا رہی ہو؟" میں جھنجلا گیا۔

"مہروج! ان دنوں تم اپنے ہوش میں نہیں تھے... تم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا نام پکارتے تھے۔ ... تم اسے بہت یاد کرتے ہو مہروج! اور شاید وہ بھی کہیں پر بیٹھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا مہروج کہ وہ پھر تم کو مل جائے۔ تم اس راجواڑے سے نکلنے کے بعد اسے ڈھونڈو۔ مہروج! مجھے شتین (یقین) ہے کہ وہ ضرور تمھیں ملے گی، ضرور ملے گی۔ وہ تمھاری زندگی کی ہر کمی کو پورا کر دے گی۔ تم میرے بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا مہروج! بالو کو اس کی گود میں ڈال دینا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری طرح وہ بھی بہت اچھی ہو گی۔ وہ میرے بچے کو اپنے بچوں کی طرح پیار دے گی۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو مہروج؟"

میرا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سلطانہ کو اس کے شانوں سے پکڑوں اور بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔ پھر دھکا دے کر دور گرا دوں یا پھر یہاں سے جھنجلا کر اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جاؤں... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

وہ اپنے جذباتی دھارے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اٹھ کر اس نے اپنا سر میرے پاؤں میں رکھ دیا اور سسک کر بولی۔ "مہروج! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔ تم مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ میری زندگی کا کوئی پتا نہیں۔ جب تک زندہ رہوں گی تم کو یاد رکھوں گی۔ تمھارے لیے دعائیں کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ملے گی کہ تم جہاں کہیں بھی آباد ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بچہ بھی آباد ہے۔ میری خاطر مہروج! میری خاطر... میری یہ بات مان لو۔ سمجھو کہ میں تم سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہی ہوں۔"

میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑائے اور چارپائی سے اتر کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی سسکتی رہی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی نے بستر پر کنڈلی مار رکھی تھی۔

میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ! بدقسمتی ہے جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا، وہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر تمھارا کوئی بس نہیں تھا مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ جو دکھ تم اب دے رہی ہو، یہ بالکل ہی برداشت سے باہر ہے۔ تم مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دو گی۔ ساری امنگیں ترنگیں جو مجھ میں پیدا ہوئی تھیں... [illegible] ... پچھلے باپ کا سایہ ... [illegible]"

"خدا کے لیے مہروج! ..." [illegible] سینے آ ... ہو کر میرا بازو تھام لیا۔

میں نے بازو چھڑایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی پانی کی نیلی جھیل ہو۔ یخ بستہ ہوا میرے بدن کو چیر رہی ہو۔ میں جھیل کے کنارے بھاگتا چلا جاؤں، بھاگتا چلا جاؤں یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں۔ لیکن جھیل تھی نہ کنارہ، نہ یخ بستہ ہوائیں۔ میں اپنے ساتھیوں سمیت اس تین منزلہ تہ خانے کا اسیر تھا۔ میں اس قبر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

میں بالائی تہ خانے میں آ گیا اور بے قراری سے ایک برآمدہ نما مستطیل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر مدھم آہٹیں ابھریں۔ یقیناً آفتاب خان آیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ ایک لاٹھی اور لالٹین سمیت میرے سامنے تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ "بہت خاص خبریں ہیں شاہ بھائی۔ عمران بھائی کدھر ہے؟"

میں آفتاب کو لے کر سیڑھیاں اترا اور زیریں تہ خانے میں آ گیا۔ عمران اور اقبال میری ایک آواز پر ہی کمرے سے نکل آئے۔ یقیناً وہ بھی آفتاب کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ آفتاب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "مالا تو مارا گیا ہے جی... ام نے سنا تھا کہ کچھ لوگ اپنے دین دھرم

digestpk.blogspot.com

کے لیے بالکل جنونی ہو جاتا ہے۔ یہ ادھر استھان والا لوگ بھی ایک دیوانہ پن دکھا رہا ہے۔ آج سارا دن گاؤں میں خوب تماشا لگا ہے۔"

پھر آفتاب نے اپنی گول ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ "جھگڑا بہت لمبا ہو گیا ہے جی۔ آج سارا دن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ فتح پور میں آتا رہا ہے۔ اب یہاں ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ جمع ہو چکا ہے۔ آج دوپہر کھیا کے مکان پر بہت بڑا پنچایت ہوا ہے۔ اس پنچایت میں مہندر اور اس کے ساتھیوں نے یہ الزام دہرایا ہے کہ رام پرشاد کی بہو نے لڑکی کلثوم کو بھگایا ہے اور ایک ایسا اپرادھ کیا ہے جس کا سخت سے سخت سزا ملنا چاہیے۔ دوسری طرف رام پرشاد اور اس کے بیٹے ستیش نے اس الزام کو ماننے سے صاف انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑکی موقع دیکھ کر خود فرار ہوا ہے۔۔۔ ان کا صفائی ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ خود مہندر اور اس کے سیکڑوں ساتھیوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر ستیش کی پتنی مالا سچا ہے تو پھر وہ پر کھشا دے۔"

"پرکھشا سے کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"وہ اس کا آزمائش کرنا چاہتا ہے۔۔۔ وہ کسی بہت پرانی رسم کا بات کر رہا ہے۔ اس میں ستیش کی پتنی کو بہت نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔"

"کیسا نقصان؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ لوگ کہتا ہے کہ اگر ستیش کا بیوی یعنی رام پرشاد کا بہو سچا ہے تو وہ مندر میں جا کر اپنا سچ ثابت کرے۔ وہ ابلتے ہوئے تیل کی کڑاہی کا بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستیش کی پتنی سچا ہے تو تیل میں اپنا ہاتھ ڈال کر ثابت کرے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ "یہ میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔ دراصل ہندوؤں کی دیو مالا میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب رانی سیتا جی پر بہتان لگا تھا تو اس نے تیل کی ابلتی ہوئی کڑاہی میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے اس کے ہاتھ جلنے سے بچ گئے تھے۔ کچھ خبطی لوگ اس واقعے کو اب تک لے کر چل رہے ہیں۔ جب کسی بڑے جرم میں کسی کو اپنی صفائی پیش کرنی ہوتی ہے تو اس کو اس آزمائش سے گزرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔"

"یہ تو بڑی جاہلیت کی بات ہے۔" عمران نے کہا۔ "مکروفریب کے اس دور میں ایسی آزمائش کا مطلب بھی مکروفریب ہی ہے۔"

"لیکن جناب! اپنا لوگ سچ کہتا ہے کہ بندہ جو ہوتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے۔" آفتاب خان نے مونچھیں سہلا کر کہا۔ "اب بات یہ ہے کہ ستیش کا دادی وہ منحوس بڑھیا بھی ایک دو موقع پر ایسے ہی دوسرے لوگوں کو یہ آزمائش دینے پر مجبور کر چکا ہے۔ اب اس کا مخالف لوگ بھی یہ بات پکڑ رہا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تب ایسا آزمائش کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا تو اب کیوں نہیں۔ اس بڑھیا کی وجہ سے اب اس کا بیٹا رام پرشاد اور اس کا پچھے ملی (فیملی) پھنس گیا ہے۔ یا تو اب رام پرشاد کی بہو کو یہ آزمائش دینا پڑے گا یا اس کو مجرم ٹھہرا دیا جائے گا۔"

یہ واقعی دلچسپ اور سنگین صورت حال تھی۔ ان لوگوں کا بے پناہ کٹڑپن اور ان کے اندر کی سفاکی تو اب ثابت ہو ہی چکی تھی۔ یہ لوگ جس طرح سلطانہ کو زندہ جلانے پر تل گئے تھے اور پھر جس طرح انہوں نے اپنے ہی "محترم گرو" کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے عقیدے کی پیروی میں ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

عمران نے پوچھا۔ "اب پنچایت کس نتیجے پر ختم ہوا ہے؟"

آفتاب بولا۔ "کوئی پورا نتیجہ تو اب تک کوئی نہیں نکلا ہے جی۔ جب شور بہت بڑھ گیا اور پنچوں نے فیصلہ دیا کہ ستیش کی پتنی کو آزمائش دینا پڑے گی تو ستیش ایک دم طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ہاتھ جلانے ہی ہیں تو پھر میں اپنے ہاتھ جلاؤں گا۔ بڑے پنچ نے کہا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو وشواس ہے کہ تمہارا پتنی سچا ہے تو پھر تم اس کے نام پر آزمائش دے سکتا ہے۔ اگر تمہارا پتنی سچا ہے تو بھگوان تمہارا رکھشا کرے گا۔"

"ستیش کی پتنی کیا کہتی ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"وہ تو مسلسل رو رہا ہے جی۔ ایک ہی بات کہہ رہا ہے کہ اگر وہ دوشی ہوتا تو فوراً اپنا دوش مان لیتا۔ اس نے یہ سب نہیں کیا ہے۔ کلثوم خود وہاں سے نکلا ہے۔ کس طرح نکلا ہے اسے کچھ پتا نہیں۔"

اندازہ ہو رہا تھا کہ مہندر اور گرو کے چیلوں نے گرو کا قتل خطرے بیٹوں برداشت نہیں کیا ہے۔ اب انہیں رام پرشاد کی بہو کے خلاف اپنا اندرونی غصہ نکالنے کا موقع ملا ہے اور وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

آفتاب خان باہر کی خبریں دے کر چلا گیا۔ ہم کچھ انتظار کی سولی پر لٹک گئے۔ تہ خانوں کے اندر فضا بہت بوجھل اور یاسیت سے بھری ہوئی تھی۔ میرے اور سلطانہ کے درمیان بول چال تقریباً ختم تھی جا ایک ہی کمرے میں ہوتے ہوئے ہم جیسے ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر تھے۔ یہ فاصلہ اس رات کی سیاہی سے بھرا ہوا تھا جب بے بسی کی انتہا کو چھو کر سلطانہ نے مجھے جارج گوما کے کمرے سے نکالا تھا اور خود کو اس فاتح کے حوالے کرنے کے لیے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا لی تھی۔

گرو کی پتنی رادھا ہر وقت پرارتھنا کرتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے پتی کے سفاکانہ قتل سے بے خبر تھی۔ وہ اس کی طرف سے پریشان رہتی تھی اور اس سے بڑھ کر پریشانی اسے اس بات کی تھی کہ کہیں اس کے گرو پتی کو پہنچنے والے کسی نقصان کی وجہ سے بھگوان اس سے ناراض نہ ہو جائیں۔ آفتاب جب بھی آتا تھا، وہ اس سے گرو کے بارے میں پوچھتی تھی۔ آفتاب خان اسے گول مول جواب دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔

اگلے روز کی ساری خبریں چونکا دینے والی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی بات چونکانے والی تھی کہ آفتاب خان آدھی رات کو آنے کے بجائے شام کو ہی آ گیا تھا۔ دن کے وقت اسے مندر میں آنے کے لیے خصوصی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔

اس نے اطلاع دی کہ باہر ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ رام پرشاد نے کہا ہے کہ اسے اپنے بیٹے ستیش اور بہو مالا پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں اور سانچ کو آنچ نہیں۔ لہٰذا اپنے بیٹے ستیش کی جگہ وہ خود پرکھشا دے گا۔ پنچوں نے پنڈت بھگوان داس سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی یہ پیشکش قبول کر لی ہے۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ کل شام کے بعد پہلے پہر کی دوسری گھڑی میں اسی مندر کے اندر خاص خاص پجاریوں اور پنڈتوں کے روبرو رام پرشاد خود اپنی بہو اور بیٹے کی سچائی کے لیے آزمائش دے گا۔

"یہ سب تو پرانے زمانے کی کہانیوں جیسا لگ رہا ہے۔" اقبال نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ "لیکن یہاں انڈیا میں کچھ لوگ اب بھی پرانے زمانے کی طرح ہی رہ رہے ہیں۔ کئی علاقے تو ایسے تھے جہاں اب تک بڑی باقاعدگی سے دیوی دیوتاؤں کو زندہ بچے بچیوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ اس بلیدان کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق کئی نام دیے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں سنا تھا کہ راجستھان میں ایک ایسی ہی تھالی رکھو بو درشا کہا جاتا ہے۔"

آفتاب بولا۔ "رام پرشاد بہت کٹر قسم کا بندہ ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر ضرور عمل کرے گا۔ اس کو پورا یقین ہے کہ اس کا بہو اور بیٹا سچا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر بھگوان ضرور بالضرور اس کا مدد کرے گا۔ اس نے آج شام سے آٹھ پہر کا برت رکھ لیا ہے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے کسی خاص پنڈت سے اپنے ماتھے پر قشقہ لگوایا ہے اور کسی تیرتھ سے آنے والا سفید لباس پہنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کڑاہے میں ڈالنے کے لیے ایک دم تیار ہے۔"

"وہ بڑھیا کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پہلے تو چپ رہا ہے لیکن اب اس نے رام پرشاد کو بلاشیری دینا شروع کر دیا ہے۔ رام پرشاد کی طرح بڑھیا نے بھی برت رکھا ہے۔ اس نے رام پرشاد کو نیلے پتھروں والا

وکٹیں

ایک ماں اپنے بیٹے کے ٹیچر کے پاس گئی اور اس سے کہا۔ "پلیز، مجھے وہ تینوں وکٹیں دے دیجیے۔"

"کون سی وکٹیں؟" ٹیچر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جو میرے بیٹے نے پچھلے میچ میں لی تھیں۔ جب اس نے مجھے بتایا تھا، تبھی میں نے اس سے کہا تھا کہ وکٹیں ہمیشہ گھر لایا کرو لیکن کم بخت بہت نافرمان ہے۔"

❖❖❖

یکسانیت

باؤلر کی ماں اسٹینڈ میں بیٹھی اپنے بیٹے کو بوونگ کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اچانک اس کے برابر بیٹھے ہوئے تماشائی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یار اچھا ہے لیکن اس کی لینتھ برقرار نہیں رہتی۔"

"کیسی ناقابل یقین بات کر رہے ہو۔" ماں نے اس تماشائی کو ڈانٹا۔ "وہ گزشتہ تیس سال سے ساڑھے پانچ فٹ کا ہے اور اتنا ہی رہے گا۔"

[illegible]

digestpk.blogspot.com

ایک مالا پہنایا ہے اور اسے وشواس دلایا ہے کہ وہ اپنی آزمائش میں ضرور کامیاب ہوگا۔"

نیلے پتھروں والی مالا سے یاد آیا کہ مجھے بھی رام پرشاد کے گھر میں اس کی بوڑھی ماتا نے ایسی ہی مالا پہنائی تھی۔ یہ بوڑھی عورت کیسے رسموں رواجوں کی الجھی گتھیوں میں سے تھی جن کی گرہیں کھولنا بڑے بڑے دانشوروں اور نفسیات دانوں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ گتھریاں اپنی بوسیدگی سمیت جل جاتی ہیں، مٹی میں دفن ہو جاتی ہیں لیکن کھلتی نہیں ہیں۔ اب رام پرشاد اور اس بڑھیا کا اندھا عقیدہ انہیں ایک خاص صورتِ حال کی طرف لے جا رہا تھا۔

آفتاب خان بولا۔ "ام بھی وہیں پنچایت والی جگہ پر موجود تھا جی۔ رام پرشاد بڑے غصے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ایشور کے بنائے ہوئے اصول کسی ایک زمانے کے لیے نہیں ہوتے۔ ہر زمانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر سچ کی پرکھشا دینے والے لوگ پرانے زمانے میں جلتے تیل سے بچ سکتے ہیں تو آج بھی بچ سکتے ہیں۔ بات صرف پکے وشواس کی ہے اور من کی شکتی کی ہے..... اور وہ سب کچھ کر کے دکھا دے گا۔ اس موقع پر رام پرشاد کا چاچا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پکار کر کہا ہمیں بھی ... ظلم ہے۔ یہ مہندر اور اس کا ساتھی لوگ ام سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ رام پرشاد بیٹے پر بھی بگڑ گیا۔ اس نے اسے بری طرح جھڑکا اور کہا کہ بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم آزمائش دینے سے پہلے ہی ہارے ہوئے ہو۔ اس لیے کہ تم ایشور کے چمتکاروں (معجزوں) پر پورا وشواس نہیں رکھتے اور یہ سارا کھیل ہی وشواس کا ہے۔ بڑھیا نے بھی بیٹے رام پرشاد کی حمایت کی اور پوتے کو تسلی دلایا اور کہا کہ کچھ نہ ہوگا۔ جائے گا۔ رام پرشاد کے ہاتھ جلنے سے بچ جائیں گے۔"

"کچھ نہ کچھ سے بڑھیا کا کیا مطلب ہے؟" عمران نے سوال کیا۔

"جہاں تک اماری عقل میں آیا ہے جی... بڑھیا کا خیال ہے کہ اگر رام پرشاد اور وہ خود اپنے ارادے پر قائم رہے تو آزمائش سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آزمائش ٹل جائے اور اگر نہ بھی ٹلا اور رام پرشاد کو اپنے ہاتھ تیل میں ڈالنا ہی پڑا تو دیوی مدد کرے گا۔ رام پرشاد کا ہاتھ کسی خاص نقصان سے بچا رہے گا۔ پنچایت کے بعد بڑھیا نے ایک روایتی مثال بھی دیا جس میں کسی سچے شخص نے پورے وشواس کے ساتھ اپنا دونوں ہاتھ ابلتے تیل میں ڈالا اور ہاتھوں پر بس معمولی سا نشان ہی پڑا تھا اور یہ چھوٹا موٹا نشان بھی چند دن تک گنگا جل لگانے سے ٹھیک ہو گیا۔"

یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ یہ بات تو ہرگز یقین کرنے والی نہیں تھی کہ رام پرشاد ابلتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالے گا اور ہاتھ جل بھن کر کباب ہونے سے بچ جائیں گے۔ ہاں، اس میں کوئی شعبدہ بازی ضرور ہو سکتی تھی۔ کوئی کیمیکل یا کوئی ایسی شے ہاتھوں اور بازوؤں پر لگائی جا سکتی تھی جو چند سیکنڈ کے لیے ہاتھوں کو تیل کی بے پناہ حدت سے بچا سکتی۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا مخالف ٹولہ اس قسم کی شعبدہ بازی چلنے دے گا؟ وہ کوئی سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے، رام پرشاد اور دستیش کے ساتھی ہی تھے اور امتحان کے سارے اچھے برے بھیدوں سے آگاہ تھے۔

آفتاب خان نے کہا کہ اگر کل شام کے بعد واقعی مندر میں یہ تماشا لگا تو پھر وہ ہمیں یہ تماشا دکھانے کے لیے پہلے کی طرح اوپر لے جائے گا اور ہوادان کے سوراخوں میں سے ہال کمرے کا منظر دکھائے گا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے تجسس میں گزرے۔ اقبال کا خیال بھی تھا کہ اس آزمائش سے پہلے ہی اس معاملے کو کوئی حل نکل آئے گا اور رام پرشاد کو کھولتے تیل میں ہاتھ نہیں ڈالنا پڑ جائے گا۔ تاہم ہوشیار سنگھ کی رائے مختلف تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ "یہ لوگ صرف سکھوں کے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان ہی کے کسی نہ کسی ڈھنگ سے ساری قوموں کے بارے میں ہیں۔ آپ لوگ دیکھنا، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ واہگرو کی کرپا سے برا ہی نکلنا ہے۔ یہ لوگ ہندو دھرم سے زیادہ ہٹ دھرم کو ماننے والے ہیں۔ یہ اپنی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

ہوشیار سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہی آفتاب خان نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "ام آپ کو لینے آیا ہے جی۔ ادھر اوپر بس تماشا شروع ہونے ہی والا ہے۔ آپ ذرا غور سے سنیں۔ ڈھول کا آواز یہاں تک بھی سنائی دے رہا ہے۔"

ہم نے کان لگا کر سنا۔ واقعی کسی بہت بڑے ڈھول کی دھم دھم گونج ان تہ خانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ پہلے کی طرح آفتاب خان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جانے والوں میں، میں، عمران، اقبال اور ہوشیار سنگھ شامل تھے۔ جلال کو سلطانہ کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ کل رات سے اسے بخار تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ اسے شدید سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ غالباً یہ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ وہ اتنی دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی تھی۔

حسبِ سابق ہم ان تنگ و تاریک زینوں میں پہنچے جہاں سے بمشکل ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ گرد و غبار اور جالوں سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے چہرے ایک بار پھر کپڑوں میں لپیٹ لیے تھے۔ عمران کے پاس رائفل تھی۔ میں اور اقبال بھی مسلح تھے۔ زینوں میں داخل ہوتے ہی ہمیں ڈھول کی دھمادھم صاف سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سنکھ بھی بجائے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم اوپر گئے، یہ آوازیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ زینوں کا ایک چھوٹا دروازہ کھولنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی اور اشاروں سے ہمیں سمجھا دیا کہ اب ہمیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی پوجا کے ہال کمرے کا بے پناہ شور ہمارے کانوں سے ٹکرایا۔ یہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جلد ہی ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنی آنکھیں ہوادان کی پتھریلی جالی سے لگا سکیں۔ ہال نما کمرے کا منظر دیدنی تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو افراد یہاں موجود تھے..... اور اس سے کئی گنا افراد شاید باہر موجود تھے۔ ان سب کا شور بھی ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہال کمرے میں موجود افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ ان کے عقب میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بھی درجنوں افراد کھڑے تھے۔ بہت سے افراد کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور بھالے تھے۔ کسی کسی کی کمر سے تلوار بھی بندھی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کے سروں پر رنگ دار پگڑ نظر آ رہے تھے۔ پجاری حضرات اور چیلے وغیرہ اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ اس اجتماع میں عورتیں بھی موجود تھیں تاہم ان کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں مجھے رام پرشاد کی فربہ اندام بیوی بھی نظر آئی۔ تاہم رام پرشاد کی بوڑھی ماں اور پتنی کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہال کمرے میں موجود ہر فرد کے چہرے پر بے پناہ تناؤ نظر آ رہا تھا۔ بہت بڑے ڈھول کی دھمادھم سے دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہال کمرے میں دیوی کی مورتی کے سامنے قریباً تیس مربع فٹ جگہ خالی تھی۔ یہاں لوہے کے ایک بڑے چولہے پر تیل کی کڑاہی دھری تھی۔ چولہے میں سرخ انگارے دہک رہے تھے اور آگ کی لپک پیدا ہو رہی تھی جو اس امر کی شاہد تھی کہ تیل میں کوئی بھی چیز ڈالی گئی تو وہ سیکنڈوں میں روسٹ ہو جائے گی۔

"وہ فسادی جڑ بڑھیا کہاں ہے؟" عمران نے سرگوشی میں آفتاب سے پوچھا۔

"امارا خیال ہے کہ وہ رام پرشاد کے ساتھ ہی اندر آئے گا۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"اور وہ کب آئے گا؟"

"بس آنے ہی والا ہے۔ وہ دیکھیں جی، مہندر اور اس کا ساتھی لوگ اندر آ رہا ہے۔" آفتاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے بھی لمبوتری شکل والے دراز قد مہندر کو پہچان لیا۔ وہ اپنے قریباً ایک درجن ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور پہلے سے مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پستول ہولسٹر میں بند اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ گہرے سانولے رنگ والا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اس نے رنگ دار پگڑ باندھ رکھا تھا۔ یہ شخص بھی پستول سے مسلح تھا۔

"یہ کالے منہ والا کون ہے؟" میں نے آفتاب سے پوچھا۔

"یہی کھیا رشید ہے۔" آفتاب کے بجائے عمران نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ مجھے اس شخص کی صورت میں سلطان کھوکھر کی تھوڑی بہت جھلک نظر آئی تھی۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے.... ہال کمرے میں بے چینی کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ مڑ مڑ کر داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "کہیں رام پرشاد اڑن چھو تو نہیں ہو گیا؟" اقبال نے سرگوشی کی۔

عمران بولا۔ "میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ وہ واقعی اڑن چھو ہو جائے اور اس کی جگہ یار لوگ اس بڑھیا کو پرکھشا دینے پر مجبور کر دیں۔ سارے فسادوں کی بنیاد تو وہی ہے۔"

"ایسے لوگ اپنا امتحان کبھی نہیں دیتے، بس دوسروں کو آگے کرتے ہیں۔ یہ جتنے بوڑھے ہوتے ہیں، ان کو زندگی اتنی ہی پیاری ہوتی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بلکہ ان میں سے زیادہ تر تو بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔" عمران نے کہا۔ "دل ہی دل میں یہی الاپتے رہتے ہیں، ابھی تو میں جوان ہوں...."

یکایک ڈھول کی دھمادھم مزید بلند ہو گئی۔ لگاتار کئی سنکھ بجنے لگے۔ پھر ڈھول کی سماعت شکن آواز میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ داخلی دروازے سے پانچ چھ افراد والہانہ رقص کرتے اور جھومتے ہوئے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے عقب میں پچاس پچپن سالہ رام پرشاد تھا۔ اس نے ایک لمبا سفید چولا پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر قشقہ اور گلے میں نیلے پتھروں والی لمبی مالا تھی۔ رام پرشاد

digestpk.blogspot.com

کے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی گھنٹیاں تھیں جنہیں وہ زور زور سے بجا رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ رام پرشاد کے عقب میں اس کی بوڑھی ماتا تھی۔ وہ زرد ساڑی میں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وجدانی کیفیت تھی اور اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لکڑی اور پتھر کی دو تین مالائیں اس کے گلے میں بھی جھول رہی تھیں۔ ان دونوں کے عقب میں سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس تھا۔ وہ رام پرشاد اور اس کی ماتا پر کوئی چیز چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی مندر کا اندرونی منظر مزید ڈرامائی اور سنسنی خیز ہو گیا۔ ہمیں یہی لگ رہا تھا کہ ہم پندرھویں صدی کے جدید دور میں نہیں، کسی قدیم زمانے میں بیٹھے ہیں۔ رام پرشاد کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گھنٹیوں کو زور زور سے بجا رہا تھا اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گھنٹیوں کی آواز میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جوں جوں گھنٹیوں کی لے بلند ہوئی، رام پرشاد کے گرد رقص کرنے والے افراد کے رقص میں بھی تیزی آتی گئی۔ رام پرشاد خود بھی جھومنے والے انداز میں اپنے سر کو آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور وہی کیفیت بڑھیا کے چہرے کی بھی تھی۔ گھنٹیاں بجاتے بجاتے اور اپنے سر کو حرکت دیتے دیتے رام پرشاد نے صرف ایک دو سیکنڈ کے لیے آنکھیں کھولیں۔ شمع دانوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ نظر آ گئیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ سرخی اس کے اندرونی جذبات کے سبب تھی یا اس نے خود کو ایک خاص کیفیت میں لانے کے لیے بھنگ آمیز مشروب پیا تھا۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ بظاہر اس کے ہاتھوں پر کوئی بھی چیز لگی نظر نہیں آئی۔

ڈھول تاشوں اور گھنٹیوں کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ رام پرشاد کڑاہی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت خود کو پرکھشا کے عمل سے گزار سکتا تھا، لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کر رہا ہے یا شاید اسے تاخیر کرنے کے لیے کہا گیا تھا... اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ عین موقع پر مخالف گروہ آزمائش کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائے۔

تین چار منٹ مزید گزر گئے۔ مہندرا اور اس کے قریبی ساتھیوں کے چٹانی چہروں پر کسی طرح کی نرمی نمودار نہیں ہوئی۔

رقص کرنے والوں نے جوش میں آ کر ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ سوکھے سڑے پنڈت بھگوان داس نے آگے بڑھ کر رام پرشاد کا کندھا مخصوص انداز میں دبایا۔ رام پرشاد نے مزید زور سے گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت بے پناہ وشواس اور جذبے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ رام پرشاد جانتا تھا کہ اس کی بہو اور بیٹے پر غلط الزام لگایا جا رہا ہے، وہ سچا ہے... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب سے بڑی چیز وشواس اور جذبہ ہی ہے اور اب یہ ثابت کرنے کی گھڑی آ گئی تھی۔

وہ ایک ہیجانی منظر تھا۔ شور سے کانوں کے پردے شق ہو رہے تھے۔ رام پرشاد نے دونوں گھنٹیوں کو پورے زور سے آخری بار حرکت دی اور پھر انہیں دونوں طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پُرجوش نعرہ بلند کیا۔ جذبے میں لتھڑے ہوئے اس زوردار نعرے کے ساتھ ہی وہ کڑاہی کی طرف جھکا۔ ہم نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لیے مضبوط دل گردے کی ضرورت تھی۔ رام پرشاد نے اپنے دونوں ہاتھ تقریباً کہنیوں تک ابلتے ہوئے تیل میں جھونک دیے۔

... اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بے حد لرزہ خیز تھا۔ ہال کمرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ گرم تیل کی بلند چھن چھناہٹ سنائی دی... اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کربناک انداز میں چلایا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ کڑاہی میں سے کھینچے، ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کڑاہی کے کنارے سے رگڑ کھائی۔ وہ ایک دل دوز منظر تھا۔ اس کے بازوؤں کی گندمی کھال اتر گئی اور نیچے سے سرخ سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک بے طرح جل چکے تھے۔ وہ فرش پر گر پڑا اور تکلیف سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہم سے فقط چھ سات فٹ کی دوری پر ہو رہا تھا۔ ہوا دان کی پتھریلی جالی کے سوراخوں میں سے ہم سب کچھ بالکل واضح دیکھ رہے تھے۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے سے رام پرشاد کے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلی ہوئی کھال کئی اور جگہ سے بھی اتر گئی... جلے ہوئے گوشت کی مکروہ بو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔

اس وقت میری نگاہ روتی چلاتی ہوئی بڑھیا پر پڑی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اسے جیسے اپنی نگاہ پر یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یکایک مہندرا اور اس کے ساتھیوں نے گرج دار نعرہ بلند کیا۔ ”جے ماتا کی“ آواز بڑی شدت سے در و دیوار میں گونجی۔ بہت سی لاٹھیاں اور بلم وغیرہ فضا میں بلند ہوئے۔ وہ سب

لوگ جو رام پرشاد اور اس کے بچوں کو جھوٹا سمجھ رہے تھے، ایک دم بپھرے ہوئے نظر آئے۔ وہ للکارے مارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے تمتما گئے اور آنکھوں میں جنون نظر آیا۔ یوں لگا کہ آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد وہ رام پرشاد کو واجب القتل سمجھ رہے ہیں۔

اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ مہندرا آگے آیا اور پکار کر بولا۔ ”پھیسلہ (فیصلہ) ہو گیا... بھگوان کا پھیسلہ ہو گیا۔“ اس کی آواز میں بلا درجے کی درندگی تھی۔

یکایک بہت سے لوگ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے رام پرشاد پر جھپٹے۔ ایک بنے ٹھنے شخص نے اس طرح کھینچ کر تلوار چلائی کہ وہ تقریباً ایک فٹ تک رام پرشاد کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد کئی افراد اس پر پل پڑے۔ رام پرشاد کی آخری کربناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ مشتعل ہجوم کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھے تھے۔ کھیا کی گرج دار آواز ہجوم کے شور میں سے ابھری۔ ”اس حرامی کا بیٹا اور بہو یہاں ہیں۔ وہ اصل دوشی ہیں۔ ان کو پکڑو...“

ایک اور للکار ابھری۔ ”اس کی بہو پاپی ہے۔ اس کنیا کو جندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جان سے مار دیں گے۔“

”... ہاں جان سے مار دیں گے۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

ہجوم میں ایک لہر سی دوڑی۔ کچھ لوگ باہر کی طرف لپکے۔ جونہی ہاتھ جلنے کے بعد رام پرشاد فرش پر گرا تھا اور مخالفین نے فلک شگاف نعرے بلند کیے تھے، رام پرشاد کے حمایتی وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔ اب مندر کے اندر مہندرا اور اس کے ساتھیوں کا غلبہ تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

”لگتا ہے کہ اب مالا کی جان کو بھی خطرہ ہے۔“ ہوشیار سنگھ لرزاں آواز میں بولا۔

ہجوم کے درمیان سے ہمیں اب رام پرشاد کی خون چکاں لاش سیاہی مائل فرش پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا سفید براق چولا خونی رنگ تھا۔ لوگ اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس کے پاس ہی مندر کا بہت بڑا ڈھول اوندھا پڑا تھا۔

”لو وہ بھی آ گئی۔“ عمران نے سنسناتی سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا، کچھ مشتعل لوگ مالا کو کھینچتے ہوئے مندر میں لا رہے تھے۔ ان مشتعل لوگوں میں لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والا کاڑی بان بھولا ناتھ سب سے آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مالا کے بال تھے اور دوسرے میں ایک چھوٹی تلوار تھی۔ کئی دوسرے لوگوں نے بھی مالا کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ دہشت سے چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ایک بلند دہاڑ سنائی دی۔ یہ برہمن زادہ ستیش تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول تھا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ چنگھاڑا اور اس نے مندر کے اندر ہی کئی ہوائی فائر کیے۔

لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ چند لمحوں کے لیے لگا کہ ستیش آگے بڑھ کر اپنی پتنی کو چھڑانے اور شاید یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پھر اچانک دو افراد نے جھپٹ کر ستیش کو عقب سے دبوچ لیا۔ ستیش نے فائر کیا تو پستول کا رخ اب زمین کی طرف تھا۔ دھماکے سے گولی چلی اور کسی کے پاؤں میں پیوست ہو گئی۔ پکڑنے والوں نے ستیش کو اوندھے منہ فرش پر گرا دیا اور جکڑ لیا۔ تب وہ لوگ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے مندر سے باہر لے گئے۔ اسی دوران میں مالا کی نگاہ فرش پر پڑی۔ وہاں اپنے سسر کی خون چکاں لاش دیکھ کر وہ کربناک انداز میں چلانے لگی۔ ”پتاجی... پتاجی۔“

اسے پکڑنے والوں نے اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس کے بازو پیچھے موڑ کر اس کے ہاتھ ایک رسی سے باندھ دیے گئے۔ پاؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس کی ساڑی بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور بالائی جسم نیم عریاں ہو رہا تھا۔ اس کی عریانی تو رہی ایک طرف، اس کی جان کی پروا بھی کسی کو نہیں تھی۔ وہ لوگ بے دردی سے اسے ادھر ادھر گھسیٹ رہے تھے۔ فرش پر اوندھا گرنے سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کے لیے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ دہشت کے پیچھے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب اس کے چہرے پر عجیب طرح کا طیش بھی پایا جا رہا تھا۔

وہ مہندرا کی طرف منہ کر کے اشتعال انگیز انداز میں پکاری۔ ”تم جانور ہو، تم ہتھیارے ہو۔ تم بھگوان کے نام پر راکھشس کے پجاری ہو۔ تمہارا انجام بہت برا ہووے گا... بہت برا ہووے گا۔“

بھولا ناتھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے تلوار سونتی اور خطرناک انداز میں مالا کی طرف بڑھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"ہیں... نا... نہیں، یہ ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں؟" مہندر کا ساتھی چیخ کر بولا۔ "یہ لڑکی دھرم دشمن ہے۔ یہ ہمیشہ سے دھرم دشمن رہی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ... رام پرشاد کی جان لینے والی بھی یہی ہے۔ اسے بھری سزا ملنی چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ حرامزادی کے ٹکڑے کر دو کہیں پرلنا کر..." ایک اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یا پھر اسے کڑاہے میں ڈال دو۔"

یوں لگتا جیسے کئی افراد مالا کی طرف بڑھنا چاہ رہے تھا۔

ایک دم ہجوم میں شدید ہلچل نظر آئی۔

ہوشیار سنگھ نے لرزاں آواز میں کہا۔ "یہ لوگ اس لڑکی کو مار دیں گے۔ کڑاہے میں پھینک دیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ پرکھشا ناکام ہو تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔"

بپھرا ہوا ہجوم اب بالکل آگ بگولا دکھائی دے رہا تھا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی، آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹتی ہوئیں۔ وہ سب کے سب ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہجوم کی نفسیات ایک اکیلے شخص کی نفسیات سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ [illegible] کیفیات انتہائی عروج پر پہنچ سکتی ہیں۔ جیسے بہادری، ہمت، ایثار اور جواں مردی یا پھر نفرت، انتقام، خوں خواری اور درندگی۔

یہاں اس ہال کمرے میں بھی اچانک درندگی اپنے عروج پر پہنچی نظر آئی۔ وحشت کی لہر نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ تیل کی کڑاہی اتنی بڑی کیوں تھی۔ کھولتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تو چھوٹی سی کڑاہی بھی کام دے سکتی تھی۔ یہ شاید کوئی قدیم کڑاہا تھا جو خاص اسی رسم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

"ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا کھلنڈرا انداز اس کے اندر کہیں بہت دور گہرائی میں جا چھپا تھا۔

کچھ مشتعل لوگوں نے بندھی ہوئی مالا کو اٹھایا اور بالآخر وہ تیل کے کڑاہے کی طرف بڑھے۔ ان میں مہندر بھی شامل تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب آٹھ دس افراد کا ایک ٹولہ زبردستی ہال کمرے میں گھس آیا۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے تھے۔

ان میں سے ایک گرجا۔ "مالا بہن کو چھوڑ دو۔ ورنہ آج کوئی نہیں بچے گا۔"

"چلاؤ گولی... چلاؤ۔" مہندر زہرناک انداز میں دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مالا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ اس کا چہرہ ایک انتہا پسند کا چہرہ تھا۔ ان گنت صدیوں سے یہ چہرہ مذہب کے نام پر سفاکی اور درندگی کی بدترین مثالیں قائم کرتا رہا ہے۔ اب دونوں طرف رائفلیں تان لی گئی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مہندر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ماحول گواہی دے رہا تھا کہ یہ فساد روکنے سے رکے گا نہیں۔ میں نے دیکھا، عمران نے اپنی رائفل کی نال جالی کے ایک سوراخ میں رکھ دی ہے اور ماہر نشانہ باز کی طرح رائفل کا کندا اپنے شانے سے لگا کر نشانہ باندھ رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایک نہایت خطرناک نشانہ لگانے جا رہا ہے۔ نشانہ خطا جاتا یا پوری طرح کارگر نہ ہوتا تو مالا کی جان جا سکتی تھی۔ [illegible] نشانہ بنانا دشوار تھا اور مالا کے پیچھے مہندر کے [illegible] حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ [illegible] چھ انچ لمبے ٹارگٹ کو نشانہ بنانا تھا۔ [illegible] اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ مجھے وہ تماشا یاد آ گیا جو عمران اقبال نے لاہور میں مجید مٹھو کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے جیب رکھ کر عمران نے حیران کن مہارت سے نشانہ لگایا تھا۔ شاید آج پھر وہی مہارت استعمال ہونے والی تھی۔

اور پھر دھماکا ہوا۔ میں نے مالا کے پیچھے مہندر کی پیشانی پر ایک داغ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور مردہ چھپکلی کی طرح پیٹ کے بل پختہ فرش پر گرا۔ عمران کے بے مثال نشانے کا دوسرا شکار مہندر کا قریبی چیلا تھا۔ اس کی کنپٹی نشانہ بنی اور وہ پہلی گولی چلانے کی حسرت دل میں لیے سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں فائروں کے درمیان بمشکل ایک سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ اتنے مختصر وقفے میں دوسری مرتبہ اتنا صاف نشانہ لینا حیرت ناک تھا۔

میں نے مالا کو مہندر کے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد جیسے ایک قیامت برپا ہو گئی۔ دھماکوں اور شعلوں نے ہال کمرے کو ڈھانپ لیا۔ کئی زخمی ہو کر گرے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ستیش کا ایک

مالا کو بچانے کے لیے مالا کے اوپر گر گیا تھا۔ تب ہم نے دیکھا کہ جتن کے دو ساتھی مالا کو جلتے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے اور وہ اندھی گولیوں کی زد سے بچ گئی... اور ہم فی الوقت یہی چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے خوں ریز مناظر تھے۔ آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نہایت نزدیک سے ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جارہی تھیں۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں بھی نکل آئی تھیں۔ جس ہوادان سے ہم جھانک رہے تھے، اس کے عین سامنے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر کھیا رشید نے ایک شخص کی گردن پر تلوار ماری اور اس کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ کوئی اندھی گولی اس بڑے شمع دان کے رسے سے ٹکرائی جو تیل کے کڑاہے کے عین اوپر جھول رہا تھا... تیل کا شمع دان اپنی قریباً دو درجن موم بتیوں سمیت ابلتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرا۔ ابلتا ہوا تیل اچھلا۔ کئی افراد کرب سے بے تاب ہو کر چلائے۔ اس کے ساتھ ہی تیل نے آگ پکڑ لی۔ ہم نے ایک شخص کو آگ کی لپیٹ میں آکر گولے کی طرح بیرونی دروازے کی طرف دوڑتے اور پھر راستے میں ہی گرتے دیکھا۔ کڑاہا الٹ چکا تھا۔ اس کا تیل جہاں جہاں گرا، اپنے ساتھ آگ بھی لیا جانے لگا۔ چند سیکنڈ پہلے جو جنونی ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے، اب اپنی جانیں بچانے کے لیے بیرونی دروازوں کی طرف دوڑے۔ دروازے صرف دو تھے اور نکلنے والے درجنوں۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں ہر شے کو ڈھانپتا چلا جارہا تھا۔ یہ دھواں ہوادان کے اندر سے ہماری طرف بھی آرہا تھا۔ اب ہمارا یہاں رکنا خطرناک تھا۔

”نیچے چلیں جی۔“ آفتاب خاں پکار کر بولا۔

ہم آگے پیچھے تنگ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ چند زینے اتر کر ہم نے وہ دروازہ بند کردیا جسے کھول کر اوپر آئے تھے۔ اس دروازے کے بند ہونے سے عارضی طور پر سیڑھیاں دھوئیں سے محفوظ ہوگئیں۔ جن کپڑوں سے ہم نے چہرے لپیٹے تھے، وہ ابھی تک ہمارے پاس تھے۔ ہم نے ان میں سے دو تین کپڑے دروازے کی درزوں میں ٹھونس دیے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیر زمین تہ خانے میں موجود تھے۔

”کیا ہوا؟“ سب سے پہلے راجا نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

اسے ہر وقت اپنے شوہر نامدار کی پڑی رہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شوہر صاحب کو سورگ باشی ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں اور اب اس کی وفات سے کہیں زیادہ اہم خبریں موجود ہیں۔

مندر میں جو آگ بھڑکی تھی، وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم یہاں ان تہ خانوں کے اندر سے کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے مگر تصور کی نگاہ میں سب کچھ دکھا رہی تھی۔ قدیم مندر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شعلے اس کے دروازوں سے نکل کر باہر تک جارہے تھے۔ تاریکی میں ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

”گولیاں چل رہی ہیں۔“ عمران نے بیرونی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ غور سے سننے پر فائرنگ کی بہت مدھم آواز یہاں بھی نوٹ کی جاسکتی تھی۔

”اگر آگ یہاں لکڑی کے زینے تک پہنچ گئی تو؟“ اقبال نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ”تو ہم گانا گائیں گے۔ خداوندا! یہ کیسی آگ سی جلتی ہے زینے میں۔“ عمران نے حسب عادت بات کو مذاق میں اڑایا۔

لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ آگ جس طرح بھڑکی تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تہ خانے بھسم ہو سکتے تھے۔ اگر آگ مندر کے اس بیرونی دروازے تک ہی پہنچ جاتی جس میں سے ہو کر آفتاب خاں ہر رات یہاں ہمارے پاس آتا تھا تو بہت برا ہو سکتا تھا۔

”کیا خیال ہے آفتاب خاں؟“ میں نے پوچھا۔ ”آگ نیچے تو نہیں آجائے گی؟“

”بس جی، آپ سب کی طرح ہم بھی دعا ہی کر سکتا ہے۔ خطرہ تو ہر صورت میں موجود ہے۔ اگر آگ یہاں تک نہ پہنچا لیکن دھواں بھر گیا تو بھی ہم سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔“

آفتاب خاں درست کہہ رہا تھا۔ ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہلکا ہلکا دھواں سیڑھیوں سے اتر بھی رہا تھا مگر یہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ ہم فی الحال خطرے سے تھے۔ تہ خانوں میں گرمی بڑھتی جارہی تھی۔

عمران اور میں، آفتاب کے ہمراہ ایک بار پھر زینوں پر چڑھے اور اس دروازے کو ایئر ٹائٹ کرنے کی کوشش کی جہاں سے دھواں اندر آرہا تھا۔ اس کوشش میں بری طرح کھانسنے لگے اور آنسو بہاتے ہوئے واپس آئے۔ بہرطور یہ کوشش فائدہ مند ہوئی اور دھوئیں کی آمد کم ہوگئی۔

... اگلا تقریباً ایک گھنٹا سخت تشویش میں گزرا۔ صورت حال بہتر ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں بھی معدوم ہو چکی تھیں... فائرنگ کے علاوہ اور کسی طرح کا شور یہاں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب رات کے قریباً دس بجنے والے تھے۔ ہمیں اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ باہر آگ بجھائی جا چکی ہے لیکن باقی حالات کیا ہیں، اس کے بارے میں آفتاب خاں ہی کوئی خبر لا سکتا تھا... اور آفتاب ابھی تک ہمارے پاس موجود تھا۔ رات قریباً ایک بجے کے لگ بھگ وہ بالائی دروازے تک گیا اور سن گن لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب مندر کے ارد گرد خاموشی ہے۔ وہ باہر نکلنے کا چانس لے سکتا ہے۔ عمران نے اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ ابھی کچھ دیر مزید انتظار کرے۔ آخر رات تین بجے کے لگ بھگ آفتاب باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی اور لالٹین سنبھال لی۔ بستی سے غیر حاضری کے لیے اس کے پاس ایک نہایت معقول جواز موجود تھا۔ اس کے ایک دوست کی بیوی سخت بیمار تھی۔ شام کو اس نے کھیا سے اجازت لی تھی کہ وہ ایک دو گھنٹوں کے لیے اپنے دوست کی طرف جائے گا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیر ہو گئی ہے۔

اب آفتاب کو کل رات ہی کسی وقت آنا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل رات بھی نہ آسکتا۔ اس کی واپسی تک ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا۔ مندر کے ہولناک مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خاص طور سے جو کچھ مالا کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی اس کو سزا دی جارہی تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں وہ نیم عریاں ہو گئی تھی۔ اس کی جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاملہ بھی ہے۔ اگر اسے سچ مچ تیل کے کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال دیا جاتا تو آناً فاناً دو زندگیاں ختم ہو جاتیں۔

... اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ سلطانہ اوپر والے تہ خانے میں کلثوم اور نوری کے پاس تھی۔ کلثوم کے کان کا درد ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا، وہ تکلیف میں تھی۔ اس کی کمر کو بھی آرام کی شدید ضرورت تھی۔ میں رات کا جاگا ہوا بستر پر لیٹا تو نیند آگئی۔ اچانک کسی آہٹ کے سبب میں جاگ گیا۔ تہ خانوں میں رات دن برابر تھے۔ کمروں میں شمعیں یا لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ میرے کمرے میں لالٹین بجھی ہوئی تھی اس لیے تاریکی تھی۔ مجھے کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ سلطانہ تو ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا دیکھتا رہا۔ ہیولا اس کھونٹی کی طرف بڑھا جہاں جیکٹ کے نیچے میرا پستول لٹک رہا تھا۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ پندرہ سالہ طلال تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ میرے پستول تک رسائی حاصل کی اور اسے ہولسٹر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

”طلال!“ میں نے اچانک بلند آواز میں کہا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہولسٹر جلدی سے کھونٹی پر لٹکا دیا... میں نے ماچس جلا کر موم بتی روشن کی۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ایک دم پریشان نظر آرہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے تھے؟“ میں نے تحکم سے پوچھا۔

”کچھ نہیں جی۔ میں وہ... دراصل... آپ کا پستول دیکھنا چاہ رہا تھا۔“

”دیکھنا چاہ رہے تھے یا لے جانا چاہ رہے تھے؟“

”ناہیں جی۔ میں بس دیکھنے لگا تھا۔“

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”طلال! مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟“

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے یہ تاثرات دیکھ کر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ واقعی اس لڑکے نے سلطانہ کے ساتھ مل کر زندگی میں چار سنگین وارداتیں کی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجب سی سرد مہری تھی۔

”طلال! ادھر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے سامنے نشست کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔ ”مجھے سچ بتاؤ طلال! تم نے ایسا کیوں کیا؟... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم کچھ چھپاؤ گے نہیں تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مدد بھی کروں گا۔“ اچانک میں چونک گیا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں طلال کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”طلال! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“

وہ اشک بار ہو گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”میری خالہ مر جائے گی۔ وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے پہلے میں مرجانا چاہتا ہوں یا پھر اس کتے کو مار دینا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے جانے دیں... خدا کے لیے جانے دیں۔“ اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اس کے آنسوؤں میں آگ بھی تھی اور زہر بھی۔

”کیا تم جارج گورا کی بات کر رہے ہو؟“

”اور کس کی کر سکتا ہوں۔ وہی ہے جس نے میری خالہ کو

digestpk.blogspot.com

برباد کیا۔ اسے جندوں میں چھوڑا تھا مردوں میں۔ ہر جگہ اس کو بدنام کر دیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔ وہ ایک دو دن میں چپ کر کے یہاں سے نکل جائے گی۔ وہ جارج گورا سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس بدلے کے بغیر وہ جندہ نہیں رہ سکتی... اور میں نہیں چاہتا کہ وہ یہ خطرناک کام کرنے کے لیے جائے۔ وہ عورت جات ہے۔ وہ اسے بہت تکلیف دے کر ماریں گے۔ یہ کام میں کروں گا۔ میں جارج کو قتل کروں گا... اس کا سر لا کر خالہ کے قدموں (قدموں) میں ڈالوں گا... یا پھر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔''

میں طلال کی باتوں اور اس کے انداز پر ششدر تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ایک دو دن میں یہاں سے چلی جائے گی؟''

''مجھے سب پتا ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ میری بہن بھی ہے، ماں بھی اور خالہ بھی۔ میں سب جانتا ہوں کہ وہ کب کیا کریں گی۔ ان کے پاس زہر کی پڑیا ہے۔ جب وہ جل پانی سے گئی تھیں تو یہ پڑیا انہوں نے اپنے بالوں میں چھپائی ہوئی تھی۔ بعد میں جب ہم یہاں آئے تو میں نے وہ پڑیا ان سے چھین لی تھی اور چھپا لی تھی۔ وہ پڑیا پھر غائب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پڑیا پھر انہوں نے لے لی ہے۔ ان کو ایک بھی مجھے سمجھ رہی ہیں کہ انہوں نے بس ایک دو روز میں اب یہاں سے نکل جانا ہے۔''

میں سناٹے کی سی کیفیت میں طلال کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا اور وہ باتیں بھی بڑی ہی کر رہا تھا۔

ایک دم مجھے لگا کہ میں مجرم ہوں۔ میں سلطانہ کا ہی نہیں ان سب لوگوں کا مجرم ہوں جو سلطانہ کے قریبی ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں طلال بھی شامل تھا۔ سلطانہ کا بوڑھا والد جبار راجپوت بھی اور اس کا اپاہج بھائی بھی۔ جس نے میری صحت کے بدلے میں ایک تکلیف دہ بیماری گلے لگائی ہوئی تھی اور اب اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ میں سلطانہ سمیت ان سب لوگوں کا مقروض تھا۔ ان کے بے پایاں احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ ان احسانوں کے بے پناہ بوجھ سے نکلنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ میں کسی طرح... کسی طرح سلطانہ کو پھر سے زندہ کر سکتا... اور اسی جگہ، اسی گھڑی... وہیں اس تنہا اٹک بارڈر کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے یہ طے کیا کہ میں یہ کام کروں گا... اور اس کے کرنے میں مزید تاخیر نہیں کروں گا۔ اندازہ تو مجھے پہلے ہی تھا، آج کامل یقین بھی ہو گیا تھا کہ سلطانہ کے مردہ تن میں جان ڈالنے کی کوشش ایک ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس کی کچلی مسلی زخمی روح کو انصاف دیا جائے۔

میں نے کہا۔ ''طلال! تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح میرا پستول لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے اور رزگاں پہنچ کر جارج کو گولی مار دو گے؟ تم اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے۔ وہ ایک آسان دشمن نہیں ہے۔ وہ تمہیں کسی بازار میں گھومتا ہوا نہیں مل جائے گا۔ اس نے اپنی حفاظت کا مضبوط گھیرا بنا رکھا ہے۔ کیا تمہیں پہلے تجربہ نہیں ہوا کہ یہ گھیرا کتنا مضبوط ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سسکی لے کر بولا۔ ''مجھے بتائیں میں کیا کروں... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم اپنی خالہ کے بہت قریب ہو۔ اسے میرے بارے میں بتاؤ کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو وہ خود کرنا چاہتی ہے اور میں یہ سب کروں گا بھی۔ جارج گورا اب زیادہ دن سانس نہیں لے پائے گا۔ یہ تمہاری خالہ سے میرا وعدہ ہے۔''

طلال نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''طلال! میں کوئی ہوائی بات نہیں کر رہا۔ میں اب وہ ''میروج'' نہیں رہا جو پہلے تھا۔ کیا تمہیں مجھ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟'' وہ اب بھی خاموش رہا۔ تاہم اس کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ میری بات سے اختلاف نہیں کر رہا۔ وہ اتنا بھی نا سمجھ نہیں تھا۔ وہ بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں رنجیت پانڈے کی جو درگت بنی تھی وہ تو اس کی اور سلطانہ کی نگاہوں سے اوجھل رہی تھی لیکن ابھی پانچ دن پہلے کا واقعہ تو اس نے دیکھا تھا۔ میں تن تنہا مندر سے نکلا تھا اور کلثوم کو چھڑا کر یہاں لے آیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔ میرے ان کام پر اعتراض تو کیے گئے تھے لیکن اندر سے سب معترف ہوئے تھے۔

طلال روہانسی آواز میں بولا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں کہ میں انہیں سمجھاؤں... میں انہیں کیا سمجھاؤں گا؟ میں کس گنتی میں آتا ہوں۔ وہ تو آپ کے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہیں... اور جتنا کہا وہ آپ کا مانتی ہیں، کسی اور کا نہیں مانتیں۔ وہ آپ سے جتنا پیار کرتی ہیں کچھ میں ہی (جی) جانتا ہوں... وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں، ماموں! بہت ابنا

جیارہ۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ وہ نہیں چاہتی۔''

''لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہیں... وہاں استھان میں بھی وہ دن رات آپ کا نام لیتی رہتی تھیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''آپ نے دیکھا ہی ہو گا کہ وہاں خالہ کو زنجیریں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ خالہ کو یقین ہو چکا تھا کہ استھان والے موہن کمار کے قتل کے بدلے میں ان کو جندہ جلا دیں گے۔ ان کو وہ دن بھی بتا دیا گیا تھا جب ان کو جندہ جلایا جانا تھا۔ اس سے ایک رات پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا... طلال! تم جندہ رہو گے اور ایک نہ ایک دن اپنے خالو سے جرور ملو گے۔ جب بھی ملو، ان سے کہنا میری خالہ آپ سے بہت پریم کرتی تھی۔ اتنا جیادہ جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ آپ ان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر پیارے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر اللہ میاں نے بندوں کی پوجا کی اجاجت دی ہوتی تو وہ آپ کی پوجا کرتیں۔ پھر انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔''

''وہ کیوں؟''

''کہنے لگی تھیں۔ یہ دیکھو... جس طرح میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں، اسی طرح میری طرف سے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا اور کہنا کہ وہ میری غلطیوں کے لیے مجھے ماف کر دیں۔''

طلال نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''جس روز ان کو چتا میں جلایا جانا تھا، اس روز شام سے پہلے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔ اب دوبارہ ہوش میں نہیں آؤں گی، میری باتیں یاد رکھنا۔ بے ہوش ہوتے ہوئے انہوں نے بس ایک دو بار اللہ کا نام لیا۔ اس کے بعد آپ ہی کا نام لیتی رہیں اور نام لیتے لیتے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔''

شاید میری اور طلال کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لکڑی کے زینوں پر سلطانہ کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہی تھی... ہم خاموش ہو گئے۔

رات تک میں بے چینی سے آفتاب کا انتظار کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر یکجا ہوئیں۔ دس پندرہ منٹ بعد سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور آفتاب خان اپنی لاٹھی اور لالٹین کے ساتھ اندر آ گیا۔ میں اس وقت کپڑے بدل رہا تھا۔ کپڑے بدل کر

مشورہ

کانسٹیبل نے ایک شخص کو عین اس وقت پکڑ لیا جب وہ جھیل کے پل پر سے چھلانگ لگانے والا تھا۔ اور بولا۔ ''دیکھیے جناب، اگر آپ نے چھلانگ لگائی تو مجھے بھی آپ کے پیچھے کودنا پڑے گا۔ آج سردی بہت ہے، ایمبولینس پہنچنے تک ہم دونوں کو نمونیا ہو جائے گا اور ہم مر جائیں گے۔ تو جناب ذرا صبر سے کام لیجیے، گھر جائیے اور رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیجیے۔''

❖❖❖

تنبیہ

ماں نے اسکول جا کر اپنے بچے کی استانی سے کہا۔ ''دیکھیے مس، اگر میرا بیٹا کوئی غلطی کرے تو اسے سزا نہ دیں۔ یہ بڑا حساس واقع ہوا ہے۔ اگر واقعی کوئی ایسا ضروری ہو تو اس کے برابر والے بچے کو مار دیں، میرا بچہ اتنا سہم کر خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور آئندہ کبھی غلطی نہیں کرے گا۔''

[illegible]

میں درمیانی تہ خانے میں پہنچا تو آفتاب خان عمران کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن جب میں نے عمران سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''یار! ہر جگہ ناک کیوں گھساتے ہو۔ ہر بندے کی پرائیویسی ہوتی ہے، میری بھی ہے۔''

''کس طرح کی پرائیویسی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ناگوں والی۔ عمر کوئی تیس چونتیس سال۔ تین فقرہ اچھا ہے۔ ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔''

''کس کی؟''

''بھئی پرائیویسی کی... اگر تم شادی شدہ ہوتے تو تمہارا عشق بڑا چھوٹی سے گروایا جا سکتا تھا۔ مقامی حسن کا بے مثال نمونہ ہے وہ بھی۔''

"یار! کیا ہانک رہے ہو؟"

"ہانک نہیں رہا جگر! میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں ایک لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر اس لڑکی کو کچھ کچھ ہوتا ہے... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو دیکھ کر لڑکی کے اباجی کے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں میری شکل دیکھتے ہیں، ہوا میں لٹھ گھمانا شروع کر دیتے ہیں... آفتاب یہی بتا رہا تھا کہ اس کے اباجی یہاں فتح پور میں دیکھے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ غصہ رفع کرنے کے لیے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔"

اسی دوران میں اقبال بھی آ گیا۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی آفتاب پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اوپر کے حالات کیا ہیں۔

آفتاب نے اپنے مخصوص پٹھانی لب و لہجے میں جو انکشافات کیے، وہ کچھ اس طرح تھے... مندر کی آگ بجھ چکی تھی۔ سیکڑوں افراد نے قریبی جوہڑ سے پانی بھر بھر کر آگ پر پھینکا تھا اور اسے پوری طرح پھیلنے سے روک لیا تھا۔ تاہم اس دوران میں مندر کا قریباً ایک تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور تین گھنٹے سے یہ ملبہ ابھی تک سلگ رہا تھا۔ اس آگ میں اور آگ سے پہلے ہونے والی لڑائی میں تقریباً نو افراد کی جانیں گئی تھیں۔ زخمیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ قریباً ایک سو افراد زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دس پندرہ افراد کو آگ یا تیل سے جلنے کے زخم آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حالت تشویش ناک تھی۔ مکھیا عبدالرشید بھی آگ میں جھلس کر شدید زخمی ہوا تھا۔ اسے ڈل پانی لے جانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مہندر، اس کا دوست چھیل اور اس کے دو اور ساتھی موقع پر ہی مارے گئے تھے۔

اچھی خبر یہ تھی کہ بالا اور ستیش جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زوردار ہنگامے کے دوران میں ہی ستیش اپنی فیملی کے ساتھ فتح پور سے نکل گیا تھا۔ اس کے پتا کی لاش ساری رات مندر کے اندر پڑی رہی اور جل کر بری طرح مسخ ہو گئی۔

عمران نے پوچھا۔ "اب اس کے پتا اور مہندر وغیرہ کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"آج صبح علاقے کا بہت سا معزز لوگ فتح پور میں جمع ہوا ہے جی۔ ان میں پنچایت والا بڑا لوگ بھی شامل ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک گاؤں میں پورا امن نہیں ہو جاتا، وہ لوگ یہاں رہے گا اور نگرانی کرے گا۔ ان لوگوں نے دونوں طرف کا لاشیں بھی ان کے وارثوں کے حوالے کیا ہے۔ شام کے وقت وہ لوگ اپنا اپنا لاشیں لے کر چلا گیا ہے۔ باہر کا جو پندرہ بیس لوگ ابھی تک گاؤں میں موجود ہے، ان سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ صبح تک گاؤں چھوڑ دے۔ ان لوگوں سے ہتھیار وغیرہ لے لیا گیا ہے۔ جب یہ لوگ گاؤں چھوڑے گا تو انھیں ہتھیار واپس دے دیا جائے گا۔"

میں آفتاب خان کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں عجیب سا دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ جاہلیت اور توہم پرستی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ اندھے عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے۔ ان عقیدوں کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے، اپنے خیالات پر اس کا یقین پختہ سے پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتہا پسندی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ہی دشمن ہونے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو دین دھرم سے خارج قرار دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ انتہا پسندی کی وجہ سے موہن کمار کی قاتلہ (یعنی سلطانہ) کو بے دردی سے زندہ جلانے کی سزا دی گئی تھی۔ اسی انتہا پسندی نے ایک اور خوفناک فیصلہ کیا اور تیرہ سیوکوں کی ہتھیا کرنے کے الزام میں اپنے ہی ساتھی گروسوامی کو موت کے گھاٹ اتارا اور اس کا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا۔ اس سفاکی کا ردعمل یہ ہوا کہ اب مہندر، چھیل اور خود رام پرشاد موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور ابھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ دونوں طرف کے مرنے والے خود کو رتبۂ شہادت پر فائز سمجھ رہے تھے۔ بڑھیا کی دقیانوسیت اپنے پچاس پچپن سالہ صحت مند بیٹے کی جان لے چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اس خونی حماقت کو بھی ایشور کا کوئی بھید قرار دے رہی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب اندھے وشواس کے ساتھ رام پرشاد اپنے ہاتھ تیل کی کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی۔

یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ گھر والوں میں زیادہ تر افراد سو چکے تھے، شاید تایا افضل جاگ رہا ہو۔ عمران اور اقبال والے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ سلطانہ میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے کی

سادگی میں ایک کشش تھی۔ جسمانی موزونیت اور اس کشش نے مل کر اس کی شخصیت کو پُراثر بنا دیا تھا۔ کسی وقت جب وہ ہلکا سا سنگھار کر لیتی تھی تو مزید قابلِ توجہ ہو جاتی تھی۔

مجھے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ثروت مجھ سے دور جا چکی تھی۔ ثروت کے بے پناہ خلا کو پُر کرنے کے لیے سلطانہ میری زندگی میں آئی تھی... اور اس نے آنے کا حق ادا کیا تھا۔ کچھ باتیں میرے علم میں تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے، محبت اور ناکامی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ محبت میں ناکامی کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کچھ لوگ تو سچی محبت ہی اس کو کہتے ہیں جو ناکام ہو۔ مرد جب محبت میں ناکام ہوتا ہے تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ زندگی گزارنا دنیا کا دشوار ترین کام لگنے لگتا ہے۔ ایسے میں ایک "دوسری عورت" اس کی زندگی میں آتی ہے۔ یہ دوسری عورت تائیدِ غیبی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ مرد کی زندگی کے مسمار کھنڈر میں سے ایک نئی عمارت کے خدوخال ابھارتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں، جذبوں اور خوب صورتیوں کی مدد سے مرد کی زندگی کو پھر سے زندگی بناتی ہے۔ پہلی عورت بے شک پہلی ہوتی ہے لیکن یہ دوسری بھی قدرت کی مہربانیوں اور عنایتوں کا بے مثل ثبوت ہے۔ یہ دوسری چارہ گر عورت نہ ہوتی تو شاید ناکام محبت کا عفریت ان گنت بدنصیبوں کو نگل چکا ہوتا۔

یہ بات کہنے کے بعد ہمارے استاد محترم نے کلاس میں بیٹھی ہوئی ایک کم عمر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا تھا... ہاں اس "دوسری عورت" کی طرح ایک دوسرا مرد بھی ہوتا ہے۔ قدرت نے مرد و زن میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔

میں سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ آج میں اس "دوسری عورت" کو دیکھ رہا ہوں۔ جب میں نے ثروت کو کھویا تھا تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زخم زخم ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مہلک زخموں کا مداوا کرنے والی وہ دوسری عورت لاہور سے ہزاروں میل دور اتر پردیش کے اس دور دراز رانجواڑے کے ایک چھوٹے سے گھر میں موجود ہے اور میری تقدیر مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔

نیند کی حالت میں سلطانہ کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھے تھے۔ یہی وہ ہاتھ تھے جن سے اس نے مجھے بھی ڈوبتے ہوئے گڑھے کے اندر سے نکالا تھا۔ میں نے محبت سے ان ہاتھوں کو دیکھا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا، پھر نگاہوں سے اس کی پیشانی کو الوداعی بوسہ دیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہاں، میں جانے کے لیے تیار تھا۔ میرے اندر کے بے پناہ اضطراب کا علاج اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا کہ میں سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک دیوانی ٹھوکر مار کر یہاں سے نکل جاؤں۔ زرگاں کا رخ کروں اور سلطانہ کی عزت کے ہتھیاروں سے قرار واقعی انتقام لے لوں۔ میں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس بارے میں بہت سوچ بچار کی تھی۔ ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور کیا تھا۔ اس وقت میرے کپڑے کی جیکٹ کی جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا۔ پسٹل کے دو فالتو میگزین اور قریباً سو راؤنڈ بھی میرے پاس تھے۔ اس کے علاوہ ایک شکاری چاقو اور ٹارچ بھی تھی۔ تھوڑا سا خشک راشن بھی میں نے لے لیا تھا۔

کل دوپہر جب سلطانہ میری گردن کے زخم کی پٹی کرنے کے بعد اوپر کلثوم اور رادھا کے پاس چلی گئی تھی، میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا اور طلال کے ساتھ مل کر کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ ایک دراز میں بچھے ہوئے موٹے کپڑے کے نیچے سے مجھے پوستین کی وہ چھوٹی سی پڑیا مل گئی جس کا ذکر طلال نے کیا تھا۔ اس پڑیا میں نیلے تھوتھے جیسا کوئی مہلک سفوف موجود تھا۔ طلال اپنی عمر سے بڑھ کر سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر سمجھا دیا تھا کہ میں کہاں جانے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اور طلال کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ سلطانہ اور عمران وغیرہ کو بتا دے گا کہ میں کہاں گیا ہوں... اور میری طرف سے سلطانہ کو پوری تسلی بھی دے گا کہ میں تین چار دن کے اندر اندر یہاں واپس پہنچ جاؤں گا۔

نصف شب کی ان گھڑیوں میں، میں نے خود کو ریاست کپل وستو کے راجا سدھارتھ کی طرح محسوس کیا، جو آدھی رات کو اپنی محبوب بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا اور نامعلوم منزلوں کا راہی ہو گیا۔ میں بھی یہاں سے نکل رہا تھا لیکن... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جا سکوں گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے ساتھ کچھ ایسا ہوگا جو میرے پروگرام میں بالکل شامل نہیں۔

پروگرام یہی تھا کہ میں پہلے کی طرح مندر سے نکلوں گا۔ مجھے سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے کمرے میں جانا تھا جہاں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ امید تھی کہ بارہ سوا بارہ کے قریب آفتاب یہاں آئے گا...... مجھے دروازے پر سے ہی ساتھ لے کر باہر نکل جاتا تھا اور اسے پابند کر دیا تھا کہ وہ آج رات واپس مندر میں، عمران وغیرہ کے پاس نہیں

digestpk.blogspot.com

آئے گا۔

حسب پروگرام میں خاموشی سے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے اوپر والے تہ خانے میں پہنچا اور پھر کاٹھ کباڑ والے تاریک کمرے میں چلا گیا۔ آفتاب کی آمد میں اب پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ آج کہیں ناغہ نہ کر لے۔ میرے کان باہر کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ آوارہ کتوں کی مدھم آوازوں کے علاوہ باہر مکمل خاموشی تھی۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ باہر سے نہیں تاریک کمرے کے اندر سے ہی آئی تھی۔ یہ عمران تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”جگر! چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ تو آدھی رات ہے۔۔۔ بھئی یہ تو آدھی رات ہے۔“

وہ بلی کی چال چلتا ہوا اتنی صفائی و مہارت سے مجھ تک پہنچا تھا کہ میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ مجھ سے فقط دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔

”تت۔۔۔ تم یہاں؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔۔۔ یہ تو آدھی رات ہے۔۔۔“ اس نے پھر شعر پڑھا۔ ”میں آفتاب کا انتظار کر رہا تھا۔“

”کس لیے؟“

”بتانا ضروری ہے؟“ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔ کیونکہ مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے میری جیکٹ کے ابھرے ہوئے حصے کو ٹٹولا جہاں پسٹل کے فالتو راؤنڈ موجود تھے۔

میں جھنجھلا گیا۔ کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“ میں نے برہم لہجے میں کہا۔

”مسئلہ تو تمہارا ہے جو اس طرح بغیر کسی کو بتائے آفتاب کے ساتھ باہر نکل جاتے ہو۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اس مرتبہ تمہارا ارادہ صرف آس پاس جانے کا نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے میں جا رہا تھا۔۔۔ بلکہ میں جا رہا ہوں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم سے اجازت لوں۔“

”جگر! یہاں کوئی ماتحت اور باس نہیں ہے لیکن ہمارا نفع نقصان تو ایک ہے نا۔ ہم میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان ہو۔“

”میرے جانے سے بھی کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اپنی جان دے دوں گا لیکن تم لوگوں کے بارے میں ایک لفظ۔۔۔ ہاں، ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گا۔“

”واہ۔۔۔ یہ بات تم نے اچھی کہی ہے۔ کیا تمہارے جان دے دینے سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا؟ گدھے! ہم تو جیتے جی مر جائیں گے۔ کم از کم میں تو ضرور وفات پا جاؤں گا۔“

”مخول نہ کرو عمران۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

”جارج گورا کی طرف؟“ اس نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، جارج گورا کی طرف۔“ میں نے سینہ تان کر کہا۔

وہ چند لمحے تک میرے پرتپش، باغی لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ ”جارج گورا کی طرف ہم دونوں جائیں گے لیکن اس وقت جب جانا مناسب ہوگا۔“

”مناسب اور نامناسب کا فیصلہ تم مت کرو۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ اس معاملے سے میں ہی نمٹوں گا۔“

”یہاں کسی کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں ہے۔“ عمران کے لہجے میں پہلی بار ترشی آئی۔ ”ہم سب کی قسمت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جس سے دوسروں کے لیے مصیبت ہو۔“

”میں نے کہا ہے نا میری وجہ سے تم لوگوں کو۔۔۔“

”پلیز تابی، پلیز۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ ہمارا دشمن بہت خطرناک ہے۔ ہماری جلد بازی اسے اور خطرناک بنا سکتی ہے۔۔۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”انتظار۔۔۔ انتظار۔۔۔ میں نہیں کر سکتا اب انتظار۔۔۔ وہ مر جائے گی۔۔۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

اسی دوران میں بیرونی دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد آفتاب اپنے ٹریڈ مارک لالٹین اور لاٹھی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت سرد ہوا کا جھونکا بھی اندر آیا۔ آفتاب کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی جس میں راشن وغیرہ تھا۔ ہم دونوں کو تناؤ کی حالت میں آمنے سامنے کھڑے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

میرے اندر عجیب سا اشتعال پیدا ہو چکا تھا۔ دروازہ

کھلا تو میں بے جھجک دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روکا۔ ”کیا کرتے ہو تابی! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟“

”ہاں۔۔۔ اور تم بھی ہوش کرو۔۔۔ آج مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔“

”تم سوچ سمجھ کر نہیں کر رہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ ادھر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اس نے میرا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی آفتاب کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ آفتاب نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔

”آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہاری آنکھیں کھولوں۔“ عمران نے کہا۔ میرا بازو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

”تم جو مرضی کر لو عمران۔۔۔ لیکن میں آج رکوں گا نہیں۔“

”پہلے میری بات سن لو پھر فیصلہ کرنا۔“

عمران مجھے لے کر بالائی تہ خانے میں آ گیا۔ اس نے آفتاب کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایک کمرے میں آ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہاں ایک بڑی لالٹین روشن تھی اور فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ عمران نے مجھے اور آفتاب کو چٹائی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”تمہیں خطرے کا احساس نہیں [illegible] آفتاب سے باتیں کر رہا تھا اور تمہیں دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

”اور تم نے ہمیشہ کی طرح بات کو مذاق میں ٹال دیا تھا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”اس مذاق کی کوئی وجہ تھی۔ اگر میں وجہ بتا دیتا تو شاید تمہارا اب تک کا وقت بڑی پریشانی میں گزرتا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”چھ سات دن پہلے تم نے اپنی من مانی کی اور باہر چلے گئے۔ ٹھیک ہے کہ اس من مانی کا نتیجہ اچھا نکلا اور تم کلثوم کو سکی اور مہندو وغیرہ سے بچا کر یہاں لے آئے لیکن اس کا ایک نتیجہ برا بھی نکلا ہے۔ بے شک تم تھوڑی دیر کے لیے تہ خانے سے باہر رہے ہو مگر یہ تھوڑی دیر بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ آفتاب خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم بتاؤ خان۔“

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ”تابش برادر! منگل کے روز صبح سویرے کچھ لوگ ایک جیپ پر سوار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس وقت گاؤں کا سب لوگ سو رہا تھا۔ ان جیپ والوں نے ام کو بتایا کہ وہ شکاری ہے اور ایک ایسے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے جو ان کا دو انگلش رائفلیں اور بہت سا کارتوس لے کر بھاگ گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک تصویر دکھایا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ آپ کا تصویر تھا۔ لگتا تھا کہ آپ جیل میں کھڑا ہے۔۔۔ شاید زرگوں کے جیل میں۔ آپ نے جیل کے قیدیوں والا وردی بھی پہنا ہوا تھا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر حیران تو بہت ہوا لیکن ام نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ام نے کہا کہ کچھ مہمان وغیرہ تو گاؤں میں ضرور آیا ہوا ہے لیکن ام ان سب کو جانتا ہے۔ ان میں یہ بندہ تو نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ام کو آپ کا دو فوٹو اور بھی دکھایا لیکن ام نے ماننے سے صاف انکار کیا۔“

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ”ان لوگوں کے پاس جیپ میں ایک انٹینا قسم کا چیز بھی رکھا تھا۔ وہ اس انٹینا کو لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ حویلی کے حجرے کی طرف بھی گیا پھر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس نے جاتے جاتے ام کو پانچ سو روپیہ بھی دیا اور بولا۔ ”خان! [illegible] آگے کے بارے میں کچھ پتا لگے تو [illegible] رکھنا۔“ ام [illegible] یہاں کا چکر لگائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ چلا گیا۔

عمران نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تابی! اس رات تم اور ہم سب اس لیے [illegible] کے لوگوں سے بچے رہے کہ تم سب سے نیچے والے تہ خانے میں تھے۔ اگر تم اوپر والے تہ خانے میں ہی ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ منحوس انٹینا تمہاری چپ کے سگنل پکڑ لیتا۔۔۔ وہ لوگ دفعان نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ جب تم کلثوم کی مدد کرنے کے لیے اوپر بستی میں گئے تو ان لوگوں نے تمہارے سگنل پکڑے۔ تمہارے باہر نکلنے کا مطلب پکڑے جانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔“

”یا خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ایک گاڑھا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میں آزاد نہیں ہوں۔ ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہوں۔ اتنی تنگ کوٹھری ہے کہ میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اب سے نہیں لاتعداد زمانوں سے اس کوٹھری میں

digestpk.blogspot.com

ہوں۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

میری فرسٹریشن انتہا کو پہنچ گئی۔ شدید جھنجلاہٹ اور تپش کے زیر اثر میں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر زوردار مکا مارا۔ موٹی لکڑی کی یہ تپائی ٹوٹ گئی... میرے بازو میں ہاتھ سے لے کر کندھے تک درد کی ٹیسیں اٹھیں لیکن ایسی ٹیسیں مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔

آفتاب حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی ٹوٹی ہوئی تپائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی کچھ دیر بھونچکا رہا۔ پھر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ "حوصلہ رکھو تابی! سب ٹھیک ہو جائے گا مگر... کسی طریقے سے چلنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اس منحوس "چپ" سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں سے نکلنے اور کچھ کرنے کے قابل ہو سکیں گے... تم دیکھنا..."

"کچھ نہیں ہوگا... کچھ نہیں۔" میں نے تیزی سے عمران کی بات کاٹی اور پاؤں پٹختا ہوا نچلے تہ خانے کی طرف چلا گیا۔

میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ابھی جیکٹ سے شکاری چاقو نکالوں اور آئینے کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو جاؤں۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گردن کا پچھلا حصہ چیر ڈالوں اور اس منحوس دھاتی ٹکڑے کو اکھاڑ کر پھینک دوں جس نے کئی برس سے مجھے اس "اسٹیٹ" میں زنجیر کر رکھا ہے۔ میرے اس روپے نے "آپریشن" کو نتیجہ کچھ بھی ہو مگر میں یہ کام کر گزروں۔

میرے ہاتھ سے تھوڑا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے روئی سے اسے صاف کیا۔ سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے تیکھے چہرے پر وہی کرب تھا جو بیداری میں اسے گھیرے رکھتا تھا۔ اس کرب اور بے قراری کی وجہ وہ بے پناہ زخم تھا جو سلطانہ کے جسم سے لے کر اس کی روح تک اترا ہوا تھا۔ مجھے اس زخم کا مرہم تو معلوم ہو گیا تھا مگر مرہم تک رسائی ممکن نظر نہیں آرہی تھی۔

طلال ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ میری روانگی ملتوی ہو گئی ہے۔ کم از کم میں آج رات تو نہیں جا رہا۔

"کیوں جی؟"

"بس کوئی وجہ ہے..... تم ابھی اپنی خالہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

میں نے طلال سے پوچھا۔ "تمہاری خالہ کو اب تک پتا کیا تو نہیں چلا؟"

"نہیں جی۔ ابھی تک تو نہیں۔"

"کوئی اور بات کی ہے انہوں نے؟"

"نہیں جی... لیکن کل دوپہر جب آپ اوپر عمران بھائی اور ... افضل کے ساتھ بیٹھے تھے، وہ نوری سے کچھ بات چیت کر رہی تھیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے سنا تو کچھ نا ہیں جی... پر میں نے نوری کو خالہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ ایک دم گم صم نظر آرہی تھی۔"

میرے اور طلال کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر وہ سونے کے لیے چلا گیا۔

میں نے بے حد مایوسی کے عالم میں اپنا پسٹل، ٹارچ اور فالتو راؤنڈز وغیرہ جیکٹ سے نکال کر پھر سے الماری میں رکھ دیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً دھیان نوری کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ سلطانہ سے زبردست جھاڑیں کھانے کے بعد وہ جیسے ایک دم اوجھل ہو گئی تھی۔ آج بند کمرے میں سلطانہ اس سے نہ جانے کیا بات کرتی رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں سیڑھیاں چڑھا اور درمیانی تہ خانے میں آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوتی ہے اور پھر دن چڑھے تک پڑی رہتی ہے۔ شاید اس کی یہ عادت حمیا کی حویلی میں پختہ ہوئی تھی جہاں وہ سلطان سلو کی رکھیل تھی۔ یقیناً سلطان سلو کے ساتھ ساتھ اسے اس کے یار دوستوں کی میزبانی بھی کرنا پڑتی ہوگی اور ایسی میزبانیاں عموماً رات کو ہی ہوتی ہیں۔

میں نوری کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گنگنانے کی نہایت مدھم آواز بھی سنائی دی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نوری ابھی جاگ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں نوری کے ساتھ پیچھے گرو کی بیٹی رادھا بھی سوتی تھی لیکن رادھا پکی دھرمی لڑکی تھی۔ ایک مسلمان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اس کے دھرم پر بلیپٹ کرتا تھا اس لیے اسے اوپر والے تہ خانے میں نسبتاً بڑا کمرا دے دیا گیا تھا جہاں پوجا کے لیے بہت سی مورتیاں موجود تھیں۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور ایک کھڑکی میں ایک باریک سی جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ کمرے کا ایک تہائی منظر ہی نظر آسکا۔ اس منظر میں نوری بھی شامل تھی۔ وہ حسب معمول گھٹنوں تک آتا چولی نما

تھی جو ہم سر پر چنری نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ پر مہندی لگائی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ سے اپنے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی لگا رہی تھی۔ اس کے سامنے پرانی طرز کا ایک بیضوی آئینہ تھا۔

لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان تاثرات میں انتظار، امید، خواہش سب کچھ شامل تھا۔ شاید یہ امید اور خواہش وہی تھی جو ہر لڑکی کے دل میں اس کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک روز شدید تمنا کا روپ دھار لیتی ہے... ایک شوہر، ایک گھر اور پھر ایک ہمکارتے ہوئے بچے کی آمد۔ خوش رنگ شام، کسی کے قدموں کی چاپ کا انتظار... اور پھر پھولوں بھرے آنگن میں زندگی کی کھلی کھلی خوشیاں۔ نوری کوئی کنواری دوشیزہ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنے گندے ہاتھوں کے نشان تھے لیکن پھول تو سڑے ہوئے کیچڑ میں بھی اگتے ہیں۔ آرزوؤں پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔ عمران نے نوری کو ایک اچھی زندگی کی آس دلائی تھی اور شاید وہ اس وقت آئینے میں اسی آس کے نقش دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا... اور پھر اندر چلا گیا۔ نوری نے مجھے گھوم کر دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے چنری کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ سامنے کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ وہ اسے لینے کے لیے بڑھی۔ مہندی والی ہتھیلی پر اس کا پاؤں پڑا اور بری طرح رپٹ گیا۔ وہ گر گئی۔ "اوئی اللہ جی۔" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اسے اٹھانا چاہا مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح سٹی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے چنری کھونٹی سے اتاری اور اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیا۔

وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ "بابو جی! آپ یہاں کیسے؟" وہ ہکلائی۔

"کمرے میں روشنی دیکھ کر آگیا ہوں۔ پر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"کچھ نا ہیں جی۔ آپ کی "وہ" بڑی سخت ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو میرا حشر نشر کر دیویں گی۔ آپ کا تو کچھ نا ہیں جاوے گا، پر ان کی مار سے مجھ غریبنی کی ساری چولیں ہل جاویں گی۔" وہ بار بار سینے پر دوپٹا درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے اس حوالے سے اسے خاص ہدایات دے رکھی ہیں۔

میں نے کہا۔ "زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ اس وقت کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔ اس کے ادھر آنے کا چانس بالکل نہیں۔"

"لیکن... ب... بابو جی... میں... دراصل... اس طرح کی لڑکی نا ہیں ہوں۔ وہ تو آپ کو پتا لگ ہی گیا ہوگا۔ مجھے عمران بابو نے کہا تھا کہ آپ سے ذرا نس کھیل کر بات کروں۔ وہ چاہت تھے کہ آپ میاں بیوی میں ذرا جلدی سے صلح ہو جاوے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نا ہیں تھی جی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سب پتا ہے۔ تمہیں صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی۔ "میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کل دوپہر سلطانہ نے تمہیں کیوں بلایا تھا... کچھ کہا تھا اس نے؟"

"کوئی خاص بات تو نا ہیں تھی جی۔ بس وہی باتیں تھیں جو وہ پہلے بھی دو تین بار کر چکی ہیں... وہ آپ سے بہت زیادہ پریم کرتی ہیں جی۔ جتنا آپ کو بتاتی ہیں، شاید اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔ وہ آپ کے پاس میرا سایہ بھی دیکھنا نا ہیں چاہتیں بلکہ شاید کسی لڑکی کا سایہ بھی نا ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے بس چھوڑا ہے، معاف نہیں کیا اور اگر آئندہ مجھ سے اس بارے میں کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہوئی تو وہ ایسا کچھ کر گزریں گی کہ میں سوچ بھی نا ہیں سکتی۔ انہوں نے مجھ سے کہلوایا کہ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نا ہیں ہے جی۔ میں نے بتایا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا..."

"ہاں ہاں، مجھے پتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا عمران کے کہنے پر کیا۔ میں صرف یہی پوچھنے آیا تھا کہ تمہارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟"

"باتیں تو بس یہی ہوئی تھیں جی... بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے... کہیں چلے جانا ہے اور وہ سوچ رہی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد بھی میں کوئی ایسی ویسی غلطی نہ کروں... یا پھر شاید وہ ویسے ہی بہت زیادہ وہمی ہو گئی تھیں۔" نوری نے اپنے کشادہ گریبان پر پھر آنچل درست کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا کہ اسے کہیں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی، یونہی۔ ایویں میرے دل میں بات آرہی تھی۔ وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ بندہ، بندوں سے تو چھپ سکت ہے لیکن خدا سے نا ہیں چھپ سکت۔ یہ بات کبھی نا ہیں سوچنی چاہیے کہ جھوٹ چھپا رہے گا۔ جلدی یا دیر سے اس کا پتا ضرور چل جاوت ہے۔ بس اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔"

ایک دم سیڑھیوں کی طرف آہٹ ہوئی۔ نوری کا رنگ

digestpk.blogspot.com

بلند ہو گیا۔ اس نے آنچل کو مضبوطی سے سینے پر تھاما اور ڈری ڈری آواز میں بولی۔ "کوئی آ رہا ہے۔"

میں نے دروازے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ کوئی سیڑھیوں پر تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے سیڑھیوں کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اور اپنا جسم آگے کو جھکایا تاکہ نیچے دیکھ سکوں۔ اس کے لیے مجھے گردن کو پورا گھمانا پڑا۔ گردن کے پچھلے حصے میں سر کے نیچے، زخم میں ٹیس سی اٹھی۔ بہرحال میں دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ تاؤ افضل تھا۔ ہاتھ میں چوکیداری والی لٹھ لیے وہ ڈگمگاتا ہوا دو تین زینے چڑھا پھر ایک زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے رات کو اسے اکثر اسی زینے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ زینہ اس دروازے کے عین سامنے تھا جہاں اس کی دونوں بیٹیاں کلثوم کے ساتھ سوتی تھیں۔ وہ اس مے خانے میں بھی ان کا پہرا دیتا تھا۔ اس کا دل شاید یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹیاں چند لمحوں کے لیے بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ وہ فتح پور کا نگہبان تھا۔ کالی راتوں میں وہ اپنے گھر کو بھول کر دوسروں کے گھروں کا پہرا دیتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے اپنے ہی گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ اس کی بیوی جان سے چلی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے فتح پور کے اس نگہبان کو نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ اب وہ صرف اپنی جوان بیٹیوں کا نگہبان تھا۔ ان کی طرف سے آنکھ جھپکنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

میں واپس مڑا۔ نوری سے چند منٹ اور گفتگو کی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی اس لیے میں نے زیادہ دیر اس کے کمرے میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نوری سے گفتگو کے دوران میں بھی میری گردن سے ٹیسیں اٹھتی رہیں لیکن میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ گردن کے اس زخم کا مناسب علاج نہیں ہو سکا تھا اس لیے ذرا سے کھنچاؤ کے سبب زخم سے خون رسنا شروع ہو جاتا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور آئینے میں دیکھ کر خود ہی خون کا رساؤ روکا۔ تازہ پٹی باندھ کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ درد میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گردن کا سارا پچھلا حصہ اور کندھے وغیرہ سن ہو رہے ہیں۔۔۔ میں درد برداشت کرنے میں ماہر ہو گیا تھا۔ میں درد کی لہروں میں ڈوب جاتا تھا اور جس طرح دھند کے اندر چلے جانے سے دھند اوجھل ہونے لگتی ہے، میرا درد بھی شدت کھونے لگتا تھا۔ مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، درد کی شدت بڑھتی گئی۔ یہی کیفیت میں نے کچھ دیر کے لیے کل رات بھی محسوس کی تھی مگر آج تو حد ہو رہی تھی۔

میں درد سے لڑتا رہا۔ بارود خیلی اس حوالے سے مجھے بہت کچھ سونپ گیا تھا اور وہ جو کچھ سونپ گیا تھا، میں اسے بروئے کار لا رہا تھا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ میں ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگایا تو وہ پسینے سے تر تھی۔ گردن ہی نہیں پورے جسم میں درد کی شدت سے اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ بے پناہ درد سے لڑتے لڑتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے درد کے حوالے سے میرا سارا فلسفہ بے کار ہے۔ تکلیف، تکلیف ہی ہوتی ہے۔۔۔ اسے کب تک اور کس حد تک سہا جا سکتا ہے مگر پھر فوراً ہی اپنے اس خیال کو۔۔۔۔۔۔ رد بھی کیا۔ رات تین بجے کے قریب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔۔۔ تاہم میں نے سلطانہ کو جگایا اور نہ کسی دوسرے کو مدد کے لیے پکارا۔ میرے اور درد کے درمیان ایک جنگ جاری تھی اور ہم میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ضد سی میرے اندر پروان چڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن کسی کو مدد کے لیے نہیں بلاؤں گا۔

اور تب واقعی مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ میرے کندھے اور ریڑھ کی ہڈی سن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے بری طرح چونکا گیا۔ میری گردن کا یہ تازہ زخم اس جگہ کے بالکل قریب تھا جہاں زنگیاں کے سرجن اکمل نے میرے اندر "چپ" پلانٹ کر رکھی تھی۔ تو کیا میرا یہ زخم اس "چپ" کو تو ایفیکٹ نہیں کر رہا تھا؟

یہ خیال کسی دہکتی ہوئی سلاخ کی طرح میرے سینے میں لگا۔ ڈاکٹر ہی وان نے کہا تھا کہ وہ چپ بڑی نازک جگہ پر پلانٹ کی گئی ہے۔ اسے نکالتے ہوئے میرے عصبی نظام کو بھی گزند پہنچ سکتی ہے۔۔۔ کیا میرے ساتھ کچھ اسی طرح کا معاملہ تو نہیں ہونے والا تھا؟

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کرب کی شدت سے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی۔

"کیا بات ہے مہروج؟" سلطانہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش سمٹ آئی تھی۔۔۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی
داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

کشیدگی کسی بھی حال میں خوشگواریت کا باعث نہیں بنتی۔۔۔ اپنے شوہر سے نالاں ایک ایسی بیوی کا ماجرا۔۔۔ ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں تناؤ کی فضا بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ جو کسی بھی لمحے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

لب دریا پیاسے رہ جانے والے سودائی کا ڈرامائی انداز

اونچی بولی

تنویر ریاض

دن کا آغاز اچھا نہیں ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پر ہی ان دونوں کے درمیان جھڑپ ہو گئی۔ برائن ڈیلن نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے لیے اس تقریب میں جانا کیوں ضروری ہے؟"

ہیلری نے خط پر سے نظریں ہٹائیں اور چشمے کے شیشوں میں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "ہمارا جانا اس لیے ضروری ہے کہ پولی میری عزیز ترین دوست ہے اور فریڈی سے بھی تمہاری اچھی خاصی دوستی ہے۔ ہمارا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ویسے تو ہم کہیں باہر جاتے نہیں اور اس لیے بھی کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ہم ابھی تک ایک جوڑے کے طور پر

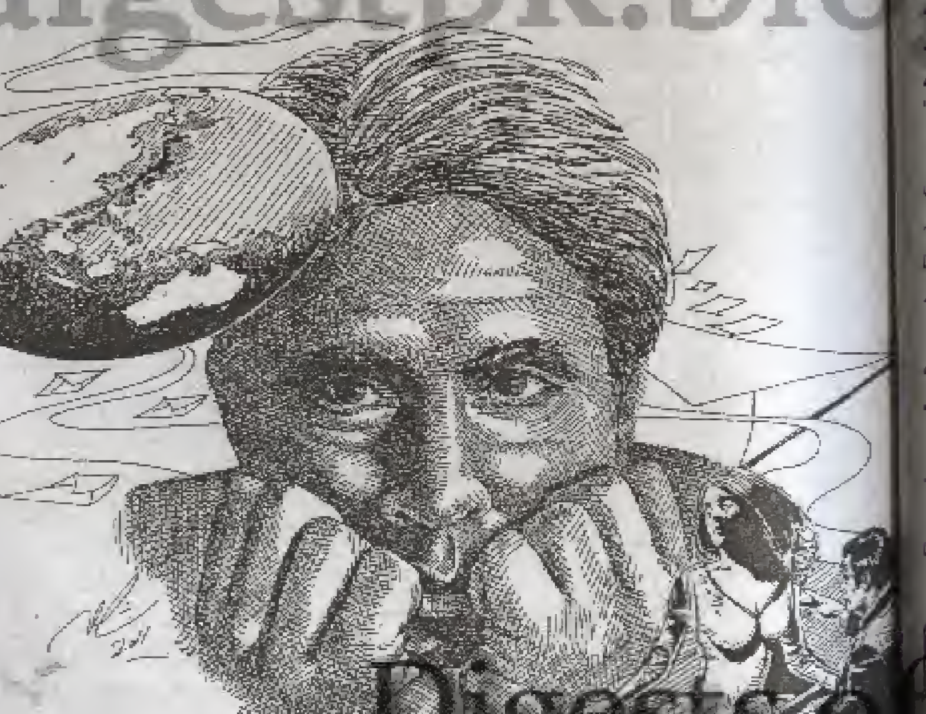

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

ساتھ رو رہے ہیں۔"

"اب انہیں اس نوکری پر بڑا لاڈ آرہا ہے۔ ایک سال پہلے تو علیحدگی کی نوبت آگئی تھی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب پولی روتی ہوئی یہاں آیا کرتی تھی۔"

"وہ بات پرانی ہو چکی، اب ان کے تعلقات پہلے سے بہتر ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تبدیلی کیسے آئی... لیکن وہ یونہی ایک بچی کے والدین نہیں بن گئے۔"

"بہرحال، فریڈی سے میری بھی دوستی نہیں رہی۔ میں نے تو اسے کافی عرصے سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔ انہیں بتا دینا کہ میں بہت مصروف تھا۔"

"ہم اکٹھے ہی جائیں گے۔" ہیلری کی آواز میں فولاد جیسی سختی تھی۔ "تمہیں تو جانا ہی ہوگا کیونکہ کیٹرنگ کا انتظام تمہارے ذمے ہے۔ کیا تمہاری چہیتی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

واقعی ڈیف نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"صرف ایک سو مہمانوں کے لیے دو ڈشیں تیار کرنی ہیں۔ شاید تمہاری چہیتی اتنے چھوٹے آرڈر میں سر کھپانا پسند نہیں کرتی۔" ہیلری نے طنز کیا۔

"تمہارے لیے ہر آرڈر یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے بتانا بھول گئی ہو یا پھر... کوئی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کام پر چل دیا۔ راستے میں کار چلاتے ہوئے وہ ہیلری کے تلخ رویے کے بارے میں سوچ رہا تھا گو کہ ابھی علیحدگی کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار ضرور حائل ہو گئی تھی۔ شاید دولت آجانے سے رویوں میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ اپنی زندگی کے بیس سال ان آسائشوں کے پیچھے بھاگنے میں گزار دیتے ہیں جو آپ کی زندگی کو آسان بنا سکیں اور جب سب کچھ دسترس میں آچکا ہوتا ہے تو پتا لگتا ہے کہ زندگی قطرہ قطرہ کر کے آپ سے دور چلی گئی ہے اور آپ دولت کے اس انبار کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

اس نے سوچا کہ پہلے وہ لوگ کتنا خوش رہا کرتے تھے لیکن یہ بہت شروع کی بات ہے... جب اس کی کامیابی کا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔ اسے وہ تقریب اچھی طرح یاد تھی جب وہ پہلی بار آزادانہ کیٹرنگ منیجر کی حیثیت سے کسی شادی کا انتظام کر رہا تھا۔ وہ بوکھلایا ہوا پنڈال میں آیا اور اس نے میزوں کی سجاوٹ پر آخری نظر ڈالی۔ اسے [illegible] کام کرنے تھے جن میں کھانے کو چیک کرنا اور بیروں کو ہدایات دینا بھی شامل تھا۔ ابھی وہ ان سب کاموں کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا تھا کہ ایک لڑکی سلک کا لباس پہنے اور سر پر ہیٹ لگائے پنڈال میں داخل ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دلہن کی بہن تھی۔ اس نے ایک نظر سجی ہوئی میزوں پر ڈالی اور سیٹی بجاتے ہوئے بولی۔ "یہ سب تم نے کیا ہے؟"

اس کی زبان سے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ یوں لگا جیسے حلق میں گولہ پھنس گیا ہے۔

وہ لڑکی اس کی خاموشی کو اقرار سمجھتے ہوئے بولی۔ "ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بہت عمدہ انتظام کیا ہے۔"

شاید پہلی نظر کی محبت اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد معاملات طے ہونے میں دیر نہیں لگی اور سات مہینے بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس کے چھ ماہ بعد برائن نے اپنی کمپنی کھول لی۔ "ذہین آدمی" ہیلری کا تکیہ کلام تھا۔ پہلی بار اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر برائن کو بہت اچھا لگا تھا اور آج بھی جب بھی وہ یہ الفاظ استعمال کرتی تو برائن کے حلق میں گولہ اٹکنے لگتا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم جاتا جب اس کا سامنا پہلی بار سلک کے لباس میں ملبوس اس لڑکی سے ہوا تھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی مخصوص جگہ پر پارک کر دی۔ اس کے دفتر کے برابر میں ہی ایک اور عمارت زیر تعمیر تھی جہاں زور و شور سے کام جاری تھا۔ کنکریٹ کا کام مکمل ہو چکا تھا اور اب اینٹوں کی چنائی شروع ہونے والی تھی۔ برائن نے ایک نظر زیر تعمیر عمارت پر ڈالی اور سوچا کہ یہ بھی اچھا کاروبار ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا خریدو اور اس پر کئی منزلہ عمارت کھڑی کر کے لاکھوں ڈالرز کماؤ۔

وہ دفتر پہنچا تو اس کی معاون ڈیف نے اسے فریڈی کی پارٹی کے بارے میں بتایا۔ وہ پہلے ہی اپنے طور پر سارا انتظام کر چکی تھی اور اس نے فریڈی کو فیکس کے ذریعے مینو کی تفصیلات بھی بتا دی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں ڈیف کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے ہیلری کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ ڈیف نے یہ بھی بتایا کہ کیمبل نامی کوئی شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے اسے سوموار کے دن گیارہ بجے کا وقت دیا ہے۔ برائن نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ بہت سے گاہک ڈیف سے مطمئن نہیں ہو پاتے تھے اور ذاتی طور پر اس سے ملنا چاہتے تھے۔ برائن نے [illegible]

انتظامات مکمل تھے لیکن اسے ویٹرز کا بندوبست کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ڈورس کا کہنا تھا کہ اس روز تین شادیوں اور روٹری کلب کی ایک پارٹی میں اس کی تمام ویٹرس مصروف ہوں گی۔ یہ سن کر برائن کا دماغ گھوم گیا، وہ کسی قیمت پر بھی ہیلری کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ڈورس کو دگنے معاوضے کی پیشکش کی، تب کہیں وہ راضی ہوئی۔

☆☆☆

فریڈی کی بیٹی بھی باپ کی طرح بدصورت تھی جبکہ اس کی ماں پولی کا شمار خوب صورت عورتوں میں ہوتا تھا لیکن فریڈی اپنی بیٹی کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر بوفے... پر ڈالی اور برائن سے بولا۔ "بہت خوب! تم نے بہت اچھا انتظام کیا ہے۔"

"اگر تم ذرا پہلے آرڈر دے دیتے تو اس سے بھی اچھا انتظام ہو سکتا تھا۔" برائن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"دراصل ہم نے پہلے سے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔"

برائن نے ایک نظر دور بیٹھی پولی پر ڈالی جو بچی کو گود میں لیے بڑے انداز میں بیٹھی مسکرا مسکرا کر دوسری خواتین سے باتیں کر رہی تھی۔ ہیلری بھی اس کے برابر میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اچٹتی ہوئی نظر برائن پر ڈالی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ برائن نے فریڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "گو کہ مجھے کچھ پوچھنے کا حق تو نہیں لیکن پھر بھی جاننا چاہوں گا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

"کیا؟" فریڈی نے حیرانی سے پوچھا۔

"فریڈی! گزشتہ برس تم دونوں کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ نوبت علیحدگی تک پہنچ گئی تھی، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

فریڈی ہنستے ہوئے بولا۔ "نہیں، تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں... لیکن حالات کی یہ تبدیلی کس طرح عمل میں آئی؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے رازداری کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بس کوئی وجہ ایسی بن گئی جس نے ہم دونوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔"

"یہ تو مجھے کوئی پُراسرار کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں، اس میں کوئی پُراسراریت نہیں، جو حقیقت تھی [illegible] ہیں۔"

برائن کو خیال تھا کہ فریڈی اور پولی کی پارٹی میں جانے کے بعد ہیلری کا موڈ اچھا ہو گیا ہوگا لیکن اتوار کی صبح اس کی بیوی نے اٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ گالف کلب جا رہی ہے اور دوپہر کا کھانا بھی اپنے دوستوں کے ساتھ ہی کھائے گی۔ اس کے جانے کے بعد برائن نے بھی اپنی گاڑی نکالی اور دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سارے راستے وہ ہیلری کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر وہ کیوں اتنی بیزار اور چڑچڑی ہو گئی ہے جبکہ وہ اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سر جھٹک کر اس سوچ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور دفتر پہنچ کر کام میں مصروف ہو گیا۔ شام ڈھلے گھر واپس آیا تو ہیلری سو چکی تھی۔ اس نے فریج میں سے کھانا نکال کر کھایا اور لمبی تان کر سو گیا۔

☆☆☆

مسٹر کیمبل کے بارے میں برائن نے جیسا سوچا تھا، وہ اس سے بالکل مختلف نکلا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا۔ اوور کوٹ، سوٹ، شرٹ اور ٹائی سب کا رنگ سیاہ تھا۔ اس سیاہ لباس میں اس کا سفید چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا، برائن نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی کیونکہ برابر والی زیر تعمیر عمارت میں کھدائی کا کام ہو رہا تھا اور اس کے شور کی وجہ سے انہیں بات کرنے میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ کیمبل نے تحسین آمیز نظروں سے دفتر کا جائزہ لیا اور بولا۔ "بہت اچھا دفتر ہے۔ یقیناً تمہیں اس کاروبار سے ٹھیک ٹھاک آمدنی ہوتی ہوگی؟"

برائن کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا اور وہ بے رخی سے بولا۔ "مسٹر کیمبل! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"یہ سوال تو میں تم سے کرنے والا ہوں کہ کیا تم ہماری خدمات حاصل کرنا چاہو گے؟"

"او ہو تو۔" برائن نے سوچا۔ "یہ تو کوئی سیلزمین معلوم ہوتا ہے۔" ان کے پاس کیٹرنگ میں استعمال ہونے والے سامان کی سپلائی کے لیے سیلزمین آتے رہتے تھے جنہیں ڈیف ہی ڈیل کر لیا کرتی تھی۔ برائن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیف نے اسے اس کے پاس کیوں بھیج دیا، لہٰذا اس نے ٹالنے کی خاطر کہا۔

"میرا خیال ہے مسٹر کیمبل کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" کیمبل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم اور..."

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

کہ مجھے کوئی الجھن نہیں ہے۔"

براؤن نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ بتاؤ تم کیا چاہ رہے ہو؟"

مسٹر کیمپل نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک دستخط شدہ چیک نکال کر براؤن کے سامنے رکھ دیا جس پر تاریخ تو درج تھی لیکن رقم نہیں لکھی ہوئی تھی اور نہ ہی وصول کرنے والے کا نام تھا۔ براؤن نے اس چیک پر ایک نظر ڈالی۔ اس پر ہیلری کے دستخط تھے۔

کیمپل بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ دستخط پہچان لیے ہوں گے؟"

"ہاں۔" براؤن نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "تمہارے پاس میری بیوی کا دستخط شدہ چیک ہے۔"

"تم یہ بھی جاننا چاہو گے کہ مسز براؤن نے یہ سادہ چیک مجھے کس لیے دیا؟"

براؤن نے اپنا لہجہ دھیما رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم اسی بارے میں بتانے کے لیے آئے ہو۔"

کیمپل نے سر ہلایا اور بولا۔ "مسٹر براؤن! کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری ازدواجی زندگی کامیاب ہے؟"

"تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے... پھر بھی اگر جاننا چاہتے ہو تو سن لو کہ میں بہت ہی خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں۔ اب تم کام کی بات کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے۔ ممکن ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔" کیمپل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

براؤن کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ تاہم اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس صرف تیس سیکنڈ ہیں مسٹر کیمپل! اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔ ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔"

کیمپل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "مسٹر براؤن! غصہ کرنے کے بجائے تمہیں مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ تمہاری بیوی نے مجھے اپنا دستخط شدہ... ایک سادہ چیک کیوں دیا ہے؟"

براؤن کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "یہ بات مجھے تم ہی بتا سکتے ہو۔"

"تمہاری بیوی نے میرے ذمے ایک کام لگایا ہے اور اس کے معاوضے کے طور پر مجھے یہ چیک دیا ہے۔ یہ کام مکمل ہونے کے بعد ہی یہ کارآمد ہوگا۔ فی الحال اس کی حیثیت علامتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ اسے تم سے کیا کام ہو سکتا ہے؟" براؤن نے حیرت سے پوچھا۔

"اس نے مجھ سے تمہیں قتل کرنے یا کسی بھی طریقے سے مار دینے کا معاہدہ کیا ہے۔"

براؤن کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو۔ وہ ایسا کیوں چاہے گی؟"

"میں عام طور پر وجہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔" کیمپل اطمینان سے بولا۔ "لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ دولت ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم کسی بس کے نیچے آ جاؤ یا کسی اور حادثے کے نتیجے میں تمہاری موت واقع ہو جائے تو تمہاری ساری دولت اسے مل جائے گی۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ تم نے جس کام کی ذمے داری قبول کی ہے، اسے پورا کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"عام حالات میں، میں شاید ایسا ہی کرتا۔" کیمپل شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ ہم کسی طریقے سے اس صورت حال کو اس طرح تبدیل کر سکتے ہیں جو ہم سب کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم دوسرے راستے بھی تلاش کر سکتے ہیں... اگر تم اپنی بیوی کے مقابلے میں زیادہ بولی دے سکو۔"

"زیادہ بولی... کیا یہ کوئی نیلام ہو رہا ہے؟"

"بالکل، یہ نیلام ہی ہے۔" کیمپل اس اصطلاح پر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس نے مجھے کتنا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے... اگر تم چاہو تو زیادہ قیمت دے کر اس پر سبقت حاصل کر سکتے ہو۔"

"بڑی بولی دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم مجھے نہیں مارو گے۔"

"بالکل۔" کیمپل نے کہا۔ "حالانکہ تمہیں جیسے کو تیسا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اسے مارنے کے لیے تمہیں معاوضہ ادا کروں؟"

کیمپل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"

"ایسی صورت میں تمہارے کنٹریکٹ کو کیا ہوگا جو تم نے میری بیوی کے ساتھ کیا ہے؟" براؤن

"تم جانتے ہو کہ یہ فری مارکیٹ کا دور ہے... جو زیادہ خرچ کرے گا، وہی جیتے گا۔"

براؤن نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اسے ابھی بہت سے کام نمٹانے تھے اس لیے اس نے اس گفتگو کو مختصر کرنے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ "اب تک کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میری بیوی کا چیک لگ گیا ہے۔ اس کے علاوہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" کیمپل نے کہا۔ "تمہاری بیوی نے یہ چیک میرے لیے لکھا ہے۔ تم چاہو تو میں اس ملاقات کی مزید تفصیل بتا سکتا ہوں۔ اس وقت اس نے گہرے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر کڑھائی سے سفید پھول بنے ہوئے تھے۔ وہ کچھ جلدی میں لگ رہی تھی، شاید اسے جم جانا تھا۔"

براؤن کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اتنی معلومات صرف وہی شخص دے سکتا تھا جو ہیلری سے مل چکا ہو۔

"اگر میں ہیلری سے اس بارے میں پوچھوں یا پولیس کو بتا دوں تو تمہارے معاہدے کا کیا بنے گا؟"

"وہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی کہ اس نے ایسا کوئی معاہدہ کیا ہے اور بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں وقتی طور پر یہ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔"

براؤن حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ کیمپل نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے تمہارا بہت وقت لے لیا۔ بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے پر ایک دو روز اچھی طرح غور کر لو۔ میں دو دن بعد تمہیں فون کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈیف اندر آئی اور بولی۔ "سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں۔" براؤن نے آہستہ سے کہا۔ "وہ ایک کام کے سلسلے میں آیا تھا لیکن ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔"

☆☆☆

گھر آنے تک وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کیمپل کی بیان کردہ کہانی میں کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ محض اس سے کچھ رقم اینٹھنے کی خاطر یہ ڈراما کر رہا ہے۔ البتہ یہ سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ کیمپل نے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ اس نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ ہیلری اس کے قتل کے لیے معاوضہ ادا کر سکتی ہے۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ "ایسا ممکن ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ یہ وہی ہیلری ہے جس سے تم نے شادی کی تھی؟ ... تبدیلی ... وقت

کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔ ان کے رویوں میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہیلری بھی بدل گئی ہو۔"

رات کے کھانے پر اس نے ہیلری سے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل کچھ دھوکے باز کافی سرگرم ہو گئے ہیں۔ وہ گیس انسپکٹر، میٹر ریڈر یا پولیس والوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں اور گھر میں داخل ہو کر دھوکے سے رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ تم بھی ذرا ہوشیار رہنا۔"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "پھر بھی میں مسز ولسن سے کہہ دوں گی کہ وہ ایسے لوگوں پر نظر رکھے۔"

اس لمحے براؤن نے اپنے آپ کو بہت بڑا احمق تصور کیا۔ بھلا وہ کیوں اعتراف کرے گی کہ وہ کچھ دن پہلے ایسے ہی ایک دھوکے باز کو ایک چیک دے چکی ہے۔ ہاں، اس کی چیک بک سے اس بات کی تصدیق ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس سے اس چیک کے بارے میں پوچھے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ اس کے پاس پہلے سے جواب تیار ہو۔ وہ کوئی بھی کہانی ... سے مطمئن کر سکتی تھی۔ وہ بہت دیر تک ان ... پر ... کرتا رہا۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

1987ء سے خدمت میں مصروف
پھلبہری
LEUCODERMA-VITILIGO
سفید داغ قابل علاج مرض ہے
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ایوارڈ ہولڈر
اجمل زیدی
کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA
اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
(051) 2864896 - 2265650
0300-6566188
2261536
پشاور
ہوٹل امین
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر
(091) 2218215-9
0300-8566188
لاہور
ہوٹل عامر
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر
(042) 7115015-19
0300-8566188
کراچی
فورچون سینٹر
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
K.F.C
021-7012068-9
0300-8566188
ملتان
ہوٹل سلور سینڈ
28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
(061) 4518061-67
4582603 (0300-8566188)
www.leucodermatologist.com
E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com

رگیں پھٹنے لگیں۔ وہ صوفے کے بجائے لیٹ گیا لیکن نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ دیر تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کا سامنا ہیلری سے ہوا۔ وہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“

”رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا۔“ اس نے بات بنائی۔ ”کام کی مصروفیت بہت زیادہ ہے اس لیے تھکن سوار رہتی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے چھٹی لے لوں۔ شاید اس دوران ہم کہیں گھومنے کے لیے باہر جا سکیں۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ اس طرح ہمیں ساتھ گزارنے کے لیے کچھ وقت مل سکے گا۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی جیسے اسے براؤن کی بات کا یقین نہ ہو، تاہم اس کے چہرے پر ہلکی سی چمک ضرور آ گئی تھی۔

☆☆☆

دفتر پہنچ کر اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ڈلیوری کی تاخیر کی وجہ سے دو تعمیرات کے انتظامات گڑبڑ ہو گئے تھے اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس غلطی کو کس طرح درست کرے۔ براؤن نے گھر سے چلتے وقت سر درد کی گولی لے لی تھی۔ اس کے باوجود سر درد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تاہم اس نے جیسے تیسے معاملے کو سلجھایا پھر ٹھیکیداروں کو فون کیے۔ زیر تعمیر عمارت کا کام کسی طرح مکمل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اب انہوں نے ایک بار پھر کھدائی شروع کر دی تھی۔ مزدوروں اور مشینوں کا شور اس کے سر پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ اس نے تنگ آ کر کھڑکی بند کر دی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس ہفتے کا آغاز ہی اچھا نہیں ہوا تھا اور پے در پے ایسے واقعات پیش آ رہے تھے جن سے اس کی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ کام کا بوجھ تو تھا ہی، اب کیمپل کی صورت میں ایک نیا عذاب نازل ہو گیا تھا۔ اس کا فون کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ ہر گھنٹی پر اسے کیمپل کے فون کا ہی گمان گزرتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ شام گھر آنے کے بعد اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ہیلری سے اس بارے میں پوچھے لیکن جانتا تھا کہ وہ صاف انکار کر دے گی بلکہ اس کی وجہ سے ایک نیا جھگڑا بھی شروع ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ہیلری سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

اسے اپنی اور ہیلری دونوں کی زندگی عزیز تھی۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اگر وہ [illegible]

کی پیشکش کر کے کہے کہ وہ ہیلری سے کیے ہوئے معاہدے کو بھول جائے اور سمجھ لے کہ یہ رقم اسے ہیلری کو قتل نہ کرنے کے لیے ادا کی جا رہی ہے کیونکہ وہ ہیلری کو بھی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر کیمپل نے انکار کر دیا تو...... لیکن وہ کیوں انکار کرے گا؟ اسے پیسوں سے غرض ہے اور وہ اسے ہیلری کے مقابلے میں بڑی رقم کی پیشکش کر رہا تھا۔

☆☆☆

جمعے کی صبح کیمپل کا فون آیا تو براؤن نے اسے بتا دیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے لہٰذا وہ ہیلری کا دیا ہوا چیک لے کر ہفتے کی شب نو بجے اس کے دفتر پہنچ جائے کیونکہ اس وقت تک سب لوگ اپنے گھروں کو جا چکے ہوں گے لہٰذا وہ دونوں تنہائی میں سکون سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ کیمپل نے اس پروگرام سے اتفاق کیا اور مقررہ وقت پر پہنچنے کی ہامی بھر لی۔

ہفتے کی شب ساڑھے آٹھ بجے براؤن بزنس پارک پہنچا تو اس وقت بھی ٹرک سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ دراصل اس روز دوپہر میں ایک شادی کی تقریب ہوئی تھی اور یہ سامان وہیں سے آیا تھا۔ براؤن تھوڑا سا جھنجھلایا لیکن پھر وہ بھی سامان کو اسٹور میں رکھوانے میں اپنے آدمیوں کی مدد کرنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ نو بجے سے پہلے یہ لوگ کام ختم کر کے چلے جائیں۔ جب سارا سامان اندر پہنچا دیا گیا تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ خود ہی دروازہ بند کر کے تالا لگا دے گا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اسٹور کا جائزہ لیا۔ وہاں بہت سی چیزیں بے ترتیب حالت میں نظر آ رہی تھیں۔ بیشتر سامان بکھرا پڑا تھا اور کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ اسے مناسب طریقے سے رکھ دیتا۔ اسے وہاں ایک سائیکل بھی نظر آئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پیر کی صبح اس بارے میں ہیری سے ضرور بات کرے گا اور آئندہ خود بھی ہفتے میں ایک بار اسٹور کا معائنہ کرتا رہے گا۔

اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ بزنس پارک میں ہلکی روشنی تھی لیکن برابر والی زیر تعمیر عمارت نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور دور تک زندگی کے آثار نہیں تھے۔ آدھی رات کے بعد وہاں تین سیکیورٹی گارڈز گشت کرتے تھے ورنہ پیر کی صبح تک یہاں ویرانی ہی چھائی رہتی۔ اس نے پارک میں داخلی دروازے کی جانب دیکھا تو اسے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ اس کی سانس تیز ہونے لگی۔ کیمپل ایک سلور فورڈ میں آیا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور سیدھا براؤن کے پاس آیا جو اس وقت [illegible]

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"گڈ ایوننگ! آج موسم کافی خوش گوار ہے۔"

"اندر آجاؤ۔" برائن نے کہا اور اسے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گیا۔ کیمپل اسٹور میں داخل ہوا۔ وہ دلچسپی سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے ایک چولہے کا دروازہ کھول کر دیکھا اور اس پر رکھے ہوئے برتنوں پر نگاہ ڈالی پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے کوئی فیصلہ کر لیا؟"

"ہاں... لیکن پہلے تم مجھے اس پیشکش کے بارے میں بتاؤ گے؟" برائن نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس نے مجھے بیس ہزار پاؤنڈز دینے کے لیے کہا ہے۔"

"کمال ہے، میں اتنا قیمتی شخص ہوں کہ کوئی مجھے مارنے کے لیے بیس ہزار پاؤنڈز بھی دے سکتا ہے؟ کیا تم دوسروں سے بھی اتنا ہی معاوضہ لیتے ہو؟"

کیمپل نے اپنے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ کیا میں سمجھوں کہ تم بولی لگانے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں۔" برائن نے کہا۔ "لیکن ویسی نہیں جس کے بارے میں ہمارے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔"

"اچھا... پھر تم کس سلسلے میں بولی لگانا چاہتے ہو؟" کیمپل نے پوچھا۔

"میں اونچی بولی لگانے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔"

"گویا تم چاہتے ہو کہ دونوں میں سے کسی کو نہ مارا جائے... اور تم اس کے عوض اپنی بیوی سے زیادہ رقم دینے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" برائن نے کہا۔

"ہم ایسی کسی پیشکش کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے اصول اور روایت کے خلاف ہے کہ زیادہ پیسوں کے لالچ میں ہم پورے معاملے کو ایک طرف رکھ دیں۔ ہم اس طرح کام نہیں کرتے۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو اس سے ہماری ساکھ پر بہت برا اثر پڑے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں لوگوں کو مارنا ہے... اگر ایسا نہیں کرو گے تو یہ کام نہیں کر پاؤ گے؟"

"بالکل ایسی ہی بات ہے۔" کیمپل ڈھٹائی سے بولا۔

برائن کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس شخص سے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے جل کر کہا۔

"گویا تمہیں میری بیوی کو مار کر [illegible]

بجائے اس کے کہ تم کسی کو نہ مارو؟"

"اگر تم نے اس بارے میں سوچ لیا ہے تو ہمیں یہ کام کر کے خوشی ہوگی۔" کیمپل نے سفاکانہ انداز میں کہا۔

یہ سنتے ہی برائن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ اس نے لوہے کا ہتھوڑا اٹھایا جو شامیانہ لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور پوری قوت سے اس کے سر پر ضرب لگا دی۔ کیمپل پیچھے کی طرف جھکا لیکن گرا نہیں۔ اس نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھا اور خون بہتا دیکھ کر بولا۔ "مسٹر برائن......"

اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ برائن نے اس کی کھوپڑی پر دوسری ضرب لگائی۔ اس بار کیمپل کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ برائن نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ زیر تعمیر عمارت کے دائیں طرف ایک بڑا سا چوکور گڑھا کھدا ہوا تھا جس کے چاروں طرف لکڑی کی شٹرنگ لگی ہوئی تھی اور درمیان میں لوہے کے سریے ایستادہ تھے۔ اس نے کیمپل کی لاش کو گڑھے کے برابر لٹایا اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ جیکٹ کی اندرونی جیب سے اسے ایک بٹوا ملا جس میں کار کی چابیوں کے علاوہ وہ چیک بھی موجود تھا۔ اس نے کار کی چابیاں الگ کر لیں اور بٹوا اپنی جیب میں رکھ لیا پھر اس نے کیمپل کی لاش کو گڑھے میں دھکیل دیا جو تقریباً دس فٹ گہرا تھا۔ پھر وہ کیمپل کی کار تک گیا اور اسے بجری اور پتھروں کے ڈھیر کی طرف لایا جو اس گڑھے کی بھرائی میں استعمال ہونا تھا۔ اس نے بلڈوزر کی طرح کار کی مدد سے اس ڈھیر کو دھکیلنے کی کوشش کی اور اچھی خاصی مقدار گڑھے میں پھینکنے میں کامیاب ہو گیا پھر وہ کار سے باہر آیا اور گڑھے میں جھانک کر دیکھا۔ کیمپل کی لاش پوری طرح پتھروں سے دب چکی تھی۔

اسے یقین تھا کہ پیر کی صبح جب یہاں کام شروع ہوگا تو کنکریٹ کی بھرائی سے قبل کسی کو بھی یہ لاش نظر نہیں آئے گی اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو کسی کا دماغ اس کی طرف نہیں جائے گا۔ گو کہ اس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے آئے تھے لیکن ان سے جلد فرصت میں جان چھڑا سکتا تھا۔ دوسرا مرحلہ کیمپل کی کار کا تھا۔ وہ چلتا ہوا اسٹور میں آیا۔ وہاں سے وہ سائیکل نکالی جس کی وہاں موجودگی پر ہیلن سے پہلے اسے اعتراض تھا۔ اس نے سائیکل کار کی پچھلی سیٹ [illegible]

نظر آیا۔ اس نے کیمپل کی کار ایسی جگہ کھڑی کی کہ سڑک سے صاف نظر آئے۔ چابیاں اس نے اگنیشن میں ہی لگی رہنے دیں اور سائیکل پر سوار ہو کر واپس برنس پارک چلا آیا۔ اسٹور میں سے ایک بڑی بالٹی لے کر اس میں گرم پانی اور جراثیم کش دوا ڈالی اور ایک سوپ کے ذریعے فرش پر سے خون کے دھبے صاف کر دیے۔ پھر اس نے وہ لوہے کا ہتھوڑا ایک پلاسٹک کے تھیلے میں رکھا اور اسٹور کا دروازہ بند کر کے باہر آگیا۔

گھر واپس جاتے ہوئے اس نے ممکنات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ سب سے بری صورت حال وہ ہوگی اگر پیر کی صبح کیمپل کی لاش دریافت ہو جائے۔ لاش کی شناخت کے لیے اس کی تصویر اخبارات میں شائع ہوگی۔ ڈلیف وہ تصویر دیکھ کر پولیس کو مطلع کر دے گی کہ یہ شخص ان کے دفتر آچکا ہے۔ اس کے بعد پولیس کے لیے کڑیاں ملانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "لاش کے دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کام کرنے والے مزدور بھرائی شروع کرنے سے پہلے گڑھے میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ اس لیے ننانوے فیصد امکان یہی ہے کہ کیمپل کی لاش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کنکریٹ کے ٹھوس بلاک کے نیچے دفن ہو جائے گی۔ اس کے غائب ہونے پر تھوڑی بہت ہلچل تو ضرور ہوگی لیکن دو چار دن بعد لوگ اسے بھول جائیں گے۔"

گھر آکر اس نے وہ چیک جلا دیا اور اس کی راکھ کچن کے سنک میں بہا دی۔

☆☆☆

پیر کی صبح وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ وہ علی الصباح دفتر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا کہ برابر والی زیر تعمیر عمارت پر کام شروع ہونے کی تیاری ہو رہی تھی۔ تمام مزدور کام پر آچکے تھے۔ کنکریٹ مکسر کے سرے پر ایک بڑا سا ربڑ کا پائپ لگا دیا گیا تھا جس کا دوسرا سرا گڑھے کے کنارے پر رکھا ہوا تھا۔ سپروائزر نے اشارہ کیا اور مکسر سے کنکریٹ کی بھرائی شروع ہو گئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور واپس اپنی میز پر آکر کام میں مصروف ہو گیا۔

گیارہ بجے کے قریب ڈلیف معمول کی میٹنگ کے لیے اس کے پاس آئی تو بولا۔ [illegible]

"واقعی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ پچھلے دنوں کافی مصروف رہے ہو۔" ڈلیف نے اس کی تائید کی اور ڈائری دیکھنے لگی۔ آئندہ چند روز تک کوئی ایسا بڑا کام نہیں تھا جس میں اس کی ضرورت پیش آتی۔ معمول کے کام تو ڈلیف اور ہیری بھی نمٹا سکتے تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے ایک ٹریول ایجنٹ کو فون کیا اور وینس جانے کے لیے اورینٹ ایکسپریس میں دو نشستیں مخصوص کروا لیں۔ گھر پہنچ کر جب اس نے ہیلری کو وینس جانے کے بارے میں بتایا تو اسے یقین نہ آیا لیکن جب اس نے ٹکٹ دکھائے تو وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔ "اورینٹ ایکسپریس... یہ کچھ زیادہ مہنگی نہیں ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا روز روز جاتے ہیں۔" وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری زبان سے کافی عرصے بعد ایسی بات سن رہی ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

اورینٹ ایکسپریس سے سفر بے حد پر لطف رہا۔ وینس پہنچ کر انہوں نے گریٹی پیلس میں قیام کیا۔ وہ کئی برس پہلے بھی یہاں آچکے تھے اور اس سے اچھی جگہ ان کے خیال میں پورے وینس میں نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد بھی اسے اپنے کاروبار کے بارے میں دھڑکا لگا رہتا۔ وہ دن میں دو مرتبہ ڈلیف کو فون کر کے صورت حال جاننے کی کوشش کرتا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ ڈلیف اسے ہر بار یقین دلاتی کہ وہ اطمینان سے چھٹیاں گزارے۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ اسے یوں لگا جیسے پرانا وقت لوٹ آیا ہے۔ وہ دونوں کھلی فضا میں بیٹھے مشروب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے برابر والی میز پر مردوں اور عورتوں کا ایک گروپ براجمان تھا۔ وہ سب ہنسی مذاق کر رہے تھے اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر ان کے درمیان سے ایک آواز ابھری۔

"میں جیتی ہوں..."

ہیلری نے چونک کر برائن کو دیکھا۔ کبھی یہ اس کا تکیہ کلام ہوا کرتا تھا اور ان دونوں کے درمیان پہلی بار گفتگو کا آغاز بھی اسی سے ہوا تھا۔ اس کے لبوں میں آہستہ سے جنبش ہوئی اور وہ بول پڑی۔ "میں جیتی ہوں..." اس کے بعد وہ [illegible] دی۔ وہی درخشندہ مسکراہٹ جس نے کبھی برائن کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ گم صم ہو کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

بولا۔ اس نے دیکھا کہ ہیلری کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔ ہیلری کی مسکراہٹ دم توڑ گئی اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ برائن نے اس کا آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہیلری نے اسے روک دیا اور بولی۔

"سب ٹھیک ہے۔"

اور اس کے بعد واقعی سب ٹھیک ہو گیا۔

☆☆☆

گھر واپس آنے کے بعد ہیلری نے ٹیلی فون پر نظر ڈالی اور بولی۔ "او میرے خدا! سترہ پیغامات۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کون ہوگا۔" پھر وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں، مجھ سے ایک حماقت سرزد ہو گئی تھی۔ جانتی ہوں کہ کون شخص مجھے فون کرتا رہا ہے۔"

برائن کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ تو اپنے طور پر اس تلخ حقیقت کو بھلا بیٹھا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ پچھلے دنوں ہمارے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"اس وقت مجھ سے یہ غلطی ہو گئی تھی۔" ہیلری نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

برائن کا گلا خشک ہونے لگا۔ اس نے حلق تر کرنے کے لیے مشروب کا ایک گھونٹ لیا اور دھڑکتے دل سے ہیلری کی بات سننے لگا۔

"پولی نے مجھے اس شخص کے بارے میں بتایا تھا۔ دراصل وہ تنہا کام نہیں کرتا بلکہ اس کا پورا گروہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی تبدیل کر دیتے ہیں اور معاملات کو سیدھا کر دیتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے، جب پولی اور فریڈی میں اختلافات ہو گئے تھے اور نوبت علیحدگی تک پہنچ گئی تھی؟"

برائن نے سر ہلا دیا۔

"اس وقت اس شخص اور اس کے گروہ نے اس مسئلے کا حل نکالا۔ البتہ پولی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے کیا عمل کیا تھا۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں مختلف طریقہ اختیار کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب ہوتا ہے۔"

"تم نے کیا کہا؟ وہ شخص تنہا نہیں بلکہ ان کا پورا گروہ ہے؟" برائن کو اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں، وہ سب مل کر کام کرتے ہیں۔ [illegible]

تھا۔ اگر گروہ کا کوئی فرد کسی وجہ سے اپنا کام مکمل نہ کر سکے تو کوئی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔"

برائن کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اگر کیمپل تنہا نہیں تھا تو اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس ڈیل کے بارے میں علم ہوگا۔ وہ انہیں بتا کر آیا ہوگا کہ وہ کہاں اور کس سے ملنے جا رہا ہے۔

"پولی کے کہنے پر میں بھی تیار ہو گئی اور ایک دن میں نے کیمپل کو گھر بلا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہمارے مسئلے کا حل تلاش کر سکتا ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا کرے گا، البتہ یہ ضرور بتایا کہ اس کا طریقۂ کار ہر بار مختلف ہوتا ہے اور اس کا انحصار جوڑے پر ہے۔ البتہ کامیابی کی سو فیصد گارنٹی ہے۔ مجھے اسے ایک ہزار پاؤنڈ کا چیک ایڈوانس دینا تھا جبکہ بقیہ رقم کی ادائیگی بعد میں ہوتی۔"

"یہ بھی لوگوں کو ٹھگنے کا ایک طریقہ ہے۔" برائن منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"نہیں، اس نے میرے چیک کے بدلے ضمانت کے طور پر مجھے ایک بینک ڈرافٹ دیا جس پر تاریخ نہیں پڑی تھی۔ وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہو گے؟"

برائن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"وہ چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ پھر ہم لوگ باہر چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنا چیک واپس لینے کے لیے رابطہ کر رہا ہوگا۔"

"نہیں۔" برائن نے دل میں سوچا۔ "وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔" اس خیال کے آتے ہی اسے پسینا آ گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ ایک حماقت تھی لیکن مایوسی کے عالم میں آدمی کچھ بھی کر لیتا ہے۔ پولی نے بتایا تھا کہ کیمپل کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ اس لیے میں نے بھی اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں احمق ہوں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ہیلری کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور وہ سمجھ گیا کہ کیمپل [illegible]

ریچل اس وقت بہت پچھتا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے ٹینا اور میری کی بات کیوں مانی؟ ہالووین پر ڈرنا ضروری ہے کیا؟ وہ اس وقت ایک جھاڑی میں دبکی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کا سبب یقیناً سردی نہیں تھی۔ اگرچہ سردی بھی تھی کیونکہ ہالووین کا تہوار سردی میں آتا ہے لیکن سردی سے نمٹنے کے لیے اس نے مناسب بندوبست کر رکھا تھا۔ جینز کے ساتھ اس نے چست سوئٹر پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر اونی ٹوپی بھی تھی۔ پیروں میں موٹے جوگرز تھے جو چلنے اور بھاگنے میں مدد دینے کے ساتھ سردی سے بھی بچا رہے تھے۔

شکست

آصف ملک

ماحول اور تربیت کے اثرات انسانی زندگی پر تادمِ مرگ برقرار رہتے ہیں، انسان چاہے بھی تو اس کے طلسم سے نکل نہیں سکتا... ایک ایسے ہی نوجوان کی دل خراش داستان جو اپنے ساتھ بیتی حقیقتوں کو بھلا نہیں پایا تھا... اور ان سفاک حقائق نے اس کی زندگی کو [illegible] دیا۔

[illegible] ماحول کی پروردہ... [illegible] سے بھرپور کہانی

Digests of Pakistan
blogspot.com

پانچ منٹ پہلے اس نے نینا کی لاش دیکھی تھی اور اس کے دو منٹ بعد ہی اس نے میریا کی لاش بھی دیکھ لی تھی اور صرف لاش نہیں بلکہ اس نے قاتل کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر قاتل تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا تیز چاقو تھا جس سے اس نے میریا کا گلا کاٹ دیا تھا اور نینا کا بھی گلا ہی کاٹا گیا تھا۔ پانچ منٹ پہلے وہ خوش خوش ان جھاڑیوں میں انہیں تلاش کر رہی تھی اور پانچ منٹ بعد صورت حال یہ تھی کہ وہ خود اپنی دوستوں کے قاتل سے بچتی پھر رہی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے اپنے منہ سے بے اختیار نکلنے والی آوازیں روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑ رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ جب اس نے قاتل کو دیکھا تو اپنی چیخ پر قابو نہیں پا سکی اور اس طرح قاتل کو اس کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا اور اب وہ درختوں اور جھاڑیوں میں اسے تلاش کر رہا تھا۔

اس چکر کا آغاز دو دن پہلے ہوا تھا۔ رنجیل، نینا اور میریا جارجیا یونیورسٹی کی طالبہ تھیں۔ تینوں ہی ہسٹری کے شعبے میں تھیں لیکن ان کی دوستی کا آغاز ہائی اسکول میں ہوا تھا۔ وہاں بھی ان کا پسندیدہ مضمون ہسٹری تھا اور انہوں نے اسکول میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں بھی یہی مضمون لیں گی اور کسی ایک ہی تعلیمی ادارے میں پڑھیں گی۔ اتفاق سے انہیں جارجیا یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ تینوں ہی متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کے ماں باپ ان کی تعلیم کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ سکون سے پڑھتی تھیں اور فارغ اوقات میں تفریح کرتی تھیں۔

رنجیل ویک اینڈ پر یونیورسٹی پہنچی تو نینا اور میریا اسے لان میں مل گئیں۔ وہ کسی بات پر بحث کر رہی تھیں۔ رنجیل ان کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔ "کیا موضوع ہے؟"

"ہالووین۔" میریا نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ہم اس بار ہالووین ذرا مختلف انداز میں منانا چاہتے ہیں۔" نینا بولی۔ "بات یہ ہو رہی ہے کہ کہاں منایا جائے۔"

"کہاں منانا ہے؟" رنجیل نے اپنا بیگ شانے سے اتارا۔ "گھر کے آس پاس ہی منائیں گے۔"

"اس دفعہ ذرا مختلف کوشش کیوں نہ کی جائے۔" نینا نے کہا۔ "تم نے ایسٹ ووڈ کا نام سنا ہے؟"

رنجیل نے ذہن پر زور دیا۔ "ہاں، سنا ہوا لگ رہا ہے۔"

"میں اس ایسٹ ووڈ کی بات کر [illegible]

سے برمن ہام جانے والی ہائی وے پر آتا ہے۔" نینا نے بتایا۔ "یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے ساتھ ایک جنگل ہے۔ اصل میں اس جنگل کا نام ایسٹ ووڈ ہے اور قصبہ بھی اسی نام سے مشہور ہے۔"

"نہیں، میں نے اس کے بارے میں نہیں سنا۔" رنجیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں کیا خاص بات ہے؟"

نینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اس کے بارے میں نہیں جانتیں، منتظموں نے دو سال پہلے اسے ہالووین کے لیے کیمپنگ سائٹ بنایا تھا۔ اس کا باقاعدہ اعلان بھی ہوا تھا لیکن پہلے سال ہی یہاں کچھ پُراسرار قتل ہو گئے۔"

"پُراسرار قتل؟" رنجیل نے سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا۔

نینا نے وضاحت کی۔ "کسی پُراسرار قاتل نے تین لڑکیوں کو یہاں ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس نے انہیں چاقو سے مارا اور ایک لڑکی کی آبروریزی بھی کی تھی۔ پولیس اسے تلاش نہیں کر سکی ہے۔ دوسرے سال پھر دو لڑکیوں کو قتل کیا گیا اور ان اموات کے بعد حکومت نے یہاں ہالووین کے دوران کیمپنگ سے منع کر دیا ہے۔ اس سال سنا ہے کہ پولیس وہاں جانے والوں کو روکے گی۔"

"تب اس کا ذکر کرنے کا فائدہ؟" رنجیل نے منہ بنایا۔ وہ تقریباً بائیس برس کی حسین لڑکی تھی۔ ان تینوں میں وہی سب سے خوب صورت تھی۔ لیکن میریا اور نینا بھی اچھی صورت اور جسامت رکھتی تھیں۔ ان کا گروپ لڑکوں میں بہت مقبول تو نہیں تھا لیکن انہیں آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کو لڑکوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی کیونکہ رنجیل کا کوئی دوست نہیں تھا۔ نینا اور میریا کے بوائے فرینڈز یونیورسٹی سے باہر تھے۔ یہاں وہ صرف تعلیم حاصل کرنے آئی تھیں۔ یونیورسٹی کے لڑکوں سے ان کی صرف ہیلو ہائے تھی۔

"میں نے سنا ہے کہ لوگ اب چوری چھپے جانے کی تیاری کر رہے ہیں اور ہالووین کی رات وہاں گزاریں گے۔ ذرا سوچو، اس ایڈونچر میں کتنا مزہ آئے گا۔ ایک طرف ہالووین کا سسپنس ہوگا اور دوسری طرف ہم پولیس کو چکمہ دے کر وہاں جائیں گے۔"

"یعنی ہم چوری چھپے جائیں گے؟" رنجیل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "اگر پولیس نے پکڑ لیا [illegible]

والوں کو ہائی وے پر چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن یہ سرکاری حکم کی خلاف ورزی ہے۔" رنجیل نے اعتراض کیا۔ "اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ ہماری تعلیم پر بھی اثر ہو سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا ڈیئر... اسی یونیورسٹی کے کوئی درجن طلبا پچھلے سال پکڑے گئے تھے اور پولیس نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔" میریا نے بتایا۔ "تو کیا خیال ہے؟"

"سوری... میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" رنجیل نے انکار کر دیا۔

"پلیز... بہت مزہ آئے گا۔" میریا اکسانے والے انداز میں بولی۔

ان دونوں کے اصرار پر وہ سوچنے لگی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "مام اور پاپا نہیں مانیں گے۔"

"ان کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟" نینا نے کہا۔ "ہم رات کو نکلیں گے۔ مشکل سے دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے... صبح تک واپس آ جائیں گے۔"

"میں سوچوں گی۔" اس نے جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ اس طرح اس کے پیچھے پڑیں کہ اسے ہاں کہنی پڑی۔

☆☆☆

شیرف جان دفتر میں داخل ہوا تو آپریٹر سوزن نے اسے آواز دی۔ "شیرف... ہیپی ہالووین نائٹ۔"

"ہالووین۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اس مصیبت کو تو میں بھولا ہوا تھا... کوئی خبر آئی ہے؟"

"ہاں، تین افراد ایسٹ ووڈ سے پکڑے گئے ہیں۔" اس نے اطلاع دی۔ "پیٹرولنگ کرنے والوں نے انہیں ہائی وے پر چھوڑ دیا ہے لیکن اطلاع ہے کہ مزید لوگ جنگل میں داخل ہو رہے ہیں۔"

"مصیبت یہ ہے کہ ہمارے پاس نفری کم ہے۔" شیرف نے اپنے لیے کافی نکالی اور گھونٹ لے کر بولا۔ "قصبے میں بھی خاصی پولیس لگانی پڑی ہے۔"

"اگر اس بار یہاں کوئی قتل ہوا تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔" سوزن نے ہمدردی سے کہا۔ وہ آفس کی سب سے پرانی کارکن تھی اور کئی شیرف کے ساتھ کام کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں جان ان سب میں بہتر تھا لیکن اس کی بدقسمتی [illegible]

ایک ہی ہتھیار سے قتل کیا تھا۔ ان میں سے جو پہلی لڑکی ماری گئی تھی، اس کی آبروریزی کی گئی تھی۔ باقی کسی لڑکی کو قاتل نے اس زاویے سے ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی انہیں اذیت دے کر مارا تھا۔ بس ان کے گلے کاٹ دیے گئے تھے جبکہ پہلی لڑکی کو قاتل نے چاقو کے کئی وار کر کے قتل کیا تھا۔ جان نے دونوں مواقع پر تحقیقات کے لیے خصوصی ٹیمیں بنائی تھیں اور خود ان کی تفتیش کی نگرانی کرتا رہا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

"ایسٹ ووڈ کے علاقے میں کل چار کاریں اور آٹھ آفیسرز ہیں۔"

"درست۔" سوزن نے جواب دیا۔

"میکس کہاں ہے؟"

میکس، شیرف جان کے نائبین میں سے ایک تھا۔ سوزن نے اس کے بارے میں بتایا۔ "میکس کی ڈیوٹی رات دو بجے شروع ہوگی۔"

"یہ کون سا وقت ہے ڈیوٹیاں لگانے کا؟" شیرف خفا ہو گیا۔ "اس وقت ہمیں ایک ایک آدمی کی ضرورت ہے۔"

"میکس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شام کو اس کا فون آیا تھا، اسے فلو ہو گیا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنی ڈیوٹی پر آئے گا۔" سوزن کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" شیرف نے کاغذی کپ خالی کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ "بہتر ہے، میں جنگل اور قصبے کا ایک چکر لگا لوں۔ جرائم پیشہ لوگ موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" سوزن نے اس سے اتفاق کیا۔

"میکس آئے تو اس سے کہنا کہ دفتر میں رکے۔" شیرف نے کہا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

نینا بہت تیز ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے کہیں بھی رفتار سو سے نیچے نہیں کی تھی۔ رنجیل اور میریا نے کئی بار اسے ٹوکا لیکن اس نے رفتار کم کرنے سے انکار کر دیا۔ "کبھی کبھی تو موقع ملتا ہے اس طرح ڈرائیونگ کرنے کا۔"

رنجیل نے اس کا منہ سونگھا۔ "تم نشے میں تو نہیں ہو؟"

"میں نے صرف آدھا گلاس بیئر کا لیا ہے۔" نینا نے یقین دلانے والے انداز میں کہا لیکن رنجیل کو یقین تھا کہ اس نے اس سے زیادہ ہی پی ہوگی۔ شہر سے باہر ہائی وے پر

digestpk.blogspot.com
Digests of Pakistan

ٹریفک کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ہالووین نائٹ تھی۔ آج کی رات لوگ زیادہ تر اپنے گھروں یا علاقے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے بھی ٹریفک کم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ٹینا بے فکری سے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھے ہوئے تھی۔ اس نے ریچل اور میریا کے ٹوکنے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دو کے بجائے وہ ڈیڑھ گھنٹے میں ایسٹ ووڈ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ٹینا کے پاس ایک نقشہ بھی تھا، اس کی مدد سے اس نے ایسٹ ووڈ جنگل کے آنے سے ذرا پہلے کار کو دائیں طرف ایک سڑک پر موڑ لیا۔ ریچل نے پوچھا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ایسٹ ووڈ کی طرف لیکن دوسرے راستے سے کیونکہ ہائی وے پر پولیس موجود ہوگی اور وہ لوگوں کو اس طرف جانے سے روک رہی ہوگی۔"

اس سڑک پر انہیں کئی اور گاڑیاں نظر آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے علاوہ اور لوگ بھی اس راستے سے ایسٹ ووڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ کئی گاڑیاں پارک تھیں اور وہاں لوگ بھی جمع تھے۔ ٹینا نے بھی کار روک دی اور وہ سب باہر نکل آئیں۔ میریا نے چاروں طرف دیکھا اور کسی قدر جوش سے اچھلتے ہوئے بولی۔ "واہ... یہاں تو اچھے خاصے لوگ ہیں۔"

لوگوں نے روشنی کے لیے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس اور ٹارچوں کے ساتھ مشعلیں بھی جلائی تھیں۔ وہ پینے پلانے کا سامان ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے اکثر نوجوان تھے اور ان میں برابر کی تعداد لڑکیوں کی تھی۔ جو نشے میں تھے، وہ شور شرابا بھی کر رہے تھے۔ ٹینا نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کوئی لڑکا نہیں ہے۔"

ریچل بولی۔ "ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

یہاں سڑک کے بائیں طرف تقریباً دس مربع میل پر پھیلا...... گھنا جنگل تھا جس میں بلند قامت درخت اور گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میریا نے جنگل کی طرف دیکھا۔ "کس طرف جانا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے بائیں طرف۔" ریچل بولی۔

"نہیں، اس طرف ہائی وے ہے اور سنا ہے پولیس جنگل میں لوگوں کو تلاش کرتی پھرتی ہے۔ جو ان کے ہاتھ لگتا ہے، اسے پکڑ کر دور ہائی وے پر لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔" ٹینا نے کہا۔

"اس بار بھی پولیس مستعد ہے۔" میریا بولی۔ "اس لیے دائیں طرف والا جنگل بہتر رہے گا۔ یہاں پولیس کی رسائی کا امکان کم ہے۔"

ٹینا نے یاد کر کے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ پُراسرار قاتل کا نشانہ بننے والی پانچوں لڑکیاں اسی دائیں طرف جنگل میں اس کا نشانہ بنی ہیں۔"

"یہ درست ہے۔" میریا نے اعتراف کیا۔

"کیا اس صورت میں ہمارا اس طرف جانا مناسب ہوگا؟" ریچل بولی۔

"ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے اور ساتھ رہیں گے۔" ٹینا نے کہا۔

"دیکھو، دوسرے بھی اس طرف جا رہے ہیں۔" میریا نے اشارہ کیا۔

واقعی خاصے لوگ اس طرف بھی جا رہے تھے۔ ٹینا اور میریا ریچل کو بھی کھینچ کر جنگل میں لے آئیں۔ اچانک عقب میں پولیس کاروں کا سائرن بجا اور جنگل میں موجود لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ پولیس سے بچنے کے لیے اندر بھاگے۔ ان میں وہ تینوں بھی شامل تھیں۔ جب تک پولیس کاریں وہاں آتیں، وہ تینوں خاصی دور نکل گئی تھیں۔ میریا اور ٹینا تو بھاگی جا رہی تھیں، ریچل نے بہ مشکل ان کو روکا۔ "خدا کے لیے رک جاؤ۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "پولیس جنگل میں نہیں آئی ہے۔"

وہ تینوں رک کر سانس درست کرنے لگیں۔ وہ جنگل کے ایک ایسے حصے میں نکل آئی تھیں جہاں ان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آسمان پر پورا چاند تھا اور اس کی چاندنی میں منظر کافی روشن تھا۔ ریچل نے چاروں طرف دیکھا اور کسی قدر خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "ہم کہاں آ گئے ہیں؟"

"جنگل میں۔" ٹینا شوخ لہجے میں بولی لیکن ریچل کا خوف کم نہیں ہوا۔

"ہم دوسروں سے الگ ہو گئے ہیں اور یہاں مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔" ریچل پریشان لگ رہی تھی۔

"کیسی مدد؟" میریا نے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر قاتل یہاں آ گیا تو؟"

☆☆☆

وہ اس وقت جنگل کے ایک تاریک گوشے میں خاموش کھڑا تھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے اپر پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ سردی کے ساتھ اسے دوسروں کی نظروں سے بھی بچا رہا تھا۔ اگر اس کا کوئی جان پہچان والا بھی اسے دیکھ لیتا تو اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھا، صرف اس کا

دایاں ہاتھ حرکت کر رہا تھا جس میں چھوٹا سا کھلنے والا چاقو تھا۔ اس چاقو سے اس نے اسی جنگل میں پانچ لڑکیوں کو قتل کیا تھا۔ ان میں پہلی لڑکی کو اس نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ ایک تو وہ اسے اکیلی مل گئی تھی اور دوسرے وہ اس وقت قتل کرنے کے لطف سے ناواقف تھا۔ اس لطف سے وہ اس وقت آشنا ہوا جب اس نے اپنا کام کرنے کے بعد لڑکی کو قتل کیا تھا۔ اس نے اس پر چاقو سے پے در پے وار کیے۔ لڑکی بُری طرح زخمی تھی اور جب اس کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا تو اسے ایسا سرور ملا جس سے وہ اب تک نا آشنا تھا۔

اس کا بچپن اچھا نہیں تھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور ان کی گزر بسر سرکاری وظیفے پر تھی۔ کوئی کام تو وہ کرتے نہیں تھے۔ ماں کو اپنے دوستوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ دونوں ہی اس پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ قصبے سے دور ایسٹ ووڈ کے جنگل میں ایک ٹریلر میں ان کی رہائش تھی۔ اس نے ایسٹ ووڈ میں آنکھ کھولی تھی اور یہ جنگل ہی اس کا گھر تھا۔ ماں باپ دونوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ بس وہ کسی خود رو پودے کی طرح پل رہا تھا۔ شاید اسی لیے اس میں انسانوں کے لیے بے حسی اور سفاکی آ گئی تھی۔ وہ چھوٹا سا تھا جب جنگل میں نکل جاتا اور گھنٹوں...... وہیں رہتا تھا۔ اگر وہ سارا دن جنگل میں رہتا تب بھی اسے تلاش کرنے کوئی نہیں آتا تھا۔ اسے بھی ماں باپ کے بجائے درختوں اور پودوں کے ساتھ زیادہ سکون ملتا تھا۔ اس کا گھر آنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن گھر آنا اس کی مجبوری تھی۔

اس کی ماں ایک آوارہ اور بے وفا عورت تھی۔ شوہر کی زندگی میں بھی وہ اس سے چھپ کر دوسرے مردوں سے ملتی تھی۔ یہ بات اس کا شوہر جانتا تھا لیکن اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اسے شراب مل جاتی تھی، اس کے بدلے وہ بیوی کی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کرتا تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ سب جان گیا تھا لیکن اپنی ماں کی آوارگی اور باپ کی بے غیرتی پر سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس کا شرابی باپ ایک حادثے میں مارا گیا تو اس کی ماں کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ جن دوستوں سے پہلے وہ گھر سے باہر ملتی تھی، اب انہیں گھر میں لانے لگی تھی۔ یہ دوست رات بھر اس کی ماں کے بیڈ روم میں رہتے تھے۔ اس وقت وہ بارہ سال کا تھا۔ ان کی حرکتیں دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنا چھوٹا سا چاقو لے کر کمرے میں گھس جائے اور انہیں قتل کر دے۔ یہ چاقو اسے اس کے باپ نے اس وقت دیا تھا جب وہ صرف سات سال کا تھا۔ یہ باپ کی طرف سے ملنے والا واحد تحفہ تھا اور اس نے اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ یہ چاقو اسے اتنا پسند تھا کہ ہر وقت اس کے پاس رہتا۔ اس کا دستہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور بلیڈ اعلیٰ درجے کی دھات کا تھا۔ اس کی دھار استرے جیسی تیز تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد اس کے پاس بہت فارغ وقت ہوتا تھا اور اس وقت میں وہ اپنے چاقو سے کھیلتا تھا۔

بند کمرے سے آنے والی آوازوں سے بچنے کے لیے وہ جنگل میں پناہ لیتا۔ یہی اس کا واحد دوست اور ساتھی رہ گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کا تھا تو ایک دن اس کی ماں اپنے کسی دوست کے ساتھ قصبے سے فرار ہو گئی اور اس کے بعد اس نے اسے نہیں دیکھا۔ اسے ماں کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش بھی نہیں تھی بلکہ وہ اس سے جان چھوٹنے پر خوش تھا۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کی بھی کسی لڑکی سے دوستی ہو اور اسے اس کی قربت ملے مگر جھجک نے اسے کسی کے قریب ہونے نہیں دیا۔ تہواروں اور اہم مواقع پر جب لوگ اپنے خاندان والوں اور دوست احباب کے ساتھ ہوتے تھے، وہ اکیلا ہی ہوتا۔ یہ تنہائی اس کی فطرت میں رچ بس گئی تھی۔ اگرچہ ملازمت کرنے کے بعد اس نے جنگل میں رہائش ترک کر کے قصبے میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا لیکن جنگل سے اس کی دوستی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسے جب فرصت ملتی، وہ ایسٹ ووڈ چلا آتا۔ قصبے اور جنگل کے درمیان صرف ہائی وے تھی۔ اسے پار کر کے وہ آسانی سے ایسٹ ووڈ پہنچ جاتا تھا۔

دو سال پہلے ہالووین کے موقع پر منچلوں نے ایسٹ ووڈ کو ہالووین کیمپنگ سائٹ بنانے کا اعلان کیا۔ اسے یہ سن کر تکلیف ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ ہرا بھرا اور پُرسکون جنگل صرف اس کا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ یہاں آ کر شور شرابا اور گندگی کرے لیکن وہ کسی کو یہاں آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ رات کو جنگل میں داخل ہوا تو لوگ ہجوم کی صورت میں یہاں کیمپنگ کر رہے تھے۔ ہر طرف روشنیاں اور شور تھا۔ ہالووین کے مخصوص نقاب اور حلیے بنائے لوگ گھوم رہے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ اسے لگا جیسے یہ لوگ اس کے جنگل کی بے حرمتی کر رہے ہیں اور اسے پامال کر رہے ہیں۔ وہ ان کے درمیان گھومتا رہا اور دل ہی دل میں انہیں بُرا بھلا کہتا رہا۔

جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہونے لگا تو وہ جنگل کے غیر آباد حصے کی طرف چلا آیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن نہیں، وہاں کوئی تھا۔ یہ کوئی لڑکی تھی جو لڑکھڑاتی آواز

digestpk.blogspot.com

میں ہالووین کا گیت گا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس نے پی رکھی ہے اور نشے میں دھت ہے۔ اس نے درختوں کی آڑ سے لڑکی کو دیکھا۔ خاصی سردی میں اس نے نہ ہونے کے برابر لباس پہن رکھا تھا جو منی اسکرٹ اور منی بلاؤز پر مشتمل تھا۔ چہرے پر اس نے کیٹ وومن کا نقاب لگا رکھا تھا اور اس کا تاثر مکمل کرنے کے لیے اسکرٹ سے ایک دُم بھی منسلک کر رکھی تھی۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ وہ درختوں سے نکل کر اس کے سامنے آیا تو لڑکی ڈر گئی اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اس نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کشمکش میں اس کا رہا سہا لباس بھی اتر گیا تھا۔ لڑکی کو عریاں دیکھ کر اس کے اندر کا شیطان جاگ گیا۔ اس نے چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے مزاحمت کی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ اپنی ہوس پوری کرتے کرتے اسے اتنی سرشاری طاری ہوئی کہ اس نے بے اختیار لڑکی کو چاقو سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ چیخ رہی تھی اور مزاحمت کر رہی تھی۔ چیخ و پکار سے مشتعل ہو کر اس نے لڑکی کا گلا کاٹ دیا۔

اس لڑکی کو قتل کر کے اسے اتنا لطف آیا کہ اس نے زندگی میں کبھی کسی کام میں اتنا لطف محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ کیوں اس دنیا میں آیا؟ اس سوال کے جواب میں اسے اپنا وجود بے معنی اور فضول لگتا تھا لیکن اس رات اسے لگا کہ وہ ایک قاتل ہے اور اس کے اندر شروع سے کسی کو قتل کرنے کی آرزو پل رہی تھی اور آج یہ آرزو پوری ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی ہوس ابھی بجھی نہیں تھی۔ اس رات اس نے دو لڑکیوں کو اور قتل کیا۔ وہ ایک ساتھ تھیں اور جنگل میں گھوم رہی تھیں۔ وہ ان پر جھپٹا اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگتیں یا کسی کو مدد کے لیے بلاتیں، وہ اپنے چاقو سے ان کا خاتمہ کر چکا تھا۔

پورا ایک سال اس نے ان مقتول لڑکیوں کے بارے میں سوچ کر گزارا۔ جب وہ ان کے بارے میں سوچتا تو اسے ویسی ہی لذت محسوس ہوتی تھی جیسی ان کے قتل کے وقت محسوس کی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اس نے ان لڑکیوں کو قتل کیوں کیا؟ ان کا کیا جرم تھا؟ اسے ہمیشہ یہی سوچ آتی تھی کہ کسی نوجوان لڑکی کو قتل کرنا بہت پُرلطف کام ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ان وارداتوں کے بعد اب ایسٹ ووڈ میں کوئی ہالووین منانے کا سوچے گا بھی نہیں لیکن اگلے سال پھر لوگوں نے ایسٹ ووڈ میں ہالووین منانے کا اعلان کیا۔ اس نے یہ اعلان سنا اور فیصلہ کیا کہ اس بار بھی لوگوں سے جنگل کی بے حرمتی کا بدلہ لے گا۔ جب دوسری ہالووین نائٹ آئی تو وہ شکار کے لیے تیار تھا اور اس رات اس نے مزید دو لڑکیوں کو قتل کیا۔ اسے موقع دو کو قتل کرنے کا ملا ورنہ ممکن ہے اس کے شکار کی تعداد زیادہ ہو جاتی اور اب یہ تیسری ہالووین نائٹ تھی۔ عجیب بات تھی کہ اس بار وہ لوگوں کے یہاں آنے پر جھنجلایا نہیں کیونکہ اس طرح اسے انہیں قتل کرنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ جنگل کے ویران حصے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا اسے اس بار موقع ملے گا؟ کیونکہ دو سال مسلسل ہونے والے واقعات کی وجہ سے پولیس اور لوگ چوکنا ہو گئے تھے۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اسے شکار ضرور ملے گا۔ وہ ہاتھ میں اپنا چاقو تھما رہا تھا۔

☆☆☆

رتجل کے اس سوال پر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" رتجل بولی۔ "آخر دو لڑکیاں اسی جنگل میں قتل کی گئی تھیں۔"

"کم آن، رتجل۔" نینا بولی۔ "موڈ مت خراب کرو... ہم تین ہیں اور وہ قاتل ہمیشہ اکیلی لڑکی کو قتل کرتا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے وہ اب یہاں نہیں ہو گا کیونکہ اسے بھی پتا ہے کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔" میریا بولی۔

"وہ ابھی تک پکڑا نہیں گیا ہے۔" رتجل نے انہیں یاد دلایا۔ "اس لیے یہاں اس کی موجودگی کا پورا امکان ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس لیے نہیں پکڑا گیا ہے کیونکہ وہ یہاں سے کہیں اور جا چکا ہے۔ یہ شہر نہیں دیہی علاقہ ہے اور یہاں کوئی قتل کر کے زیادہ دیر نہیں چھپ سکتا۔" نینا نے خیال ظاہر کیا۔

رتجل دیکھ رہی تھی کہ وہ قاتل کے خطرے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہیں اعتماد تھا کہ اوّل تو قاتل ان کی طرف نہیں آئے گا اور آیا تب بھی وہ تین ہیں اور اس سے نمٹ سکتی ہیں۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ دو بجے یہاں سے رخصت ہو جائیں گی تاکہ چار بجے تک گھر پہنچ سکیں۔ رتجل نے ماں باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چار بجے تک لوٹ آئے گی۔ میریا نے اچھل کر کہا۔ "ہمارے پاس چار گھنٹے ہیں۔"

نینا نے اپنی پشت پر بندھا بیگ اتارا اور اس میں سے بیئر کی بوتلیں نکالیں۔ اس نے ایک ایک بوتل ان دونوں کو تھمائی اور ایک خود لے لی۔ "چلو مزے کرو۔"

جنگل میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑوں کا امکان بھی تھا اس لیے وہ کھڑی رہیں۔ بوتلیں ختم کرتے کرتے ان کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔ بیئر تیز تھی، اسے پی کر ان کے خون میں بھی گرمی آ گئی۔ رتجل اتنی تیز بیئر کی عادی نہیں تھی اس لیے اسے ہلکا سا نشہ محسوس ہونے لگا اور شاید اسی وجہ سے وہ بھی قاتل کا خطرہ فراموش کر بیٹھی اس لیے جب میریا نے چھپنے اور پکڑنے والا کھیل کھیلنے کی تجویز دی تو وہ مان گئی۔

"مزہ آئے گا۔"

"پہلے کون پکڑنے والا بنے گا؟" نینا نے سوال کیا۔

"ٹاس کر لیتے ہیں۔" میریا بولی اور اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "جو سب سے آخر میں سگریٹ ختم کرے گا وہی چور بنے گا۔"

"یہ غلط ہے۔" رتجل نے احتجاج کیا۔ "تم دونوں جانتی ہو کہ مجھ سے اتنی جلدی سگریٹ ختم نہیں ہوتی۔"

"[illegible]۔" میریا نے بیک وقت تین سگریٹ سلگا کر ایک ایک انہیں پکڑا دی اور وہ جلدی جلدی کش لے کر اسے ختم کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میریا اکثر اسموکنگ کرتی تھی اور اسے تجربہ تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے سگریٹ ختم کر دی۔ دوسرے نمبر پر نینا رہی اور رتجل اپنی توقع کے عین مطابق سب سے آخر میں سگریٹ ختم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر اسے جوتے سے بجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بے ایمانی ہے... آئندہ سگریٹ سے ٹاس نہیں ہو گا۔"

نینا کھنکھناتی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "اب تو ہو گیا۔"

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" میریا نے اس کا ساتھ دیا۔ "تو تم تلاش کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"میں صرف پچاس تک گنتی گنوں گی۔" رتجل نے کہا اور بلند آواز سے گنتی شروع کر دی۔ "ایک... دو... تین..."

"ارے... ہمیں جانے تو دو۔" میریا چلائی۔

رتجل اس کی بات اَن سنی کر کے گنتی رہی۔ "چار... پانچ... چھ..."

وہ دونوں بھاگیں اور الگ الگ جھاڑیوں میں گھس گئیں۔ رتجل اب رک رک کر گن رہی تھی اور ساتھ ہی آوازوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ دونوں کہاں ہو سکتی ہیں۔ پچاس گنتی ہوتے ہی اس نے چلا کر کہا۔

"میں آ رہی ہوں... تیار ہو جاؤ۔"

☆☆☆

لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا خیال غلط ثابت ہوا کہ جنگل کے اس حصے میں کوئی نہیں ہے۔ یہاں لڑکیاں تھیں اور وہ انہیں اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی تھی۔ وہ کچھ دیر میں جھاڑیوں کے درمیان پہنچ گیا اور ایک جھاڑی سے جھانکنے پر اسے وہ تینوں نظر آ گئیں۔ پورے چاند کی روشنی اتنی ضرور تھی کہ وہ ان تینوں کو دیکھ سکتا تھا۔ تینوں نوجوان اور خوب صورت تھیں اور ان کے ہاتھوں میں بیئر کی بوتلیں تھیں۔ آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ نشے میں ہیں۔ اس کی نظر ایک لمبی اور دراز قامت اور صحت مند لڑکی پر جم گئی۔ وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور اس گردش کا سبب قتل کرنے کا جذبہ نہیں تھا۔ اسے اپنا پہلا قتل یاد آ گیا جب اس نے لڑکی کو مارنے سے پہلے اس کی قربت سے لطف اٹھایا تھا۔ آج اس لڑکی کو دیکھ کر اسے وہ لطف یاد آ گیا۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ تین تھیں اور اس کے لیے تین قتل بھی کر سکتا تھا لیکن وہ چیخ و پکار کرتیں تو اس کا پورا امکان تھا کہ جنگل کے دوسرے حصوں میں موجود لوگ اور پولیس والے سن کر ان کی مدد کو آ جاتے۔ اگرچہ اس جنگل میں ایسٹ ووڈ کی ساری پولیس فورس مل کر بھی اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی لیکن اس طرح وہ نہ ہو پاتا جو اس نے سوچا تھا۔ وہ پچھتا اور سوچ رہا تھا۔ اگر کسی طرح یہ لڑکیاں الگ الگ ہو جاتیں تو وہ باری باری سب کو شکار کر سکتا تھا اور آخر میں اس لڑکی کو مارنے سے پہلے اپنی آرزو کی تکمیل بھی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ انہیں الگ کیسے کرے؟ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اس نے ان کو چھپنے اور پکڑنے والا کھیل کھیلنے کے بارے میں بات کرتے سنا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس صورت میں وہ آسانی سے ایک ایک کر کے انہیں اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔

جلد لڑکیوں نے طے کر لیا کہ لمبی والی لڑکی انہیں تلاش کرے گی اور وہ دونوں چھپیں گی۔ سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جیسا وہ چاہتا تھا۔ لمبی لڑکی بلند آواز سے گنتی گننے لگی۔ باقی دونوں بھاگیں اور جھاڑیوں میں گھس گئیں۔ اس نے سب سے پہلے اس لڑکی کو چنا جس کی پشت پر ایک عدد بیگ بندھا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے جھاڑیوں میں پیچھے ہٹا اور اس طرف جانے لگا جہاں بیگ والی لڑکی گئی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ میں

تھا اور اس کا بلیڈ ابھی اندر تھا لیکن وہ چاہتا تو ایک سیکنڈ میں بلیڈ نکال سکتا تھا۔ یہ چاقو اس کے جسم کے ایک حصے کی طرح تھا اور اسے اس کے استعمال پر ایسی قدرت تھی جیسے اپنے ہاتھ کو استعمال کرنے پر تھی۔ یہ جنگل اس کا جانا پہچانا تھا کیونکہ بچپن سے لے کر اب تک اس کا کافی وقت یہیں گزرا تھا اور وہ آنکھ بند کر کے بھی اس میں چل پھر سکتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کہاں جھاڑیاں ہیں اور کہاں درخت ہیں۔

وہ گھومتا ہوا اس طرف پہنچا جہاں اس کے خیال میں بیگ والی لڑکی موجود ہوگی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ اسے ایک جھاڑی میں دبکی نظر آ گئی۔ اس کا گلابی رنگ کا بیگ الگ سے نظر آ رہا تھا۔ اس نے اس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس وقت وہ چوکنا تھی اور ذرا سی آہٹ سے اسے معلوم ہو جاتا کہ کوئی اس کی طرف آ رہا ہے اس لیے اپنی جگہ رک گیا۔ پھر اس نے جھک کر ایک چھوٹا پتھر اٹھایا اور جھاڑیوں میں مخالف سمت میں اچھال دیا۔ پتھر لڑکی کے سر کے اوپر سے گزر کر جھاڑی میں جیسے گرا تو وہ ہڑبڑا کر جھاڑی سے باہر نکل آئی۔ اس کا خیال تھا کہ تلاش کرنے والی لڑکی آس پاس آ گئی ہے وہ ہلکے سے ہنسی اور دبے قدموں اسی طرف آ نکلی جہاں وہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔ لڑکی اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ اسے اس وقت اس کی موجودگی کا علم ہوا جب اس نے اس کا منہ دبا کر اسے جھاڑیوں میں کھینچ لیا اور اسی حالت میں چاقو اس کی گردن پر پھیر دیا۔ تیز دھار نے لمحے میں اس کی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ چاقو پھیرتے ہی اس نے اسے چھوڑ دیا اور وہ زمین پر گر گئی۔ اس کے کٹے ہوئے گلے سے خرخراہٹ کی مدھم آواز آ رہی تھی لیکن یہ آواز چند گز سے زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اسے تڑپتا دیکھتا رہا پھر اسے چھوڑ کر دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اب اس کا رخ اس طرف تھا جہاں دوسری لڑکی چھپنے گئی تھی۔

کچھ دیر میں وہ وہاں پہنچ گیا لیکن لڑکی اسے نظر نہیں آئی اور نہ ہی کوئی آہٹ ہوئی۔ کیا لڑکی یہاں نہیں ہے؟ اس نے سوچا۔ وہ وہاں سے جانے والا تھا کہ اسے ہلکی سی آواز آئی۔ ”اوہ شٹ۔“

آواز قریبی جھاڑی سے آئی تھی۔ وہ اس طرف بڑھا اسے لڑکی کی پشت نظر آئی۔ اس کے ہاتھ سے کوئی چیز لگ گئی تھی جسے وہ اپنی جینز سے رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ اس کے لیے موقع اچھا تھا۔ اس نے لڑکی کا منہ دبا لیا اور اسے جھاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ خلاف توقع لڑکی نے تڑپ کر شدید مزاحمت کی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی گرفت سے نکل جائے گی اس لیے مجبوراً اسے ایک وار اس کے دل پر کرنا پڑا... اس وار نے اس کی مزاحمت ختم کر دی اور پھر اس نے آرام سے اس کی گردن پر چاقو پھیر دیا۔ چاقو پھیرتے ہی اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اسی لمحے اسے ایک چیخ سنائی دی۔

☆☆☆

ریچل ان دونوں کو تلاش کر رہی تھی۔ اکیلے ہونے کے بعد اس کے اندر کا خوف پھر ابھر آیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد کسی کو تلاش کر لے تا کہ تنہائی کا یہ احساس ختم ہو۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان گھوم رہی تھی اور ان میں سے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز وہ جگہیں تھیں جہاں تاریکی زیادہ تھی۔ چھپنے کے لیے ایسی جگہیں بہترین تھیں۔ وہ ایک ایسی ہی نیم تاریک جگہ سے گزر رہی تھی کہ اچانک اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ گری اور نینا کی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اگر اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو اس کی چیخ سے سارا جنگل گونج اٹھتا۔ نینا بلاشبہ مر چکی تھی کیونکہ اس کا گلا سامنے سے مکمل طور پر کٹا ہوا تھا اور اس سے بہنے والا خون اس کے سینے اور زمین پر پھیل گیا تھا۔ ریچل کو احساس نہیں تھا کہ اس کا خون اس کے ہاتھ پر لگ گیا ہے۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی اٹھی اور وہاں سے اندھا دھند بھاگی۔ اسے سمتوں کا احساس بھی نہیں ہوا۔

بھاگتے بھاگتے وہ رکی۔ اس کے سامنے ایک اور خوفناک منظر تھا۔ ایک اپر پوش نے چاقو سے میریا کا گلا کاٹ دیا تھا اور اسے زمین پر پھینک دیا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ ریچل کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اپر پوش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ریچل وہاں سے بھی بھاگی۔ اسے احساس تھا کہ قاتل اب اس کے پیچھے آ رہا ہوگا اور اگر وہ اسی طرح بھاگتی رہی تو جلد اس کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ اسے کہیں چھپ جانا چاہیے...

یہ خیال آتے ہی وہ ایک جھاڑی میں گھس گئی اور اس میں دبک کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ ہلکی ہلکی آہٹیں بتا رہی تھیں کہ قاتل آس پاس ہے اور اسے تلاش کر رہا ہے لیکن کبھی آہٹ ہوتی اور کبھی تھم جاتی تھی۔ ریچل اپنے جسم کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی تا کہ جھاڑی ہلنے سے قاتل کو اس کا پتا نہ چلے لیکن اس کا جسم بے اختیار کانپے جا رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم کہاں ہو؟“ اچانک ہی قاتل کی دھیمی سی آواز آئی۔ ”میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور میں آ رہا ہوں۔“

قاتل کی آواز میں اتنا یقین تھا کہ ریچل بے ساختہ حرکت میں آ گئی اور جب جھاڑی سے باہر آ کر اس نے قاتل کو پشت کر کے کھڑے دیکھا تو اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ قاتل اس کی جائے پناہ کے بارے میں نہیں جانتا تھا اور اس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ اسے جھاڑیوں سے نکالنا یا اس کی جائے پناہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور اب اس نے جان لیا تھا۔ قاتل آہستگی سے مڑا تو ریچل پلٹ کر بھاگی۔ اس بار بھی اسے سمتوں کا احساس نہیں تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ قاتل اس کے پیچھے آ رہا ہے یا نہیں۔ ایک بار بھاگتے بھاگتے اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اس کے پیچھے نہیں تھا۔ ریچل نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اگر وہ اس کے پیچھے نہیں تھا تو یقیناً دائیں یا بائیں کہیں تھا۔

اس نے پلٹ کر دوبارہ بھاگنا چاہا تو اپنے پیچھے کھڑے قاتل سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔ وہ کب اس کے پیچھے آ گیا، اسے پتا ہی نہیں چلا اور اب وہ عین سر پر کھڑا تھا۔ ریچل نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن قاتل نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ ریچل کو احساس تھا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے اور اس کی دوستوں کی طرح اس کا وقت بھی آ گیا ہے۔

”پلیز... پلیز۔“ اس نے التجا کی۔

”شٹ اپ۔“ قاتل مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔ ”تم زندہ رہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں... ہاں... پلیز۔“

قاتل نے مشاقی سے اپنا چاقو ہاتھوں میں گھمایا اور انگوٹھے کی مدد سے اس کا بلیڈ نکال لیا۔ ریچل لرز اٹھی۔

”پلیز...“ اس نے پھر کہا۔

”اپنے کپڑے اتار دو۔“ قاتل پھنکارا۔

اب ریچل کی سمجھ میں آیا کہ قاتل نے اس پر فوری حملہ کیوں نہیں کیا اور وہ دیر کیوں کر رہا ہے۔ اس کا ارادہ کچھ اور تھا۔ وہ ایک بار پھر کانپ گئی۔ ”نہیں۔“

قاتل اس پر جھک گیا اور چاقو اس کی گردن سے لگا دیا۔ ”کپڑے اتار دو۔“ اس نے تحکمانہ انداز میں اپنا حکم دہرایا۔ ”ورنہ میں تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔“

ریچل کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سوئٹر کی طرف گیا۔ اس نے زپ کھولی پھر سوئٹر اتار دیا۔ نیچے اس نے صرف برا پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر قاتل ایک لمحے کے لیے غافل ہو گیا اور اس کا چاقو ریچل کی گردن سے ہٹ گیا۔ اس وقت نہ جانے کیسے ریچل میں اتنی جرأت آ گئی کہ اس نے اچانک ہی

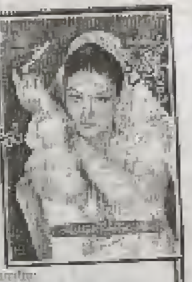

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

اپریل 2011ء کے سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

آپ کی پرزور فرمائش پر فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ میں اس مرتبہ
محترمہ عذرا رسول کی سچی اور کھری باتیں

ذکیہ بلگرامی کا ناول
اگر ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن

شیریں حیدر کا نیا ناول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کی پہلی قسط

عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر
ایک نئی مہک کے ساتھ

راحت وفا کا نیا ناول ایک تھی نیناں
نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین پہلی قسط

میمونہ خورشید، رضوانہ پرنس اور اقبال بانو کے سچے جذبوں سے مزین پر تاثر ناولٹ

سیما یاسمین مجتبیٰ، نگہت اعظمی
ثناء العزیز شہنا، سعدیہ رئیس،
نیلم احمد بشیر اور نور العین ساحرہ
کے زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں افسانے

آپ کی آرا کی روشنی سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

دونوں پاؤں جوڑ کر قاتل کی ٹانگوں کے درمیان مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ قاتل منہ کے بل زمین پر لڑھک گیا اور اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا۔ ریچل نے چاقو اٹھایا اور قاتل کی بائیں کلائی میں گھونپ دیا۔ وہ کراہا تو ریچل چاقو چھوڑ کر بھاگی۔ اس بار اس نے چیخنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور اس وقت تک چیختی اور دوڑتی رہی جب تک اسے سامنے سے آتے ہوئے لوگ اور روشنی نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

شیرف جان اپنی گاڑی میں ایسٹ ووڈ کی طرف جارہا تھا کہ اس کی کار کا ریڈیو بول اٹھا۔ ”اٹ از پیٹرول آفیسر جیمسن... ایسٹ ووڈ میں گڑبڑ ہے۔ ایک نیم عریاں لڑکی باہر آئی ہے۔ اس کے جسم پر کچھ خون لگا ہے۔ وہ زخمی نہیں ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ کسی نے اس کی ساتھی دو لڑکیوں کو قتل کر دیا ہے۔“

”میرے خدا!“ شیرف جان نے کہا اور رفتار تیز کرتے ہوئے اپنا مائک اٹھالیا۔ ”جیمسن! میں شیرف ہوں۔ تم لوگ فوری طور پر ایسٹ ووڈ جنگل میں موجود تمام افراد کو باہر نکالو۔“

”شیرف! ہم نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔“ آفیسر جیمسن نے جواب دیا۔ مائک رکھ کر شیرف نے رفتار مزید تیز کر دی۔ دس منٹ میں وہ جنگل کے کنارے پر تھا جہاں پولیس کی کئی گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں اور میگا فون پر جنگل میں موجود لوگوں سے باہر آنے کو کہا جارہا تھا اور لوگ باہر آرہے تھے۔ گاڑیوں کی تعداد سے اندازہ لگایا جارہا تھا کہ اندر مزید کتنے لوگ باقی ہیں۔ ریچل ایک پولیس کار کے عقبی حصے میں بیٹھی تھی اور کسی نے اسے پولیس جیکٹ دے دی تھی۔ شیرف پہلے اس کے پاس آیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ریچل نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جنگل میں کیا ہوا تھا؟“

”سرخ اپر پوش... اس نے میری دونوں ساتھیوں کو مار دیا۔“ ریچل ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ شیرف نے جیمسن کی طرف دیکھا۔

”کوئی سرخ اپر پوش ملا ہے؟“

”نہیں جو لوگ باہر آئے ہیں، ان میں کوئی اپر پوش نہیں ہے۔“

”سب کو چیک کرو اور کسی کو چیک کیے بغیر جانے مت دینا۔ اسے پولیس اسٹیشن بھجوادو۔“

کچھ دیر بعد ریچل پولیس اسٹیشن کی طرف جارہی تھی۔ وہ اب تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک ٹینا کا خون لگا ہوا تھا لیکن ٹینا کا خون اس کے بائیں ہاتھ پر لگا تھا جبکہ اس کے دائیں ہاتھ پر بھی خون کے دھبے تھے۔ اسے یاد آیا جب اس نے قاتل کے ہاتھ میں چاقو اتارا تھا تو اس کا خون اسے لگ گیا تھا۔ وہ اس خون کو گھورنے لگی۔ قاتل کا کچھ حصہ اس کے پاس آگیا تھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے وہ دوسروں کے جسم میں چاقو اتارتا آیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا چاقو اسے لگا تھا۔ لڑکی کے بھاگ جانے کے بعد اس نے چاقو کھینچ کر ہاتھ سے نکالا۔ اس کا بلیڈ کوئی دو انچ اندر اتر گیا تھا۔ اس نے جلدی سے جیب سے رومال نکال کر اسے زخم پر لپیٹ لیا۔ لڑکی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور اسے معلوم تھا کہ جلد یہ جنگل پولیس والوں سے بھر جائے گا۔ اس سے پہلے اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس کا وجود غصے سے بھر گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا کوئی شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اپنا ہاتھ دبائے تیزی سے چل پڑا۔ اس کا رخ ہائی وے کی طرف تھا۔ ہائی وے پر آکر وہ ذرا محتاط ہوا اور جب اسے دور تک کسی گاڑی کا نام ونشان نظر نہیں آیا تو اس نے دوڑ کر ہائی وے عبور کر لی اور قصبے کی طرف جانے والی سڑک پر آگیا۔ رومال خون سے تر ہو گیا تھا۔ اس نے رومال سڑک سے دور پھینک دیا اور زخم کو ہاتھ سے دبالیا۔ وہ جنگل تک پیدل آیا تھا۔ اس کی گاڑی گھر میں کھڑی تھی۔ اچانک عقب سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں لیکن وہ رکے بغیر چلتا رہا۔ گاڑی خود اس کے پاس آکر سست ہوئی اور ایک ادھیڑ عمر شخص نے کھڑکی سے جھانکا۔

”تمہیں لفٹ چاہیے؟“

وہ رک گیا تو آدمی نے کار روک دی اور وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ آدمی نے کار آگے بڑھادی۔ وہ خاموش تھا۔ قصبے کے قریب ادھیڑ عمر آدمی نے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں کہاں اترنا ہے؟“

”مجھے پولیس اسٹیشن کے پاس فرانز اسٹریٹ پر اتار دینا۔“ اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر میں وہ فرانز اسٹریٹ پر تھے۔ وہ کونے پر اتر گیا اور بنا کچھ کہے یا لفٹ دینے والے کا شکریہ ادا کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ کار والا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے شانے اچکا کر کار آگے بڑھادی۔ وہ اپنا ہاتھ دبائے گھر کی طرف بڑھا لیکن سامنے سے جانے کے بجائے اس نے عقبی حصے کا رخ کیا اور کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس نے اپر اتار کر اسے میز پر ڈال دیا اور باتھ روم میں آیا۔ اس کے زخم سے خون رس رہا تھا۔

”کتیا...“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے زخم دھو کر دواؤں والے خانے سے ٹنچر آیوڈین نکالا اور زخم پر الٹ دیا۔ شدید تکلیف کی وجہ سے اس کے منہ سے کراہٹ نکلی۔ لیکن ٹنچر نے زخم جلا کر خون روک دیا۔ اسے روئی سے صاف کر کے اس نے اوپر پٹی لپیٹ لی اور پھر اس پر ٹیپ لگا دیا۔ منہ اور بال صاف کر کے وہ کمرے میں آیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور الماری کھولی جس میں اس کا کام کا لباس رکھا ہوا تھا۔ اس نے کپڑے پہنے۔ آستین کلائی تک آنے سے اس کا زخم چھپ گیا تھا۔ تیار ہو کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر آیا۔ کار کے بجائے اس نے پیدل جانے کو ترجیح دی۔ اسے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔

☆☆☆

کال آپریٹر سوزن کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ نیٹ ووڈ کی لوکل آپریٹر تھی اور اس کی ڈیوٹی مصروف گھنٹوں میں ہوتی تھی۔ یعنی شام چھ سے رات دو بجے تک کیونکہ دن ڈھلتے ہی کو کالز کی زیادہ تعداد شام کو آتی تھیں اور اسی میں زیادہ آپریٹر کی ضرورت پڑتی تھی۔ دو بج رہے تھے۔ اس نے اپنا مخصوص فون بند کر دیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور میکس اندر آیا۔ وہ نوجوان آفیسر تھا۔

”ہائے مام۔“ اس نے سوزن سے کہا۔

”کیا حال ہیں میکس۔“ سوزن نے اٹھ کر اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔

”اب بہتر ہے۔“ وہ بولا اور چارج شیٹ اٹھائی۔ ”شیرف کہاں ہے؟“

”ایسٹ ووڈ میں آج پھر دو لڑکیوں کا قتل ہوا ہے۔ ایک مشکوک لڑکی ملی ہے اور فی الحال اسے لاک اپ کیا گیا ہے۔ وہ پیچھے والے کمرے میں ہے۔“

”اس کا فارنسک معائنہ کر لیا گیا ہے؟“ میکس نے سوال کیا۔

”ہاں، اس کے پاس سے تمام ممکنہ نمونے لے لیے گئے ہیں۔“ سوزن نے جواب دیا اور دروازے کی طرف چل دی۔ باہر جانے سے پہلے اس نے میکس سے کہا۔ ”بائے کڈ۔“

”بائے مام۔“

میکس نے پوچھ گچھ والے کمرے میں جھانکا۔ لڑکی مخروطی سامنے کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جو میز پر لگے ہک سے منسلک کر دی گئی تھی۔ میز زمین میں نصب تھی اس لیے اگر دروازہ کھلا بھی جاتا تو وہ فرار نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کے سامنے میز پر ریکارڈر رکھا تھا۔ میکس دروازہ کھول کر اندر آیا۔ لڑکی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میکس اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ٹیپ ریکارڈر آن کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ”میرا نام آفیسر میکس ٹیلر ہے... تمہارا نام کیا ہے؟“

”ریچل ویز۔“ وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔

”دیکھو تم نے بتایا کہ تم تین لڑکیاں جنگل میں گئیں اور وہاں کسی نے دو لڑکیوں کو قتل کر دیا۔ صرف تم بچیں؟“ اس نے ہاتھ میز پر رکھ لیے جس پر سادہ کاغذ رکھے تھے۔

”یہ درست ہے۔ قاتل نے میرے سامنے میری دونوں دوستوں کو مار دیا۔“ ریچل کانپنے لگی۔ ”وہ درندہ ہے۔“

”وہ کوئی بھی ہو، پولیس اسے گرفتار کر لے گی۔“ میکس نے کہا۔ ”کیا تمہارے جسم سے خون اور دوسری چیزوں کے نمونے لے لیے گئے ہیں؟“

ریچل نے سر ہلایا۔ ”مجھے یہاں لانے والے آفیسر نے سب سے پہلے یہی کام کیا تھا۔“

ریچل کے ہاتھوں اور چہرے پر ابھی تک خون کے دھبے تھے۔ میکس کھڑا ہوا اور اس نے ریچل کی ہتھکڑی میز سے کھولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ اسے واش روم میں لایا۔ ”اپنے ہاتھ اور منہ صاف کر لو۔“

ریچل نے مشینی انداز میں اپنا منہ اور ہاتھ دھوئے۔ میکس اس کے پاس کھڑا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ کہاں کہاں خون لگا ہے۔ جب ریچل نے خود کو اچھی طرح صاف کر لیا تو وہ اسے واپس پوچھ گچھ والے کمرے میں لایا اور ہتھکڑی میز سے باندھ دی۔ ”تم کچھ دیر آرام کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ کیا تم کچھ پینا پسند کرو گی؟“

”پانی۔“ اس نے کہا پھر التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ”پلیز میرے ماں باپ کو اطلاع کر دو کہ میں یہاں ہوں۔“

”اس کا فیصلہ شیرف کرے گا۔“ میکس نے کہا اور باہر آگیا۔ وہ ریکارڈ روم میں آیا۔ وہاں فارنسک باکس رکھے تھے۔ اس نے ان پر لگی چٹیں دیکھیں اور ان میں سے وہ بکس نکالا جس میں لڑکی سے حاصل کیے ہوئے نمونے محفوظ کیے گئے تھے۔ اس نے بکس میں سے تھیلیوں میں محفوظ نمونے نکالے اور جس نمونے پر لکھا تھا کہ وہ لڑکی کے دائیں ہاتھ سے حاصل کیا گیا ہے، اس کی تھیلی پھاڑ کر اسٹک نکال لی۔ اس نے

digestpk.blogspot.com

دونوں چیزوں کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے پتلون کی جیب سے چھوٹا چاقو نکالا اور اس کا بلیڈ کھولا جس پر خون لگا تھا۔ اس نے ایک نئی اسٹک اور تھیلی لی۔ بلیڈ پر لگا خون اسٹک پر لگا کر اس نے اسے تھیلی میں ڈال دیا اور اسے سیل کر دیا پھر اس پر وہ چٹ لگا دی جو... تھیلی سے اتاری تھی اور اسے بکس میں رکھ دیا۔ یہ کام کرکے وہ مسکرایا اور واش روم میں آکر چاقو دھونے لگا۔

☆☆☆

ریچل کو خون صاف کرکے ذرا سکون ملا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور جب پولیس آفیسر چلا گیا تو اس نے پہلی بار سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ سادہ کمرا تھا اور اس میں ایک طرف آئینہ لگا تھا۔ ریچل جانتی تھی کہ یہ در اصل آئینہ نہیں بلکہ شیشہ ہے جس کے دوسری طرف سے اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ سامنے میز پر ریکارڈر رکھا تھا۔ ریکارڈر کے نیچے سادہ کاغذات تھے جو پولیس والے نوٹس لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اچانک ریچل کی نظر سب سے اوپر والے کاغذ پر لگے خون پر پڑی۔ اس نے ذرا جھک کر کاغذ اٹھایا... یہ بالکل تازہ خون تھا اور ابھی خشک بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ آیا کہاں سے؟ اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ پولیس آفیسر ان کاغذات پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا۔ تو کیا یہ خون اس کے ہاتھ سے نکلا تھا؟ اچانک ریچل کو ایک رونگٹے کھڑے کرنے والا خیال آیا۔ اس نے گھبرا کر خود سے کہا۔

”نہیں... نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

لیکن حالات بتا رہے تھے کہ ایسا ہی تھا۔ یہی پولیس آفیسر اصل میں اپر پوش قاتل تھا۔ اس کا ہاتھ ریچل نے زخمی کر دیا تھا اور اسی زخم سے خون رس رہا تھا اور یہی خون کاغذ پر لگا تھا۔ قاتل کو موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اپنے زخم کی ٹھیک طرح سے مرہم پٹی کرتا کیونکہ اسے ڈیوٹی پر آنا تھا اور اسی طرح سے وہ خود کو شبے سے بالاتر رکھ سکتا تھا۔ ریچل کانپنے لگی۔ قاتل ایک بار پھر اس کے پاس تھا اور وہ اس پولیس اسٹیشن میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے کاغذ اپنی جگہ واپس رکھ دیا اور دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ وہ قاتل پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اس نے خون آلود کاغذ نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قاتل اسے پولیس اسٹیشن میں قتل نہیں کرے گا لیکن اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ریچل اسے بہ حیثیت قاتل پہچان چکی ہے تو وہ اسے لازمی قتل کر دے گا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ دوسرے پولیس افسران آجائیں۔

لیکن اس کی دعا قبول نہیں ہوئی اور میکس منرل واٹر کی بوتل لے کر اندر آیا اور بوتل اس کے سامنے رکھ دی۔ ”پانی پیو۔“

اس نے نروس انداز میں میکس کی طرف دیکھا اور جلدی سے بوتل اٹھالی۔ میکس اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جب اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پانی پی لیا تو میکس نے ریکارڈر آن کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مس ویز! کیا تم بتاؤ گی کہ ایسٹ ووڈ میں کیا ہوا تھا؟“

”وہاں... ایک اپر پوش قاتل نے میری دو ساتھیوں کو مار دیا۔“

”اپر پوش۔“ میکس نرمی سے بولا۔ ”کیا تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا؟“

”نہیں، میں اسے نہیں دیکھ سکی کیونکہ اس نے اپرن کا ہڈ سر پر لیا ہوا تھا۔“

”کوئی اور چیز جس سے تم اسے شناخت کر سکو؟“

”نہیں، ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

”مس ویز۔“ میکس نے کہا۔ ”تم گھبرا کیوں رہی ہو؟“

ریچل نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”نہیں، میں گھبرا تو نہیں رہی ہوں۔“

میکس کچھ دیر غور سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ریکارڈر بند کر دیا۔ اسی دوران میں اس کی نظر کاغذ پر لگے خون پر پڑی۔ اس نے بے اختیار اپنی آستین چیک کی۔ پولیس وردی کے نیلے رنگ کی وجہ سے خون کا دھبا نمایاں نہیں تھا لیکن اس کی آستین پر خون لگا تھا اور یقیناً یہی خون کاغذ پر لگا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر ریچل کو دیکھا تو وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن جب میکس نے دیکھا تو اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ میکس نے گہری سانس لی اور سوچا، یہ جان گئی ہے۔

اگر ریچل جان گئی تھی اور اس سے یہ بات چھپا رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ شیرف اور دوسرے افسران کا انتظار کر رہی ہے تاکہ ان کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ سکے۔ صورتِ حال اچانک ہی خطرناک ہو گئی تھی۔ اگر بات کھل جاتی تو وہ کسی صورت اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کے زخم کی کیا وضاحت پیش کرتا؟ پکڑے جانے پر اس کا ڈی این اے چیک کیا جاتا اور اس کے بعد اسے سزائے موت یا ہمیشہ کے لیے جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ اس نے سوچا اور پھر ریچل کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ بھی جان گئی کہ قاتل جان گیا ہے کہ وہ اس سے واقف ہو چکی ہے۔ ریچل اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میکس مسکرایا اور اٹھ کر اس کے عقب میں آیا۔ ریچل کو لگا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ ایک بار پھر وہ قاتل کے رحم و کرم پر تھی۔ میکس نے جیب سے چاقو نکال کر کھولا تو وہ رونے لگی۔

”پلیز... پلیز۔“

”نہیں۔“ اس نے چاقو ریچل کی گردن سے لگا دیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں چاقو سے نہیں ماروں گا۔“

ریچل کے جسم میں لرزش بڑھ گئی۔ میکس اس کے عقب میں اپنے ہاتھ پر موٹا رومال لپیٹ رہا تھا۔ اس نے اچانک ریچل کے سر پر گھونسا مارا تو اس کا سر میز سے جا لگا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے ریچل کی نبض چیک کی اور بولا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

حالانکہ اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ پوچھ گچھ والے کمرے سے باہر آیا، دفتر کا دروازہ کھلا اور آفیسر جیمسن اندر آیا۔ میکس کا دل ڈوب گیا۔ اس کے ساتھی واپس آرہے تھے۔ اس نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”شیرف اور دوسرے ایسٹ ووڈ میں ہی ہیں۔ شیرف نے مجھے بھیجا ہے کہ میں لڑکی سے پوچھ گچھ کروں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میکس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ کمرے میں موجود ہے۔“

آفیسر جیمسن پوچھ گچھ والے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

ریچل کو لگا جیسے وہ تاریکیوں میں ڈوب رہی ہے۔ پھر وہ چونکی۔ وہاں سچ مچ تاریکی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا سر شدت سے دکھ رہا تھا۔ وہ اسی کمرے میں اور اسی کرسی پر پڑی تھی۔ لیکن کمرا تاریک تھا اور دروازے کے اوپر لگے شیشے سے ہلکی سی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر کیا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی ہتھکڑی کا جو حصہ میز سے بندھا ہوا تھا وہ اب کھل گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کے سامنے میز پر ہتھکڑی کی چابی اور ایک عدد پستول رکھا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے آس پاس دیکھا۔ شاید قاتل بھی کمرے میں موجود ہو لیکن وہاں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے چابی اٹھا کر اپنے ہاتھ والی ہتھکڑی بھی

تمہارے پاپا خراب کارکردگی کی وجہ سے
وکٹ کیپر کو ٹیم سے باہر نکال رہے ہیں

کھول دی۔ پھر اس نے پستول اٹھا لیا۔ اس سے بارود کی تیز بو آرہی تھی جیسے اس سے کوئی فائر ہوا ہے۔ وہ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی اس نے قدم آگے بڑھایا اس کا پاؤں کسی سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اس کے سامنے فرش پر ایک پولیس والے کی لاش پڑی تھی۔ وہ لاش جیمسن کی تھی اس کے سر میں عین ماتھے پر سوراخ تھا جس سے خون نکل کر اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ ریچل کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی اور میز کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میز پر ریکارڈر بھی رکھا ہوا تھا۔

ریچل کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہمت کی اور کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ بند ہوگا لیکن وہ کھلا ہوا تھا..... دفتر میں بھی تاریکی تھی۔ پورے دفتر کی بجلی غائب تھی اور صرف باہر پارکنگ کی تیز روشنی کھڑکیوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ وہ کانپتے اور ڈولتے قدموں سے باہر آئی۔ اسے قاتل آفیسر میکس نظر نہیں آیا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا اور اس نے ریچل کے خلاف کوئی سازش کی تھی۔ اسی نے اس پولیس والے کو مارا تھا اور شاید اس کا الزام اس پر عائد کیا جانا تھا۔ وہ دفتر کے درمیانی حصے میں آئی۔ یہاں روشنی کسی قدر بہتر تھی۔ اسے میز پر ایک ٹارچ مل گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر آن کیا۔

”خوب... تو تم آزاد ہو گئیں۔“

میکس کی آواز پر وہ بھڑک گئی۔ اس نے گھوم کر ٹارچ اور پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ”تم..... یہ سب تم نے کیا

digestpk.blogspot.com

ہے؟"

"ہاں۔" میکس بولا۔ وہ ایک الماری سے ٹکا کھڑا تھا۔

"ذلیل آدمی۔" ریچل جذبات سے مغلوب ہو کر بولی۔ "میں تمہیں قتل کر دوں گی۔" اس نے پستول تان لیا۔

"ضرور کرو... میں اسی قابل ہوں۔" وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی نے ریچل کو مشتعل کر دیا اور اس نے ٹریگر دبا دیا۔ لیکن ٹریگر دبنے پر صرف ٹرچ کی آواز آئی۔ اس نے پھر ٹریگر دبایا اور بار بار دباتی چلی گئی۔ پستول خالی تھا۔ اس نے پستول میز پر رکھ دیا۔

"یہ خالی ہے۔" میکس نے کہا۔ "تین گولیاں تم نے کمرے میں چلائیں اور باقی یہاں دفتر میں چلائیں۔"

"میں نے؟" وہ چلائی۔ "تم ایسا کرتے ہو تم۔ قاتل تم ہو۔" ریچل نے دوبارہ پستول اٹھا کر ٹارچ کا رخ براہ راست میکس کی آنکھوں کی طرف کر دیا۔

"ہاں، میں قاتل ہوں۔"

"صرف اس پولیس آفیسر کے نہیں... ان تمام لڑکیوں کے بھی قاتل ہو جو ایسٹ ووڈ میں ماری گئی تھیں۔"

"ہاں کیونکہ وہ میرے جنگل کا سکون برباد کرنے آئی تھیں۔" میکس کے لہجے میں غصہ آ گیا۔ "میں ان تمام لوگوں کو قتل کروں گا جو ایسٹ ووڈ کو برباد کرنے آ رہے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، بے گناہ لڑکیوں کو قتل کرنے سے یہ سلسلہ رک جائے گا؟"

"اگر ابھی نہیں رکے گا تو چند اور لڑکیوں کے مارے جانے کے بعد یہ سلسلہ ضرور رک جائے گا۔" میکس نے یقین سے کہا۔ "ان میں ایک تم بھی ہو۔"

"تم مجھے مار دو گے؟" ریچل نے بے یقینی سے کہا۔

"اس پولیس اسٹیشن میں؟"

"ہاں کیونکہ یہاں اچانک بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا اور تم نے تیزی سے فائدہ اٹھا کر آفیسر جیمسن سے اس کا پستول چھین کر اسے قتل کر دیا۔ اگرچہ آفیسر کو خیال رکھنا چاہیے تھا کہ جب وہ ایک مشکوک فرد سے تفتیش کرنے جا رہا ہے تو اسے اپنا ہتھیار باہر چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے، اسے تم نے مارا ہے۔"

میکس اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولتا رہا۔ "پھر تم نے اس سے چابی لے کر اپنی ہتھکڑی کھولی اور باہر آ گئیں۔ یہاں تم نے مجھ پر بھی فائر کیے لیکن میں بچ گیا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"پھر میں نے تم پر فائر کیا اور تم ماری گئیں۔"

"یہ... یہ جھوٹ ہے۔" ریچل کو اپنا جسم سرد ہوتا محسوس ہوا۔

"نہیں، یہ سچ ہے۔" میکس نے سفاک لہجے میں کہا اور اچانک پستول سیدھا کر کے اس پر گولی چلا دی۔ ریچل الٹ کر پیچھے گری۔ اسی لمحے باہر روشنی لہرائی اور پولیس کاریں آ کر رکیں۔ فائر کی آواز یقیناً باہر تک گئی اس لیے شیرف سمیت دوسرے پولیس والے دوڑتے ہوئے آئے۔ شیرف جان آگے تھا۔ اس نے اندر آتے ہی چلا کر کہا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میکس گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ آزاد ہو گئی اور اس نے جیمسن کو شوٹ کر دیا۔ پھر یہ باہر آئی اور اس نے مجھ پر فائر کیے۔"

شیرف نے جھک کر ریچل کی... نبض دیکھی لیکن وہ مر چکی تھی۔ گولی ٹھیک دل پر لگی تھی۔ اس دوران میں کسی پولیس والے نے بجلی کا متبادل سسٹم آن کر دیا اور دفتر میں روشنی ہو گئی۔ شیرف نے نیچے پڑی ریچل کو دیکھا۔ "کس ہتھیار سے؟"

"جو اس کے ہاتھ..." میکس بولتے بولتے رک گیا کیونکہ اس نے میز پر پڑا پستول دیکھ لیا تھا۔ جب پستول میز پر پڑا تھا تو لڑکی نے اس کے سامنے کیا چیز کی تھی؟ شیرف نے جھک کر ریچل کے ہاتھ میں دبا ہوا چھوٹا سا ریکارڈر نکالا اور میکس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اب اسے پتا چلا کہ ریچل جو چیز ٹارچ کی روشنی کے پس پردہ سامنے رکھے ہوئے تھی وہ اصل میں یہ ریکارڈر تھا۔ شیرف نے اس کا بٹن دبا دیا اور دفتر میں میکس اور اس کے درمیان... ہونے والی گفتگو گونجنے لگی۔ اس گفتگو کے چند جملے سنتے ہی وہاں موجود تمام پولیس افسران نے اپنے ہتھیار نکال لیے اور شیرف نے میکس کو للکارا۔

"ہتھیار پھینک دو۔"

میکس نے گہری سانس لی۔ اس لڑکی نے مرتے مرتے بھی اسے شکست دے دی تھی۔ اس نے چالاکی سے اس کی تمام گفتگو ریکارڈر میں محفوظ کر لی تھی اور اب یہ اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھا۔ اسے سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اور جب اسے مرنا ہی تھا تو اتنا انتظار کس لیے؟ اس نے پستول بلند کیا اور اپنے سر سے لگا لیا۔ شیرف چلایا۔

"رک جاؤ۔"

"سوری شیرف۔" میکس نے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔

ڈونا سنگار میز کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی کہ فرینک نے پیچھے سے آ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "رہنے دو۔ تم ایسے ہی اچھی لگتی ہو۔"

"تمہیں برا لگ رہا ہے؟" ڈونا ہونٹوں پر لپ اسٹک پھیرتے ہوئے بولی۔ "بہت زیادہ نہیں کروں گی۔ ویسے تم بھی کبھی کبھی اسی کے انداز میں گفتگو کرنے لگتے ہو۔"

"شاؤ؟"

"وہ بھی اسی طرح کے جملے بولتا ہے۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، رہنے دو۔ چھوڑو وغیرہ وغیرہ اور پھر یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ کسی مباحثے میں تقریر کر رہا ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ اس کا تکیہ کلام ہو گا۔"

"کیوں، وہ آخر ایسا کیوں کرتا ہے اور ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے۔ تم کچھ جانتے ہو؟"

فرینک نے کندھے اچکا دیے اور بولا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اب وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد وہ ہمیشہ اسی طرح مضطرب ہو جاتا تھا کیونکہ اس کے پاس مزید رکنے کے لیے کچھ نہ ہوتا اور اس کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ ڈونا اپنے گھر چلی جائے۔

"وہ اپنی مجھے نیچا دکھانے پر تلا ہوا ہے۔" ڈونا شکایت آمیز

اپنی دانست میں کامیابی سے شکار کر لینے والے شکاری کا المیہ

شکار

بابر نعیم

تعلق استوار کرنے میں دیر نہیں لگتی... چند لمحوں میں ہو جانے والی شناسائی ایک گہرے تعلق میں بدل جاتی ہے... تین افراد کے مابین قائم ہو جانے والے تعلق سے ایک نیا موڑ اختیار کر لینے والی پُرتجسس کتھا۔

digestpk.blogspot.com

لہجے میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ اسے کچھ شک ہو گیا ہے۔"

"کیسا شک؟"

"یہی کہ میں کسی سے ملتی ہوں۔"

فرینک مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس میں غلط کیا ہے۔ واقعی تم کسی سے ملتی ہو اور اسی لیے اس وقت یہاں نظر آرہی ہو۔"

"میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "وہ میری جاسوسی کر رہا ہے مثلاً آج جب میں گھر جاؤں گی تو وہ میرے بیگ میں سے ساری رسیدیں نکال کر دیکھے گا کہ میں نے کہاں سے کس وقت کیا خریداری کی۔ اسے اتنی زیادہ کرید رہتی ہے۔ بعض اوقات تو مجھے بہت مشکل ہوتی ہے کہ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا کیا حساب دوں۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو کر رہا ہے، اسے کرنے دو۔ البتہ اگر کھل کر پوچھے تو صاف انکار کر دینا وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔" وہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ تم اس کے ساتھ نہیں رہتے۔ کبھی کبھی میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھرتی ہے کہ..."

"کیسی خواہش؟"

"یہی کہ اسے اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں۔"

فرینک کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی گردن پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "خدا کے لیے ایسی غلطی مت کرنا۔ وہ ہم دونوں کو اس دنیا سے رخصت کر دے گا۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مسلتے ہوئے بولی۔ "تم ہی بتاؤ فرینک کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"جس طرح چل رہا ہے، اسے چلنے دو۔" فرینک اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں تمہیں چاہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ ہم اکٹھے رہیں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اس نے کہا لیکن اسے اپنے الفاظ کھوکھلے اور بے جان محسوس ہوئے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس میں سو فیصد سچائی نہیں ہے۔ "لیکن ہم حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"اگر وہ درمیان میں نہ ہوتا تو ہم ایک ہو سکتے تھے۔"

"ہاں... لیکن وہ ہمارے درمیان کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے۔" فرینک نے کہا۔

"ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ نہ رہے۔ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کام کے دوران میں کچھ غلط ہو جائے...."

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈونا کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ اس نے کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں ایسا کوئی بندوبست کروں۔"

ڈونا کندھے اچکا کر رہ گئی۔ "تم ہمیشہ کہا کرتے ہو کہ جو کام تم دونوں کر رہے ہو، اس میں بہت خطرات ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کل تم شمال کی طرف جاؤ اور وہاں حادثہ پیش آجائے اور یہ تو طے ہے کہ اگر جارج کے ساتھ کچھ ہوتا ہے تو تم ہی اس کی جگہ لو گے۔ تمہاری ترقی ہو جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ وہ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔"

یہ سچ تھا کہ کمپنی کے بڑے اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ اپنے کام میں مستعد اور کھرا تھا۔ اس نے کبھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ جارج بھی اکثر اس کے کام کی تعریف کیا کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ کمپنی کے لوگ اس کے کام سے بہت خوش ہیں۔

اسے دفتر جانے کے لیے دیر ہو رہی تھی لہٰذا وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے کانوں میں ڈونا کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں فرینک۔ میں نہیں جانتی کہ اس طرح کب تک اس کے ساتھ رہ سکوں گی۔"

اس نے شیو کرتے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس طرح کے لمحات بار بار آتے ہیں... اگر وہ چاہے تو عقل مندی سے کام لے کر اس کھیل کو ختم کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ معاملہ خطرناک حد تک بڑھ جائے۔

"فرینک! میں واقعی نہیں جانتی کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے یا نہیں لیکن میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ اسے سب کچھ بتا دوں پھر وہ جو چاہے کرتا رہے اور اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"وہ تمہیں قتل کر سکتا ہے۔" فرینک نے سوچا۔ اس کے پاس اعشاریہ پانچ چار کا ریوالور ہے جو وہ تم پر آزما سکتا ہے۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ اب بھی خاصا خوش شکل لگ رہا تھا۔ اس میں زندگی کی بھرپور حرارت تھی اور وہ ڈونا جیسی عورت کے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آیا۔ نئی قمیص پہنی اور زرد رنگ کی ٹائی باندھنے لگا جو اس قمیص کے ساتھ میچ کر رہی تھی۔

ڈونا اس کے قریب آکر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں اکٹھے رہیں اور میں تمہاری دیکھ بھال کروں۔" پھر وہ اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ "ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ پوری ٹائی پر خون کے دھبے لگ گئے ہیں۔"

اس نے آئینے میں دیکھا۔ شیو کے دوران میں اس کا گال

اور گردن جگہ جگہ سے زخمی ہو گئی تھی اور اس کی ٹائی کی ناٹ پر ایک بڑا سا دھبا لگ گیا تھا۔ اس نے ٹائی اتار دی۔

"میں اسے صاف کر دوں گی۔" وہ بولی۔ "اس ٹائی کو جارج کے سامان میں رکھ دو۔"

"کیا جارج کو یہ معلوم نہیں کہ اس کے پاس کتنی ٹائیاں ہیں۔" وہ اس کی حماقت پر جل کر بولا اور ٹائی کو میلے کپڑوں کی باسکٹ میں ڈال دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اسے وہ ٹائی بہت پسند تھی اور وہ اس میں اچھا نظر آتا تھا۔ اس نے بیزار ہو کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

"ٹھیک ہے۔" ڈونا نے کہا۔ "میں تمہاری بات سمجھ گئی۔ کیا میں تمہارا باتھ روم استعمال کر سکتی ہوں۔ اس کے بعد چلی جاؤں گی۔"

فرینک نے ایک اور ٹائی کا انتخاب کیا لیکن وہ زرد رنگ کی نہیں تھی اور اس کی قمیص سے میچ نہیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دوسری قمیص نکالتا۔ ڈونا کے جانے کے بعد اس نے اپنے ہتھیار نکالے اور انہیں صاف کرنے لگا۔ اس کے پاس گلاک..... اور براؤننگ تھیں۔ اس نے انہیں صاف کرنے کے بعد دوبارہ لوڈ کرنے میں وہ سب پھر خوش خوش گزار دیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی دونوں پستول لے جانا ضروری ہیں۔ دوسرے دن انہیں ایک خاص مشن پر جانا تھا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ شمال میں گیلاپاگوس کا ایک جوڑا دیکھا گیا ہے۔ یہ یونانی نسل کے کچھوے سے ملتا جلتا ہے اور یونانیوں کے لیے مشہور ہے کہ وہ کوئی حماقت کیے بغیر نہیں رہ سکتے اس لیے بہتر ہے کہ دونوں ہتھیار ساتھ لے جائے۔

اس نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور پھر اپنے لیے کھانا بنانے لگا۔ ویسے تو عام طور پر وہ ہوٹل میں ہی کھانا کھاتا تھا لیکن اب اس کا باہر جانے کا موڈ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس نے گھر کے کھانے کو ترجیح دی۔ اس دوران میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی اگلے دن کے کام کے بارے میں خیال نہ آیا۔ یہ کام صحیح طریقے سے انجام پاتا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر جارج نے کوئی جلد بازی نہ کی تو ان کا مشن کامیاب رہے گا۔

دوسری صبح وہ معمول کے مطابق اٹھا۔ شیو کرنے اور نہانے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور نو بجے تک گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے موسم کا جائزہ لیا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی لیکن اس کے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ جارج کو پروگرام اگلے روز کے لیے ملتوی کرنے کے بارے میں سوچنا پڑتا۔ اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور کھڑکی سے برف باری کا نظارہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈونا کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اس سے تعلق ختم کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے یہ قدم اٹھانا ہی ہو گا۔ اگر ڈونا اور جارج میں لڑائی ہوئی تو وہ کوئی بھی احمقانہ قدم اٹھا سکتی ہے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی ملازمت عزیز تھی اور وہ ڈونا کی خاطر اس سے ہاتھ نہیں دھو سکتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ جارج اس کے پیچھے لگ جائے۔ اس سے ایک حماقت سرزد ہو گئی تھی اور اب اس کھیل کو ختم ہونا چاہیے۔

اس نے کبھی بھی جارج کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ ایک رات بار میں ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو جارج نے ایک خوب صورت عورت کا بازو تھاما ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر جارج کچھ پریشان ہو گیا لیکن فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مجبوراً اس نے فرینک کا تعارف اپنے دفتر کے ساتھی کے طور پر کرایا جبکہ ڈونا کو اس نے اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرینک کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں صنف نازک کو متاثر کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے جارج نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا لیکن ڈونا اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی لہٰذا جارج نے ایک ضروری کام کا بہانہ کیا اور ڈونا کو لے کر وہاں سے چل دیا۔ جاتے ہوئے ڈونا نے مڑ کر فرینک کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک واضح پیغام تھا جسے سمجھنے میں فرینک کو زیادہ دیر نہیں لگی۔

دوسرے دن وہ پارکنگ سے اپنی کار نکال رہا تھا کہ وہ عمارت کے مرکزی دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ یہ محض اتفاق ہی تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس شہر کے راستے بھی کتنے عجیب ہیں کہ دو اجنبیوں کو اتنی جلدی ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں۔ اس نے فرینک کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کسی بھی تعلق کے لیے یہ ایک حوصلہ افزا آغاز تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈونا اس کی جانب اتنی تیزی سے کیوں بڑھتی چلی آئی۔ شاید وہ خطروں سے کھیلنے کی عادی تھی یا پھر اسے فرینک کی زندگی گزارنے کا انداز پسند آ گیا تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ جو ہونا تھا، سو ہو گیا لیکن گزشتہ روز ڈونا کی باتیں سن کر اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ جارج واقعی پرشک ہو گیا تھا اور کسی وقت بھی کھوج لگاتا ہوا فرینک تک پہنچ سکتا تھا۔ ڈونا کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر جارج نے اس سے کوئی باز پرس کی تو وہ بے دھڑک علیحدگی کا مطالبہ کر دے گی جس کے لیے فرینک کسی صورت بھی تیار نہ تھا۔

اس نے کافی ختم ہی کی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ جارج کچھ

dgstpk.blogspot.com

لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”تم نیچے آؤ گے یا میں تمہیں لینے اوپر آجاؤں۔“

اسے جارج پر غصہ آیا۔ شاید وہ یہ توقع کر رہا تھا کہ فرینک اس سخت سردی میں جیبوں میں تین پاؤنڈز وزنی اسٹیجر لے کر نیچے کھڑا ہو۔ اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور اوور کوٹ پہن کر نیچے چل دیا۔ جارج کی گاڑی عمارت کے سامنے ڈبل پارک کھڑی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں سے گزرنے والے ٹریفک کو دشواری ہو رہی تھی اور گاڑیوں میں سوار لوگ جارج کو گھورتے ہوئے گزر رہے تھے۔ فرینک جیسے ہی کار میں سوار ہوا، اس نے گاڑی چلا دی اور اسے دروازہ بند کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے دروازے میں آجاتی۔

جارج کی ایک اور خاص عادت یہ تھی کہ وہ بڑی سڑکوں پر سفر کرنے سے کتراتا تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی وہ ذیلی راستوں کا انتخاب کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان سڑکوں پر بے خوف ہو کر گاڑی چلا سکتا ہے۔ اسے یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سوار ہونے کی کوشش کرے گا۔ فرینک کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے گھبراتا تھا کیونکہ جارج کو دوسروں کی طرح گاڑی چلاتے ہوئے بولنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ مضبوطی سے سیٹ پر بیٹھا سڑک پر نظریں جمائے گاڑی چلاتا تھا۔

فرینک اس سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ شاید اس کے اندر کا احساس جرم اسے کچھ بولنے پر مجبور کر رہا تھا عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا لیکن اس روز نہ جانے کیوں وہ بولنے پر مجبور ہو گیا۔

”یہ جانور ہمارے لیے مسئلہ بن سکتے ہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے گفتگو کا آغاز کیا۔

”مسئلہ... کیسا مسئلہ؟ ہم انہیں شکار کرنے جا رہے ہیں۔ پہلے کسی محفوظ جگہ رک کر ان کا جائزہ لیں گے پھر اپنے امکانات پر غور کریں گے۔“

”وہاں ایک دریا بھی ہے اور اس کی موجودگی میں ہمیں کئی مواقع مل سکتے ہیں۔“ فرینک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بالکل، وہ کوئی بھی حماقت کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔“

دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ جنگل کے علاقے میں داخل ہو گئے جس کے درمیان سے ایک دو رویہ سڑک گزر رہی تھی اور اطراف میں انناس کے درخت لگے ہوئے تھے۔ جارج نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ سیدھے ہاتھ پر ایک کچا راستہ تھا۔ جارج نے گاڑی وہاں کھڑی کی اور بولا۔ ”میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ تم چاہو تو ساتھ چل سکتے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ کار سے اترا اور درختوں کی جانب چل دیا۔ فرینک لمحہ بھر کے لیے وہیں بیٹھا رہا پھر اس نے اپنی جیب سے گلاک نکالی جو اسے بہت دیر سے تنگ کر رہی تھی اور گلو کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں پہلے سے ہی جارج کا اعشاریہ چار چار کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ فرینک نے اپنا پستول بھی اس کے ساتھ ہی رکھ دیا پھر وہ کار سے باہر آیا اور جارج کا پیچھا کرتے ہوئے درختوں کی جانب چل دیا۔ وہاں ہلکی ہلکی برف پڑ رہی تھی لیکن اس کے جمع ہونے کے آثار نہیں تھے۔ آگے جا کر جنگل کچھ اور گہرا ہو گیا لیکن وہ بہ آسانی جارج کو دیکھ سکتا تھا جو اس سے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا۔ اس کی پشت فرینک کی جانب تھی۔

وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور جھک کر اپنی پتلون کے پائنچے موڑنے لگا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو جارج اس کے سامنے گن تھامے کھڑا تھا۔ یہ ایک نسبتاً چھوٹا ریوالور تھا کیونکہ بڑا ریوالور تو وہ کار میں چھوڑ آیا تھا۔

”یہاں آکر راستہ ختم ہو جاتا ہے۔“ جارج بولا۔

فرینک نے اس کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا۔ وہ ان الفاظ کا مفہوم بھی سمجھ رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو جارج...“

وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ ”دیکھو جارج...“

لیکن جارج کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فرینک اس کے رویے کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے تھوڑا سا پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تاکہ اس کے اور ریوالور کے درمیان فاصلہ بڑھ جائے۔ اچانک اس کا پاؤں لکڑی پر پڑا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ جارج نے فائر کر دیا۔ جنگل میں گولی کی آواز نے ارتعاش پیدا کر دیا اور لکڑی کے کئی سوکھے ٹکڑے فضا میں اچھلے۔ ان میں سے ایک فرینک پر آکر گرا۔ اس نے پھرتی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور براؤننگ نکالی۔ جارج نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار اس کا نشانہ بہتر تھا۔ گولی اس کے برابر میں درخت کی ایک شاخ پر لگی اور فرینک ایک فٹ اچھل پڑا۔

”نہیں۔“ وہ زور سے چلایا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس فریاد کا جارج پر کوئی اثر نہیں ہوگا چنانچہ اس نے براؤننگ کا رخ جارج کی طرف کیا اور گولی چلا دی جو سیدھی اس کے سینے پر جا کر لگی۔ جارج زور سے کراہا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا پھر وہ جھکا اور اپنے دائیں جانب لڑھک گیا۔ فرینک نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ جنگل میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ برف گرنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی لیکن اس کی بہت تھوڑی سی مقدار درختوں سے چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ فرینک اپنے قدموں

پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے کافی دور سے دوڑتا ہوا آیا ہو۔ وہ ہاتھ میں براؤننگ لیے ہوئے جارج کی طرف بڑھا اور ریوالور کو ٹھوکر مار کر اس سے دور کر دیا۔ پھر وہ ایک قریبی تنے پر بیٹھ گیا اور جارج پر نظریں جما دیں۔

”جارج! تمہارا یہی انجام ہونا تھا۔“

جارج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا آدھا چہرہ پتوں میں چھپ گیا تھا اور اس کی آنکھیں نہ جانے کس سمت دیکھ رہی تھیں۔ فرینک نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ یہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا ورنہ ہی سڑک پر ٹریفک کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن وہ اسے یونہی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ یقیناً یہاں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور ہوں گے اور کوئی نہیں تو جنگلات میں کام کرنے والوں میں سے کوئی یہاں آسکتا ہے۔ سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ وہاں کھڑی ہوئی کار کو دیکھ کر متوجہ ہو سکتے ہیں۔

اسے یقین نہیں تھا کہ جارج کی کار میں کوئی بلیچ ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ جارج جیسا شخص کبھی بھی اپنی نئی گاڑی میں بلیچ یا اس جیسی کوئی چیز رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو ایک سو سال بوڑھے کے مانند تصور کر رہا تھا اور اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ اسے اپنے دائیں جانب ایک گڑھا نظر آیا۔ وہاں زمین نرم اور گیلی تھی۔ اس نے جارج کے اوور کوٹ کا کالر پکڑا اور اسے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ جارج ویسے ہی خاصا وزنی تھا اس لیے فرینک کے لیے اسے گھسیٹنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ گڑھے تک پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ گڑھا ایک ڈھلوان کی شکل میں تھا۔ فرینک نے جارج کی لاش کو کنارے پر رکھا اور نیچے کی جانب دھکیل دیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک درخت کا پرانا تنا پڑا ہوا تھا جس کا ایک سرا گڑھے کے کنارے کو چھو رہا تھا۔ فرینک نے اپنے پیر سے اسے کھسکانے کی کوشش کی۔ تنا تھوڑا سا ہلا۔ اس نے زور لگا کر اسے دھکیلنا چاہا۔ اس بار تنا پوری طرح گھوم گیا اور چکر کھاتا ہوا گڑھے میں جا گرا۔ فرینک نے ایک گہری سانس لی اور پیچھے ہٹ گیا۔ اسے یوں لگا کہ شاید یہ گڑھا جارج کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔

فرینک اس جگہ گیا جہاں سے جارج نے اس پر گولی چلائی تھی۔ وہاں زمین پر جارج کا ریوالور پڑا تھا اس نے اپنے کوٹ کے دامن سے اسے صاف کیا اور پہلے اس کی نال زمین میں دبائی اور پھر اسے پوری طرح گہرائی میں دفن کر دیا۔ پھر اس نے اپنی براؤننگ اٹھائی اور اسے بھی اچھی طرح صاف کیا اور اسے پوری قوت سے درختوں کی جانب پھینک دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس جانب آنے والے کسی بھی شخص کی نظر اس ہتھیار پر نہیں جائے گی پھر وہ واپس مڑا اور درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا جارج کی گاڑی تک آگیا جو برف سے پوری طرح ڈھک چکی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ غیر متوقع طور پر وہ ابھی تک گرم تھی۔ چند لمحوں تک وہ پرسکون ہونے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے کار اسٹارٹ کی اور یوٹرن لیتا ہوا واپس جانے والے راستے پر آگیا۔ وہ اس گاڑی کو صرف شہر تک پہنچنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد کار کو کسی مناسب جگہ پر چھوڑ دے گا اور اپنے گھر پہنچ کر دفتر فون کر کے کہے گا کہ وہ صبح سے جارج کا انتظار کر رہا ہے لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچا اور نہ ہی سیل فون پر اس سے رابطہ ہو رہا ہے۔ آج انہیں اپنے کام کے سلسلے میں شمال کی جانب جانا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کم از کم دو دن تک ڈونا کو فون نہیں کرے گا۔ اگر اس نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو کہہ دے گا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہے۔ البتہ اس دوران میں وہ دوسرے لوگوں کو فون کر کے جارج کے بارے میں پوچھتا رہے گا کہ وہ کہاں ہے کیونکہ اس سے ملاقات نہیں ہو پا رہی اور نہ ہی فون پر کوئی رابطہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے رویے اور گفتگو میں بھی محتاط رہنا ہوگا۔ کسی کو ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان ڈونا کے معاملے میں رقابت چل رہی تھی اور جارج نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے اردگرد کئی ایسے لوگ تھے جنہیں اس پر شک ہو سکتا تھا لیکن فرینک کا ان لوگوں سے زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا اور ویسے بھی جارج اس کا باس تھا۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی دشمنی ہو سکتی ہے پھر بھی تمام امکانات پر غور کرنا ضروری تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ جارج نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اسے ڈونا اور اس کے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر ایسی بات تھی تو جارج یہ انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے تھوڑا بہت شور ضرور مچاتا۔ سب سے پہلے تو وہ ڈونا سے باز پرس کرتا۔ شاید ایسا ہوا ہو۔ ڈونا تو ویسے ہی اس سے بیزار تھی۔ ممکن ہے کہ اس نے فرینک کے ساتھ اپنے تعلق کا اعتراف کر لیا ہو اور اس کے بعد ہی جارج نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہو لیکن اس مقصد کے لیے اس نے جنگل میں جانے کا انتخاب کیوں کیا۔ یہ جارج کا انداز نہیں تھا۔ وہ بے خوف اور نڈر شخص تھا اور کسی کو بھی بیچ چوراہے پر گولی مار سکتا تھا۔ اسے اگر فرینک کو قتل کرنا ہوتا تو اس کے فلیٹ پر آکر شوٹ کر دیتا۔ یقیناً یہ بات نہیں تھی۔ جارج نے اگر اسے مارنے کا ارادہ کیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہی ہوگی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

برف باری تیز ہو گئی اور دن ہونے کے باوجود تاریکی

digestpk.blogspot.com

بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے بمشکل آدھا فاصلہ طے کیا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے گاڑی چلا رہا ہے۔ اس نے کسی بھی حادثے سے بچنے کے لیے گاڑی کی بتیاں جلا دیں۔ اچانک ہی عقب میں اسے پولیس کی گاڑی نظر آئی جس کی جلتی بجھتی بتیاں نزدیک آتی جارہی تھیں اور وہ ہارن بجا بجا کر اسے رکنے کا اشارہ کررہے تھے۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ اس وقت وہ پولیس سے الجھنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن پولیس کار بالکل قریب آچکی تھی۔ مجبوراً اس نے اپنی کار سڑک کے ایک جانب کھڑی کردی۔ ایک پولیس والا اتر کر اس کے پاس آیا۔ فرینک نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کردیا۔

"گڈ مارننگ سر!" وہ نوجوان تھا اور اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حال ہی میں اپنی تربیت مکمل کرکے آیا ہے۔ "کیا آپ کے علم میں ہے کہ آپ کی گاڑی کے پیچھے کی ایک لائٹ کام نہیں کررہی؟"

"واقعی؟" فرینک نے کسی جھنجلاہٹ کا اظہار کیے بغیر کہا اور گاڑی سے باہر آگیا۔

"کیا یہ گاڑی آپ کی ہے سر؟" نوجوان پولیس آفیسر نے تجربہ کارانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں، میرے ایک دوست کی ہے۔ وہ کسی کام سے شہر میں رک گیا ہے اس لیے میں یہ گاڑی واپس لے کر شہر جارہا ہوں۔"

اس کے بیان میں کوئی مبالغہ نہیں تھا ماسوائے اس کے کہ اس نے جارج کو باس کے بجائے دوست ظاہر کیا۔

"کیا آپ کے پاس گاڑی کے کاغذات ہیں؟"

فرینک نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال کر گاڑی کے کاغذات نکال لیے پھر تیزی سے اسے بند کردیا کیونکہ گلوز کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے پستول بھی رکھے تھے۔ اگر پولیس والے گاڑی کی تلاشی لینے پر اصرار کرتے تو وہ مشکل میں پڑسکتا تھا۔

وہ گاڑی سے اترا۔ اب وہاں ایک کے بجائے دو پولیس والے تھے جو بڑے غور سے گاڑی کے پچھلے حصے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لائٹ کام نہیں کررہی ہے۔"

فرینک نے کوئی جواب نہیں دیا جبکہ دوسرا پولیس والا بڑے انہماک سے گاڑی کا معائنہ کررہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اور فرینک سے بولا۔ "لگتا ہے تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔"

فرینک نے قریب جاکر دیکھا۔ وہاں عقبی لائٹ سے ذرا اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آرہا تھا۔

پہلا پولیس والا بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تمہاری گاڑی پر گولی چلائی ہے۔"

"کیا تم کار کی ڈکی کھولنا پسند کرو گے؟" دوسرا پولیس والا چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔

فرینک نے اگنیشن سے چابیاں نکالیں اور ڈکی کا تالا کھول کر اسے اوپر اٹھا دیا۔

"اوہ میرے خدا۔" پہلا پولیس والا چلایا۔

فرینک کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ جارج نے بیلچہ کہاں رکھا ہوا تھا۔ وہاں صرف بیلچہ ہی نہیں بلکہ ڈونا بھی تھی۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ کار کی باڈی میں ہونے والا سوراخ اس گولی کا تھا جو جارج نے آخری بار اس پر چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہوگیا اور گولی کار کی باڈی میں سوراخ کرتی ہوئی ڈونا کے ماتھے پر جالگی لیکن ڈونا اس گولی سے نہیں مری تھی بلکہ اس کی موت کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کی گردن کے گرد وہی زرد رنگ کی ٹائی لپٹی ہوئی تھی جس پر فرینک کے خون کے دھبے تھے۔ فرینک نے وہ ٹائی پھاڑنے کپڑوں کی ٹوکری میں ڈال دی۔ لیکن بےچاری ڈونا نے وہ ٹائی وہاں سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لی تاکہ گھر جاکر اسے دھو سکے اور فرینک پر ظاہر کرسکے کہ وہ اس کا کتنا خیال کرتی ہے۔ جارج نے حسبِ عادت اس کے پرس کی تلاشی لی ہوگی اور زرد رنگ کی ٹائی دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا ہوگا کیونکہ اس کے پاس اس رنگ کی کوئی ٹائی نہیں تھی۔ ڈونا غریب کو کیا معلوم تھا کہ جس چیز کو وہ دھونے کے لیے لائی تھی وہی اس کے لیے موت کا پھندا ثابت ہوگی۔

"تمہارا کہنا ہے کہ یہ کار تمہارے ایک دوست کی ہے۔" پہلے پولیس والے نے کہا۔ اب وہ دونوں آہستہ آہستہ اسے گھیرے میں لے رہے تھے۔

"ہاں۔" فرینک تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "تم گاڑی کے کاغذات دیکھ سکتے ہو۔ یہ گاڑی جارج ویز لے کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسٹر جارج ہمیں کہاں مل سکیں گے؟" دوسرے پولیس والے نے پوچھا۔

فرینک کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اب اسے اپنی زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

جب اسے ہتھکڑیاں پہنائی جارہی تھیں تو اسے وہ جملہ یاد آگیا جو جارج اپنے شکار کو پھانستے وقت کہا کرتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اب بھی اس کے کان میں کہہ رہا ہو..."اب بھاگ کے دکھاؤ...!"

کہانی کار

مختار آزاد

صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے موتی بکھیرنا کار دارد ہے.... خونِ جگر کی آمیزش کے بغیر کوئی بھی شاہکار تخلیق نہیں پاتا.... مناسب الفاظ کی جادوگری.... منظر نگاری اور زبردست مکالمہ نویسی ایک لازوال کہانی کی بنت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں.... کہانیوں کے شوقین افراد کے لیے بطورِ خاص انتخاب۔

ایک کہانی کار کا قصہ جو ہر صورت کامیابی کی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا

میں اس دن مضامین کی تخلیق پر ایک ورکشاپ میں لیکچر دے رہا تھا۔ جس تعلیمی ادارے نے یونیورسٹی کے اشتراک سے اس تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا، میں کئی سالوں سے ان کے ساتھ منسلک تھا۔ یہ کام میرے لیے پسندیدہ تھا اور مجھے اس میں مزہ آتا تھا۔ اکثر طالب علم مجھے پریشان کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن تجربے نے مجھے سکھا دیا کہ شرارتی طالب علموں کو کس طرح قابو میں کیا جاسکتا ہے۔

پہلے پہل جب میں نے بطور لیکچرر کام کرنا شروع کیا تو اس طرح کی باتوں سے بہت ڈسٹرب ہوجاتا تھا۔ میری توجہ موضوع سے ہٹ جاتی اور بات کسی دوسری سمت چلی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ میں نے یہ بات جان لی کہ آپ کو ہر جگہ ایسے شاگرد ملیں گے جو کلاس میں ٹیچر کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لہٰذا میں نے ان کی باتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس میں زیادہ دخل میری خود اعتمادی کا تھا۔ پہلے میں زیادہ خود اعتماد نہیں تھا۔ ہاں... جب سے میں نے بطور انسٹرکٹر کام کرنا شروع کیا، غیر محسوس انداز میں یہ میری شخصیت میں شامل ہوتی چلی گئی۔ اب بھری کلاس میں میری بات کے جواب میں کوئی کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے... مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی۔ میں تمام غیر متعلق باتوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنے موضوع پر توجہ مرکوز رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ سے نہ صرف آج میں ایک کامیاب انسٹرکٹر ہوں بلکہ اب تو نوبت یہ ہے کہ میرا ادارہ چاہتا ہی نہیں کہ میں انہیں چھوڑ کر کسی اور ادارے میں جاؤں۔ مجھے نہایت بہترین تنخواہ، مراعات اور گاڑی جیسی سہولتیں حاصل ہیں جو کہ کسی پروفیسر کو بھی کوئی یونیورسٹی فراہم نہیں کرتی ہے۔

اُس دن میں جس کلاس کو لکھنے کا فن سکھانے کی کوشش کر رہا تھا، اس ورکشاپ میں اُن کا یہ دوسرا سیشن تھا۔ پچھلے سیشن میں، میں نے انہیں بتایا کہ تخلیقی تحریر کیا ہوتی ہے۔ اُس دن میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ اگلے سیشن میں وہ اُن موضوعات کا انتخاب کر کے آئیں جن پر انہیں اپنا ایک، ایک مضمون لکھنا ہے۔ اسی مضمون کے جائزے سے پتا چلے گا کہ ورکشاپ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی ہے۔

جب تمام طالب علموں نے موضوعات کا انتخاب کر لیا تو میں نے انہیں اپنے منتخب کردہ موضوع پر لکھنے کے لیے ایک مختصر سا خاکہ بنانے کو کہا۔ اس کام کے لیے انہیں ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ جب سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے تو میں نے اپنی کرسی سنبھالی اور وقت گزاری کے لیے بیٹھ گیا۔ مجھے ایک گھنٹا اسی طرح خاموش بیٹھ کر گزارنا تھا۔ اب اندازہ کریں کہ ایک ٹیچر کے لیے ایک گھنٹا مکمل طور پر خاموش بیٹھ کر دوسروں کو تکتے ہوئے گزارنا کتنا کٹھن لگتا ہوگا...

میں نے ستانے کے لیے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موند کر چند گہری گہری سانسیں لیں۔ اس طرح مجھے اپنی دماغی قوت کو بحال کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر گھڑی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ابھی صرف پانچ منٹ ہی گزرے ہیں۔ میں نے دوبارہ سر کرسی کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موند کر دماغ کو کھلا چھوڑ دیا مگر جناب دماغ کو جب کھلا چھوڑ دو تو یہ ایسی ایسی قلابازیاں لگاتا ہے، ایسے ایسے قصوں میں جا پڑتا ہے اور ماضی کے ایسے ایسے بند دروازے کھول کر یادوں کو باہر کا راستہ دکھاتا ہے، جنہیں انسان بھولنا چاہتا ہے مگر یہ کمبخت بے لگام دماغ اسے باہر نکال لاتا ہے۔ یہ اسی بے لگام دماغ کی کارستانی تھی کہ بیٹھے بٹھائے مجھے اپنا بیتا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں یونیورسٹی میں ادب کا طالب علم تھا۔ لکھنا میرا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ میرا مقصد تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ایک کہانی کار اور مصنف کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کروں۔ جب تخلیقی تحریر کے موضوع پر ایک ورکشاپ منعقد ہونے لگی تو یونیورسٹی نے مجھے منتخب کر کے اس ورکشاپ میں بھیج دیا۔ یہ اس قسم کی پہلی ورکشاپ تھی، جس میں، میں شرکت کر رہا تھا۔

ورکشاپ کے پہلے ہی دن ہمارے انسٹرکٹر نے کہا۔ ”کیا آپ لوگ تجسس آمیز تحریر لکھنا چاہیں گے؟“ سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اگر میں آج یہ کہوں کہ اس ورکشاپ کی اُس پہلی کلاس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر دیا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ اس ورکشاپ نے مجھ پر نئے نئے انکشافات وا کیے تھے۔

ایک ٹیچر اپنے طالب علموں پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے، یہ باتیں مجھے اُس ورکشاپ کے دوران میں پتا چلیں۔ لیکچر کے لیے اپنے موضوع کا انتخاب، موضوع کے بارے میں تمام تر معلومات اور کہے گئے ہر جملے میں یہ پوشیدہ تجسس، جس سے طالب علموں کو اگلے جملے کا انتظار شدت سے ہو۔ لیکچر دیتے ہوئے جسمانی حرکات و سکنات، لہجے کا اُتار چڑھاؤ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سامنے بیٹھے لوگوں کو نظر انداز کر کے یہ محسوس کرنا کہ آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے سب لوگ اُس بات سے قطعی لاعلم ہیں، جو آپ انہیں بتانے جا رہے ہیں۔ یہ سب وہ گُر ہیں جو ٹیچر کو ہر دلعزیز بناتے ہیں اور اسی فن کی بدولت وہ اپنے طالب علموں کو کس طرح اپنی گرفت میں جکڑ لیتے ہیں کہ کوئی بھی شاگرد اس کلاس کو مس نہیں کرنا چاہتا ہے۔

ابتدا میں، میں نے نہایت گھٹیا رومانوی ناول لکھے جن کے چھپنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ میرے رومانوی ناولوں کے کردار آج کی منی اسکرٹ، تنگ اور چھوٹی ٹی شرٹ پہنے والی کالج کی لڑکیوں، میلی کچیلی جینز میں ملبوس، سر کے بال بکھرائے، داڑھی بڑھائے نوجوانوں کے بجائے قدیم یورپی طرز کے لڑکے لڑکیاں ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ شاید

رہی ہو کہ جب میں زمانۂ طالب علمی اور اس کے کافی عرصے بعد تک جو کچھ لکھتا تھا، اس کا منظر نامہ کم از کم سو برس پرانا یورپ ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ میری قدامت پسندی ہی رہی ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو ماضی میں جیتے ہیں۔ میرے ناولز کی ناقابل اشاعت ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں مرکزی خیال کے بجائے منظر نگاری اور جملوں پر اتنی زیادہ توجہ دیتا تھا کہ کہانی غائب ہو جاتی تھی۔

میرا گھر یونیورسٹی کیمپس میں واقع ہے۔ گھر کی کھلی کھڑکی سے کیمپس کی مرکزی سڑک صاف نظر آتی ہے۔ میں جب بھی، خاص کر گرمیوں کے دنوں میں کالج میں لڑکیوں کو منی اسکرٹ اور تنگ ٹی شرٹ میں ملبوس اپنے ساتھی لڑکوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے اندر کا بوڑھا باہر نکل آتا ہے۔ میں آج کے تمام تر سماجی تقاضوں کو بھول کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ انہیں یہ وقت اپنے نصاب کے مطالعے میں گزارنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی نسل کو میری یہ بات پسند نہیں آئے گی حالانکہ گئے وقتوں میں یورپ کے تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کے لیے ایسے لباس پہننا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ماضی پرستی کا یہ اثر پہلے تو میرے ذہن پر اتنا شدید تھا کہ ہر تحریر اسی ناصحانہ انداز میں لکھی ہوئی ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے ناول ہمیشہ مسودے کی شکل میں رہے۔ ویسے سچ کہوں تو یہ راز بھی مجھے بہت مدت بعد جا کر سمجھ میں آیا تھا کہ ماضی پرستی حال کو تاریک بنا دیتی ہے۔ اندر سے تو میں اب بھی ماضی پرست ہوں لیکن جس دن سے میں نے اپنی تحریر کو ماضی پرستی کے غلاف سے باہر نکالا اور یہ سوچ کر لکھنا اور بولنا شروع کیا کہ میرے قارئین، بالخصوص نوجوان نسل کیا پڑھنا چاہتی ہے، کیا سننا چاہتی ہے... بس اُس دن سے میری کامیابیوں کا نہ رکنے والا سفر شروع ہو گیا جو تاحال جاری ہے۔

اُف... دیکھ لیا نا... ذہن کو ذرا سی آزادی ملی تو وہ کہاں کہاں بھٹکنے لگا۔ خیر... تو میں بتا رہا تھا کہ جس دن ہمارے انسٹرکٹر نے ورکشاپ میں تجسس اور پُراسراریت کے موضوع پر کہانی لکھنے کی ہدایت کی تو پہلے پوری کلاس گم صم ہوئی اور اس کے بعد چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ سب اپنے برابر بیٹھے ساتھیوں سے تبادلۂ خیال کرنے لگے مگر ہلکی آواز میں لیکن یہ ہلکی آواز بھی کمرے میں اچھے خاصے شور کا تاثر پیش کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے شہد کی سیکڑوں مکھیوں نے ایک ساتھ بھنبھنانا شروع کر دیا ہو۔

اسکول کالج کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ جب رومانوی، جاسوسی، اور سسپنس سے بھرپور، ناول لڑکے لڑکیوں میں بڑے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اب تو طالب علموں کی دلچسپیوں کی کئی چیزیں آ گئی ہیں لیکن ہمارے وقتوں میں سنیما اور ریڈیو کے سوا کوئی اور بڑی تفریح نہیں تھی اس لیے یہ ناول وقت گزاری کا بہترین ذریعہ تھے۔

جب انسٹرکٹر نے ہمیں تجسس سے بھرپور تحریر لکھنے کا کہا تو سب آپس میں اپنے اپنے پڑھے گئے ناولز کو ذہن میں دوڑا کر موضوع تلاش کرنے لگے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے اپنے ممکنہ موضوع کے بارے میں رائے لے رہا تھا یا پھر اپنی رائے دینے میں مصروف تھا۔ رہے انسٹرکٹر، تو وہ بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے سب کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں بھی سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کہانی لکھنے کے لیے نہایت گھٹیا ترین پلاٹ بنے جا رہے تھے۔ یہ ورکشاپ خالصتاً تخلیقی تحریر کے حوالے سے تھی لیکن سچ پوچھو تو مجھے اپنے ساتھیوں کی باتیں سن کر رنگ رہا تھا کہ کسی نے بھی نئے خیال کو سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ہر شخص پہلے سے لکھی گئی کسی تحریر کی بنیاد پر، اپنی تحریر کی عمارت کھڑی کر کے اسے نیا بنانے پر مُصر نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے یہ عظیم الشان خیالات نہایت بچکانہ نظر آ رہے تھے۔ کسی کو اعتراض تھا کہ رومانوی موضوع کیوں نہیں دیا گیا۔ وہ اس پر سب سے اچھی کہانی لکھ سکتا ہے۔ رومانوی موضوع کے حق میں دلیل دینے والے میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ رومانی ماحول کی عکاسی، پُراسرار ماحول کے مقابلے میں زیادہ اچھی کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کئی کے رومانوی معیار سے میں بخوبی واقف تھا۔ ان کا رومانوی ذوق ادب لڑکی کی جسمانی ساخت سے شروع ہو کر اس کے اعضا کے فطری حالت میں جائزے اور تنقید پر ختم ہوتا تھا۔ وہ رومانوی ادب کے جس حد تک دلدادہ تھے، وہ انتہائی تھا۔ میں اُن سب میں خود کو نہایت مدبر اور صاحب الرائے سمجھ رہا تھا اس لیے ان کے ساتھ بحث میں شریک ہونے کے بجائے صرف سننے پر اکتفا کیے بیٹھا تھا۔ میرے لب خاموش تھے لیکن دل ہی دل میں اُن پر ہنس رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کس موضوع کا انتخاب کروں جس پر تجسس سے بھرپور ایسی کہانی لکھی جائے جو بالکل نئی ہو اور اسے پڑھنے والے پڑھ کر اور سننے والے سُن کر واہ واہ کر اٹھیں۔

اگرچہ یہ بات تو مجھے اُس وقت بھی معلوم تھی کہ کہانی میں منظر نگاری، کردار نگاری اور جملوں کی ساخت سے اسے ایک نیا انداز بخشا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھار تجسس اور تحیر

سے بھرپور کہانی بننے کے لیے اس میں تھوڑا بہت ایکشن بھی ضرورت کے مطابق کہانی میں ڈالا جاسکتا ہے۔ میں پلاٹ کی اہمیت سے بھی تھوڑا بہت آگاہ تھا لیکن اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر پلاٹ ہی کمزور ہو تو مضبوط کہانی لکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ منظر نگاری، ایکشن اور مکالمے وغیرہ کہانی کو دلچسپ ضرور بناسکتے ہیں مگر اسے انوکھے پن سے ہمکنار کرنے کے لیے مضبوط پلاٹ ہی لازم ہے۔

اس وقت... جب ورکشاپ میں ہر کوئی مانگے تانگے کے پلاٹ سنائے جارہا تھا، میں اپنی کہانی کے لیے انوکھا پلاٹ سوچنے میں مصروف تھا۔ پلاٹ کی اہمیت مجھے انسٹرکٹر کے لیکچر سے ہی معلوم ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر بڑبولے ساتھیوں کی طرح فوراً بک بک کرنے کے بجائے میں سوچ میں غرق ہوگیا۔ تاکہ ایک شاندار پلاٹ تخلیق کرکے عمدہ کہانی لکھ سکوں۔

انسٹرکٹر نے ہمیں کہانی لکھنے کے لیے ایک ہفتے کا وقت دیا تھا۔ دو روزہ ورکشاپ کا پہلا دن ختم ہوا۔ دوسری اور آخری کلاس اگلے ہفتے ہونا تھی، جس میں ہمیں اپنی لکھی ہوئی کہانیاں جمع کروانا تھیں۔ جس کے جائزے کے بعد ہی ہمیں اسناد ملنی تھیں۔ اس ورکشاپ میں پاس فیل کی بنیاد پر اسناد دینی تھیں۔ ہاں یہ بات بھی کی گئی تھی کہ کہانیوں کی بنیاد پر ہی یہ فیصلہ ہوگا کہ کس طالب علم نے کون سا گریڈ حاصل کیا ہے اس لیے میں نے فوراً دماغ کھپانے کے بجائے اپنی کہانی کے پلاٹ پر غور شروع کردیا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی اس کے پلاٹ کو بغور سنے اور اس کی تعریف کرے جبکہ وہ خود ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ دیکھ دیکھ کر مزے لے رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے دماغ کے گھوڑے کو بھی پلاٹ کی تلاش میں متواتر دوڑائے جارہا تھا۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی گیا، کلاسز اٹینڈ کیں۔ کل صبح ورکشاپ والی کلاس سے لے کر اس وقت تک چوبیس گھنٹے بیت چکے تھے لیکن اب تک مجھے ایسا پلاٹ نہیں سوجھ رہا تھا جس پر اپنی کہانی لکھ سکوں۔ اس صبح بھی اسی ادھیڑ بن میں یونیورسٹی پہنچا لیکن سچ پوچھیں تو کلاس میں دیے گئے لیکچر سے کچھ بھی سمجھ میں آیا ہو۔ میرا دماغ تو اپنی کہانی کے پلاٹ کو سوچنے میں مصروف تھا۔ بس جسم کلاس میں تھا، وہ بھی اس لیے کہ کہیں غیر حاضری نہ لگ جائے۔

دوپہر تک تو میرا دماغ بدستور مصروف رہا لیکن دوپہر ڈھلتے ڈھلتے ایک آئیڈیا میرے ذہن میں آگیا۔ اس وقت میں گھر پہنچ چکا تھا۔ انسٹرکٹر کی طرف سے ہمیں بتایا گیا تھا کہ کل

تین انعام یافتہ کہانیوں کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ اور وہ بھی ادب کا... اس کے لیے اس سے بڑی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس کی کہانی کتاب میں شامل ہو اور اس کے سرورق پر اس کا نام لکھا ہو۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور کل والے لیکچر کو اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔

انسٹرکٹر پچاس کی دہائی کو عبور کرلینے والی ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھیں اور ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ ان کا لہجہ اور شخصیت، دونوں نہایت مدبرانہ تاثر قائم کرتے تھے مگر ان کی عادتیں ان دونوں باتوں کی ضد تھیں۔ وہ لیکچر کے دوران میں متعدد بار کسی دوسرے کی پروا کیے بغیر سگریٹ پھونکتیں اور اپنے منہ اور ناک سے دھوئیں کے مرغولے ساتھیوں کے چہرے پر چھوڑتی رہتیں۔ کلاس روم میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی لیکن محسوس ہورہا تھا کہ منتظمین میں سے کسی کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ محترمہ کو اس عادت بد سے روک سکے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ انسٹرکٹر کی حیثیت کا ان سب پر کتنا زیادہ اثر تھا۔

کچھ دیر کے وقفے کے بعد جب دوپہر کے دو بجے ورکشاپ کا دوبارہ آغاز ہوا تو مختصر سی تقریر کے بعد محترمہ نے اجازت دی کہ کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو پوچھ لیں۔ اگلے دو گھنٹے صرف سوال جواب کے لیے مخصوص تھے جس کے بعد ورکشاپ کا دن اختتام پذیر ہوجاتا۔

انسٹرکٹر نے جیسے ہی سوالوں کی اجازت دی، پوری کلاس میں ایک ساتھ کئی ہاتھ کھڑے ہوگئے۔ لگتا تھا ہر شخص اپنے ذہن میں سوال لیے بیٹھا ہے۔ اگر اس کو فوراً جواب نہ ملا تو پھر یہ دنیا اپنے محور سے پلٹ جائے گی۔ میں سب کے سوالوں کو بڑے شوق اور توجہ سے سن رہا تھا۔ آج جب میں سوچتا ہوں تو بہت حیرت ہوتی ہے کہ کس کس طرح کے بے فائدہ سوال تھے وہ۔ میرے اس کلاس فیلو کو تشویش تھی کہ جب وہ ناول لکھے گا اور وہ شائع بھی ہوجائے گا تو اس کے بعد وہ کس طرح اس ناول کو ادب کے نوبل انعام کے لیے امیدواروں کی فہرست میں بھجواسکتا ہے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ جب بھی وہ ناول لکھے تو اس پر نوبل انعام ضرور ملے۔ ایک لڑکی کا مسئلہ یہ تھا کہ کہانی میں حسین دوشیزہ کا حلیہ بیان کرنے کے لیے کتنے الفاظ ہونے چاہئیں۔ ایک ساتھی کو پریشانی تھی کہ خوفناک ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے وہ بیمار لڑکی کے لباس کی تشریح کیسے کرے، جب کہ ماحول پر گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

انسٹرکٹر نے ان تمام طالبانہ سوالات کو نہایت توجہ سے سنا۔ اس پر حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے سوال کی بھی تشریح کی اور جوابات بھی غیر ضروری تفصیل میں جاکر دیے۔ آج مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیسی بے وقوف تھیں وہ انسٹرکٹر... مگر یہ سوچ کر خوش ہوجاتا ہوں کہ عقلمند وہی تھیں ورنہ کہیں سڑک پر خوار ہورہی ہوتیں اور کسی فیکٹری میں صبح کے سات سے شام پانچ بجے تک مشینوں میں سر کھپا رہی ہوتیں۔ عقلمند تھیں، جبھی تو عالم فاضل بن گئیں اور دنیا میں دوسرے عالم اور فاضل کو تیار کرنے لگیں۔ سچ پوچھو تو میں زندگی میں جن دو تین لوگوں کا پرستار رہا ہوں، ان میں سے ایک وہی مسز جان بھی تھیں۔

ہاں تو جب میں نے دیکھا کہ ہر شخص انسٹرکٹر مسز جان سے سوال پر سوال کیے چلے جارہا ہے تو مجھے بھی شوق ہوا کہ کچھ میں بھی تو پوچھوں۔ یہ خیال ذہن میں آنا تھا کہ سوال کھٹ سے دماغ میں اترا اور زبان پر چلا آیا۔ بس... پھر کیا تھا۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑا کیا۔

"میرا ناول کس طرح شائع ہوسکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ یہ سن کر جب مسز جان نے سگریٹ کا کش لیا اور گہری نظروں سے مجھے گھورا تو میں نے پھر وہی سوال کچھ اور انداز سے دہرادیا۔ "اصل میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ ناول لکھنے کے بعد اس کی اشاعت کس طرح ممکن ہوتی ہے؟"

"اچھا سوال ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک اور کش لیا اور ناک و منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد ایک اور کش... اور کہنے لگیں۔ "بہت آسان سی بات ہے۔"

"مگر کیسے؟" میں نے ان کی آسان سی بات کا جواب سن کر ایسے کہا جیسے سوال کی تشنگی اس جواب سے بجھ نہیں پائی ہو۔

"سب سے پہلے تو کتاب لکھ لیں۔" انہوں نے جواب دینا شروع کیا۔ مجھے لگا کہ اب تفصیل سے جواب ملے گا اس لیے پوری توجہ سے نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "کتاب لکھنے کے بعد پبلشر سے رابطے کریں۔ یہ رابطے ایک وقت میں صرف ایک پبلشر سے نہیں بلکہ بیک وقت کئی پبلشرز سے کیے جائیں اور اس سلسلے میں سب سے اہم بات ہے آپ کے رابطوں کا نیٹ ورک..." اگرچہ ان کا جواب اب تک روایتی تھا مگر پھر بھی میں پورے دھیان سے سننے کی کوشش کررہا تھا۔

"اگر پبلشنگ کے شعبے میں آپ کے کسی دوست یا رشتے دار، کسی پبلشر سے تعلقات ہیں تو انہیں استعمال میں لائیے یا پھر کسی ایجنٹ سے رابطہ کیجیے جو آپ کی کتاب کی اشاعت سے ملنے والی رائلٹی کا ایک بڑا حصہ بطور فیس خود لے گا مگر آپ کی کتاب ضرور شائع ہوجائے گی، وغیرہ وغیرہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے سگریٹ کی ڈبیا کھولی اور دوسرا سگریٹ نکال کر سلگانے لگیں۔ وہ اپنے شغل میں مصروف ہوگئیں اور میں بدستور توجہ کو مرکوز کیے بیٹھا رہا کہ شاید کوئی اور کام کی بات معلوم ہوجائے۔ اس دوران میں پوری کلاس خاموش تھی۔ شاید وہ میرے سوال کو اپنا سوال سمجھ کر اس کے جواب سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں تھے۔ اسی لیے تو مسز جان کے سگریٹ سلگانے کے دوران میں کسی نے بھی کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"ہاں تو تمہاری تسلی ہوگئی؟" تازہ سگریٹ کے پے در پے کئی کش لینے کے بعد وہ پھر کلاس کی طرف متوجہ ہوئیں اور میری طرف گھورتے ہوئے بولیں۔

"نہیں... بالکل نہیں۔" میں نے سر کو دائیں سے بائیں جنبش دیتے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"اچھا... تم سنجیدہ لگتے ہو۔" انہوں نے بھویں چڑھاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو پھر سنو۔" اس بار ان کا لہجہ گمبھیر اور چہرے پر گہری سنجیدگی آگئی۔ "تم بہت اچھا لکھتے ہو۔ اتنا اچھا کہ تمہاری تحریر دنیا کے کسی بھی ملک میں چھپے، وہ کتاب بیسٹ سیلر بن سکتی ہے مگر ایک بات یاد رکھو... اچھی کتاب صرف لکھی ہی نہیں جاتی بلکہ ایڈٹ ہونے کے بعد اچھی کتاب بنتی ہے۔"

اب مسز جان اصل جواب کی طرف آئی تھیں۔ اس ایک بات نے میری پوری توجہ سنجیدگی سے ان کے چہرے کی جانب مرکوز کردی تھی۔ یہ تو میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کلاس میں موجود میرے دیگر ساتھی ان کی بات کو کتنی سنجیدگی سے سن رہے تھے لیکن میں بتاسکتا ہوں کہ میرے لیے یہ کامیاب مصنف بننے کا گر تھا، جسے وہ بیان کررہی تھیں۔

"میرا مشورہ ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد ایک اچھا ایڈیٹر تلاش کرو۔ اگر ایسا کرلیا تو تمہاری کمزور کتاب بھی بیسٹ سیلر بن سکتی ہے لیکن اچھا ایڈیٹر نہ ملے تو پھر کتاب لکھنے کو بھول جاؤ۔ کمزور ایڈیٹر تمہاری بیسٹ سیلر کتاب کو بھی اس قابل بنادے گا کہ اسے صرف ردی کی ٹوکری میں ہی جگہ ملے گی۔" مسز جان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ایک اچھا ایڈیٹر کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے؟" میں نے قطع کلامی کی۔

"اپنے ارد گرد نظریں دوڑاؤ۔ تمہیں اچھا ایڈیٹر مل جائے گا۔" انہوں نے پھر کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے جواب کو مکمل کرنے لگیں۔ "ایڈیٹر کو اپنے مسودے کی کاپی دو۔ اس سے رائے لو اور پھر ایڈٹ کرنے کی درخواست کرو... نہایت سادہ سی بات ہے۔" اس نے جتنی سنجیدگی سے جواب دیا تھا، مجھے وہ سن کر لگا کہ انہوں نے میرے سوال کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اب وہ اس بات میں بھی دلچسپی لے رہی ہیں کہ ہر ممکن طور پر اس حوالے سے میرے ذہن میں موجود تمام سوالات کی تشفی کر سکیں۔

میں ان کا جواب نہایت سنجیدگی سے سن رہا تھا لیکن جب انہوں نے بات مکمل کی تو کلاس میں قہقہے گونج اٹھے۔ مجھے لگا کہ انہوں نے اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا ہے۔

"اچھا ایڈیٹر گو کہ عام طور پر خود کتابیں نہیں لکھتا لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے ایک اچھی کتاب کی شکل ضرور دیتا ہے۔ اس لیے ایک اچھا ایڈیٹر مل جانے کا مطلب ہے کہ ایک شاندار اور کامیاب کتاب کی اشاعت..." مسز جان نے ابھی بات ختم ہی نہیں کی تھی کہ کلاس میں ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتھایا، گلاسس صاف کیے اور پھر پوری کلاس پر طائرانہ نظر ڈالی۔

"بات ہنسی کی ہوتی تو میں بھی تمہارے ساتھ ہنستی... لیکن میں نہیں ہنسی۔ مجھے لگا ہے کہ تم اپنے مستقبل پر ہنسے ہو یا مستقبل میں پیش آنے والی ناکامیوں پر..." انہوں نے سنجیدگی سے اپنی بات کہی اور چند لمحوں تک خاموش رہیں۔

"میرا خیال ہے کہ جو لوگ میری بات سن کر ہنسے ہیں، انہوں نے شاید اپنے مستقبل میں پیش آنے والی ناکامیوں کا اندازہ کرلیا ہے۔ یہ ہنسی کامیاب لوگوں کی ہنسی نہیں تھی۔" مسز جان کے لہجے میں بلا کا طنز چھپا ہوا تھا۔ اس طنز کے تیر کی چبھن وہاں موجود سب لوگوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ "کامیاب لوگ گدھوں کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرکے چلانے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔" انہوں نے بات ختم کی تو پوری کلاس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اگلے ہفتے دوبارہ ملیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب لوگ اپنی اپنی کہانیاں لکھ کر جمع کروادیں گے۔ بس... اب اس بات کے ساتھ ہی ورکشاپ کے آج کے سیشن کا وقت ختم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

مسز جان کے جانے کے بعد سب خاموش تھے۔ شاید انہیں اپنی بے عزتی پر ندامت محسوس ہو رہی تھی یا پھر بے عزتی کرنے والی پر غصہ آرہا تھا لیکن میں ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

پورا ہفتہ کہانی لکھنے اور مسترد کرنے میں گزرا۔ میں نے ایک پُراسرار کردار کے حامل ماہر آثارِ قدیمہ کو اپنا موضوع بنایا اور اس کی شخصیت کے اَسرار کا راز کھولنے میں اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں صرف کردیں۔ میں بھی اُس ماں کی طرح خوش فہمی میں مبتلا تھا جو بچوں کی خوبصورتی کے مقابلے میں اپنے کالے کلوٹے اور بھدے نقوش والے بچے کو اٹھا لائی ہو، وہ بھی اس امید پر کہ اس کا بچہ خوبصورتی کے مقابلے میں پہلا انعام پائے گا۔

ورکشاپ کا دوسرا اور اختتامی مرحلہ شروع ہوا۔ میں نے بھی دوسرے شرکا کی طرح اپنی کہانی جمع کروائی۔ کہانیوں کا نتیجہ لنچ کے بعد نکلنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری کہانی شروع کی تین کہانیوں میں شامل ہوگی۔ اس لیے میں لنچ کے وقفے تک تو بہت خوش و خرم رہا لیکن لنچ کے بعد جب نتیجہ نکلنا شروع ہوا تو میرا دل اتنا تیز دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔

عموماً کامیاب کہانیوں کا اعلان سب سے آخر میں کیا جاتا ہے البتہ جن کی کہانیاں نامناسب یا وہ مسترد کردی گئی ہوں، پہلے ان کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ایک ایک کرکے بہت سارے شریک طالب علموں نے مزہ چکھ لیا۔ میں مطمئن تھا کہ میرا نام تین کامیاب کہانیوں کے تخلیق کار کی فہرست میں ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میں مسکرانے لگا۔ ابھی میرے ہونٹ کھل کر مسکرا بھی نہ پائے تھے کہ اچانک میرا نام پکارا گیا۔ پہلی بار تو میں سمجھا کہ شاید پکارنے والے سے کوئی غلطی ہوگئی ہے مگر دوسری بار بھی جب میرا نام پکارا گیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن ایسا لگا کہ جیسے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہوں۔ بڑی مشکل سے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے ججز کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرا نام ناکام مصنفین کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ تو میرے دل کی آواز تھی جبکہ دماغ کہہ رہا تھا کہ حوصلہ رکھو۔ ہوسکتا ہے کہ کامیابی مل جائے مگر صاحب کیا کیجیے... کہتے ہیں کہ دماغ ہمیشہ درست تصویر دکھاتا ہے اور دل کا مشورہ خواری کا باعث بنتا ہے مگر اُس دن دل نے دماغ کو پچھاڑ دیا تھا۔ میں ناکام ہی نہیں، بری طرح ناکام قرار پایا تھا۔

ججز کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کے مانند میرے

کانوں میں اُتر رہے تھے۔ میری پشت پر وہ سارے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے، جن کے سامنے میں، میں پہلا انعام حاصل کرنے کی پیش گوئی کر چکا تھا۔ سامنے وہ ججز موجود تھے جو میرا نامۂ اعمال ہاتھوں میں لیے میرے ڈھول کا پول بڑی جانفشانی اور تندہی سے کھولے جارہے تھے۔

"مجموعی طور پر آپ کی کہانی نہایت فضول ہے۔ کہیں پر منظر نامہ مضبوط ہے تو جملے ڈھیلے ڈھالے اور غیر متاثر کن ہیں۔ کہیں پر جملے مضبوطی سے بنے گئے ہیں مگر اُس وقت منظر کشی کی ضرورت تھی جو کہ بالکل غائب ہے۔" مسز جان جو پچھلی ورکشاپ میں انسٹرکٹر تھیں آج تین ججز میں سے ایک تھیں اور کہانیوں کا پوسٹ مارٹم کررہی تھیں۔

"تمہیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ لکھنے سے پہلے کہانی لکھنے کے فن کو سمجھو۔" مسز جان نے اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں میری بُری طرح درگت بن جانے کے بعد اب حتمی فیصلہ سنانا شروع کیا۔

"تم لکھ سکتے ہو..." یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں اور پھر سگریٹ کا کش لینے کے بعد کہنے لگیں۔ "مگر بات یہ ہے کہ تمہیں کہانیاں لکھنا آتا نہیں، بس صرف شوق ہے۔ اب شوق کے سہارے تو مصنف نہیں بنا جاتا..."

میں سر جھکائے اُن سب کی تقریر سنتا رہا۔ کافی دیر کے بعد وہ لوگ شاید بولتے بولتے تھک گئے تھے، لہٰذا خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا اور اس کے بعد مجھے مسز جان کی آواز سنائی دی۔ "اب تم واپس اپنی سیٹ پر جاسکتے ہو۔"

"شکریہ۔" میں نے نہایت شرمندگی سے جواب دیا اور سر جھکائے اپنی سیٹ پر آگیا۔

بہر حال میں اُن بد نصیبوں میں شامل تھا جنہیں ورکشاپ میں شرکت کی سند تو ملی مگر بطور ناکام طالب علم کے۔ میرے لیے یہ سند بیکار تھی۔ یہ تو میری نااہلیت کا منہ بولتا تصدیق نامہ تھا۔ اس لیے جونہی ورکشاپ ختم ہوئی، میں نے باہر آکر اس کاغذ کے ٹکڑے پر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس کے اتنے ٹکڑے کیے، جتنے کہ میں کرسکتا تھا۔ اس کے بعد وہ سند پُرزہ پُرزہ ہوکر کچرے دان کی آغوش میں سما گئی۔

☆☆☆

اُس ورکشاپ میں شرکت کیے کئی برس بیت گئے۔ وہ ورکشاپ ایک خاص عمر تک میری ناکام ادبی زندگی کی پہلی اور آخری ورکشاپ ثابت ہوئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس دن جو کچھ ججز نے مجھ سے کہا تھا، اُسے اپنے ذہن سے نکال دوں لیکن ایسا نہ کرسکا۔ وہ لمحات تلخ یادوں کی صورت

قابلِ دید

ٹیچر نے کلاس روم میں دیکھا کہ پچھلی بنچ پر بیٹھا ہوا ایک لڑکا کبھی منہ چلا رہا ہے اور کبھی عجیب عجیب شکلیں بنا رہا ہے۔

"فاخر...!" ٹیچر نے اسے پکارا۔ "یہاں سامنے آؤ... اور جو کچھ تمہارے منہ میں ہے... مجھے دے دو۔"

"کاش میں ایسا کرسکتا ٹیچر..." فاخر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرے منہ میں تو چھالے ہیں۔"

پیش بندی

"تم ایک نہایت حسین لڑکی ہو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم دل میں ایسا نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی کہہ رہے ہو۔"

"میں اصل میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر میں ایسا نہیں کہوں گا تب بھی تم دل میں ایسا ہی سمجھتی رہوگی۔"

شناسائی

ایک صاحب خاتون کا پیچھا کر رہے تھے۔ خاتون تیز تیز چلتی ہوئی گھر پہنچیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح گھر میں بھی داخل ہوگئے۔ خاتون کچھ خوف اور کچھ غصے سے بولیں۔ "میرے شوہر کاروباری دورے پر لاہور گئے ہوئے تھے... اب پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی شوٹ کردیں گے۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ خاتون جلدی سے بولیں۔ "میرے شوہر آگئے۔"

"میں کہاں چھپوں؟" اجنبی نے گھبرا کر پوچھا۔

"الماری میں۔" خاتون نے گویا ترس کھا کر کہا۔ اجنبی الماری میں گھس گیا۔ بیوی نے گرم جوشی سے شوہر کا استقبال کیا۔ چند لمحے بعد شوہر نے کوٹ لٹکانے کے لیے الماری کا دروازہ کھولا تو اجنبی کو کھڑے پایا۔

"کمینے، مردود، کون ہو تم؟" شوہر غصے سے بولا پھر اس کے لہجے سے کچھ پریشانی جھلک آئی۔

"ایسا لگتا ہے میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"ہاں لاہور میں میرے گھر دیکھا تھا۔" اجنبی نے جواب دیا۔

"اس وقت آپ الماری میں تھے۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی سوغاتیں

digestpk.blogspot.com

میں میرے ذہن سے ایسے چپکے بیٹھے تھے کہ لاکھ کھرچ لوں مگر بات وہیں رہتی ہے۔ وہ لمحہ میری زندگی کا ایک منجمد لمحہ بن چکا تھا آج خوشحالی کے دنوں میں، جہاں میں ہزاروں تکلیف دہ یادوں کو بھلا چکا ہوں، وہاں یہ ایک یاد کسی بھی طرح ذہن سے محو ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے۔

خیر... قصہ یہ ہے کہ اتنے نمبر حاصل کر کے جن کی بدولت میں صرف پاس ہو سکتا تھا، یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا۔ میرے پاس کوئی اور پروفیشنل یا اعلیٰ کارکردگی کی حامل سند تو تھی نہیں اور نہ ہی میرا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا اس لیے مجھے از خود کسی اچھی نوکری کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس پر بُرا یہ ہوا کہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد کوئی کمتر درجے کی بھی ملازمت نہیں مل سکی اور جو ملازمت مل جاتی تھی، اس پر مجھے ایک یا دو ہی ہفتے گزرتے تھے کہ مالکان 'مایوسانہ کارکردگی' کا خط میرے ہاتھ میں تھما کر چلتا کر دیتے۔

اس دوران میں میں نے ہر جگہ طبع آزمائی کی۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، اشتہاری کمپنیاں... کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ جہاں مجھے قسمت نہ لے گئی ہو مگر یہ اور بات کہ قسمت مجھے ہر اُس جگہ لے جاتی تھی جہاں ذلت میرے استقبال کے لیے پہلے سے شکست کا ہار تھامے کھڑی ہوتی تھی۔

ناکامیوں پر مشتمل اس جہدِ مسلسل میں بھی، میں نے اپنے قلم کو رکنے نہیں دیا۔ مستقل طور پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ میں نے پھول بیچنے والوں، قحبہ خانے والی عورتوں، گھٹیا سے ہوٹل کے مکینوں کی بود و باش، یتیم بچوں، ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم، نوکری کی تلاش میں سرگرداں بیروزگاروں سمیت... الغرض ہر موضوع پر کہانیاں اور ناول لکھے مگر کسی ایک پبلشر یا رسالے نے میری کہانیاں، ناول وغیرہ چھاپنے کی حامی نہ بھری۔ انٹرنیٹ، ٹیلی فون، ای میل، خط، دوست احباب... ہر قسم کے رابطے استعمال کیے مگر یہ حسرت ہی رہی کہ میری کہانی یا کوئی ناول شائع ہو جائے۔

رسالے کا مدیر ہو یا ناشر، سب کے پاس سے صرف ایک ہی قسم کا جواب آتا تھا۔

مسٹر ڈگلس...

ہم آپ کے بہت مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا اور اپنا مسودہ برائے اشاعت ارسال کیا۔ ہم افسوس کے ساتھ اطلاع دیتے ہیں کہ اس مسودے میں اتنی کمزوریاں ہیں کہ کوئی اچھے سے اچھا ایڈیٹر بھی، نہایت عرق ریزی سے اس کی کاٹ چھانٹ کے بعد بھی اسے اشاعت کے قابل نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا ہماری معذرت قبول فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش

اب یہ کہنا فضول ہے کہ میرے اتنے ڈھیروں 'خیر اندیش' تھے کہ ان کا نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

جب اس طرح کے بہت سے خطوط ملنے لگے، تب بھی میں نے مایوس ہو کر لکھنا نہیں چھوڑا۔ گھر پہنچتے ہی میں کمپیوٹر کھولتا اور پھر ایک نئی کہانی لکھنے بیٹھ جاتا۔

کئی برس اسی خواری میں گزر گئے۔

ایک روز مجھے بڑی تگ و دو کے بعد، ایک معروف اشتہاری کمپنی میں کاپی رائٹر کی نوکری مل گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کچھ بھی ہو جائے، یہ ملازمت اب ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا مگر جناب قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔

مجھے پہلے ہی دن ایک اسائنمنٹ دے دیا گیا۔ ایک کمپنی کے لیے اشتہار بنانا تھا۔ ہر روز، دن میں کئی بار میں اپنے زرخیز دماغ کو استعمال کرتا اور اپنی دانست میں ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار تخلیق کرتا مگر کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں لکھی گئی جو کمپنی کے مالک یا کلائنٹ کو پسند آتی... پھر وہی ہوا جو پہلے بھی ہوتا آیا ہے۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا اور نوکری سے فراغت۔ بات یہیں تک رہتی تو مناسب ہوتا کہ میں اس رویے کا عادی بن چکا تھا لیکن فراغت کی دال پر جو تڑکا کمپنی کے مالک نے لگایا، وہ تابوت میں آخری کیل کی طرح میرے سینے میں کھب گیا۔

"میرا تمہارے لیے ہمدردانہ مشورہ ہے کہ یہ لکھنا وکھنا چھوڑو اور کہیں فٹ پاتھ پر برگر کا اسٹال لگالو۔ کم از کم بھوکے نہیں مرو گے۔ لکھنا... پڑھے لکھوں کا کام ہے تمہارے جیسے گدھے کے بس کی بات نہیں۔" کمپنی کے مالک نے میرے اٹھنے سے پہلے کیبن میں آ کر، سب کے سامنے اپنا مخلصانہ مشورہ دیا۔ میری وہی حالت تھی جو مسز جان کی ورکشاپ کے نتیجے والے دن ہوئی تھی۔ اس دن مجھے مسز جان بھی بہت یاد آئی تھیں کم از کم ایک انسٹرکٹر نے میری بے عزتی کی تھی، ایک سیٹھ نے تو نہیں۔ اس دن مجھے مسز جان اس شخص کے مقابلے میں خاصی معقول لگیں۔

بس... یہی وہ وقت تھا، جب میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ سارا دن گھوم پھر کر شہر کو اچھی طرح دیکھ لوں اور پھر سورج غروب ہونے کے بعد اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کا چراغ گل کر لوں گا...

میں نے بڑی مشکل سے اپنی بے بسی کے ان آنسوؤں کو ضبط کیا جو آنکھوں سے بہنے کے لیے بے قرار تھے۔ میں ٹوٹے دل اور بوجھل قدموں سے دفتر سے باہر نکل آیا۔

شام تک میں بے مقصد، خالی ذہن اور بوجھل دل کے ساتھ ادھر سے اُدھر بے مقصد گھومتا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، خودکشی کا خیال میرے دل میں مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔

شام پانچ بجے کا وقت ہوگا، جب میں اپنے گھر جانے کے لیے میٹرو... اسٹیشن پہنچا۔ ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ گیا۔ گاڑی آنے میں خاصی دیر تھی، میں بے مقصد گھومنے لگا۔ اچانک میری نظر پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر گئی۔ وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ اچانک یاد آیا "ارے یہ تو مسز جان ہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں فوراً واپس پلٹ آیا...

"ہیلو مسز جان..." میں نے اُن کے قریب پہنچ کر نہایت لگاوٹ سے کہا۔ اگرچہ میرے دل میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی مگر مجھے ان کے بڑھاپے پر ترس آ گیا۔ اس لیے میں نے خندہ پیشانی سے ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ہیلو..." انہوں نے میری طرف دیکھا اور دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان کا چہرہ بھی سوالیہ تاثرات لیے ہوئے تھا۔

اس کے بعد میں نے بڑی تفصیل سے اپنا تعارف اُن سے کروایا تو وہ شفقت سے پیش آئیں۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔

"کیا کام کر رہے ہو۔ کوئی کتاب شائع ہوئی تمہاری؟" انہوں نے نہایت ہمدردی سے دو بول ادا کیے تو میرا دل بھر آیا اور پھر پوری رام کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ وہ بڑے تحمل اور سنجیدگی سے میری داستان سن رہی تھیں۔

"آج تو حد ہی ہو گئی۔" میں نے صبح والی تازہ ترین

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
معظم علی 325/-
انسان اور دیوتا 280/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
گمشدہ قافلے 350/-
خاک اور خون 350/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 60/-
ثقافت کی تلاش 150/-
داستانِ مجاہد 200/-
کلیسا اور آگ 300/-
آخری چٹان 25/-
قیصر و کسریٰ 380/-
پردیسی درخت 325/-
قافلۂ حجاز 350/-
سو سال بعد 150/-
یوسف بن تاشفین 325/-
محمد بن قاسم 300/-
سفید جزیرہ 225/-
پورس کے ہاتھی 180/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 051-35539609 042-37220879
022-2780128 021-2765086 041-2627568

ذلت کا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ پریشانی کی حالت میں سنتی رہیں۔ مجھے برسوں پہلے اور آج والی مسز جان کے رویے میں بہت فرق نظر آیا۔ وہ مسز جان بدتمیز، مغرور اور دوسروں کی بے عزتی کرکے خوش ہونے والی خاتون لگتی تھیں لیکن یہ مسز جان میری داستان سُن کر ایک شفیق ماں کی طرح ہمدردی دکھا رہی تھیں۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے، اب کیا کرو گے؟" انہوں نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"خودکشی... وہ بھی آج شام۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"بُری بات... ایسا نہیں سوچتے۔" انہوں نے پچکارا تو میرا جی اور بھر آیا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔ میرے پاس ایڈیٹنگ کا بہت کام ہے۔ میں تمہیں جینا سکھاؤں گی۔" یہ سن کر میں کھل اٹھا۔ خودکشی کا پروگرام یکدم ختم اور نئی زندگی کے خوش کن خوابوں کا سلسلہ شروع...

اتفاق کی بات یہ ہے کہ مسز جان میرے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں۔ یہ بات مجھے اُس دن ہی پتا چلی، جب انہوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا سمجھایا اور کل صبح سے کام شروع کرنے کو کہا۔

دوسرے دن میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا، کام شروع ہو گیا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ میں مسودوں کی ایڈیٹنگ کرتا اور پھر مسز جان اس پر نظر ثانی کرتیں۔ اس کے عوض مجھے اچھی خاصی تنخواہ ملنے لگی۔ ایک بار میں ایک مسودہ ایڈیٹ کر چکا تھا، مسز جان نے اسے فائنل بھی کر لیا تھا مگر ایک افسوس ناک واقعہ رونما ہو گیا۔ جس مصنف نے وہ ناول لکھا تھا، وہ خاصا معروف تھا لیکن اچانک اس کی موت ہو گئی۔ مصنف نے یہ ناول انہیں ذاتی حیثیت میں ایڈیٹ کے لیے دیا تھا۔ مصنف کی موت مسز جان کے لیے افسوسناک تھی کیونکہ اس کی موت کے ساتھ ہی ان کے معاوضے کی رقم بھی ڈوب گئی تھی۔

ابھی اس واقعے کو چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن مسز جان گھر کے سامنے کی سڑک کو پار کرتے ہوئے تیز رفتار گاڑی کی زد میں آ گئیں اور اس جہاں سے چل بسیں۔ اس وقت تک مجھے مسز جان کے ساتھ کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ ان دو سالوں میں، میں کامیاب مصنف بننے اور خوشحال زندگی گزارنے کے کئی گُر ان سے سیکھ چکا تھا۔

مسز جان کی تجہیز و تکفین میں، میں نے بطور وارث کی حیثیت سے حصہ لیا۔ وہ اس لیے کہ ان کی کوئی اولاد یا رشتے دار نہیں تھا۔ ان کی موت کے کافی دن بعد میں نے تمام کاغذات کی تلاشی لی تو مجھے دو ایسے مسودے مکمل حالت میں مل گئے، جن کے مصنفین انتقال کر چکے تھے۔ یہ بات مسودے کے اوپر لگی چٹ پر لکھی ہوئی تھی۔ میں نے تینوں مسودے سنبھالے۔ معمولی نوعیت کی ردّو بدل کے بعد ان میں سے ایک ناول معروف پبلشر کو ارسال کر دیا۔ ایک ہفتے بعد ہی مجھے جواب مل گیا:

"آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مسودے کا ہر لحاظ سے تکنیکی جائزہ اور تجزیہ کر لینے کے بعد اسے قابلِ اشاعت قرار دیا گیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ جواب میں یہ بتائیے کہ آپ جلد از جلد کب تک نیویارک پہنچ سکتے ہیں، تاکہ رائلٹی کے لیے معاہدہ اور ایڈوانس رقم کی ادائیگی کے معاملات طے پا جائیں۔ آنے جانے کے اخراجات، ہوٹل میں رہائش اور طعام کی ذمے داری ادارے کے ذمے ہوں۔"

برسوں کی ناکامی کے بعد آخر کامیابی مل ہی گئی۔ اب یہ اور بات کہ گھی ٹیڑھی انگلی سے نکلا تھا۔ اس کامیابی کی مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن ضمیر پر بوجھ بھی تھا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا، وہ غلط تھا مگر حالات کی مجبوری ضمیر کی آواز پر غالب آ گئی۔

صرف ایک ماہ کے اندر اندر میرا ناول شائع ہوا اور دو ماہ میں ہی اس نے فروخت کے ریکارڈ توڑ دیے۔ بڑے بڑے امریکی اخبارات نے ہی نہیں، یورپ اور ایشیا کے کئی اخبارات نے میرے ناول پر تبصرے شائع کیے۔ بس پھر کیا تھا تین ماہ کے اندر دوسرا اور صرف چھ ماہ کے عرصے میں تیسرا ناول بھی شائع ہو گیا۔ مجھے پہلے ناول سے خاصی شہرت مل چکی تھی۔ اس لیے یہ دونوں ناول بھی بیسٹ سیلر قرار پائے۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات... ہر جگہ پر میرے ناولز کا چرچا تھا۔ میرا نام بن چکا تھا۔ لوگ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میرے ساتھ تصویریں کھنچواتے تھے۔ مجھ پر شہرت کا نشہ چڑھ چکا تھا۔

ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھا ایک مسودے پر کام کر رہا تھا کہ ایک معروف یونیورسٹی نے مجھ سے رابطہ کیا اور ادب کے نئے رجحانات پر لیکچر دینے کی پیشکش کی۔ اس لیکچر کا معاوضہ بھی بہت خوب تھا۔ بس اس کے بعد لیکچر دینے کا

بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔

چند ماہ گزرے ہوں گے کہ ایک ادارے نے مجھے بھاری معاوضے اور پرکشش مراعات پر بطور انسٹرکٹر کام کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اس ملازمت کے تحت میں مختلف یونیورسٹیوں میں منعقدہ ورکشاپ میں جا کر ادب کے طالب علموں کو لکھنے کے گُر بتانے لگا۔

کئی سال گزر چکے ہیں لیکن مسز جان کی موت کے بعد میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب بھی کبھی کبھی ضمیر کی آواز سر اٹھاتی ہے کہ میں چوری کا علم لے کر دانشور بنا بیٹھا ہوں لیکن جب میرا پیٹ یہ کہتا ہے کہ ایمانداری کے علم نے مجھے کتنی بار، کتنے دنوں تک فاقہ کروایا ہے تو ضمیر بیچارہ سر پیٹ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

... ہاں ایک راز کی بات بتاؤں۔ ایک دن مسز جان سرِشام بوتل کھولے کرے نوشی میں مصروف تھیں۔ انہوں نے اتنی زیادہ پی لی تھی کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں۔ نشے میں چور وہ اول فول بک رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے ادب اور دانشوروں کو جھاڑ پلانا شروع کر دی۔

"پیر مسز جان... یہ ادب کی دنیا کے بڑے لوگ ہیں، کم از کم انہیں تو بُرا بھلا مت کہیے۔" میں نے یہ اول فول سن کر ایک دفعہ میں انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ "آخر کو آپ بھی تو ہماری ادبی دنیا کا سرمایہ ہیں۔"

"بکواس ہے یہ۔" میری بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھیں۔ "سب فراڈ ہے۔ جب میں اپنا ناول لکھتی تھی تو کوئی شائع نہیں کرتا تھا۔ جب میں نے چوری شروع کی تو واہ واہ ہوئی۔" یہ سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیا تھی؟" مسز جان نے نیم مدہوشی کی حالت میں ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بچوں کے اسکول کی ایک معمولی ٹیچر... میں نے بھی تمہاری طرح زندگی کے گرم و سرد دیکھے ہیں۔ اگر کسن نہ مرتا تو میں ساری زندگی اس کے ناولز کی پروف ریڈنگ کرتے ہوئے گزار دیتی۔ ویسے وہ اچھے وقت پر مرا تھا۔ جس دن ناول مکمل ہوا، اُسی دن اس نے آخری سانس لی..." وہ جھنجھتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں۔ "یہیں سے میری کامیابی شروع ہوئی۔ اب تم بھی کسی دن بڑے آدمی بن جاؤ گے، فکر نہ کرو..." یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک گلاس اپنے معدے میں اُنڈیلا اور کچھ دیر بعد صوفے پر لُڑھک گئیں۔

مسز جان نے نشے کی حالت میں جو انکشافات کیے تھے، میں نے انہیں کامیابی کے آزمودہ گُر سمجھ کر اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لیا مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ کامیابی حاصل کرنے کا ایسا نادر موقع اتنی جلد مل جائے گا۔

ہوا یوں کہ جس روز انہوں نے نشے کی حالت میں بڑے بڑے انکشافات کیے تھے، اس کے چند روز بعد وہ اچانک اس جہانِ فانی سے گزر گئیں۔ اُن کے انکشافات میرے ذہن میں موجود تھے۔ مجھے خیال آیا کہ قدرت نے برسوں کی ناکامی کے بعد اب مجھے ترقی کا وقار موقع عطا کر دیا ہے جس پر عمل کر کے میں منزل تک پہنچ سکتا ہوں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو آپ جان ہی چکے ہیں۔

"سر..." اچانک کسی نے میرا کاندھا پکڑ کر ہلایا تو میں چونک کر اٹھ گیا۔ یہ میرا اسیکریٹری تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"سر، طلبا تیار ہیں۔ انہیں دیکھ لیں پھر اس کے بعد آپ کو تخلیق کاری پر ایک لیکچر دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں اُٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد میرا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ اچانک ایک طالب علم نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔ "اچھا ناول کیسے لکھا اور شائع کروایا جا سکتا ہے؟" یہ سن کر میں مسکرا دیا اور ایک بار پھر مجھے مسز جان یاد آ گئیں۔ یہی سوال، ایسی ہی ورکشاپ میں، میں نے اُن سے کیا تھا لیکن اس پر عمل بے نتیجہ ہی رہا۔ یہ سوچ کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"اچھا ناول لکھنے کے لیے اچھا ایڈیٹر اور اس کی اشاعت کے لیے ناشر کو تلاش کرنا ضروری ہے۔" میں نے اپنا لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں گُر کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ سب توجہ سے میری بات سُن رہے تھے۔ ایک میں واحد شخص تھا جسے اپنے کہے پر یقین نہیں تھا۔ جو گُر میں انہیں بتا رہا تھا، بظاہر ان میں وزن تھا البتہ جو آزمودہ گُر تھا، وہ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ چلیے... آپ کو بتا دیتا ہوں۔ سنیں، اگر آپ ناول نگار ہیں تو کبھی نوجوان اور ایسے ایڈیٹر کو مسودہ نہ تھمائیں جو خود ادیب بننا چاہتا ہو ورنہ جہاں میں آج کھڑا ہوں... لیکچر دے رہا ہوں، وہاں مجھ سے پہلے مسز جان تھیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل آپ کا ایڈیٹر آپ کے ناول کی سیڑھی پر چڑھ کر یہاں پر آن دھمکے۔ سچ پوچھیں تو یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی اپنے مسودات کی جانچ کے لیے ایڈیٹر کی خدمات نہیں لیں اور یہی ہے کامیابیوں کا گُر...

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنی جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان، محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے ..... زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر، عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک لشکر ہے۔

اسما قادری

قسط 22

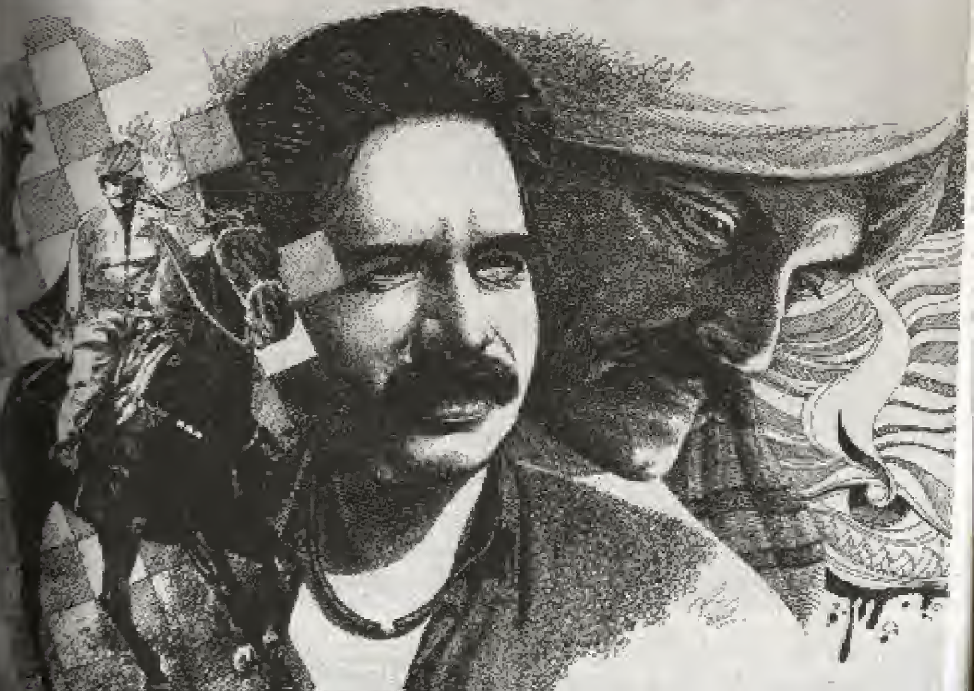

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

باروسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے رعب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی نواسی پسند بی بی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشتاق برہان خان کے مشورے پر ماہ بانو کو [illegible] منتقل کر دیتا ہے۔ [illegible] ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گوما جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور، آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر مشتاق برہان خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایکسپلوژن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کروا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کافی معمر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشتاق برہان خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو یہاں بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملواتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار [illegible] پہنچ جاتا ہے اور مشتاق برہان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے [illegible]۔ افضل کا ملازم حملے میں مارا جاتا ہے۔ ادھر چوہدری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور شہریار کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جس کی لپیٹ میں آکر اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہریار اس واقعے کی رپورٹ چوہدری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں [illegible] کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست بابر کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزین ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا داماد بھی اسے تنگ کرتا ہے۔ ادھر چوہدری کے وفادار بابے کو کچھ لوگ [illegible] بنا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں جس کا الزام چوہدری شہریار پر لگاتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں مہاگرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی آجاتا ہے۔ یہاں وہ اپنے ایک دوست کے خالی بنگلے میں ٹھہرتا ہے اور ماہ بانو کے بتائے ہوئے بنگلے کی نگرانی شروع کر دیتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے [illegible] نظر آتا ہے، وہ اس سے مل کر مہاگرو کا پتا لگاتا ہے اور [illegible] کی مدد سے اس پر دھاوا بولتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ماہ بانو اپنی سہیلی راحیلہ کے گھر جاتی ہے۔ وہاں سے واپسی پر اسے چوہدری کا کارندہ نظر آتا ہے جو اسے اشارے سے اپنے پاس بلاتا ہے مگر ماہ بانو خوف سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ راحیلہ کے گھر میں ہوتی ہے۔ ادھر کشور کی ملازمہ [illegible] جنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگا لیتا ہے۔ اسے وہاں چوہدری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کر کے اسے مار دیتے ہیں۔ مہاگرو (ورما) کے لوگ ایک سینئر ڈاکٹر کی بیٹی کو یرغمال بنا کر ڈاکٹر کو ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ اس میں کافی لوگوں کی جانیں جاتی ہیں اور ڈاکٹر زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر شہریار کے ماموں لیاقت راؤ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ شہریار خبر سن کر پریشان ہو جاتا ہے اور انھیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریہ بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریہ کی طبیعت کی خرابی کے باعث انھیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو شہریار کے رویے پر پریشان ہوتی ہے اور اسی کیفیت کے زیر اثر اسے نیند نہیں آتی۔ اس کی روم میٹ اسے ٹرینکولائزر دے دیتی ہے جسے کھا کر وہ نیند کی وادی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آنکھ کھلنے پر ماہ بانو خود کو انجان جگہ پر پاتی ہے اور اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر چوہدری کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ ادھر شہریار اپنے قدم بھٹکنے پر خود کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریہ کی [illegible] گفتگو سن کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وہیں چوہدرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ ماہ بانو کو چوہدری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ چوہدری سمجھتا ہے کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے شہریار کا ہاتھ ہے۔ ادھر آفتاب جمعے کی نماز کے لیے جاتا ہے تو وہاں اسے [illegible] کسی کی صورت ذہن میں آنے کے بعد وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔ شہریار کی شادی کے موقع پر وہاں چوہدری کی موجودگی اسے [illegible] کر دیتی ہے اور وہ اس سے [illegible]۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے چنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہ تھک ہار کر لیٹتی ہے تو اسے نیند آجاتی ہے مگر ایک احساس اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس احساس کو سمجھتے ہی اسے جیسے ڈنک لگتا ہے اور وہ اچھل کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جھونپڑی میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کونے میں جلتی چھوٹی سی لالٹین کی مدھم لو نے ماحول کو بس اتنا واضح کیا تھا کہ وہاں موجود اشیا سائے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ ماہ بانو نے ماحول کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے ذہن نے سب سے پہلے اس احساس کا تجزیہ کیا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ انسانی ہاتھ کا لمس تھا جسے وہ اپنے ہاتھ کی پشت پر متحرک محسوس کر سکتی تھی۔ متحرک ہاتھ کا کھردرا پن اور سختی صاف بتا رہی تھی کہ وہ مردانہ ہاتھ ہے۔ لمحہ بھر میں مکمل ہونے والے تجزیے کا نتیجہ سامنے آتے ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہاتھ پر متحرک ہاتھ اس کے اس ردعمل پر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ماہ بانو نے آنکھیں پھاڑ کر تاریکی کی چادر میں چھپے اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ذرا سی کوشش سے ماحول سے ہم آہنگ ہو جانے والی اس کی نظروں نے جس شخص کو شناخت کیا، وہ اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے اس شخص کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں سے مختلف ہے لیکن شاید صرف اس کا ظاہر ہی ان لوگوں سے مختلف تھا۔ باطن میں وہ بھی وہی تھا جو اس کے دوسرے ساتھی تھے۔ اپنے مختلف پہناوے کی وجہ سے وہ دوسروں سے کچھ منفرد محسوس ہوا تھا اور ماہ بانو نے اس وقت اسے آسانی سے شناخت بھی اسی لیے کر لیا تھا کہ وہ دوسرے ڈاکوؤں کی طرح گھیردار شلوار قمیص کے بجائے جینز اور شرٹ پہنے ہوا تھا لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ حلیے سے دوسروں سے الگ نظر آنے والا کردار کے معاملے میں بالکل مختلف ثابت ہوا تھا۔ اس کے ساتھی اگر دن بھر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے تھے تو وہ بھی اپنی ہوس پوری کرنے رات کی تاریکی میں اس تک پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو کو خود کو اس کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھنا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنے لگی۔

"آئی ایم سوری! میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔" وہ کچھ سوچ پاتی، اس سے قبل ہی اندھیرے کی چادر کے اس پار سے ایک آواز سفر کرتی ہوئی اس تک پہنچی اور اپنے الفاظ سے اسے پہلے سے بھی زیادہ چونکا گئی۔ بولنے والے کا لہجہ بہت صاف اور نرم تھا اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس شخص کی ہر خصوصیت سے قطع نظر ماہ بانو کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس وقت اس کی وہاں موجودگی کی وجہ جان سکے کیونکہ اس کی جس حرکت کی وجہ سے اس کی نیند خراب ہوئی تھی، وہ نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔

"میں اس لیے یہاں آیا ہوں کہ صرف مجھے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ میں یہاں آسکوں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے یہ اختیار خود اپنے لیے حاصل کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ماہ بانو نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے چہرے کے نقوش بھی واضح طور پر نظر نہیں آرہے تھے۔ تاثرات سمجھنا تو بہت دور کی بات تھی۔

"مطلب..." اس نے سوچنے والے انداز میں کہا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔

ماہ بانو اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ آخر اس نے کچھ دیر بعد اپنے لبوں پر پڑا خاموشی کا قفل کھول ہی دیا۔

"ہم ڈاکو ہیں اور ان جنگلات میں پناہ گزین ہیں، یہ بات تو تم نے جان ہی لی ہوگی؟" اس نے گویا اصل گفتگو سے قبل تمہید باندھنے کے لیے یہ سوال کیا۔

"ظاہر ہے اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی یہ بات جانتی ہوں کہ ان جنگلات میں ڈاکوؤں کا ٹھکانا ہے جو وقتاً فوقتاً ادھر سے گزرنے والے معصوم سیاحوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں میرے لیے یہ اندازہ لگانا کیا مشکل تھا کہ تم لوگ ڈاکو ہو۔ ویسے اگر میرے علم میں یہ بات نہ بھی ہوتی تو تم لوگوں کی وضع قطع اور اسلحہ دیکھ کر بھی سمجھ جاتی۔" ماہ بانو نے اسے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یقیناً تم نے ہمیں دیکھتے ہی ہمارے بارے میں جان لیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے اس جنگل میں اپنے لیے زندگی کی ممکنہ سہولیات جمع کر لی ہیں اور کافی آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن یہاں ایک چیز کی بہت کمی ہے اور اس چیز کے بغیر رہنا مرد کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔" ماہ بانو نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں اتنے بہت سارے مردوں کے درمیان اس نے عورت کی شدید قلت دیکھی تھی۔ اپنے علاوہ یہاں اس نے صرف دو عورتیں دیکھی تھیں، ایک وہ موٹی تازی عورت جو اسے کھانا وغیرہ پہنچاتی رہی تھی اور دوسری وہ سوکھی چمرخ جس کے ساتھ مل کر اس نے آج ان ڈاکوؤں کے میلے کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ وہ دو عورتیں یقیناً اتنے سارے مردوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ پھر ان کا جو حال تھا، اسے دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی مرد کے

لیے کوئی کشش نہیں رکھتی ہوں گی اور وہ بس مجبوراً ہی ان سے کام چلا رہے ہوں گے۔ ایسے میں ماہ بانو کا تازہ گلاب کا سا شاداب وجود دیکھ کر ان کی رال ٹپکنا تو لازم تھا اور اس کے سامنے موجود شخص یقیناً اس کا پہلا طلب گار بن کر یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی باقی دونوں عورتوں کی طرح سب کی مشترکہ جاگیر بن جاتی۔ ان عورتوں کے ساتھ وہاں کیا سلوک روا رکھا جا رہا تھا، اس بات کا اندازہ اس نے خود ہی لگا لیا تھا اور اب خود کو بھی انہی کی قطار میں محسوس کر کے اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز اس کی تنہائی میں آنے والے ڈاکو نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"اپنی زندگی میں موجود اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہاں کچھ نہ کچھ بندوبست کیا جاتا رہتا ہے۔ کبھی کسی واردات کے وقت جیسے موقع لگے، وہ استفادہ کر لیتا ہے... کبھی یہ لوگ کہیں سے کوئی لڑکی اٹھا لاتے ہیں اور کبھی کبھار کسی پیشہ ور طوائف کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں لیکن یہ سارے چانسز مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف بھی کبھی کسی کو دل بھر کر اپنی حسرتیں نکالنے کا موقع نہیں دیتا۔ ہمارا ایک ساتھی اس معاملے میں بہت ہی بے صبرا تھا اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بڑی پابندی سے ایک طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ وہاں کسی نے مخبری کر دی۔ پولیس نے چھاپا مار کر اسے کوٹھے پر سے گرفتار کر لیا۔ ہم تک بھی اس کی گرفتاری کی اطلاع پہنچ گئی۔ پورے گروہ میں کھلبلی مچ گئی کہ جانے کب اس ساتھی کے ذریعے پولیس ہمارے ٹھکانے تک پہنچ جائے۔ ہم سارے روپوش ہونے کے لیے ادھر اُدھر بکھر گئے لیکن ہمارا وہ ساتھی بھی جوان کا بچہ نکلا۔ پولیس کا تشدد سہتے سہتے اس نے اپنی جان دے دی لیکن زبان نہیں کھول کر دی۔" وہ اسے ایک بات کی تفصیل بتاتے بتاتے دوسرے معاملے کو چھیڑ بیٹھا اور اپنے ساتھی کی تعریفیں کرنے لگا۔

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ مجھے تمہارے ان سب معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اچھی خاصی خوف زدہ ماہ بانو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں دلچسپی لینی چاہیے۔ اب تم ہمارے درمیان ہو اور یقیناً تمہیں ایک طویل عرصے تک ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ ویسے بھی میں نے یہ سب کچھ تمہیں خود سے بتانا شروع نہیں کیا ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے اور میں تمہیں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اسے اپنا ٹوکے جانا پسند نہیں آیا اور کچھ ناراضی سے اسے جواب دیتے ہوئے بولا۔

"میں تو یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میں یہاں کیسے اور کس کی وجہ سے پہنچی ہوں؟ کیا تم مجھے میرے ان سوالوں کے جواب دو گے؟" اس شخص کا رواں لہجہ اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا اور ایک ہی چیز ماہ بانو کو امید دلا رہی تھی کہ وہ ڈاکو ہونے کے باوجود قدرے مہذب ثابت ہو سکتا ہے اس لیے اس کی ناراضی کے باوجود حوصلہ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں اٹکے سوالات بھی کر ڈالے۔ یوں بھی وہ جس تواتر سے بول رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ گفتگو کی روانی میں وہ اسے بہت کچھ بتا سکتا ہے۔

"تم جو جاننا چاہتی ہو میں تمہیں وہ بھی بتا دوں گا لیکن پہلے تم مجھے اپنے پچھلے سوالوں کا جواب مکمل کرنے دو۔ میں کبھی بھی ادھورے پر چل کرنے کا عادی نہیں رہا۔" اس کے اس جملے نے ماہ بانو کا یقین اور بھی پختہ کر دیا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہے جو نہ جانے کس طرح ان اجڈ ڈاکوؤں کے ساتھ آملا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ پہلے تم اپنی بات مکمل کر لو پھر مجھے میرے اس سوال کا جواب دے دینا۔" اس نے قدرے نرم اور متوازن لہجے میں گویا اسے اجازت دی۔ اس پر چھا جانے والا خوف بھی اب بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

"میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ کچھ نہ ملے تو یہاں ڈیرے پر موجود دونوں عورتوں میں سے ہی کسی سے کام چلا لیا جاتا ہے لیکن میں اپنے ساتھیوں میں وہ واحد شخص ہوں جس نے خود کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں عورت کا خانہ بالکل خالی رہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر کوئی خواہش نہیں ہے یا میں کوئی زاہد خشک ہوں۔ میں بھی ہر مرد کی طرح اپنے دل میں ایک عورت کی تمنا رکھتا ہوں لیکن اس معاملے میں میرا نفس کسی جانور کی طرح بے لگام نہیں ہے۔ اصل میں جمالیاتی ذوق اتنا بلند ہے کہ کوئی معمولی عورت کبھی میرے معیار پر پوری ہی نہیں اتر سکی۔ میرے ساتھی میری اس بات کو نہیں مانتے تھے اور اکثر اس شک کا اظہار کرتے تھے کہ شاید میں اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ میں نے کبھی ان کے شکوک دور کرنے کے لیے بھی خود کو اپنے معیار سے نیچے لانا پسند نہیں کیا لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے لگا کہ میرا انتظار ختم ہو گیا ہے اور تم ہی وہ عورت ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے نمبردار سے کہہ کر تمہیں اپنے لیے

مانگ لیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ تمہیں میرے سوا کوئی اور نہیں چھوئے گا۔ کیونکہ میں نے پہلی بار کسی عورت کے لیے دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس لیے سردار نے میری بات ماننے سے انکار نہیں کیا اور وعدہ کر لیا کہ جب تک میرا تم سے دل نہیں بھر جاتا یا میں خود اجازت نہیں دے دیتا، تب تک گروہ کا کوئی دوسرا شخص تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

وہ نہایت اطمینان سے جو کچھ بتا رہا تھا، اسے سن کر ماہ بانو کا اپنا سارا اطمینان رخصت ہو گیا اور وہ سمجھ گئی کہ وہ ایک بار پھر ان حالات میں پھنس گئی ہے جن سے اب تک بچتی رہی ہے۔ چودھری افتخار سے لے کر اس ڈاکو تک اس نے مردوں کے کئی روپ دیکھے تھے۔ وہ سارے زبان، لباس اور پیشے وغیرہ کے اعتبار سے تو ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن عورت کے معاملے میں سب کا نظریہ ایک یکساں تھا۔ وہ اللہ کی مہربانی سے اب تک ان حیوان صفت مردوں سے بچتی رہی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ اب اس جنگل بیابان میں اس کے ساتھ کیا پیش آتا ہے؟ ایک ایسی جگہ پر جہاں سب ہی عورت کے معاملے میں بھوکے درندوں کی طرح تھے، کوئی اس کا مددگار ثابت بھی ہوتا تو کیسے؟

"میں تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے مالک بنے بیٹھے ڈاکو کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تو میں تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب دے رہا ہوں اور یہ بات میں تم پر پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں ادھورے پر چل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" اس نے ماہ بانو کی بات کو کسی دخل اندازی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اسے جواب دیا اور اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیسے اور کس کی وجہ سے پہنچی ہو تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تمہیں یہاں پہنچانے کا ذمے دار چودھری کا داماد اشرف شاہ ہے۔ کسی وجہ سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری شادی چودھری سے ہو اس لیے اس نے تمہیں حویلی سے غائب کرنے کا بندوبست کر دیا۔ وہ چاہتا تو تمہیں ہلاک بھی کروا سکتا تھا لیکن اس نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے تمہیں تحفے کے طور پر سردار کے حوالے کر دیا۔ سردار کی اشرف شاہ سمیت سارے چودھریوں سے بھی دوستی ہے اور اس دوستی کو نبھانے کے لیے ان کے درمیان باہمی مفادات کے سلسلے میں اس طرح کے کام

ہوتے رہتے ہیں۔ اب تم اپنا معاملہ ہی لے لو۔ اشرف شا[ہ] نے اپنی خواہش کے مطابق تم سے جان بھی چھڑا لی اور سردا[ر] کو تحفہ بھیج کر اسے خوش بھی کر دیا۔ اب آئندہ اشرف شا[ہ] سردار سے اپنا کوئی کام کہے گا تو سردار انکار تھوڑی کر سک[ے] گا۔"

اس کا جواب سن کر ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی کہ آخر اشرف شاہ کو اس سے کیا دشمنی تھی کہ اس نے اسے یہاں ڈاکوؤں کے درمیان بھیج دیا... لیکن سوچنے پر بھی اسے دشمنی کی کوئی وج[ہ] سمجھ نہیں آئی، البتہ وہ یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس کی چودھری سے شادی ہونے کی صورت میں یقیناً اشرف شا[ہ] کے کسی مفاد پر ضرب پڑتی ہوگی اس لیے اس نے یہ سارا چک[ر] چلایا تھا۔ بہرحال وہ تو اس کے لیے بیک وقت نجات دہند[ہ] بھی ثابت ہوا تھا اور دشمن بھی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف و[ہ] چودھری کے چنگل سے نکلی تھی تو دوسری طرف اس جنجال م[یں] آ پھنسی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اندھیرے کے باوجود اس نے ماہ بانو کی کیفیات بھانپ لیں اور اس سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" ماہ بانو نے اسے اپنی سوچوں سے آگا[ہ] کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

"شاید تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔" اس نے کافی حد تک درست اندازہ لگایا۔

"جو شخص میری عزت کے درپے ہے کیا مجھے اس سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے؟" ماہ بانو تیز لہجے میں بولی۔

"نہیں، کم از کم تمہیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے جو کچھ کیا، وہ تمہاری عزت بچانے کے لیے کیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ تم وہ پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور جس کی تمنا میرے دل میں جاگی ہے لیکن میں سردار سے تمہیں مانگنے کے بعد مسلسل تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میں نے بہت غور کیا۔ فطری طلب بھی مجھے اکساتی رہی لیکن بے شمار برائیوں میں جتلا ہو جانے کے باوجود میں خود کو اتنا گرانے کی ہمت نہیں کر سکا کہ اپنے ہاتھوں کسی عورت کی عزت پامال کر سکوں۔ تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ ابھی جب میں نے تمہارے ہاتھ تھام رکھے تھے تو میرے دل کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سے زیادہ قربت کا میں سوچ بھی نہیں سکا۔" وہ اتنا کہہ کر ایک دم ہی رخ موڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ دم بخود سی ماہ بانو اس کے اس طرح اچانک چلے جانے پر بے یقینی کے عالم میں پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

digestpk.blogspot.com

☆☆☆

"تم دونوں ہنی مون کے لیے کہاں جا رہے ہو؟" وہ سب شام کی چائے پر جمع تھے، تب اچانک آفرین رانا نے شہریار اور ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"میں نے کچھ سوچا نہیں۔" شہریار گویا بڑبڑا کر کسی خیال سے باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر ماریا سے شادی محض اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کی تھی۔ اپنے گناہ کا تاوان ادا کرتے ہوئے ذہن میں ہنی مون جیسے خوب صورت خیال کا گزر ہونا ممکن ہی نہیں تھا، اسی لیے آفرین رانا کے سوال نے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

"سوچا نہیں تو اب سوچ لو۔ ماریا کیا سوچے گی کہ اس کا کس قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ آج کل تو لوگ شادی سے پہلے ہی ہنی مون پلان کر لیتے ہیں اور تمہیں شادی شدہ ہو جانے کے بعد بھی ہوش نہیں۔" آفرین رانا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ جواباً شہریار نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس موقع پر ماریا اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔

"آپ میرے سوچنے کی فکر نہیں کریں آنٹی! میں جانتی ہوں کہ شہریار کس قسم کے آدمی ہیں۔ مجھے ان کی مصروفیات کا بھی اندازہ ہے۔ ان کا شیڈول جتنا ٹائٹ ہے اس میں انہوں نے شادی کا وقت نکال لیا، یہی بڑی بات ہے۔ ہنی مون وغیرہ کے لیے ان کے پاس فی الحال وقت نہیں ہے۔ یہ میں جانتی ہوں اس لیے اس حوالے سے میں نے خود بھی کچھ نہیں سوچا ہے۔"

"سوچنا چاہیے تھا۔ اگر تم اسے اسی طرح ڈھیل دیتی رہیں تو تمہاری زندگی بالکل خشک اور روکھی پھیکی کر دے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ جنون کی حد تک اپنے کام کے ساتھ انوالو ہو جانے کا عادی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اس کی یہ عادت تمہیں بہت پریشان کرے گی۔" انہوں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے گویا ماریا کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ فکر نہیں کریں۔ میں ہر بار انہیں اس طرح نہیں چھوڑوں گی۔ ہمارا ہنی مون ان پر ڈیو رہے گا اور فرصت ملتے ہی میں سب سے پہلے ان سے اپنی پسندیدہ جگہوں پر جانے کا اصرار کروں گی۔ ابھی تو فی الحال میں خود بھی کافی مصروف ہوں۔ حیدرآباد کے ہیلتھ سینٹر میں میرے علاوہ کوئی دوسری لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے۔ چھٹیوں پر جانے سے پہلے مجھے اپنی جگہ کسی دوسری ڈاکٹر کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔"

وہ بہت سبھاؤ سے شہریار کا دفاع کر رہی تھی۔ شہریار خاموشی سے بیٹھا ہونے کے باوجود اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں ماریا کا شکر گزار بھی تھا۔ شادی کے بعد اس نے اس کے لیے کوئی بھی پریشانی کھڑی نہیں کی تھی۔ وہ ذرا بھی ڈیمانڈنگ نہیں تھی۔ کوئی فرمائش کرنا تو کجا، اس نے شہریار کے لیے دیے انداز پر بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ماریا سے قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کے اس رویے پر تہِ دل سے اس کا مشکور تھا۔ ورنہ آج کل اس کے قلب و ذہن کی جو حالت تھی، اس کے ساتھ اگر ماریا بھی اس کے لیے کوئی پریشانی کھڑی کرتی تو وہ بہت ڈسٹرب ہو جاتا۔ پہلے ہی پے در پے ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے جن کی وجہ سے وہ غم و غصے کا شکار تھا۔ اوّل بڑی جدوجہد کے بعد ہاتھ آیا "را" کا ایجنٹ ورما پولیس کی نااہلی کی وجہ سے اسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ دوسرا اچھی بھلی سکون سے کراچی کے ہاسٹل میں مقیم ماہ بانو کو کسی نے اغوا کر لیا، سو ماہ اس کی ساری زندگی کی پارسائی کا بھرم ٹوٹ گیا۔ یہ سارے واقعات کوئی معمولی نہیں تھے۔ ورما اس کی چہیتی بہن شیبا کا قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کا دشمن بھی تھا۔ اس نے اب تک جانے ملک کو کتنے نقصان پہنچائے تھے اور اب آزادی ملنے کے بعد کتنے پہنچانے والا تھا، یہ کچھ معلوم نہیں تھا۔

ماہ بانو بھی ایسی غائب ہوئی تھی کہ ابھی تک اس کا پتا نہ چلا تھا اور نہ ہی اب تک یہ معلوم ہو سکا تھا کہ کس طرح اس تک چوہدری کی رسائی ممکن ہو گئی۔ اس نے چاہے اب تک واضح طور پر خود سے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ ماہ بانو کی محبت میں مبتلا ہے لیکن دل میں اس کے لیے جو جذبہ تھا، وہ خود اسے ماہ بانو کے لیے تڑپاتا تھا اور وہ بے چین ہو جاتا تھا کہ وہ جہاں بھی، جس بھی مشکل میں گرفتار ہے، اسے اس سے نجات دلا کر ایک پُرسکون اور خوشیوں بھری زندگی دے سکے۔ وہ اس زندگی میں اپنے ساتھ کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ ماہ بانو کے لیے اس کے دل میں جو جذبہ تھا، وہ قطعی بے غرض اور بے لوث تھا۔ اور اب اس کی زندگی میں جو اتنا بڑا حادثہ پیش آ چکا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ کی خواہش کرتا۔ ماریا کے معاملے میں اس کے قدم جس طرح ڈگمگائے تھے اور وہ خود اپنی ہی نظروں میں گرا تھا، اس کے بعد تو زندگی بس گناہ کا کفارہ ادا کرتے ہوئے ہی گزرنی تھی اور وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی ہی سمجھ رہا تھا کہ ماریا بہرحال ایک سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی ہے جس کا ساتھ اسے قلبی خوشی بے شک نہ دے سکے لیکن وہ اس کے لیے مسائل بھی نہیں کھڑے کرے گی۔

"آپ کا موبائل بج رہا ہے شہریار!" وہ اپنی سوچوں

میں الجھا ہوا تھا کہ ماریا نے اس کے شانے کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے اس کی توجہ موبائل کی طرف مبذول کروائی۔ اس نے موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ یہ کال اس آدمی کی طرف سے تھی جسے اس نے کراچی میں ماہ بانو کے اغوا کے واقعے کی تحقیقات کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

"ایکسکیوز می۔" اس نمبر کو دیکھ کر وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ لیاقت رانا کی کوٹھی کا لان خاصا خوب صورت تھا۔ وہاں مختلف اقسام کے کئی پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ ان پودوں کی شاخیں ہر وقت پھولوں سے لدی رہتی تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے خوب صورت نظارہ پیش کرتی تھیں لیکن اس وقت وہ کسی نظارے سے لطف اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اس کال کی طرف تھی جسے سننے کے لیے وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر یہاں آیا تھا۔

"ہاں بولو! کیا بات ہے؟" کال ریسیو کرتے ہی اس نے سوال کیا۔

"میں نے اچھی خاصی معلومات کر لی ہے سر! ماہ بانو کی روم میٹ بالکل کلیئر ہے، البتہ اس نے ماہ بانو کی ایک کلاس فیلو کی نشان دہی کی تھی جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ماہ بانو کی اس لڑکی سے کافی دوستی تھی اور وہ کئی بار اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گئی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو بہت ہی قابلِ غور باتیں معلوم ہوئیں جن سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ ماہ بانو کے اغوا میں اس کی وہ قریبی دوست انوالو ہو سکتی ہے۔"

"کہیں اس لڑکی کا نام راحیلہ تو نہیں ہے؟" اس کے علم میں تھا کہ ماہ بانو اپنی ایک کلاس فیلو راحیلہ کے بھائی ڈاکٹر طارق سے اسٹڈیز میں مدد لینے کے لیے اس کے گھر جاتی رہی ہے اس لیے فوراً ہی سوال کیا۔ ماہ بانو کے راحیلہ کے گھر جانے کی وجہ سے ہی تو وہ خواجہ سراؤں کے مہا گرو کا روپ دھار کر رہنے والے "را" کے ایجنٹ ورما تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ماہ بانو نے راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر سے پڑوس کی کوٹھی میں ورما کو دیکھ کر شناخت کر لیا تھا اور پھر اسے اطلاع دی تھی جس کے بعد وہ ورما تک پہنچ کر اسے گرفتار کروانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

"بالکل سر... یہی نام ہے اس لڑکی کا۔ ماہ بانو کی روم میٹ کی نشان دہی پر جب میں نے اس لڑکی سے ملنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ آج کل کالج نہیں آ رہی ہے۔ میں کالج ریکارڈ میں سے ایڈریس نکلوا کر اس کے گھر پہنچا تو وہاں اس کے والد سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ راحیلہ اور اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر طارق آج کل گلشن میں اپنے ایک عزیز کے گھر رہ رہے ہیں۔ ان کے وہ عزیز کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے انہوں نے ان لوگوں کو اپنے گھر کی حفاظت کے خیال سے وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ میں راحیلہ کے والد سے ایڈریس لے کر گلشن پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بہن بھائی آج کل وہاں موجود نہیں ہیں۔ ان دونوں کی غیر موجودگی نے مجھے کھٹکا دیا۔ میں نے چوکیدار کو ٹٹولا اور تھوڑی بہت معلومات اِدھر اُدھر سے حاصل کیں تو ڈاکٹر طارق کے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کی روشنی میں، میں اس شخص کو مشکوک قرار دے سکتا ہوں۔

"وہ انتہا درجے کا فلرٹ آدمی ہے اور اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی کے قصے مشہور ہیں۔ خود وہاں کے چوکیدار کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طارق کے ساتھ اکثر و بیشتر مختلف لڑکیاں بنگلے پر آتی رہتی تھیں۔ وہ جس اسپتال میں جاب کرتا تھا، وہاں بھی اس کی ریپوٹیشن زیادہ اچھی نہیں ہے اور معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں اس کی ایک ساتھی نرس لاپتا ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر طارق نے اس نرس سے اپنی دوستی کو باقی اسٹاف سے پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب وہ غائب ہوئی تو اس کی بڑی بہن نے واویلا مچا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن ڈاکٹر طارق سے ملنے کا بتا کر گھر سے نکلی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ ڈاکٹر طارق نے ایسی کسی بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ نرس کے گھر والے غریب لوگ تھے اس لیے تھوڑا سا شور مچا کر چپ ہو گئے اور طارق کی جان چھوٹ گئی لیکن مجھے شک ہے کہ اس قسم کے کردار کا مالک شخص ماہ بانو کے لیے بھی کسی طور مخلص ثابت نہیں ہوا ہوگا اور اس نے ایسی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کی ہوگی جس کی وجہ سے ماہ بانو کو نقصان پہنچا۔ ہو سکتا ہے اس نے ماہ بانو کی کراچی میں موجودگی کی خبر چوہدری تک پہنچا کر بدلے میں اس سے رقم وصول کر لی ہو۔ موجودہ حالات میں اس کی بہن سمیت روپوشی میرے اس شک کو اور بھی تقویت دے رہی ہے۔" اس بندے نے واقعی اچھا خاصا کام کیا تھا اور اس کی روشنی میں جو نتائج اخذ کیے تھے وہ بھی کافی درست محسوس ہو رہے تھے۔ شہریار بھی خود کو اس سے متفق محسوس کر رہا تھا چنانچہ یہ سب سن کر بولا۔

"ڈاکٹر طارق اور راحیلہ کے والدین کے گھر پر پولیس ریڈ کرواؤ۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں بہن بھائی اپنے ہی گھر پر رو

digestpk.blogspot.com

رہے ہوں اور ان کے والد نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ اگر وہ دونوں اپنے گھر پر نہ ملیں تو ان کے گھر والوں سے اگلوانے کی کوشش کرو۔ مجھے بہرحال ہر حال میں ان لوگوں تک پہنچنا ہے جنہوں نے ماہ بانو کے اغوا میں مدد کی اور اسے مشکل میں پھنسوایا۔ اس کی بازیابی کے ساتھ ساتھ میرے لیے اس کے مجرموں تک پہنچنا اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچانا بھی بہت اہم ہے۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہو نا؟ کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کسی کو کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اگر راحیلہ اور اس کے بھائی نے ماہ بانو کے لیے مارِ آستین کا کام کیا تھا تو وہ کسی صورت انہیں بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"او کے سر! آپ فکر نہ کریں، جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" دوسری طرف سے اسے یقین دہانی کروائی گئی تو اس نے قدرے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا اور موبائل اپنی جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا تو اپنے بالکل پیچھے کھڑی ماریا کو دیکھ کر چونک گیا اور قدرے سرد لہجے میں پوچھا۔

"تم کب یہاں آگئیں؟"

"بالکل ابھی ابھی۔ آپ فون پر اتنی بری طرح مصروف تھے کہ آپ کو میرے آنے کا بالکل پتا ہی نہیں چل سکا۔ کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟ آپ کا موڈ خاصا آف لگ رہا ہے۔" وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کے بالکل اچانک خاموشی سے پیچھے آکھڑے ہونے پر برا لگنے کے باوجود شہریار اسے کوئی سخت جواب نہیں دے سکا اور ٹالنے والے انداز میں بولا۔

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ آفیشل پرابلمز تھیں جنہیں سب کے سامنے ڈسکس کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر آگیا تھا۔"

"او سوری! پھر تو مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اصل میں آفرین آنٹی پوچھ رہی تھیں کہ رات کے کھانے پر کیا بنواؤں تو میں نے ان سے کہا کہ آپ سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔ ابھی مجھے آپ کی پسند ناپسند کا اندازہ تو ہے نہیں ورنہ خود ہی کچھ بتا دیتی۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی وہاں آمد کی وجہ بتائی۔

"ممانی جان کو میری پسند ناپسند کا اچھی طرح معلوم ہے اور وہ مجھ سے پوچھے بغیر خود میری پسند کا کھانا تیار کروا دیتی ہیں۔ تم اپنے لیے جو چاہو وہ بنوالو۔ اور ہاں، اپنے سامان کی پیکنگ بھی کر لینا۔ کل ہم ارلی مارننگ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر تمہیں کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو ممانی جان کے ساتھ جا کر کر سکتی ہو۔ میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اس نے جیب سے پرس نکال کر اپنا کریڈٹ کارڈ اسے تھمایا۔

"تھینکس، میں دیکھوں گی۔۔۔ اگر موڈ بن گیا تو اکیلی بھی شاپنگ کے لیے چلی جاؤں گی۔ لاہور میرا دیکھا بھالا شہر ہے اس لیے مجھے آفرین آنٹی کو تنگ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کریڈٹ کارڈ اپنی مٹھی میں دباتے ہوئے اسے جواب دیا اور وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اسی لمحے شہریار کا موبائل ایک بار پھر بجنے لگا۔ شہریار نے اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا۔ نمبر اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے سوچا کہ اس کال کو ریسیو کیا جائے یا نہیں پھر یس کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ اندر جاتی ماریا کے قدم بھی رنگ ٹون سن کر رک گئے تھے۔ اس کے رکنے پر شہریار نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ شہریار بھی سر جھٹک کر دوسری طرف سے آتی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماریا کی ان حرکتوں پر الجھن محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے رعایت دینے پر مجبور تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ماریا بے شک پڑھی لکھی لڑکی ہے لیکن طبقاتی فرق کی وجہ سے اسے ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت لگے گا اور وہ اس کی کلاس میں رائج ایٹی کیٹس آہستہ آہستہ ہی سیکھ سکے گی۔

"کیا حال ہیں اے سی صاحب! شادی کے بعد کیسی گزر رہی ہے؟" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے اس سے پوچھا گیا۔

"کون صاحب؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہم سے اپنا ناتا آپ خود طے کریں گے۔ اگر ہماری ہدایت کے مطابق آپ ہم سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھیں گے تو ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ ہمارے آپ کے درمیان دشمنی کا ناتا پکا ہے۔" دوسری طرف سے جو جواب دیا گیا، اسے سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کال کرنے والے کا تعلق کہاں سے ہے۔ جب سے اس نے ورما کو گرفتار کروایا تھا، را والے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ کچھ عرصے قبل لیاقت رانا کی گاڑی کو گولیوں کا نشانہ بنا کر بھی اسے تنبیہ کی گئی تھی اور اب پھر دھمکی کو دہرایا جا رہا تھا۔

"میری نظر میں ہمارے درمیان دشمنی کا تعلق کسی بھی

طور مشروط نہیں ہے۔ ہمیں یہ دشمنی ورثے میں ملی ہے اور جب تک تم لوگ میرے وطن کے خلاف سازشیں کرتے رہو گے، دشمنی کا یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔"

"دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے راستے سے نہیں ہٹیں گے؟" اس شخص کا لہجہ بگڑا۔

"تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔" شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سوچ لیں اے سی صاحب! ابھی کچھ دن تو ہوئے ہیں آپ کے فیملی ممبرز میں اضافہ ہوئے۔ کہیں آپ کی ضد کی وجہ سے ان میں کمی نہ ہو جائے۔" اس نے بہت واضح دھمکی دی۔

"میرا خاندان نسلوں سے وطن کے لیے قربانیاں دیتا آرہا ہے۔ اس بار بھی ہم پیچھے نہیں رہیں گے۔" وقت کے ان لمحات میں گویا وہ ہر طرح کے خدشات سے آزاد ہو گیا تھا اور اسے دوبدو جواب دے رہا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جو ہوگا، وہ آپ خود دیکھ لیں گے۔" دوسری طرف سے دھمکی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو شہریار نے بھی شانے اچکاتے ہوئے اپنا موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ را جیسی ایجنسی کے افراد اتنے بھونڈے انداز میں یہ کام کر رہے ہیں؟ ان کا رویہ سیکرٹ ایجنٹس کے بجائے بالکل تھرڈ کلاس غنڈوں جیسا تھا۔ بس وہ لوگ اسے کال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کال کسی ایسے نمبر سے کی جائے جس کی سم غیرقانونی ہو اور نمبر کے ذریعے انہیں ٹریس نہیں کیا جا سکے۔ سابقہ تجربے کی روشنی میں شہریار چونکہ یہ بات سمجھ چکا تھا، اس لیے اس نے اپنے موبائل پر آنے والا نمبر ٹریس کروا کے وقت برباد کرنا غیرضروری سمجھا تھا۔

☆☆☆

"شہریار صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔" اخبار کا صفحہ کشور کے سامنے رکھتے ہوئے آفتاب نے اسے اطلاع دی۔

"واقعی، دکھائیں تو کیسی ہے ان کی بیگم۔" کشور اشتیاق سے اخبار پر جھکی۔

"تم انہیں جانتی ہو۔ شہریار صاحب نے ڈاکٹر سے شادی کی ہے۔" آفتاب نے اسے بتایا۔ اس دوران کشور خود بھی اخبار کے صفحے پر چھپی تصویر دیکھ چکی تھی۔ یہ ایک فیملی فوٹو تھا جس میں دولہا دلہن کے علاوہ مسٹر اینڈ مسز لیاقت رانا، کریم بخش اور آئی جی مختار مرزا نمایاں نظر آرہے تھے۔

"بیوی تو اے سی صاحب نے اچھی ڈھونڈی ہے۔ ڈاکٹر ماریا بڑی سمجھ دار اور نیک فطرت خاتون ہیں۔ مجھ پر تو انہوں نے بڑا احسان کیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے لیے اپنی اور اپنے بچے کی زندگی بچانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب مجھے مسلسل ہونے والی الٹیوں پر مشکوک ہو کر بڑی ماں نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ جب تک ڈاکٹر ماریا میرا چیک اپ کرتی رہیں، مجھے یہی ڈر رہا کہ اب میرے اور آپ کے تعلق کا بھانڈا پھوٹ جائے گا لیکن انہوں نے نہ صرف سب کے سامنے بات بنا دی بلکہ بعد میں بھی میری مدد کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے جو دوائیں وغیرہ دی تھیں، ان سے میری حالت سنبھلنے اور راز کو راز رکھنے میں بڑی مدد ملی تھی۔ مجھے اے سی صاحب سے ان کی شادی کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی حیرت بھی ہے کہ ان دونوں نے بالکل مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود شادی کا فیصلہ کس طرح کیا۔ کبھی کوئی ایسی بات بھی سننے میں نہیں آئی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ شہریار صاحب اور ڈاکٹر ماریا کے درمیان پسندیدگی کا کوئی سلسلہ چل رہا ہو۔" تصویر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کشور اپنے احساسات اور خیالات کا بھی اظہار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے ایک ساتھ اتنے سارے نکات پر گفتگو کرنے پر آفتاب مسکرا دیا اور اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"آپ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک طرف آپ کو ڈاکٹر ماریا سے شہریار صاحب کی شادی کی خوشی ہے تو دوسری طرف ان کے غیرمسلم ہونے پر اعتراض بھی ہے۔"

"میں نے اعتراض نہیں کیا ہے، صرف حیرت کا اظہار کیا ہے۔" کشور نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

"حیرت بھی بے کار ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں۔ انہوں نے جو بھی فیصلہ کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ رہی ان کے پسندیدگی کے سلسلے کے سامنے نہ آنے کی بات تو وہ کوئی فلمی ہیرو ہیروئن تو ہیں نہیں کہ کھیتوں کھلیانوں میں ڈوئٹ گاتے پھرتے اور دور دور تک ان کی محبت کے قصے پھیل جاتے۔ انہیں ہماری طرح کسی ظالم سماج کا بھی سامنا نہیں تھا اس لیے بھی کوئی فلمی سچویشن کری ایٹ نہیں ہو سکی اور انہوں نے سیدھے سیدھے بزرگوں کی سرپرستی میں بیاہ رچا کر شہر بھر کو دعوت کھلا دی۔" آفتاب اب بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

"بڑی شوخیاں سوجھ رہی ہیں جناب کو۔۔۔ حالانکہ جب سے آپ نے امام صاحب کو دیکھا ہے، مجھے مسلسل پریشان ہی نظر آتے رہے ہیں۔"

digestpk.blogspot.com

"پریشان تو میں اب بھی ہوں اور میری خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد شہر یار صاحب کو اس شخص کی یہاں موجودگی سے باخبر کردوں لیکن ان سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب اخبار دیکھ کر اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ آج کل کہاں مصروف ہیں۔" وہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ شہر یار صاحب چند دن کی چھٹیوں پر ہی گئے ہوں گے۔ آپ ٹرائی کرتے رہیں، کسی دن تو آپ کا ان سے رابطہ ہو ہی جائے گا۔" کشور نے اسے تسلی دی۔

"یہ زیادہ دن انتظار کرنے والا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس شخص کے بارے میں بتایا تھا کہ کس طرح یہ پیر آباد کی مسجد میں بہروپ بھر کر مولوی غلام محمد بنا ہوا تھا اور وہاں اس نے کئی معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ ماہ بانو کا چھوٹا بھائی تو بے چارہ اس کی ہوس کا شکار ہو کر موت کے منہ میں ہی چلا گیا تھا۔ اب یہاں بھی اس نے ایک معصوم بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اتنے مکروہ کردار کے شخص کو تو دنیے ہی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زمین پر آزادی سے چل پھر سکے... اور اس شخص کے بارے میں تو یہ بھی شبہ تھا کہ یہ را کا کوئی ایجنٹ ہے۔ آپ کو نور پور میں ہونے والا بم دھماکا یاد ہے؟ اس دھماکے میں خود کش حملہ آور بچے کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے شہر یار صاحب اللہ آباد کے ایک مدرسے تک پہنچ گئے تھے۔ اس مدرسے کو شاہنواز نام کا ایک آدمی چلا رہا تھا اور اپنی دریادلی اور نرم مزاجی کی وجہ سے گاؤں میں اس شخص کی بہت عزت تھی۔ وہ لڑکا بھی شاہنواز کے بہت قریب تھا لیکن بعد میں تحقیقات سے ثابت ہوا کہ شاہنواز نام کا وہ شخص حقیقت میں ملک دشمن ایجنٹ تھا جو دین دار آدمی کا بہروپ بھر کر معصوم بچوں کو ورغلانے کا کام کر رہا تھا۔ شاہنواز کے اس ٹھکانے پر غلام محمد کی موجودگی کے بھی ثبوت ملے تھے جس سے یہی اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ بھی را کا ہی ایجنٹ ہے اور اب اسے یہاں ایک بار پھر بہروپ میں دیکھ کر مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ شخص واقعی میں را کا کوئی ایجنٹ ہے جو مسلسل اپنے مشن پر ڈٹا ہوا ہے۔" آفتاب کے لہجے میں واضح تشویش تھی۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔ اللہ ظالم کی رسی بے شک دراز کر دیتا ہے لیکن پھر اس کے لیے اللہ کی پکڑ بھی بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کالے کرتوتوں والا بہروپیا بے شک ایک بار نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن انشاء اللہ اب ضرور پکڑا جائے گا۔ معصوم بچوں کا خون ناحق اس بار اسے بچ کر نہیں نکلنے دے گا۔" کشور کے پُریقین لہجے میں آفتاب کے لیے بڑی ڈھارس تھی۔ آفتاب نے اپنے دل میں ایک سکون سا اترتا ہوا محسوس کیا اور دھیرے سے مسکرا کر اپنی شریک حیات کو دیکھا۔ اس عورت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت کچھ کھویا تھا۔ خصوصاً پیر آباد کے اسکول کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہونے کا صدمہ اس کے دل کو اب بھی اداسی میں ڈبو دیتا تھا لیکن پھر بھی کبھی وہ پچھتاوے میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ کشور اس لائق تھی کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی... اسے یقین تھا کہ کشور کی ہمراہی میں ایک دن وہ، وہ سب کر پائے گا جو اس کا مقصد زندگی ہے اور جسے انجام دیے بغیر اس کا دل کبھی خوشی سے محروم رہے گا۔

"آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اچھا خاصا سفر کر کے آئے ہیں، تھکن تو ہو گئی ہوگی۔ آرام کرنے کے بعد فریش ہو جائیں گے تو پھر سکون سے اپنا کام کیجیے گا۔ آپ کو اپنا ناول بھی تو جلد از جلد مکمل کرنا ہے۔" گاؤں میں سہولیات کی قلت کی وجہ سے آفتاب کو ضروری فون کالز کرنے اور اپنے مطلب کے اخبار و جرائد کے حصول کے لیے گاؤں سے باہر جانا پڑتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی دونوں مقاصد کے لیے گیا تھا۔ شہر یار سے بات کرنے میں تو کامیابی نہیں ہو سکی لیکن اس کی شادی کی خبر مل گئی۔ اس خبر نے جہاں ان دونوں میاں بیوی کو خوش کیا، وہیں اس سے رابطہ نہ ہو سکنے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ موجودہ حالات میں یہ رابطہ بہت ضروری تھا اور تاخیر سے کوئی بڑی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ آفتاب کی طرح کشور بھی اس بات کو سمجھتی تھی لیکن اس کے سامنے پریشانی کا مظاہرہ کر کے اسے مزید ٹینشن میں مبتلا کرنے کے بجائے مسلسل خوش امیدی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آپ کا مشورہ تو مناسب ہے، واقعی میں اس وقت آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر سو جاؤں گا تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔" آفتاب نے اس سے اتفاق کیا اور سونے کے ارادے سے اٹھ گیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے چند سیکنڈز کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر کچھ اضطرابی انداز میں کھول کر کشور کی طرف دیکھا۔ کشور جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی، اس کے اضطراب کو محسوس کر کے اس کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف بیٹھ کر اپنی نرم ملائم انگلیوں سے اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔ آفتاب نے انگلیوں کے اس لمس سے عجیب سی فرحت محسوس کرتے ہوئے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا اور اس کے غیر مصروف بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس دہکتے ہونٹوں کے لیے شبنم کا احساس جگانے لگا اور جادو جگاتی ان انگلیوں کی ٹھنڈک اور سکون کو اپنے اندر اتارتا وہ کب نیند کی وادی میں جا پہنچا، اسے خود بھی خبر نہیں ہوئی۔ وہ ڈسٹرب نہ ہو اس خیال سے کشور نے بھی وہاں سے اٹھنا پسند نہیں کیا اور اپنی بے آرامی کی پروا کیے بغیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

شاید وہ آفتاب کے جاگنے تک اسی طرح بیٹھی رہتی لیکن دروازے پر ابھرنے والی دستک نے اسے اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ دستک کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا کہ باہر موجود فرد پہلے سے زیادہ زوردار دستک دیتا اور اس دستک کی آواز آفتاب کی نیند خراب کر دیتی۔ اس کی نیند خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنی گود میں رکھا اس کا سر نرمی سے تکیے پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران میں دوسری دستک دی جا چکی تھی جو کہ پہلے کی نسبت قدرے بلند تھی۔

"کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھول کر باہر جھانکنے کے بجائے اس نے اندر سے ہی دریافت کیا۔ شروع سے پردے میں رہنے کی وجہ سے اسے یوں بھی ہر ایک کے سامنے آنے کی عادت نہیں تھی۔ اس پر سے اس روپوشی کی زندگی نے اسے مزید محتاط بنا دیا تھا چنانچہ وہ کسی کے بھی سامنے بلاجھجک آ جانے سے گریز کرتی تھی۔

"احمد صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں کیا؟" باہر سے مہذبانہ انداز میں دریافت کیا گیا۔ اس گاؤں میں آفتاب نے اپنے نام کے دوسرے حصے سے ہی سب سے اپنا تعارف کروایا تھا اس لیے لوگ اسے احمد کے نام سے ہی جانتے تھے۔

"آپ کون صاحب؟" باہر موجود ملاقاتی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کشور نے اس سے دریافت کیا۔ باہر موجود شخص کے لہجے نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ اس گاؤں کا رہائشی نہیں ہے اس لیے اس نے یہ احتیاط برتی تھی۔

"خاتون! میں پیش امام ہوں اور احمد صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ گاؤں والوں کی زبانی ان کا تذکرہ سنا تو دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان سے ملا جائے اور مل کر ان کے مشاغل پر گفتگو ہو۔ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ کوئی بڑے لائق اور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں احمد صاحب... تو پھر بھلا ہم کیوں ایسے لائق فائق آدمی سے ملاقات کرنے سے محروم رہیں؟" باہر سے تعارف کے ساتھ نہایت تفصیلی جواب دیا گیا لیکن اس کے تعارف نے کشور کے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑا دی۔ یہ شخص پہلے بھی گاؤں کے ایک فرد کے ذریعے آفتاب کو ملاقات کا پیغام بھجوا چکا تھا۔ آفتاب کو اندیشہ تھا کہ جس طرح اس نے اسے مولوی غلام محمد کی حیثیت سے شناخت کر لیا ہے، اسی طرح وہ بھی اسے ماسٹر آفتاب کے طور پر پہچان لے گا اور یہ اس کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔

"میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں، احمد کچھ دیر قبل ہی سفر سے واپس آئے ہیں اور بہت زیادہ تھک کر سو رہے ہیں۔ میں ان کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتی۔" وہ جس کردار کا مالک تھا اس سے عزت و احترام کے ساتھ بات کرنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال نرمی برتی جائے اور رویے سے ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ وہ ان لوگوں کے لیے ایک ناپسندیدہ ہستی ہے۔

"ماشاء اللہ! احمد صاحب بڑے خوش قسمت آدمی ہیں کہ انہیں آپ جیسی خیال رکھنے والی بیوی ملی ہے۔ مجھے آپ کی شوہر پرستی اچھی لگی خاتون! اگر آپ حرج نہ سمجھیں تو احمد صاحب کے جاگنے کے بعد انہیں مطلع کر دیجیے گا کہ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا۔ وہ مناسب سمجھیں تو مجھے یہ شرف بخش دیں۔" اس شخص کے لب و لہجے سے صاف مصنوعی پن جھلک رہا تھا اور کشور جیسی محدود ماحول میں رہ کر پلنے بڑھنے والی لڑکی بھی محسوس کر سکتی تھی کہ وہ نرمی چاپلوسی سے کام لے رہا ہے، ورنہ اس کے الفاظ میں خلوص کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔

"میری تعریف کے لیے شکریہ! میں آپ کا پیغام اپنے شوہر تک پہنچا دوں گی لیکن آپ کو اتنا بتاتی چلوں کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں اور ہفتہ دس دن سے پہلے کسی سے شاید ہی ملاقات کر سکیں۔ امید ہے کہ آپ ان کی مجبوری کو سمجھیں گے اور تاخیر کے لیے برا نہیں مانیں گے۔" اس نے نہایت چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے آفتاب کو کچھ مہلت مل جاتی۔ یقیناً اس مہلت میں وہ شہر یار سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور اس بہروپیے کا انجام سامنے آ جاتا۔

"چلیں جیسے آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ آدمی تو ہم بھی عزت دار ہیں اور سارا گاؤں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے لیکن احمد صاحب شاید کچھ زیادہ ہی خاص آدمی ہیں جو کسی کو

digestpk.blogspot.com

گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ بہرحال، ہمارا شوقِ ملاقات اپنی جگہ ہے۔ اگر وہ اس بندۂ حقیر کے لیے کبھی وقت نکال سکیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اب مجھے اجازت دیجیے... خدا حافظ۔" کچھ دل گیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

کشور نے اس کے لہجے سے اندازہ لگالیا تھا کہ اسے اپنا ٹال جانا اچھا نہیں لگا اور وہ خاصا خفا ہوکر یہاں سے گیا ہے۔ اس کی گاؤں والوں کی نظروں میں جو عزت تھی اسے دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگاسکتی تھی کہ اس کا ناراض ہونا کوئی اچھا شگون نہیں ہے لیکن فی الحال انہیں جو مہلت درکار تھی، اس کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی مناسب تھا۔ بعد میں اس آدمی کی اصلیت کھل جاتی تو پھر سارے مسئلے خودبخود ہی حل ہو جاتے۔

اندر سے سخت تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ زبردستی خود پر بے نیازی طاری کرنے کی کوشش کرتی ہوئی دروازے سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ آفتاب ابھی تک گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے اخبار کا جائزہ لینے لگی۔ شہریار اور ہما کی شادی کی خبر کے سوا وہ کوئی دوسری خبر نہیں پڑھ سکی تھی چنانچہ اپنی فراغت کا فائدہ اٹھا کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔ جلد ہی اس کی نظروں نے اس خبر کو اپنی گرفت میں لے لیا جو شہریار کی شادی کی خبر کے ساتھ ساتھ ہی لگی تھی۔ اس خبر میں شہریار کے شادی کے موقع پر بے قابو ہوکر چودھری افتخار سے الجھ جانے کا واقعہ بیان کیا گیا تھا۔ خبر پڑھ کر وہ افسردہ ہوگئی۔ شہریار جیسے بندے کے اس طرح بے قابو ہوجانے کا مطلب تھا کہ اس کے باپ نے کوئی نہایت گری ہوئی حرکت ہی کی ہوگی جسے وہ برداشت نہیں کرسکا۔ اپنے باپ کے کردار پر دکھی وہ اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ بے شک اس کا باپ تھا لیکن تھا تو ظالموں کے اس قبیل میں سے ہی جن کی رسّی فی الحال دراز تھی اور وہ کبھی بھی اللہ کی پکڑ میں آسکتے تھے۔

☆☆☆

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" وہ کل والے پتھر پر ہی بیٹھی اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ اس کے قریب چلا آیا اور کچھ تحکمانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم لوگوں کے بدبودار کپڑے دھو دھو کر سر چکرانے لگا تھا اس لیے تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے بیٹھی تھی۔ یہاں سانس لینے پر بھی پابندی ہے کیا؟" اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دے کر پوچھا۔

"پابندی تو نہیں ہے لیکن میں اسے تمہارے لیے مناسب بھی نہیں سمجھتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہ سب عورت کے بھوکے ہیں۔ تم جتنی دیر ان کی نظروں کے سامنے رہوگی، ان کی اشتہا اتنی ہی بڑھے گی۔ بہتر ہے کہ احتیاط کرو اور کم سے کم وقت ان لوگوں کے سامنے گزارو۔" اس نے اردگرد پھرتے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا تو وہ کچھ چپ سی ہوگئی پھر کچھ دیر بعد بے چارگی سے بولی۔

"وہ جھونپڑی بہت تنگ و تاریک ہے۔ زیادہ دیر وہاں رہوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس کا جواب سن کر وہ تھوڑی دیر سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا تو ماہ بانو بے چون و چرا اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور پھر اس کی راہنمائی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ دونوں پیروں کے درمیان بندھی زنجیر قدموں کو تیز رفتاری سے حرکت دینے میں رکاوٹ تھی اس لیے آہستہ چلنا مجبوری تھی۔ وہ بھی یقیناً یہ بات سمجھتا تھا چنانچہ خود بھی بہت آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کا رخ درختوں کے اس قطار در قطار سلسلے کی طرف تھا جہاں سے آگے بھی یقیناً گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسے بہت آگے تک نہیں لے گیا اور درختوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر پہنچ کر رک گیا جہاں زمین کا ایک ٹکڑا درختوں سے خالی تھا اور بڑی ترتیب سے چھوٹی قامت کے خوش رنگ و خوشبودار پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ پودوں کے درمیان موجود فاصلے اور ترتیب سے ظاہر تھا کہ یہاں انسانی ہاتھوں نے کارروائی کی ہے۔

"اس جگہ کو میں نے اپنے لیے سجایا سنوارا ہے۔ مجھے اپنے لیے یہ چھوٹا سا گوشۂ سکون تیار کرنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ تمہیں یہاں جو خالی جگہ نظر آرہی ہے یہ پہلے درختوں اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے خود بڑی محنت سے اسے صاف کیا اور پھر یہاں یہ پھول دار پودے لگائے۔ جب بھی میرا دل سب سے کٹ کر چپ چاپ سکون سے بیٹھنے کی خواہش کرتا ہے تو میں یہاں چلا آتا ہوں۔ سردار سمیت میرے سب ساتھی جانتے ہیں کہ میں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کی آمد کو پسند نہیں کرتا اس لیے جب تک کوئی بہت ضروری کام نہ ہو، کوئی یہاں آکر مجھے ڈسٹرب نہیں کرتا۔ تمہیں میں خاص طور پر اجازت دے رہا ہوں کہ جب دل زیادہ گھبرائے اور کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھنے کا دل چاہے تو یہاں آجایا کرو۔" وہ نہایت نرم لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا

اور وہ دل ہی دل میں قدرت کی کرشمہ سازی کی معترف ہو رہی تھی۔ یہ اسی معبود کا کرشمہ ہی تو تھا کہ اس نے ان اجڈ ڈاکوؤں کے درمیان ایک شخص کے دل کو اس کے لیے موم کر دیا تھا اور اس کے بے بسی میں آسانی پیدا ہوگئی تھی۔

"میں نے ان دونوں درختوں کے درمیان ایک مچان بھی بنائی ہے۔ شکار وغیرہ کا تو مجھے اتنا خاص شوق نہیں لیکن اس مچان پر سے دور تک کا نظارہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس مچان پر چڑھنے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ تم جتنی دیر چاہو آرام سے وہاں بیٹھ سکتی ہو۔" انگلی سے اشارہ کر کے اسے مچان دکھانے کے ساتھ ساتھ اس نے آفر بھی کی جسے ماہ بانو نے فوراً قبول کرلیا۔ مچان اچھی خاصی بلندی پر تھی جس تک پہنچنے کے لیے لکڑیوں اور رسّی کی مدد سے ایک سیڑھی لگائی گئی تھی۔ اگر اس کے پیروں میں زنجیر نہ بندھی ہوتی تو وہ دومنٹ میں اس سیڑھی کی مدد سے اوپر چڑھ جاتی لیکن اس وقت اس کے سہارے کی محتاج تھی۔ وہ سہارا دے کر اسے اوپر لے گیا تو وہ وہاں کی صفائی ستھرائی دیکھ کر اور بھی حیران رہ گئی۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں کئی گھنٹے تک آرام سے رہا جاسکتا تھا۔ کونے میں رکھی مٹی کی صراحی اور اس پر موجود سلور کے گلاس سے ثابت ہوتا تھا کہ اپنے لیے یہ مچان بنانے والا یہاں اچھا خاصا وقت گزارتا ہے۔ مچان کے ایک کونے میں پیچھے کی جانب ایک نازک سی سبز بیل لگائی گئی تھی۔ اس بیل کے سبز پتوں میں سے جھانکتے ننھے ننھے کاسنی پھول آنکھوں کو عجب سی ٹھنڈک اور تازگی بخش رہے تھے۔ ایک طرف دو تین کتابیں بھی رکھی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کتابوں کو اٹھایا اور ان کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں سے دو شاعری کی کتب تھیں جبکہ ایک میں حالاتِ حاضرہ پر مبنی ٹی وی کے ایک پروگرام کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔

"تم تو بڑے باذوق قسم کے ڈاکو ہو۔ تمہارے اس گوشۂ عافیت کو دیکھ کر تو کوئی یقین ہی نہیں کرسکتا کہ اس کی تعمیر میں کسی ڈاکو کا ہاتھ ہے۔" ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔

"میں کوئی ماں کے پیٹ سے تو ڈاکو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس زندگی سے پہلے بھی میری ایک زندگی تھی جس میں، میں واپس نہیں جاسکتا لیکن جس کا کچھ حصہ میں نے یہاں اپنے لیے تخلیق کرلیا ہے۔" اس نے یاسیت سے جواب دیا۔

"اپنی اس زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ نا۔" وہ اب اس سے خوف زدہ نہیں تھی اس لیے نہایت اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ صرف تمہیں یہاں تک پہنچانے آیا تھا۔ تمہارا جب تک دل چاہے، یہاں رہو پھر واپس آجانا۔ چڑھنے کی نسبت یہاں سے اترنا آسان ہے اس لیے تمہیں خود سے واپس آنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ البتہ تمہیں دیر ہوگئی تو پھر میں خود تمہیں لینے کے لیے آجاؤں گا، پریشان مت ہونا۔" اسے ہدایات و تسلیاں دیتے ہوئے اس نے ایک طرف ٹنگی دوربین اتار کر اپنے کندھے سے لٹکالی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماہ بانو اس دوربین کی مدد سے زیادہ دور تک کا جائزہ لے سکے۔

"جانے سے پہلے اتنا بتادوں کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس جنگل میں بہت دور دور تک ہمارا راج ہے اور میرے ساتھی جگہ جگہ پہرا دیتے رہتے ہیں۔ بالفرض اگر تم ان سے بچ کر نکلنے میں کامیاب بھی ہوگئیں تو اس جنگل سے نہیں نکل سکوگی اور بھٹک کر یا تو بھوکی پیاسی مرجاؤگی یا پھر کسی درندے کی بھوک مٹانے کے کام آجاؤگی۔" جاتے جاتے اس نے اسے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔ ماہ بانو کو اس کی کسی بات کو ماننے میں کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اسے اتنے آرام سے یہاں آزادی سے چھوڑ کر جارہا ہے تو اسی لیے کہ اپنے حفاظتی نظام سے پوری طرح مطمئن ہے۔

"میں یہ سب سمجھتی ہوں۔ تمہیں مجھے دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے نہایت رسان سے جواب دیا۔

"گڈ گرل! تو پھر ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" اس نے مچان سے لگی سیڑھی پر قدم رکھا۔

"بات سنو۔" اس کے دوسرا قدم نیچے رکھنے سے پہلے ماہ بانو نے اسے پکارا تو وہ اپنی جگہ ٹھہر کر اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اپنا نام تو بتادو۔" اس نے فرمائش کی۔

"اسلم... اسلم تیغو ہے میرا نام۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے سیڑھی اتر گیا۔ ماہ بانو اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس کی نظریں ایک بار پھر وہاں موجود پھولوں کے پودوں پر بھٹکنے لگیں۔ سرخ، گلابی، کاسنی اور زرد رنگوں کے وہ پھول دار پودے جن ہاتھوں نے اگائے تھے، اس کے صاحبِ دل ہونے پر کوئی شبہ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا مگر اس دل والے کی زندگی میں کون سا حادثہ رونما ہوا تھا کہ وہ رنگ برنگی پھولوں کی دنیا سے نکل کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے والوں میں شامل ہوگیا تھا۔ اسلم تیغو کی زندگی کے ایسے کسی حادثے کے بارے میں سوچ کر دل ہی

digestpk.blogspot.com

دل میں افسردہ ہوتی ہوئی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ کھڑے ہونے پر اسے اس پھلواری سے ہٹ کر بھی جنگل کا منظر نظر آ رہا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے جنگل کا جو حصہ تھا، وہاں درختوں کی اتنی زیادہ بہتات نہیں تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس حصے سے درختوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسا یقیناً ان ڈاکوؤں نے ہی کیا ہوگا تا کہ ان کی قیام گاہ تک گزرگاہ بن سکے اور قرب و جوار پر نظر رکھی جا سکے لیکن انہوں نے اتنی چالاکی ضرور کی تھی کہ درختوں سے خالی ہو جانے والی زمین پر خودرو پودوں اور جھاڑیوں کو اگنے سے نہیں روکا تھا۔ اس طرح کوئی باہر کا بندہ اگر وہاں آ بھی جاتا تو گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جنگل کے اس حصے میں انسانی ہاتھوں نے کارگزاری دکھائی ہے۔ وہ خود بھی محض اس لیے اندازہ لگا سکی تھی کہ خود یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان قیام پذیر تھی اور کچھ کچھ ان لوگوں کے بارے میں سمجھنے لگی تھی۔ ابھی تک یہاں اس کا اسلم کے سوا ایسے کسی آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جسے دیکھ کر یہ گمان ہو کہ وہ مجبوراً یا حادثاتی طور پر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہوا ہوگا۔

سوچتے سوچتے اور اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا دھیان اپنی کلائی پر محسوس ہونے والی جلن کی طرف گیا۔ اس کی کلائی بہت زیادہ نہیں جلی تھی لیکن پانی میں کام کرنے کی وجہ سے جلی ہوئی جلد کو نقصان پہنچا تھا اور ابھی خاصی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ جلن کے اس احساس نے اسے گزرا ہوا ماضی یاد دلا دیا اور بے ساختہ ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بے بے جس نے اسے گود لیا تھا، اس کے کیسے کیسے ناز اٹھاتی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے اور گھومنے پھرنے تک اس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ دسویں جماعت میں آنے تک بے بے نے اسے گھرداری کے جھمیلوں سے بھی دور رکھا تھا لیکن پھر اردگرد کی عورتیں اسے ٹوکنے لگیں۔ بے بے کو محلے والیوں کی یہ بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے اسے گھرداری کی تربیت دینا شروع کر دی۔ وہ خود ہمیشہ سے بے بے اور ابا کی خدمت کرنے کی خواہش مند رہا کرتی تھی چنانچہ خوشی خوشی گھرداری کے ہنر سیکھنے لگی۔ اس کی تربیت کا دوسرا ہی ہفتہ شروع ہوا تھا کہ ایک شام اس نے بے بے سے ضد کی کہ آج رات کی روٹیاں میں پکاؤں گی۔ اس کی ضد کے آگے بے بے مجبور ہو گئیں اور وہ ان کی زیر نگرانی روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔ کوئی تجربہ تو تھا نہیں۔ شومئی قسمت وہ پہلی آڑی ترچھی روٹی بیل کر توے پر ڈالنے لگی تو ہاتھ گرم توے سے جا ٹکرایا۔

پھر تو اس کی ہائے ہائے...... تھی اور بے بے کی تدبیریں کہ کسی طرح اس کی تکلیف کم ہو جائے۔ رات میں ابا اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو وہ متاثرہ ہاتھ پر مرہم کی تہ جمائے بیٹھی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تیر رہے تھے۔ ابا نے اس کی تکلیف دیکھی تو بے بے کو ڈھیروں باتیں سنا ڈالیں جنہوں نے اس کی لاڈلی سے چولہے ہانڈی کا کام لینے کی جسارت کی تھی۔ پہلے سے دکھی بے بے، ابا کی ڈانٹ کھا کر رونے لگی اور اعلان کر دیا کہ اب ماہ بانو سے گھر کا کوئی کام نہیں لے گی۔

وہ بیتے لمحوں کی گرفت میں آئی تو بے ساختہ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کا یہ سلسلہ رواں جانے کب تک جاری رہتا کہ وہ ایک نسوانی چیخ سن کر چونک پڑی۔ یہ چیخ بہت زوردار نہیں تھی لیکن کہیں قریب ہی سے ابھری تھی اس لیے اس کی سماعتوں نے اسے واضح طور پر سنا۔ وہ ادھر ادھر نظریں گھما کر چیخنے والی کو تلاش کرنے لگی۔ مسلسل آوازوں نے اس کی رہنمائی کی۔ چیخنے والی کے انداز میں خوف کے بجائے احتجاج تھا اور لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔ ماہ بانو کو اس عورت کو شناخت کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ وہ وہی مدقوق سی عورت تھی جس کے ساتھ مل کر اس نے کل کپڑوں کا ڈھیر دھویا تھا۔ اسے ایک مرد کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لیے جا رہا تھا اور وہ مسلسل سے اسے گالیاں دیتی ہوئی چیخ چلا کر اس کے ساتھ جانے سے مزاحمت کر رہی تھی لیکن ایک طاقتور مرد کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ شاید اپنی اس ناکامی پر ہی اس نے جھنجلا کر مرد کو کاٹ لیا لیکن اس کا یہ احتجاج اسے مہنگا پڑا اور مرد نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ مارنے کے بعد وہ اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا۔ سن کھڑی یہ سب دیکھتی ماہ بانو کو کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اسی جگہ گھٹنوں تک سر دیے کر بیٹھ گئی۔ عورت ذات کی جتنی تذلیل اس نے اس جگہ دیکھی تھی، اس سے پہلے کہیں اور سابقہ نہیں پڑا تھا۔

وہاں موجود کل دو عورتیں ان سارے مردوں کی جاگیر تھیں۔ اس وقت جنگل میں دن دہاڑے یقیناً یہی گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ خود اس کے ساتھ ابھی کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ خوف زدہ تھی کہ درندوں کے درمیان وہ کب تک محفوظ رہ سکے گی؟ اگرچہ اسلم تنہا اس کے لیے ایک ڈھال بنا ہوا تھا لیکن درندوں پر بھروسا تو بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کوئی اپنے سفلی جذبات سے مغلوب ہو

اس پر ٹوٹ پڑتا تو شاید اسلم کے لیے بھی اس کا دفاع کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس کی نظریں درختوں کے اس جھنڈ پر جا ٹکیں جہاں اس نے ان دونوں مرد وزن کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اسے وہاں سے مرد برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ وہ کسی بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا چل رہا تھا۔ ماہ بانو نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی تھا جو گزشتہ روز کپڑوں کی دھلائی کے دوران اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا اس جانب مڑ گیا جہاں ان لوگوں کی رہائشی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے حرکت میں آئی اور احتیاط سے سیڑھیاں اتر کر پھلواری سے گزرتی ہوئی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ مدقوق سی عورت موجود تھی۔

اس عورت نے اب تک اس کے ساتھ کوئی اچھا رویہ نہیں رکھا تھا اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی تھی لیکن اس وقت وہ اس کا ہر رویہ بھلائے اس کی ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی سمجھ آ رہا تھا کہ عورت کے خراب رویے کے پیچھے اس کے حالات کارفرما تھے۔ وہ یہاں جو ذلت اور جسمانی مشقت اٹھا رہی تھی، اس کے بعد یقینی طور پر اس لائق نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی سے خوش اخلاقی و خوش گفتاری کا مظاہرہ کر سکے۔ عورت کے حالات کا تجزیہ کر کے اس سے مزید ہمدردی محسوس کرتی ہوئی وہ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئی تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ عورت زمین پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی اور اس کے بال اس بری طرح نوچے کھسوٹے گئے تھے کہ وہ بری طرح بکھر کر رہ گئے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچی اور اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹایا۔ وہاں ایک اور دردناک منظر اس کا منتظر تھا۔ عورت کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان تھے اور ان سے رستے والا خون اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش نہیں تھی لیکن بالکل بے دم سی پڑی آنکھیں بند کیے ہولے ہولے سسک رہی تھی۔

"سنو! آنکھیں کھولو۔" اس نے دھیرے سے عورت کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تو اس نے قدرے چونکتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ان پوری کھلی ہوئی آنکھوں کو قریب سے دیکھنے پر ماہ بانو پر انکشاف ہوا کہ وہ آنکھیں اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی خوب صورت ہیں جو یقیناً کبھی عورت کے سراپا کو بہت پرکشش بنا دیتی ہوں گی لیکن اب آنکھوں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھی ویرانی نے ان کی ساری خوب صورتی اور کشش کو ماند کر دیا تھا۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا، مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو ان سارے درندوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دیتی۔" عورت سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنے دلی جذبات بھی بیان کیے۔

"تم کیوں افسوس کر رہی ہو؟ یہ درندے تمہیں تو کچھ نہیں کہتے۔ تم تو اسلم کی چہیتی ہو اور اپنی چہیتی کی طرف وہ کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنے دے گا۔" اس نے کچھ جلے کٹے لہجے میں اسے جواب دیا۔ لہجے کی یہ تپش شاید اپنی بدقسمتی اور ماہ بانو کی خوش قسمتی کی وجہ سے تھی۔ وہ دونوں عورتیں تھیں لیکن ایک کسی کی منظور نظر ہونے کی وجہ سے محفوظ و مامون تھی تو دوسری سب کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ مجھے اپنے اردگرد کے لوگوں کا ہمیشہ بہت خیال رہتا ہے۔ تم بے شک میرے لیے اجنبی ہو لیکن ہو تو میری ہم جنس ہی اور اب ہم ایک جگہ ہی رہ رہے ہیں۔ اس لیے مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔" عورت کی بات کا برا مانے بغیر اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"خالی خولی ہمدردی سے مجھے کیا ملتا ہے۔ تمہاری یہ ہمدردی میرے حالات تو نہیں بدل سکتی۔" وہ رونا ترک کر چکی تھی اور اب اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماہ بانو نے سہارا دے کر اس کی اس کوشش کو کامیاب بنایا۔ اس کے اس طرح سہارا دینے پر قدرتی طور پر عورت کا دل اس کی طرف سے قدرے نرم پڑ گیا اور وہ آہستہ سے بولی۔ "شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں۔"

"ایک مدت گزری، لگتا ہے انسانوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" یاسیت زدہ لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی۔

"تم یہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان کیسے پہنچیں؟" ماہ بانو کے تجسس نے اسے سوال کرنے پر اکسایا۔

"قسمت کو تو دوش نہیں دوں گی، میری اپنی ہی کوتاہیاں تھیں جو مجھے یہاں لے آئیں۔" اس کے بے رونق چہرے پر پچھتاوے رقص کر رہے تھے۔

"اگر تم چاہو تو مجھے اپنے حالات بتا سکتی ہو۔ میں نے

digestpk.blogspot.com

شک تمہاری مدد نہ کر سکوں لیکن کبھی کبھی کسی سے اپنا حال کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔" ماہ بانو نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا بوجھ تو قیامت تک نہیں اترنے والا... ہاں، میں تمہارا تجسس دور کرنے کے لیے اپنے حالات سنا سکتی ہوں۔" اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہوگئی۔

"تجسس تو مجھے واقعی ہے کیونکہ جن حالات سے گزر کر میں یہاں پہنچی ہوں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بھی غیر معمولی حالات میں ہی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ تمہاری بات چیت کے انداز سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تم ان ڈاکوؤں سے الگ ہو اور کہیں باہر سے ہی یہاں لائی گئی ہو۔"

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے تو میری خودسری اور نافرمانی یہاں تک لے آئی، ورنہ میں تو بڑے عزت دار ماں باپ کی اولاد تھی۔ میرے والد نے میری پیدائش پر بہت محبت سے میرا نام غزالہ رکھا تھا، میری آنکھیں بہت خوب صورت تھیں نا اس لیے۔ میرے والد بڑا شاعرانہ مزاج رکھنے والے ایک پڑھے لکھے شریف آدمی تھے۔ انہیں ادب سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ایک پرائیویٹ کالج میں اردو کے استاد تھے۔ میرے بعد دو بہنیں اور تھیں لیکن میں بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے والد کی بہت زیادہ لاڈلی تھی۔ امی بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں لیکن انہوں نے مجھے باقی دونوں بہنوں پر کبھی فوقیت نہیں دی تھی۔ وہ اولاد میں مساوات کی قائل تھیں۔ ان کے مقابلے میں ابو مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ گھر میں آنے والی ہر اچھی چیز پر سب سے پہلے میرا حق ہوتا تھا، اس کے بعد ہی چھوٹی دونوں بہنوں کو کچھ مل پاتا تھا۔ اس ترجیحی سلوک نے مجھے اچھا خاصا ضدی اور خودسر بنا دیا تھا لیکن میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی اس لیے میرے مزاج کے باوجود دونوں بہنوں کے مقابلے میں ہر جگہ مجھے ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ پڑھائی کے علاوہ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ خاندان، محلے اور کالج میں میری خوب صورتی اور ذہانت کے چرچے تھے۔ کالج میں کوئی فنکشن ہوتا تو میں سب سے نمایاں ہوتی۔ ایک بار سالانہ فنکشن کے موقع پر میں نے ایک ڈرامے میں حصہ لیا اور انارکلی کا کردار ادا کیا۔ ہر ایک کا کہنا تھا کہ میں اس کردار کے لیے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھی۔ فنکشن میں شریک ایک فلم پروڈیوسر نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی۔ وہ میرا پتا حاصل کر کے ہمارے گھر تک آپہنچا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی۔ اس نے یہ آفر ابو کے سامنے ہی کی تھی۔ ابو بڑے وضع دار آدمی تھے۔ انہوں نے پروڈیوسر کی خاطر مدارات تو خوب کی لیکن میرے کام کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم سیدھے سادے عزت دار لوگ ہیں اور مجھے قطعی اچھا نہیں لگے گا کہ میری بیٹی فلموں میں ناچنے گانے کا کام کرے۔ اس پر اس پروڈیوسر نے بتایا کہ وہ خود فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کی وجہ سے اب فلموں پر زیادہ سرمایہ کاری کرنے کے بجائے دوسری طرف دھیان دے رہا ہے اور سائڈ بزنس کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول رکھی ہے۔ ابو اجازت دیں تو وہ مجھے کمرشلز میں بک کر سکتا ہے۔ اس نے ابو کو لالچ بھی دیا کہ کمرشلز میں کام کر کے میں بہت کم وقت میں اتنا کما سکتی ہوں کہ گھر کے حالات بدل جائیں گے۔ ایک چند ہزار کی نوکری کرنے والے استاد کے لیے جس کے سر پر تین تین بیٹیوں کا بوجھ ہو یہ ترغیب بڑی کشش رکھ سکتی تھی لیکن ابو نے اپنا فیصلہ بدلنا پسند نہیں کیا۔

"ابو کے فیصلے کے سامنے میں بھی بظاہر چپ رہی لیکن حقیقت میں مجھے یہی لگا کہ ابو نے مجھے زندگی میں ملنے والا ایک بہترین چانس میرے ہاتھ سے نکال دیا ہے۔ اپنی دوستوں سے جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو ان میں سے اکثر نے افسوس کیا کہ میں اتنا سنہری موقع ضائع کر رہی ہوں۔ اپنی ذاتی خواہش اور دوستوں کے تبصروں نے مجھے اکسایا کہ میں خود اس فلم پروڈیوسر سے رابطہ کروں۔ اپنا وزیٹنگ کارڈ وہ دے کر ہی گیا تھا۔ میں نے اس پر چھپے نمبر پر کال کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ٹی وی کمرشلز میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس بات پر بھی راضی ہو گیا کہ جب تک میں اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپانا چاہتی ہوں، وہ کالج ٹائمنگ میں مجھ سے کام لے گا۔ بس پھر اس دن سے یہ ہونے لگا کہ میں گھر سے تو کالج کے لیے نکلتی لیکن وہاں پہنچنے کے بجائے ایڈورٹائزنگ ایجنسی پہنچ جاتی۔ ابتدا میں میری گرومنگ کی گئی اور ایک ماڈل کی طرح چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے گئے۔ اس کے بعد میرا حلیہ تبدیل کیا جانے لگا۔ بے شمار فیس سروسز کے ساتھ ساتھ کٹنگ کر کے میرا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کر دیا گیا۔ امی ان تبدیلیوں پر چونکیں اور مجھ سے پوچھ تاچھ کی۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ میری ایک دوست پارلر کا کورس کر رہی ہے، اسے پریکٹس کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت تھی اس لیے اس

digestpk.blogspot.com

''اس موقع پر ابو میری ڈھال بن گئے اور مجھے امی کے عتاب سے بچایا لیکن جس دن ٹی وی پر میرا پہلا کمرشل چلا، ابو ہی سب سے زیادہ دکھی ہوئے۔ صدمے کی وجہ سے وہ دو دن تک کچھ کھا پی سکے، نہ ڈھنگ سے سوئے۔ دو دن بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ تم نے ایک کمرشل میں کام کر کے اپنا شوق پورا کرلیا ہے لیکن آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا لیکن مجھ پر تو نئی نئی شہرت اور پیسے کا نشہ طاری ہو چکا تھا۔ میں نے ابو کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنی من مانی کرتی رہی۔ اب چھپ چھپا کر بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں دھڑلے سے سر شام تیار ہو کر گھر سے نکلتی۔

نے میرے ساتھ یہ سب کر ڈالا۔ امی تب بھی بہت غصہ ہوئیں کہ کیا ضرورت تھی کبھی کی محبت میں اپنا یہ حال کر دینے کی۔ انہیں میرا ماڈرن حلیہ قطعی پسند نہیں آرہا تھا۔

میری اس خودسری نے ابو کو سانپ سونگھا دیا، البتہ امی خوب باتیں سناتیں اور بڑبڑاتیں۔ انہوں نے دونوں بہنوں کو بھی مجھ سے بات چیت کرنے سے روک دیا تھا لیکن ان دنوں مجھے کسی کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ میں بن ٹھن کر گھر سے نکلتی اور رات گئے واپس آتی۔ مجھے واپس گھر پہنچانے کی ذمے داری پروڈیوسر نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ ایک رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب میں اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں شوبز کی ایک تقریب سے واپس آرہی تھی تو ایک سنسان سڑک پر ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا اور اغوا کر کے یہاں لے آئے۔ اصل میں تو ان کا شکار وہ پروڈیوسر ہی تھا جسے انہوں نے تاوان کے لیے اغوا کیا تھا۔ میں مال غنیمت کے طور پر ان کے ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے اس مال غنیمت سے خوب خوب استفادہ کیا۔ بعد میں پروڈیوسر کے گھر والوں نے منہ مانگا تاوان ادا کر کے اسے تو چھڑوا لیا لیکن میں یہیں پھنس گئی۔ سردار نے تاوان کی وصولی کے ساتھ ساتھ اس کی رہائی کے لیے یہ شرط بھی رکھ دی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد کسی کو نہیں بتائے گا کہ اغوا کے وقت اس کے ساتھ میں بھی تھی۔ اسے اپنی جان پیاری تھی چنانچہ بڑی آسانی سے یہ شرط مان گیا۔ ویسے بھی میں اس کی کیا لگتی تھی جو وہ میرے لیے فکر مند ہوتا۔ پہلے بھی اس نے اپنے فائدے کے لیے مجھے غزالہ سے لیلیٰ بنا کر استعمال کیا تھا اور مجھے چند ہزار دے کر خود لاکھوں کمائے تھے۔ جب اپنی جان پر بنی تو وہ میری قربانی دے کر خود اڑن چھو ہو گیا۔ ظاہر ہے، زندگی رہتی تو وہ مجھ جیسی شوبز کی چکا چوند سے اندھی ہو جانے والی دوسری کئی لڑکیوں کو پھنسا کر تاوان میں دی گئی رقم سے زیادہ کما لیتا۔

''وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا اور اب میں اپنے ماں باپ کا دل دکھانے کی سزا بھگت رہی ہوں۔'' غزالہ عرف لیلیٰ کی داستان بڑی افسوسناک اور سبق آموز تھی اور خود وہ عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھی۔

ماہ بانو کو اس کی داستان سن کر دلی افسوس ہوا۔ اس نے اپنی نافرمانی و خودسری کی بہت بڑی سزا پائی تھی اور مسلسل اذیت میں مبتلا تھی۔ کچھ دیر قبل اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا کسی عورت کے لیے اس سے بڑی تکلیف اور ذلت کی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی خواہش مند وہ لڑکی اتنے گہرے پاتال میں گری تھی کہ اب شاید وہاں سے نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ حساس دل ماہ بانو کو چپ سی لگ گئی۔

''تم نے تو دل پر ہی لے لیا۔ اتنی افسردہ نہ ہو۔ میں نے اپنے حالات کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ پہلے بہت روتی دھوتی تھی، اب تو چپ چاپ ہر رات اس اذیت سے گزر جاتی ہوں۔ اس کتے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے، اب میرے اندر بڑی برداشت آگئی ہے لیکن اس کمینے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے اسے تو وہ موٹی حمیداں ہی سہہ سکتی ہے۔'' اس کا اشارہ یقیناً ڈیرے پر موجود اس دوسری عورت کی طرف تھا۔

''حمیداں یہاں کیسے ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بڑی مردوں عورت لگتی ہے اور اس کی یہاں موجود ان ڈاکوؤں سے بنتی بھی خوب ہے۔ تمہاری طرح وہ اس ماحول سے بیزار بھی نہیں لگتی؟''

''وہ کیوں ہوگی بیزار؟ اس کا اپنا مرد اس گروہ میں شامل تھا۔ وہ اپنے مرد کے ساتھ مزے سے یہاں رہتی تھی۔ ایک واردات میں وہ مارا گیا تو یہ سب کی بیوی بن گئی۔ ایک بیٹا بھی ہے اس کا۔ شہر میں ہاسٹل میں رکھ کر پڑھا رہی ہے۔ ادھر جو خدمتیں کرتی ہے، اس کے بدلے بیٹے کو بھر بھر کر نوٹ بھیجتی ہے۔ سال میں ایک بار اسے مہینے بھر کی چھٹی بھی ملتی ہے، ان چھٹیوں میں وہ شہر جا کر بیٹے کے ساتھ رہتی ہے اور خوب موجیں کرنے کے ساتھ ساتھ مال دار پارٹیوں کے بارے میں کھوج بھی لگا کر آتی ہے۔ اس کی مخبری پر ان لوگوں نے بڑے بڑے ڈاکے مار کر خوب مال کمایا ہے۔ وہ تو چہیتی ہے ان لوگوں کی۔'' لیلیٰ نے قدرے طنز اور نفرت کے ساتھ حمیداں کے بارے میں بتایا تو زندگی کے نت نئے بھیدوں کے خود پر کھلنے پر حیران ماہ بانو اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال بڑی بے خبری میں

معصوم خواہشوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزارے تھے لیکن اب زندگی عجیب ہی ڈھنگ کے ساتھ اس پر منکشف ہو رہی تھی۔ وہ جہاں جاتی تھی، وہاں زندگی کا ایک حیران کن روپ دیکھنے کو ملتا تھا۔

''تو تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں سمجھا کہ میرے سمجھانے کے باوجود کوئی ایڈونچر کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو اور اب جنگل میں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔'' اسلم کب وہاں آیا، اسے اور لیلیٰ کو پتا نہیں چلا۔ وہ اس کی آواز سن کر ہی چونکیں۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر یہاں سے بھاگنا اتنا آسان ہوتا تو کوئی بھی عورت یہاں رہ کر ذلت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔'' وہ سمجھ گئی تھی کہ اسلم پہلے اسے اپنی بنائی ہوئی چھولداری میں دیکھنے گیا ہوگا اور اس کے وہاں نہ ملنے پر تشویش زدہ ہو کر اسے ادھر ادھر ڈھونڈنے نکلا ہوگا۔

''اب واپس چلو، کافی دیر ہو گئی ہے۔'' اسلم نے ایک بے نیازانہ نظر دگرگوں حالت میں بیٹھی لیلیٰ پر ڈالی اور بلا تبصرہ اس سے بولا۔

ماہ بانو نے خاموشی سے اس کے حکم کی پیروی کی اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسلم سے بگاڑ کر وہ اپنے اتنے بڑے سپورٹر سے محروم ہونا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس کی بات ماننے میں ہی بھلائی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ سے نکلتے چلے گئے۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی لیلیٰ کی ان کی پشت کو گھورتی آنکھوں نے اس پل جتنے رنگ بدلے، وہ ان دونوں کو ہی نظر نہیں آئے۔

☆☆☆

''چودھری کی حویلی سے کوئی خبر ملی عبدالمنان؟''

''تو سر! فی الحال تو ایسی کوئی خبر نہیں ہے جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔ میں نے حویلی کی جس ملازمہ کو مخبری پر لگایا ہوا ہے، اس نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ چودھری صاحب آج کل بہت غصے میں ہیں اور انہیں ابھی تک اس شخص کی تلاش ہے جس نے حویلی کے ملازموں کی مدد سے ماہ بانو کو وہاں سے نکالا ہے۔ شروع میں وہ آپ پر ہی شک کر رہا تھا لیکن اب اسے کسی وجہ سے یہ یقین آچکا ہے کہ آپ کا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے اس لیے وہ دن رات اپنے قریبی ملازموں پر برس رہا ہے کہ اصل مجرم کا سراغ لگانے کے ساتھ ساتھ ماہ بانو کو بھی تلاش کریں لیکن فی الحال وہ لوگ بھی ناکام ہیں۔'' عبدالمنان نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

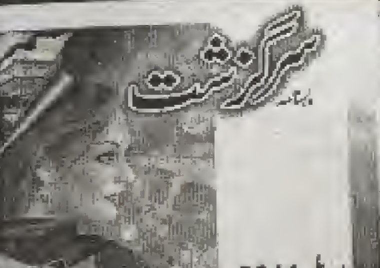

اپریل 2011ء کی ایک جھلک

شہنشاہ فن

پاکستان کی شان، ایک باکمال شخص کی زندگی نامہ جس کے فن کی قدر و قیمت سے ہم کلی طور آگاہ نہیں ہیں

کالی موت

وہ بیماری جس نے پوری دنیا کا نظام تہ و بالا کر دیا تھا کیسے اور کس طرح پھیلی؟

بے نوا مسافر

اس شاعر خوش نوا کا مختصر سا تعارف نامہ جس کے اشعار دل میں گدگدی پیدا کرتے ہیں

علاج

اگر عقل سے کام لیا جائے تو گھر کبھی نہیں ٹوٹتا ایک ایسی سچ بیانی جو مدتوں یاد رہے گی

اور کئی شمارے

قلم و ادب کے مختلف گوشوں پر مبنی داستانیں، کہی ان کہی باتیں، سراب جیسی مقبول طویل سرگزشت

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،

آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

"سمجھ نہیں آتا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ادھر کراچی سے بھی کوئی خوش کن اطلاع نہیں مل رہی ہے۔ ڈاکٹر طارق اور اس کی بہن کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ ان کے والدین کے گھر پر ریڈ کروا کر بھی دیکھ لیا اور ان کے والد کو پولیس کسٹڈی میں لے کر بھی۔ پولیس نے ان کے والد سے ٹھیک ٹھاک تفتیش کی ہے لیکن ان کا یہی جواب ہے کہ انہیں اپنے بیٹے اور بیٹی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے جس بندے کو اس کام پر لگایا ہے، اس کا کہنا ہے کہ مجھے بڑے میاں سچے لگ رہے ہیں۔ وہ کافی اچھی شہرت رکھنے والے آدمی ہیں جن کی شرافت کی آس پڑوس والوں نے بھی گواہی دی ہے۔ کسی شریف آدمی کا عموماً پولیس کی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہیں ہوتا اور اسے سچ اگلنا ہی پڑتا ہے۔"

"آپ پریشان نہیں ہوں سر! انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل ہی آئے گی۔" عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

"امید تو میں بھی یہی رکھتا ہوں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا بھی مجھے پسند نہیں۔ ہم کوشش کریں گے تب ہی تو اللہ بھی ہماری بہتری کرے گا۔ بے عمل انسان تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"کوششیں تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ اللہ کامیابی بھی ضرور عطا کرے گا، بس اس کا طے کیا ہوا وقت آجائے۔ جیسے آج بھی ایک اچھی خبر آپ کی منتظر ہے۔"

"کون سی اچھی خبر؟" شہریار چونکا۔

"میں آپ کو وہ خبر سنانے کے بجائے دکھانا پسند کروں گا۔" عبدالمنان ایک دم اٹھ کر آفس سے باہر نکل گیا، پھر دو منٹ بعد وہ دستک دے کر اندر آیا تو اکیلا نہیں تھا۔

"مشابرم خان۔" عبدالمنان کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"جی سر جی! یہ ہم ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"تمہیں دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم اتنی اچانک کیسے رہا ہو گئے۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔" اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"مہربانی تو آپ کی ہی ہے صاحب! آپ کی کوششیں شامل نہیں ہوتیں تو ان سے ہماری جان اتنی آسانی سے کہاں چھوٹتی۔ بس اللہ کا کرم یہ ہوا کہ ادھر میجر ذیشان بھی ہماری مدد کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ ہمارے ہاتھ صاف تھے اس لیے سب کی کوششیں کامیاب رہیں۔ میجر ذیشان نے ہی ہم سے کہا تھا کہ اسے سی صاحب کو پہلے سے خبر دینے کے بجائے اچانک ان کے سامنے پہنچ جاؤ تو وہ زیادہ خوش ہوں گے۔" مشابرم خان نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا۔ اس کی صحت کافی متاثر ہوئی تھی۔ شمال کے پہاڑوں کے درمیان موجود شدت پسندوں کا خفیہ ٹھکانا تباہ ہوتے ہوئے جہاں بہت سی انسانی زندگیوں کا چراغ بجھ گیا تھا، وہاں مشابرم خان بھی کافی زخمی ہوا تھا۔ بعد میں علاج معالجہ تو ہوا لیکن اسے وہاں اپنی موجودگی کے اسباب بیان کرنے اور اپنی صفائی دینے کے لیے کافی عرصہ تحقیقاتی اداروں کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر ماہ بانو اس کے حق میں گواہی نہیں دیتی اور شہریار اس کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے متحرک نہ ہوتا تو وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔

"تو تم نے اور میجر صاحب نے مل کر مجھے سرپرائز دیا ہے۔" شہریار مسکرا کر بولا۔ حقیقتاً اسے مشابرم خان کو سامنے دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ وقتی طور پر اپنی ساری ٹینشن فراموش کر بیٹھا تھا۔

"ہم نے جو کیا وہ میجر صاحب کے کہنے پر کیا ورنہ ہمیں یہ سرپرائز ورپرائز کا کیا خبر؟" مشابرم خان شرمایا۔ "میجر صاحب نے کہا تھا کہ اپنے صاحب سے کہنا مجھ سے رابطے میں رہیں۔" اس نے اس تک پیغام پہنچایا۔

"اوکے! میں انہیں فون کر لوں گا۔" شہریار نے اسے جواب دیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عبدالمنان نے کال ریسیو کی اور آپریٹر سے بات کرنے لگا۔

"سر! کوئی منشا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں بھی ان کا فون آیا تھا لیکن انہوں نے کوئی پیغام دینا پسند نہیں کیا تھا۔" آپریٹر کی بات سن کر اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

"بات کرواؤ۔" شہریار نے فوراً اجازت دی۔ اسے معلوم تھا کہ ماسٹر آفتاب کا قلمی نام ایم اے منشا ہے اور اس کے بار بار فون کرنے سے ظاہر تھا کہ اسے کوئی خاص کام ہے۔

"او کے سر۔" عبدالمنان نے آپریٹر سے لائن ملانے کا کہا اور شہریار کے اشارے پر ریسیور اسے تھما کر مشابرم خان کو لے کر باہر نکل گیا۔

"ہیلو۔" شہریار کال ملتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"السلام علیکم سر! آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہو گا؟" دوسری طرف سے آفتاب کی آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام۔ کہو آفتاب، کیسے یاد کیا ہے؟" اس نے اپنے جواب سے باور کروا دیا کہ اس کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے کہ وہ اس کا قلمی نام بھول گیا ہو۔

"آپ کو ایک بہت اہم اطلاع دینی تھی۔ کیا آپ کے دفتر کا نمبر محفوظ ہے؟" وہ بہت محتاط لگ رہا تھا۔ شہریار اس کے انداز پر چونک گیا۔ وہ آفتاب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ غیر ضروری باتیں کرنے والا کم عقل آدمی نہیں تھا۔ اگر وہ اس کے دفتر کے نمبر کے محفوظ ہونے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس واقعی کوئی بہت ہی اہم خبر موجود ہے۔

"تم کہاں ہو؟ مجھے اپنا نمبر دو، میں خود تم سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"میرے پاس اپنا ذاتی فون نہیں ہے۔ میں آپ کو پی سی او سے کال کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

"کوئی تو ایسا نمبر ہوگا جس پر تم سے رابطہ کیا جا سکے؟"

"نمبر..." شہریار کے پوچھنے پر وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ "میں آپ کو ایک بک شاپ کا نمبر دے رہا ہوں۔ آپ پانچ منٹ بعد مجھے اس نمبر پر کال کر لیں۔ مجھے یہاں سے اس شاپ تک پہنچنے میں بس دو تین منٹ ہی لگیں گے۔ وہاں آپ مجھے احمد کے نام سے بلوائیے گا۔" اس نے ایک نمبر نوٹ کروا دیا۔ شہریار نے پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اس نمبر پر اپنے موبائل سے رابطہ کیا۔ کال کسی اجنبی نے ریسیو کی۔

"مجھے احمد صاحب سے بات کرنی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس نمبر پر مجھے ملیں گے۔" اس نے اجنبی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"جی، وہ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ بات کریں۔" فون آفتاب کے ہاتھ میں منتقل کر دیا گیا۔

"اگر تمہارے نزدیک بات بہت زیادہ اہم ہے تو ابھی کچھ مت بتاؤ۔ میں تمہیں اپنا خفیہ موبائل نمبر دیتا ہوں۔ کسی محفوظ جگہ سے اس نمبر پر کال کر لو۔" آفتاب کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے بلا تمہید اس سے کہا۔

"آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔" آفتاب کے مختصر جواب نے ظاہر کر دیا کہ بات بہت اہم ہے۔

"او کے... نوٹ کرو۔" شہریار نے اسے اپنا نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ اپنے اس موبائل نمبر کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا تھا اور چند لوگوں کے سوا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں تھا اسی لیے اس نے بک شاپ پر بھی اس نمبر سے کال کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ آفتاب نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ دس منٹ بعد شہریار کے خاص موبائل نے وائبریٹ ہو کر کال آنے کا اشارہ کیا۔

"اب ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں سر۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کیا اہم خبر ہے؟" شہریار نے اسے اجازت دی۔

"آپ کا ایک مفرور مجرم اتفاق سے مجھے مل گیا ہے۔"

"کون...؟" وہ چونکا۔ مفرور مجرم کا سن کر اس کا ذہن فوری طور پر ورما کی طرف ہی گیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ حیرت بھی تھی کہ آفتاب اس کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔

"پیر آباد کی مسجد میں مولوی غلام محمد بن کر رہنے والا خبیث آدمی۔" آفتاب کی دی گئی اطلاع بھی کم اہم نہیں تھی۔ غلام محمد بھی مبینہ طور پر را کا ہی ایجنٹ تھا۔ اگر وہ ہاتھ آجاتا تو اس سے ورما کا ٹھکانا اگلوایا جا سکتا تھا۔

"تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔" وہ فوراً پرجوش ہو گیا۔ جواب میں آفتاب نے اسے پوری تفصیل کہہ سنائی کہ کہاں، کب اور کیسے اس نے غلام محمد کو شناخت کیا۔

"او کے، تم محتاط رہنا۔ میں جلد از جلد اس موذی کو پکڑنے کا کوئی انتظام کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنا مکمل ایڈریس بتا دو۔" ساری تفصیل سن کر اس نے آفتاب سے کہا تو اس نے اسے اپنا پتا نوٹ کروا دیا۔ پتا لینے کے بعد اس نے لائن منقطع کر دی اور خود سوچ میں پڑ گیا۔ اس بار اسے کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ مجرم ہاتھ آئے تو پھر کسی صورت فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

☆☆☆

چودھری اپنے سامنے رکھے کاغذ کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کاغذ پر مہک بک شاپ، واہ کینٹ کے الفاظ کے علاوہ ایک فون نمبر بھی لکھا تھا۔ اسے یہ پتا اور فون نمبر لکھا کاغذ اس اطلاع کے ساتھ پہنچایا گیا تھا کہ اس بک شاپ سے آفتاب کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور اگر وہ اسے اور کشور کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس کلیو سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ تو عرصے سے انتظار میں تھا کہ اپنی غیرت کو للکارنے والے معمولی ماسٹر اور اپنی باغی بیٹی کو ان کے کیے کی سزا دے سکے چنانچہ حاصل شدہ معلومات سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔

"آپ نے کچھ سنا چودھری صاحب؟" ابھی وہ کوئی

حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وڈی چودھرائن ہانپتی کانپتی وہاں پہنچی اور اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پُرجوش انداز میں سوال کیا۔ وہ اتنی زیادہ پُرجوش تھی کہ قاعدے کے مطابق چودھری کے کمرے میں آنے سے قبل اس سے اجازت بھی نہیں لی تھی۔ چودھری نے اس کی اس جسارت پر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"کی گل اے چودھرائن! ایسی کون سی خبر سنانی ہے جس کے لیے تو یوں دوڑی چلی آ رہی ہے؟"

"خبر ہی ایسی ہے چودھری صاحب! آپ سنیں گے تو سن کر آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔"

"کیوں خوامخواہ پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔ جو بھی گل ہے دس دے۔" چودھری کے سامنے اتنا اہم مسئلہ زیر غور تھا اس لیے اسے چودھرائن کی یہ بے وقت آمد بے حد ناگوار گزر رہی تھی۔

"اپنے بہزاد شاہ کی گھر والی ماں بننے والی ہے۔" وڈی چودھرائن نے اپنی دانست میں دھماکا کیا۔

"تو فیر؟" چودھری نے اسے گھورا۔

"آپ کو سن کر حیرت نہیں ہوئی چودھری صاحب؟" چودھرائن بے چاری پہلے خود پر ہونے والے انکشاف پر حیران تھی اور اب چودھری کے پُرسکون رہنے پر حیرت زدہ ہو رہی تھی۔

"تو تو ایسے حیران ہو رہی ہے جیسے فریدہ کے بجائے بہزاد کے حاملہ ہونے کی خبر سن لی ہو۔ ویاہ کے بعد عورت ماں بنتی ہی ہے، اس میں نیا کیا ہے؟" چودھری مکمل تجاہل برت رہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر بہزاد کا بچہ..." چودھرائن نے اپنے ادھورے جملے سے پورا مفہوم ظاہر کر دیا۔

"کیوں... بہزاد کا بچہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ مرد ہے وہ۔ تھوڑا دماغ کمزور ہے، پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ پوری طرح ناکارہ ہے۔" اس بار چودھری اس پر بگڑ ہی دوڑا۔ چودھری کی بلند آواز کے سامنے اس کی مجال نہیں تھی کہ مزید کچھ کہہ سکتی چنانچہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی ورنہ یقین تو اسے ابھی بھی نہیں تھا کہ فریدہ، بہزاد شاہ کے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔ ایک ملازمہ سے یہ خبر سننے کے بعد وہ فریدہ کے پاس بھی گئی تھی اور اس پر شک ظاہر کرتے ہوئے دھمکانے کی کوشش بھی کرتی رہی تھی لیکن فریدہ اس کی دھمکیوں پر ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئی اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ جو چاہو کر ڈالو۔ وڈی چودھرائن کو اس کی اس جرأت نے بہت

برانگیختہ کیا تھا اور وہ فوراً ہی چودھری کو اطلاع دینے چلی آئی لیکن اس کا ردعمل بھی اس کی توقعات کے برخلاف تھا اور وہ خاصی مایوس ہوئی تھی۔

"ہور کچھ کہنا ہے تجھے؟" چودھری نے اس کی لٹکی ہوئی شکل دیکھی، اس کے باوجود درشت لہجے میں دریافت کیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"تو فیر جا ادھر سے، ہور آئندہ خیال رکھنا کہ ایسے ہی منہ اٹھا کر میرے ہال نہ آ جانا۔ میں کوئی فارغ بندہ نہیں ہوں کہ بیکار کی بکواس سن کر تم زنانیوں کی طرح اس پر مغز کھپاتا رہوں۔" وہ اسے کوئی کسر نہیں رہنے دینا چاہتا تھا کہ چودھرائن پھر دوبارہ اس موضوع پر گفتگو کر سکے۔ اگر اس کا شک برقرار رہتا تو وہ کھوج میں لگ سکتی تھی اور اس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اصل بات تک پہنچ جاتی۔ اصل بات معلوم ہوتی تو خود چودھری پکڑا جاتا۔ طوائفوں اور مزارعوں کی عورتوں کی بات الگ تھی لیکن ذہنی طور پر پسماندہ بیٹے کی بیوی کے ساتھ اگر اس کا تعلق ظاہر ہو جاتا تو چودھرائن بھلے اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی، پر وہ اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا۔

فی الحال تو نتیجہ اس کی حسبِ توقع ہی نکلا تھا اور چودھرائن سر جھکائے مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکل گئی تھی لیکن چودھری نہیں جانتا تھا کہ اس کے اس جھکے ہوئے سر میں موجود دماغ میں کیا خیالات سرسرا رہے تھے۔ وڈی چودھرائن کے نام سے پکارے جانے والی کا دل بالکل بھی بڑا نہیں تھا اور وہ اپنی اولاد کے سوا کسی کو اس جاگیر میں حصے دار بنانے کی روادار نہیں تھی۔ بہزاد شاہ تو اس کی اس سوکن کا بیٹا تھا جس سے اسے سب سے زیادہ حسد رہا تھا۔ اب تک اس نے بہزاد شاہ کو برداشت کیا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے اس ذہنی مریض لڑکے سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اب جبکہ وہ باپ بننے جا رہا تھا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ اگر اسے جاگیر کا ایک اور وارث برداشت ہی کرنا ہوتا تو وہ ماہانو کو کیوں یہاں سے نکلوانے کا انتظام کرتی۔

"میں نے ساری حیاتی تیرے کرتوتوں کو بہت سہہ لیا چودھری! پر یہ طے ہے کہ اس جاگیر پر صرف میری اولاد اور ان کے بچے راج کریں گے۔ میں کسی ہور سانجھے دار کو اس دنیا میں ساہ ہی نہ لینے دوں گی۔" زیرِ لب بڑبڑا کر اپنے زہریلے خیالات کا اظہار کرتی وہ عورت کے بجائے ایک زہریلی ناگن لگ رہی تھی جو کسی بھی لمحے ڈس سکتی تھی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے، آپ کو نیند نہیں آ رہی کیا؟" آفتاب نے غنودگی بھری آواز میں اپنے پہلو میں لیٹی کشور سے پوچھا۔ وہ آج پنڈی تک جا کر واپس آیا تھا اور اس کے بعد نیچے کلینک پر بھی ٹھیک ٹھاک کام کیا تھا چنانچہ تھکن کی وجہ سے سونے کے لیے بستر پر لیٹتے ہی نیند غالب آ گئی اور وہ سو گیا لیکن پھر کروٹ بدلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ لیٹی کشور ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس کی اس بے چینی کا سبب جاننے کے لیے ہی اس نے کشور سے سوال کیا۔

"پتا نہیں کیوں عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں اتنی کوشش کر رہی ہوں، اس کے باوجود سو نہیں پا رہی۔" اس نے بے بسی سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی... کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟" آفتاب فوراً ہی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کشور جس حالت میں تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر لگی رہتی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس گاؤں میں طبی سہولیات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اگر چودھری کا ڈر نہیں ہوتا تو وہ کبھی اسے اس حالت میں یہاں نہیں رکھتا۔ اب بھی ارادہ یہی تھا کہ آخری دنوں میں کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے گا جہاں بہترین طبی سہولیات موجود ہوں لیکن اگر اس وقت کشور کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوتی تو اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ یہاں سے شہر تک پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو رات کے اس پہر سواری کا انتظام کرنا ہی مسئلہ بن جاتا۔

"کیا کہیں درد ہو رہا ہے؟" وہ کشور کو چھو چھو کر اس کی تکلیف کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے صحت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ صرف دل گھبرا رہا ہے۔" اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کشور نے اسے تسلی دی۔

"دل بلاوجہ تو نہیں گھبراتا۔" آفتاب کی تشویش برقرار تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں صرف حالات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں غلام محمد کو ڈھونڈنے کے چکر میں ہم سامنے نہ آ جائیں۔ بڑی مشکل سے کوئی ایسی جگہ ملی ہے جہاں ہم سکون سے دن گزار رہے تھے۔" اس نے اپنی پریشانی کی وجہ آخر کہہ ہی ڈالی۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ اپنے ذہن پر زور مت ڈالیں۔ زیادہ ٹینشن لینا آپ کے لیے ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔" آفتاب نے اسے سمجھایا۔

"میں جان کر یہ سب نہیں سوچ رہی ہوں، بس خود بخود

اہم بات

ایک بہت ہی موٹی عورت پلنگ پر سو رہی تھی کہ اچانک زلزلہ آ گیا اور وہ عورت دھڑام سے پلنگ سے نیچے گر گئی۔ پاس ہی اس کا شوہر سو رہا تھا۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً بولا۔ "بیگم زلزلہ آنے سے تم گری ہو یا تمہارے گرنے سے زلزلہ آیا ہے؟"

امتیاز احمد کا شگوفہ

ہی خیالات ذہن میں آتے چلے جا رہے ہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"خود کو سوچ سوچ کر ہلکان مت کریں۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ شہریار صاحب بہت محتاط اور سمجھدار آدمی ہیں۔ وہ ہرگز اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ایسی کوئی پلاننگ نہیں کریں گے جس سے ہم پر آنچ آئے۔ انہیں ہمارے حالات کا اچھی طرح علم ہے اس لیے وہ ہمارے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔" آفتاب نے اسے تسلی دی۔

"اتنا بھروسا ہے آپ کو ان پر؟" کشور نے مسکرا کر پوچھا۔

"مخلص آدمی ہمیشہ بھروسے کے لائق ہوتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو میں بھی پریشان نہیں ہوتی اور آرام سے سو جاتی ہوں۔ آپ بھی سو جائیں، صبح اٹھ کر آپ کو اپنے ناول پر کام کرنا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ٹھیک سے نیند لیں۔ فریش موڈ کے ساتھ کام کریں گے تو زیادہ اچھا لکھا جائے گا۔" اس نے آفتاب کو لیٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر خود اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آفتاب نے اپنا دوسرا بازو اس کے گرد حمائل کر کے اسے خود سے اور بھی قریب کر لیا۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن وہ فقط اس لیے نہیں سو رہا تھا کہ کشور جاگ رہی ہے۔ اس کی اس کیفیت کو محسوس کر کے کشور نے اپنی آنکھیں موند لیں اور آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہونے کے باوجود سوتی بن گئی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر جلد ہی آفتاب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

کشور بھی کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح نیند مہربان ہو جائے۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب ہونے لگی تھی اور وہ ہلکی ہلکی سی غنودگی محسوس کر رہی تھی کہ ہلکے سے کھٹکے کی آواز نے اسے ایک بار پھر پوری طرح بیدار کر دیا۔ اسے بالکل

digestpk.blogspot.com

ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں سے چلتا ہوا اس طرف آرہا ہے۔ وہ کان لگا کر غور کرنے لگی کہ اس کا احساس درست ہے یا پھر وہ کسی واہمے میں مبتلا ہے۔ کسی حتمی نتیجے سے قبل ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر کشور کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی چیخ سن کر آفتاب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر بنا کسی سوال کے خود ہی اس کے چیخنے کا سبب سمجھ گیا۔ سیاہ چست لباس میں ملبوس، چہرے کو نقاب میں چھپائے وہ شخص اپنے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑے بالکل سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے پسٹل کا رخ انہی کی طرف تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے تھر تھر کانپتی کشور کو خود سے لگاتے ہوئے آنے والے سے پوچھا۔ درحقیقت اس مسلح آدمی کو اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔

"حیرت ہے، تم نے مجھے نہیں پہچانا؛ ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ تم مجھے پہچان چکے ہو اسی لیے میرا سامنا نہیں کررہے۔" اس شخص نے استہزائیہ لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس کے الفاظ اور آواز نے آفتاب کو بتادیا کہ وہ کون ہے؟

"اگر میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے تو تمہیں کیا پریشانی ہے۔ جس طرح میں تمہیں پہچان کر خاموشی سے بیٹھا ہوں، تم بھی انجان بن جاؤ۔ ہم دونوں ہی کو اپنے پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے اجنبی بن کر یہاں خاموشی سے رہتے رہیں تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" آفتاب سمجھ گیا تھا کہ اس نے جس طرح اس مفرور غلام محمد کو پہچان لیا تھا اسی طرح وہ بھی اسے شناخت کرچکا تھا۔

"مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم اسے سی شہریار کے بھتیجے ہو اور اسے میری یہاں موجودگی کی خبر ضرور دو گے۔"

"اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو پہلے ہی کرچکا ہوتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں، میں خود بھی محفوظ نہیں رہوں گا اور میرے دشمن مجھ تک پہنچ جائیں گے۔" آفتاب نے دلیل دے کر اسے اپنے بے ضرر ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر میں خود بھی حیران ہوں۔ آخر تم یہاں کیوں رہ رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ بھی کہانی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ پیر آباد کے چودھری صاحب کسی وجہ سے میرے جانی دشمن بن گئے ہیں اور میں ان سے اپنی جان بچا کر ادھر ادھر چھپتا پھر رہا ہوں۔" اسے یقین دلانے کے لیے آفتاب نے زور دے کر کہا۔

"شاید اس کی وجہ یہ خوب صورت لڑکی ہے۔ کہیں تم چودھری کی لڑکی کو تو نہیں لے اڑے؟" کشور کی طرف اشارہ کرکے سوال کرتے ہوئے اس نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ جواب میں آفتاب خاموش رہا۔

"گاؤں والوں کی زبانی یہ سن کر کہ کوئی شہری بندہ بچوں کو لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے...... یہاں آکر رہ رہا ہے، میں بہت حیران ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کوئی شہری باشندہ بلاوجہ اس پسماندہ گاؤں میں آکر نہیں رہ سکتا۔ ضرور کوئی ایسی وجہ ہوگی جو تم یہاں آکر رہنے پر مجبور ہوگئے ہو۔ وہ وجہ جاننے کے لیے میں نے تم سے ملاقات کی خواہش کی لیکن تم یقیناً پہلے ہی مجھے دیکھ کر پہچان چکے تھے اس لیے میرا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک آدھ بار کے بہانے پر تو میں نے یقین کرلیا لیکن پھر سمجھ گیا کہ تم جان کر ایسا کررہے ہو۔ مجھ پر جنون سوار ہوگیا کہ کسی طرح تم سے سامنا ہوجائے۔ آج صبح بھی میں نے ایک آدمی تمہارے پاس بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم شہر گئے ہوئے ہو اور شام تک واپس آؤ گے۔ میں عصر کے بعد ہوا خوری کے بہانے نکل کھڑا ہوا اور بس اڈے سے تمہارے گھر کی طرف آنے والے راستے پر انتظار کرنے لگا۔ بسیں چونکہ مقررہ اوقات پر ہی یہاں آتی جاتی ہیں اور میں حساب کتاب لگا کر ہی نکلا تھا، اس لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تم نے اپنا حلیہ کافی تبدیل کرلیا ہے اور پہلی نظر میں تمہارا کوئی جاننے والا تمہیں پہچان نہیں سکتا لیکن میری نظروں سے تمہاری اصلیت چھپی نہیں رہ سکی۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہارا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ہے۔ میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں گولی مار سکتا تھا لیکن اس صورت میں تمہاری بیوی بچ نکلتی اور میں ایسے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جو میرے لیے مشکلات پیدا کرسکے۔ اب تم مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

اس نے ایک پل کے لیے بھی ان دونوں کو پسٹل کے نشانے پر سے نہیں ہٹایا تھا۔ اپنی بات مکمل کرکے سنگین لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے آفتاب مسلسل اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچتا رہا تھا کیونکہ غلام محمد بے شک نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے ایک بدکردار اور قاتل کے علاوہ را کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی جانتا ہے لیکن خود اسے معلوم تھا کہ را کے ایجنٹس کتنے شقی القلب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کوششوں سے اپنے لیے تھوڑی مہلت تو حاصل کرسکتا تھا لیکن جان بخشی کی اسے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے لیے اسے خود ہی کوئی تدبیر کرنی تھی اور تدبیر اس نے یہ کی کہ مطالعے کے لیے سرہانے رکھی ہوئی

کتاب اٹھا کر اس کے پسٹل پر دے ماری۔ اس کی یہ تدبیر اس اعتبار سے کارگر رہی کہ پسٹل غلام محمد کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن پسٹل ہاتھ سے نکلنے سے قبل وہ گولی چلا چکا تھا۔ آفتاب کے حرکت میں آجانے کی وجہ سے اسے تو گولی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی کشور زد میں آگئی۔ گولی جسم میں پیوست ہوتے ہی اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اس کی چیخ اور پھر بہتے خون نے آفتاب کو سخت مشتعل کردیا۔ وہ سیدھا سادہ آدمی تھا اور اس کا لڑنے بھڑنے سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن اس پل وہ جنونی ہوکر غلام محمد سے جا بھڑا۔

اس نے اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر غلام محمد کے پیٹ میں ماری۔ ٹکر زوردار تھی جس نے اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا اور وہ پیچھے دروازے کے ساتھ جا کر ٹکرایا لیکن اس نے فوراً ہی اپنا آپ سنبھال لیا اور آفتاب پر چھلانگ لگا کر اسے اپنے نیچے دبا کر رگیدنے لگا۔ وہ اسے ٹھوکر مار کر دور جا گرنے والے پسٹل کو اپنے قبضے میں...... لینے کے چکر میں تھا۔ غلام محمد اس پر سوار ہوا تو اسے یوں لگا کہ اس کا جسم کسی پہاڑ کے نیچے دب گیا ہو۔ اس کے جنونی پن کی را کے تربیت یافتہ ایجنٹ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ پسٹل ہاتھ میں آجانے کے باوجود کچھ نہیں کرپارہا تھا۔ غلام محمد نے اس کے سینے پر سوار ہوکر اسے رگیدنے کے ساتھ ساتھ اب اس کا نرخرا بھی اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور وہ اپنی رکتی سانسوں کے ساتھ خرخر کی آوازیں نکالنے کے سوا کچھ نہیں کرپارہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا وقت پورا ہوچکا ہے اور اب وہ اس دنیا میں چند سانسوں کا مہمان رہ گیا ہے۔ اسے کشور کی بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اپنی اور کشور کی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو مجتمع کیا اور اپنی داہنی ٹانگ موڑ کر گھٹنے کو پوری قوت سے غلام محمد کی ناف کے نیچے ضرب لگائی۔ موت کے بالکل قریب کھڑے شخص کی زندگی کے ساتھ جڑے رہنے کے لیے یہ بالکل آخری کوشش تھی جس نے کام دکھایا اور اس کے جسم پر سے غلام محمد کے جسم کا دباؤ کم ہونے کے علاوہ اس کا نرخرا بھی اس کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ لیکن یہی بات تھی کہ اس کا واسطہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ سے پڑا تھا جو ذرا سا ڈگمگایا تو ضرور لیکن پھر سنبھل کر حملہ آور ہوا اور نہایت ہوشیاری سے اس کے ہاتھ سے پسٹل چھین لیا۔ پسٹل ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر آفتاب کا سارا جوش و خروش دھیما پڑ گیا۔

وہ جس گھر میں رہائش پذیر تھے، وہ گاؤں کی دوسری آبادی سے اتنا ہٹ کر بنا ہوا تھا کہ وہ یہ بھی امید نہیں کرسکتا تھا کہ یہاں ہونے والے ہنگامے کو سن کر کوئی ان کی مدد کے لیے آئے گا۔ مگر خدا بھی اپنے وجود کو ایسے ہی لمحے میں منواتا ہے جہاں بندہ مایوس ہوجاتا ہے۔ غلام محمد نے پسٹل ہاتھ میں آجانے کے بعد اس پر گولی چلانے کے لیے تانا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ غلام محمد نے ایک نظر اپنی ہتھیلی میں ہوجانے والے سوراخ اور اس سے بہتے خون پر ڈالی اور پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا تھا جسے وہ تو نہیں پہچان سکا لیکن آفتاب کے چہرے پر رونق آگئی۔

"سیدھی طرح کھڑے ہوکر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ ہم دوسرا گولی تمہارے بھیجے میں مارے گا۔" نڈر اور بے خوف مشابرم خان نے اسے اس لہجے میں دھمکایا کہ اسے یقین ہوگیا کہ اگر اس نے اس کے کہے پر عمل نہیں کیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرگزرے گا۔ اس نے آفتاب کو چھوڑ کر کھڑے ہوجانے میں ہی عافیت جانی۔ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی آفتاب بستر پر پڑی کشور کی طرف لپکا اور اس کی نبض چیک کی۔ وہ بے ہوش تھی لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ سانسوں کا سلسلہ کب تک جاری رہ سکے گا۔

"تم آفتاب اور اس کی بیوی کو لے کر فوری طور پر اسپتال کے لیے روانہ ہوجاؤ مشابرم خان۔ یہاں کی صورت حال کو ہم خود ہینڈل کرلیں گے۔" مشابرم خان کے پیچھے سے نمودار ہونے والے شہریار کے الفاظ نے جہاں آفتاب کے چہرے کو رونق بخشی، وہیں غلام محمد کا چہرہ بالکل تاریک پڑ گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ شہریار تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جدید اسلحے سے لیس چند دوسرے افراد بھی موجود ہیں اور وہ جتنا بھی اچھا فائٹر سہی، بہرحال اس محدود کمرے کے اندر اتنے سارے مسلح افراد سے نہتا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

"آپ ابھی تک سوئے نہیں بابا؟" ادھیڑ عمر آدمی کتاب پر سے نظر ہٹا کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کی جوان سال بیٹی تھی جو رات کے اس پہر بھی اس کے جاگنے پر سوال کررہی تھی۔

"بس بیٹی یہ حصہ مکمل کرلوں تو پھر سوتا ہوں۔ اصل میں کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اسے چھوڑ کر سونے کا دل ہی نہیں چاہ رہا۔" اس نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دیا۔

dgestpk.blogspot.com

"میں نے آپ کی طرح کسی دوسرے شخص کو کتابوں کی محبت میں گرفتار نہیں دیکھا۔ دن بھر کتابوں میں گھرے رہتے ہیں پھر بھی دل نہیں بھرتا۔ گھر آکر بھی انہی میں گم رہتے ہیں۔" اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔

"کیا کروں بیٹی! میں نے زندگی میں دو ہی چیزوں سے محبت کی ہے، ایک تم سے اور دوسری کتابوں سے۔ اس محبت نے ہی تو مجھے مہک بک شاپ کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں، اس سے پہلے میں نے ذرا چھوٹے پیمانے پر یہ شاپ کھولی تھی اور شاپ کا نام رکھتے ہوئے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ اگر میرے گھر بیٹی ہوئی تو اس کا نام مہک رکھوں گا۔" اس نے سیکڑوں بار کی بتائی ہوئی بات بیٹی کے سامنے دہرائی۔

"میں جانتی ہوں بابا لیکن آپ کو اپنی صحت کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔ پچھلے کئی روز سے آپ کا بلڈ پریشر مسلسل ہائی رہ رہا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آرام کا خیال نہیں رکھا تو آپ کا بی پی کیسے کنٹرول ہوگا؟"

"اوکے میری جان! بس دس منٹ اور دے دو پھر میں سوجاؤں گا۔" اس نے بیٹی کو منانے کی کوشش کی۔

"صرف دس منٹ... یاد رکھیے گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر باپ کو تنبیہ کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ صبح اسے کالج جانا تھا اس لیے زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتی تھی۔ بیٹی کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بیٹی سے اس نے دس منٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور ڈیڑھ گھنٹا یوں گزرا کہ اسے لگا فقط چند منٹ ہی گزرے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی وہ دروازے کی گھنٹی بجنے پر چونکا۔ اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اس وقت کون آگیا؟" حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا۔

"کون؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے احتیاطاً پوچھا۔

"آپ شفیق صاحب ہیں نا؟" دوسری طرف سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے اس سے پوچھا گیا۔

"جی ہاں، مگر آپ کون؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اگر آنے والا اس کا کوئی واقف کار ہوتا تو یہ سوال ہرگز نہیں کرتا۔

"میں آپ کو اطلاع دینے آیا تھا کہ آپ کی بک شاپ میں آگ لگ گئی ہے اور کوشش کے باوجود بجھائی نہیں جارہی۔" یہ اطلاع ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس برقرار رکھ پاتا۔ اس نے فوراً ہی تڑپ کر دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"کک... کون ہو تم لوگ؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اندر چلو، فیر بتائیں گے۔" ان میں سے ایک نے بیرونی دروازہ بند کردیا اور اسے دھکیلتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔

"دیکھو تم لوگوں کو جو کچھ چاہیے لے لو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔ میں تم لوگوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کروں گا۔" رات کے اس پہر گھر میں داخل ہونے والے مسلح افراد کو وہ ڈاکو ہی سمجھ سکتا تھا چنانچہ اسی حساب سے ان سے بولا۔

"ہمیں روپیا پیسا نہیں بلکہ ماسٹر آفتاب کا پتا چاہیے۔" جواباً اس سے جو مطالبہ کیا گیا وہ اسے سن کر حیران رہ گیا۔

"کون ماسٹر آفتاب؟"

"وہی جس کے لیے آج تمہاری دکان پر نور کوٹ سے اے ایس شہریار کا فون آیا تھا۔"

"یقین کرو، میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میرے بے شمار کسٹمرز ہیں جن میں سے کئی دکان کا فون بھی استعمال کرلیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی ماسٹر آفتاب بھی ہو لیکن میری اس شخص سے ذاتی واقفیت نہیں۔" وہ سچ کہہ رہا تھا کہ اسے آفتاب کے بارے میں علم نہیں۔ آفتاب نے اس سے اپنا تعارف احمد کے نام سے کروایا تھا چنانچہ وہ کیسے انہیں کچھ بتا سکتا تھا۔

"ہمیں یہ ساری بکواس نہیں سننی۔ ہمیں تم سے صرف ماسٹر آفتاب کا پتا چاہیے۔" اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا گیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ پھر اس ایک تھپڑ پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ وہ لوگ اسے بے تحاشا مارتے ہوئے ایک ہی مطالبہ کرتے رہے کہ انہیں ماسٹر آفتاب کا پتا بتایا جائے۔ ہائی بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب کے مریض شفیق کے لیے وہ مار سہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا پہلے سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر یک دم ہی شوٹ کرگیا اور وہ سینہ مسلتے ہوئے نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

"یہ بڈھا تو کام سے گیا۔" ان میں سے ایک بڑبڑاتا ہوا اپنے ساتھی سے بولا۔

"بہتر ہے ہم ادھر سے نکل چلیں۔ اس کی حالت تو اب ایسی نہیں ہے کہ اس سے کچھ بھی معلوم کیا جاسکے۔" شفیق کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے

چنانچہ وہاں مزید رکنا بے کار جان کر راہ فرار اختیار کرلی۔ فرش پر گرے زندگی سے دور جاتے شخص سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بس اس کی خوشنودی کے خواہاں تھے جس کے کہنے پر انہوں نے پنڈی میں آفتاب کی تلاش کی مہم شروع کی تھی۔ وہ اس شخص تک آفتاب کو زندہ یا مردہ پہنچا کر خود سرخرو ہونا چاہتے تھے۔

☆☆☆

"آپا حمیداں! تمہارا بیٹا کس جماعت میں پڑھتا ہے؟" آٹا گوندھتے گوندھتے اس نے یک دم ہی آگ جلانے کے لیے چولہا تیار کرتی حمیداں سے پوچھا۔ چھوٹی بڑی لکڑیوں کو مخصوص ترتیب سے رکھ کر چولہا تیار کرتی حمیداں اس سوال پر چونک پڑی۔

"تجھے کس نے میرے پتر کے بارے میں بتایا ہے؟"

"میں بھی تو یہاں تم لوگوں کے درمیان ہی رہ رہی ہوں۔ جو بات دوسروں کو معلوم ہے، وہ مجھے بھی آخر کار پتا چلنی ہی تھی۔" اس نے کسی کا نام لینے کے بجائے گول مول جواب دیا۔

"اسلم نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ تجھ پر بڑا فدا ہے۔ ایسے نخرے اٹھاتا ہے تیرے جیسے تو اس کی رکھیل کے بجائے گھر والی ہے۔ ... یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں ورنہ تو لوگ اپنی گھر والی کو بھی پیر کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں۔" وہ اس کی قسمت پر رشک کررہی تھی جبکہ وہ خود اپنے لیے رکھیل کا لفظ سن کر اندر تک سلگ کر رہ گئی۔

"رکھیل ہونے سے پیر کی جوتی بن کر رہنا اچھا ہے اور رکھیل بھی وہی عورت بنتی ہے جو اندر سے کمزور کردار کی ہوتی ہے۔ عزت دار عورت اپنی اس ذلیل سے پہلے جان دینا پسند کرتی ہے۔" اس نے حمیداں کو جتادیا کہ وہ اس کے لیے رکھیل کا لفظ غلط استعمال کررہی ہے۔ اس کا اسلم سے جو بھی تعلق ہو لیکن وہ اس کی رکھیل نہیں ہے۔

"تو تو برا مان گئی... پر یاد رکھ، مرد کے پاؤں کی جوتی بن کر رہنا بھی بڑا اوکھا کام ہے۔ مرد پیار کرنے والا اور عزت دینے والا نہ ہو تو عورت خود اپنے لیے چور راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔" ماہ بانو کے اخلاقی اصول اس کی زندگی کے تجربات سے متصادم تھے چنانچہ اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

"اس بحث کو جانے دو اور مجھے اس بات کا جواب دو جو میں نے تم سے پوچھی ہے۔" اس نے حمیداں کو ٹوکا۔

"بارھویں میں پڑھتا ہے میرا پتر۔ آگے اس نے وکیل بننے کا سوچا ہے۔ رب اس کی تمنا پوری کرے۔" بڑے فخر سے بتاتے ہوئے اس نے دعا بھی کی۔

"چلو اچھا ہے... اگر کبھی تمہارا یہ گروہ پکڑا گیا تو کوئی مقدمہ لڑنے والا تو ہوگا۔ آخر جن کی کمائی پر تمہارا بیٹا پڑھ لکھ رہا ہے، ان کا نمک بھی تو حلال کرنا ہوگا۔ ویسے معلوم نہیں کہ حرام کی کمائی کرنے والوں کا نمک حلال کرنا ضروری بھی ہے یا نہیں؟" وہ اس طرح گفتگو کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن پھر بھی طنز کا تیر چلا گئی۔

"ایسی گل نہ کر کڑیے۔ وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب بندے کا کس طرح امتحان لے۔" حمیداں نے اسے ٹوکا تو وہ چپ ہوکر رہ گئی۔ واقعی وقت کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آدمی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ گفتگو کے دوران آٹا گوندھنے کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ حمیداں نے چولہے پر توا رکھا اور وہ دونوں مل کر روٹیاں پکانے لگیں۔

"اسلم تجھ سے محبت کرنے لگا ہے؟" روٹی توے پر ڈالتے ہوئے حمیداں نے اس سے سوال کیا۔

"معلوم نہیں۔" اس نے تجاہل برتا۔ اسلم کی محبت سے بہت سی وضاحتیں حاصل کرنے کے باوجود وہ اس کی محبت کو قبول کرنے سے گریزاں تھی۔ وہ دل جو پہلے ہی کسی کا اسیر ہو وہ بھلا کسی دوسری محبت کو کیسے قبول کرسکتا ہے۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
اسلام آباد اکیڈمی

"تجھے نہیں معلوم تو میں تجھے بتا رہی ہوں۔ اتنے برسوں سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ کبھی اسے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھاتے نہیں دیکھا لیکن تیرے لیے تو وہ سردار کے سامنے اڑ گیا۔ میں نے اسے عورت تو کیا، کبھی کسی چیز کے پیچھے بھاگتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی واردات کے بعد اپنے حصے کی رقم کی پروا نہیں کرتا، پر تیرے لیے تو جیسے اس نے ضد باندھ لی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سردار کو منانے کے لیے اب تک جمع ہونے والا اپنا سارا مال بھی سردار کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس کی ضد دیکھ کر سردار کو اس کی بات ماننی ہی پڑی۔" حمیداں اسے جو کچھ بتا رہی تھی، وہ اس کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلم نے اسے بھی اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا اور سردار سے اسے اپنے لیے مانگنے کا بھی بتایا تھا لیکن اسے پانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے، یہ نہیں بتایا تھا۔ اس کی ایسی شدت کی چاہت کا سن کر وہ ساکت سی رہ گئی۔ ایسی محبت جس میں سامنے والا اپنا سب کچھ لٹا دے اور بدلے میں کچھ طلب نہ کرے، کتنا بلند مقام رکھتی ہے اور کتنی قابلِ قدر ہوتی ہے، وہ جانتی تھی لیکن مجبور تھی کہ اس چاہت کو شرفِ قبولیت نہیں بخش سکتی تھی۔ بعد میں حمیداں اس سے کیا کچھ کہتی رہی اور بتاتی رہی لیکن وہ سن نہیں سکی، بس ایک معمول کی طرح روٹیاں پکانے میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

اس کام سے فارغ ہوئی تو اسلم کی بنائی پھلواری کا رخ کر لیا۔ رنگ برنگے پھولوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے یہاں اسلم کے ساتھ اپنی پہلی بار کی آمد کو یاد کیا۔ اس پھلواری اور اوپر کی مچان پر رکھی کتابوں کو دیکھ کر اس نے اسلم کو بڑا اچھے ہوئے صاحبِ ذوق قرار دیا تھا لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ صرف صاحبِ ذوق نہیں، صاحبِ دل بھی تھا۔ کتابوں اور پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ کوئی عام لوگ ہوتے بھی نہیں پھر جانے اسلم کے ساتھ کیا حادثہ گزرا تھا کہ وہ اپنے اصل سے ہٹ کر ان ڈاکوؤں میں شامل ہو گیا۔ محبت نہ سہی، وہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں ایک انسیت سی محسوس کر رہی تھی اور عجیب سے احساسات میں گھری وہاں ان پھولوں کے درمیان ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس کی اس کیفیت سے نسوانی چیخوں کی آواز نے باہر نکالا۔ یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی اور وہ یہ بھی اندازہ کر سکتی تھی کہ آواز درختوں کے اسی جھنڈ کی طرف سے آ رہی ہے جہاں اس نے پہلے بھی جمرو کو للی کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ للی کی چیخیں بتا رہی تھیں کہ آج بھی اس کے ساتھ وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

وہ طیش کے عالم میں اٹھی اور پھلواری سے نکل کر تیز المقدور تیزی سے جھنڈ کی طرف بڑھی۔ راستے میں اسے درخت کی ایک مضبوط شاخ پڑی نظر آئی تو وہ بھی اٹھا لی۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی اسے جمرو اور للی نظر آ گئے۔ ان دونوں کے درمیان جاری کشمکش بتا رہی تھی کہ جمرو پر آج بھی دورہ پڑا ہے اور للی اس کی بات ماننے سے گریزاں ہے۔ عورت کی اتنی تذلیل اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ان دونوں کے قریب پہنچ کر اپنا ہاتھ گھمایا اور عقب سے جمرو کے سر پر سوکھی شاخ کا وار کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اس سے دست و گریباں للی نے عین وقت پر جمرو کو زور دار دھکا دے ڈالا۔ ماہ بانو کا پوری قوت سے کیا وار بس چھوتا ہوا ہی جمرو کے بازو پر پڑا مگر وہ اس معمولی چوٹ پر بھی غضب ناک ہو کر للی کو چھوڑ کر اس کی طرف جھپٹا۔

"تجھے روکتی ہے کتیا... تیرے سر پر اس کی ہمدردی کا بھوت چڑھا ہے تو پھر ٹھیک ہے، اس کی جگہ تو ہی آ جا۔ بڑا بچا کر رکھا ہے نا تجھے اسلم نے... پر آج تو مجھ سے نہیں بچ سکے گی۔" وہ طیش کے عالم میں بولتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے شاخ چھین کر دور پھینک دی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے کیے پر عمل بھی کر گزرے گا۔ ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ جسمانی قوت سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ایک بار وہ اس کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر وہ اسے اپنے تنومند جسم کے نیچے کسی حقیر چیونٹی کی طرح رگڑ ڈالتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے بہترین حل فرار ہی تھا چنانچہ وہ سمت کا تعین کیے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پیروں میں بندھی زنجیر کی وجہ سے بھاگنا یوں بھی بہت مشکل تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہی دوڑ پڑنے والی للی یک دم ہی اس سے ٹکرا گئی۔ ٹکرانے کے بعد وہ دونوں ہی زور سے گریں۔

ماہ بانو نے کوشش کی کہ سنبھل کر دوبارہ کھڑی ہو سکے لیکن اس کے اٹھنے سے قبل ہی جمرو نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا دور تک اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بدبودار وجود کی گرفت میں بے بسی سے مچلتی ماہ بانو کو لگا کہ کچھ دیر قبل اس نے حمیداں کے سامنے جتنے بڑے بول بولے ہیں، ان کی سزا آج اور ابھی ہی جمرو کی صورت میں اسے ملنے والی ہے۔

> یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
> مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

بازی

جمال دتی

بسا اوقات انسان کو جذبات و احساسات کی رَو ناموافق سمت میں بہنے پر مجبور کر دیتی ہے.... ایک حویلی کے مکینوں کے گرد گھومتی بے مثال تحریر جس کا ہر فرد انجانے جذبات کی ڈور سے بندھا ہوا تھا۔

سراغرساں کو پیش آنے والے عجیب و غریب کیس کے پیچ و خم

میں نے جماہی لی اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ ہر روز شام میں شیو بنانا کتنا بور کرنے والا معمول ہے۔ دو مہینے پہلے تک یہ کام جالوس کرتا تھا لیکن میں نے اس کی چھٹی کر دی کیونکہ اس مہنگائی کے زمانے میں اس کے اخراجات برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ مجبوراً میں نے بستر سے چھلانگ لگائی اور کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور اس موسم میں کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن مجھے شیو تو کرنا تھی۔ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں مجھے باہر نکلنا پڑ سکتا تھا چاہے آسمان سے

اولے ہی کیوں نہ برس رہے ہوں۔ ویسے بھی اس طرح کا موسم میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ دفتر کا ناغہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ موت اور گاہک بھی کہہ کر نہیں آتے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی گاہک مجھے غیر حاضر پا کر میرے بارے میں غلط تاثر قائم کرے۔

میں نے برقی ریزر کا تار پلگ میں لگایا اور یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینے لگا۔ اب میں اس کام میں آہستہ آہستہ مہارت حاصل کر رہا تھا اور پہلے کی نسبت میرے چہرے پر کم خراشیں آ رہی تھیں۔ شیو سے فارغ ہونے کے بعد میں نے شاور لیا اور اپنی الماری کھول کر لباس کا انتخاب کرنے لگا۔ جہاں اب پہننے کے قابل صرف دو سوٹ رہ گئے تھے۔ ان کے معیار پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً کبھی انہوں نے بھی اچھا وقت دیکھا ہوگا لیکن اب ان کا زمانہ گزر گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن میری الماری میں مزید سوٹوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ تو طے تھا کہ اب میں سیاہ سوٹ کے بجائے کسی دوسرے رنگ کو ترجیح دوں گا۔ ان سیاہ سوٹوں کو دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور اوپر سے برساتی اوڑھ لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا تمباکو کا پاؤچ بھی چیک کر لیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گھر سے نکلنے کے بعد کیسے حالات پیدا ہو جائیں اور مجھے پورا دن باہر گزارنا پڑ جائے۔ عمارت سے باہر نکل کر میں نے اپنی چھتری کھولی اور دفتر کی طرف چل دیا جو بمشکل ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ بارش کی رفتار اب قدرے سست ہو چکی تھی۔ میں ڈیسکوکسن ایونیو کی طرف بڑھا اور پل عبور کر کے ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ پیدل جانے کے لیے میں یہی مختصر راستہ استعمال کرتا تھا۔ ابھی مخالف سڑک تک پہنچا ہی تھا کہ کسی نے عقب سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا بازو میری تھوڑی کے نیچے آ گیا۔ میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اپنے حواس قابو میں رکھے۔ تھوڑا سا پیچھے کو جھکا اور اسے کالر سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک دیوار تک لے گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

وہ تنہا نہیں تھا۔ اچانک ہی اس کا ساتھی برابر والی بلڈنگ سے نمودار ہوا اور اس نے پوری طاقت سے مجھ پر گھونسا مارا لیکن میں پہلے ہی تیزی سے گھوم چکا تھا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں جا کر دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے اس کی مٹھی سے چٹخنے کی آواز سنی۔ وہ بری طرح چلایا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور وہیں پھینک دیا جہاں اس کا ساتھی پڑا ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنی برساتی جھاڑی، چھتری اٹھائی اور دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے ان دونوں آدمیوں پر شدید غصہ آ رہا تھا جنہوں نے معصوم لوگوں کا رات کے وقت سڑکوں اور گلیوں میں چلنا دوبھر کر دیا تھا۔

جب اپنے دفتر پہنچا تو وہاں دروازے پر ایک عورت کو اپنا منتظر پایا جس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی پھر جب اس نے میرے ہاتھ میں دفتر کی چابیاں دیکھیں تو بولی۔ "کیا تم کارڈوال ڈیٹیکٹو ایجنسی میں کام کرتے ہو؟"

میں محتاط انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ہی کارڈوال ہوں۔" یہ کہہ کر تالا کھولا اور ہم دونوں دفتر میں داخل ہو گئے جو ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میری طرف چاندی کا کیس بڑھا کر سگریٹ پیش کی۔

"شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنے لیے سگریٹ جلائی اور بولی۔ "میرا نام اولیویا ہیکمین ہے۔ میں نے ایک گھنٹا پہلے فون کیا تھا لیکن ریکارڈنگ سے معلوم ہوا کہ تمہارے دفتری اوقات آٹھ بجے رات سے صبح چار بجے تک ہیں۔ تم دن میں کیا کرتے ہو؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ اوقات سورج ڈوبنے اور نکلنے کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ خیر تم اپنا مسئلہ بیان کرو۔"

"میں اپنے انکل ہیکٹر کے لیے پریشان ہوں۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "کسی نے ان پر اس وقت گولی چلائی جب وہ ڈنر کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ گولی ان سے چند انچ کے فاصلے سے بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر چلی گئی۔"

"ہوں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم میرے پاس کیوں چلی آئیں۔ تمہیں تو اس واقعے کی رپورٹ پولیس میں درج کروانی چاہیے تھی۔"

"ہم اسے ایک خاندانی معاملہ سمجھتے ہیں کیونکہ جن لوگوں پر شک کیا جا سکتا ہے، وہ سب قریبی رشتے دار ہیں۔ سوائے انکل کرٹس کلے کے، گو کہ وہ بھی رشتے دار ہیں لیکن ان پر اس لیے شک نہیں ہے کہ وہ خود کروڑوں کے مالک ہیں۔"

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کوئی شخص تمہارے انکل ہیکٹر کی جان کیوں لینا چاہے گا؟"

"کیونکہ کل صبح وہ اپنے وکیل کو بلا کر وصیت تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی اسٹڈی میں بلا کر کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی دولت اور جائداد میں سے ہمیں کچھ نہیں دیں گے۔"

"وہ ایسا کیوں کرنا چاہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا کہنا ہے کہ ایک کتاب پڑھنے کے بعد ان کے خیالات میں واضح تبدیلی آ گئی ہے اور اب وہ وارثوں میں دولت تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنی تمام دولت خیراتی اداروں کو دے رہے ہیں۔"

"ان کے پاس اندازاً کتنی دولت ہوگی؟"

"گزشتہ بار جب انہوں نے وصیت تیار کی تھی تو اس بارے میں بتایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی دولت اور جائداد کا تخمینہ تیس لاکھ ڈالر کے لگ بھگ ہے۔"

"اور اب تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس شخص کا پتا چلاؤں جو انہیں مارنے کی کوشش کر رہا ہے؟"

"ہاں، اگر تم ایسا کر سکو۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ کل صبح نو بجے جب وکیل ان سے ملنے آئے تو وہ زندہ سلامت ہوں۔ اس کے بعد ہم میں سے کسی کو بھی انہیں مار کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ ہم وصیت سے باہر ہو چکے ہوں گے۔"

"میں صبح چھ بجے تک ان کی حفاظت کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے کسی دوسرے کام سے جانا ہوگا۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ کچھ نہ ہونے سے یہ بہتر ہے کیونکہ اس وقت کسی دوسرے شخص کا ملنا مشکل ہوگا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص انکل ہیکٹر کو قتل کرنا چاہتا ہے تو وہ آج رات کو ہی یہ کوشش کرے گا۔ میرے پاس کار اور شوفر ہے جو نیچے سڑک پر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

باہر اب بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آدھے بلاک کے فاصلے پر پارکنگ لاٹ میں ایک فوکس ویگن کھڑی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ویگن کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک پست قد شوفر برآمد ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرے ہاتھوں کی پشت چومنے لگا۔ وہ جانوس تھا جس کا تذکرہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔

"کاؤنٹ!" وہ گرم جوشی سے بولا۔ "تمہیں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

اولیویا مسکراتے ہوئے بولی۔ "جانوس نے ہی مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ اسی لیے سیدھی تمہارے پاس چلی آئی۔ یہ تمہیں اب بھی کاؤنٹ کہہ کر بلاتا ہے۔"

"یہ بات پرانی ہو گئی ہے۔ اب میں اس کا مالک نہیں ہوں۔"

"اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔" جانوس نے میری پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایک وقت تھا کہ مجھے پیسوں کی کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میرے پاس کیوبا، کانگو، لبنان، انگولا اور بنگلہ دیش میں اثاثے تھے جو سب تباہ ہو گئے۔"

سفر کے دوران میں اولیویا نے مجھے انکل ہیکٹر کے گھر میں موجود افراد کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ان میں ایک اس کا کزن ایبرٹ تھا جس کا سیدھا بازو بائیں کے مقابلے میں تین انچ بڑا تھا۔ کزن مینگی کو ویڈ پورٹ پسند تھی جبکہ دوسرے کزن کے نام ویجنڈی اور فیئر بائرن تھے۔ تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک چڑھائی پر مڑ گئی۔ یہ ایک دو رویہ سڑک تھی جس پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کسی فارم سے آنے والی روشنی نظر آ جاتی تھی۔ اچانک ہی بارش تیز ہونے لگی۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے عجیب سا سماں باندھ دیا۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ہماری گاڑی ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہوئی۔ باوردی دربان گاڑی کو پہچانتا تھا اس لیے اس نے پوچھ گچھ کیے بغیر ہی گیٹ کھول دیا۔ بجلی ایک بار پھر چمکی تو میری نظر ایک قدیم وکٹورینا طرز کی عمارت پر گئی جس کی کھڑکیوں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔

جانوس نے بارش سے بچنے کے لیے گاڑی عین صدر دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ اولیویا اور میں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے پورچ کی جانب لپکے۔ اولیویا نے بڑا سا دروازہ کھولا اور ہم ایک نیم تاریک طویل ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ میرے کانوں میں کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی باؤلنگ میں مصروف ہے۔ اولیویا بولی۔ "میں سب لوگوں سے تمہارا تعارف کروا دیتی ہوں۔"

سب سے پہلے البرٹ سے ملتے ہیں۔"

ہم ایک طویل راہداری سے گزرتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے جو نیچے تہ خانے تک جا رہی تھیں۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس تہ خانے کی دیواریں، فرش سب کچھ پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اولیویا نے دروازہ کھولا اور ہم ایک روشن کمرے میں داخل ہو گئے جہاں باؤلنگ کے لیے دو رویہ لین بنی ہوئی تھی اور ایک تیس سالہ شخص پورے انہماک سے باؤلنگ میں مصروف تھا۔ اس نے پانچ قدم کا اسٹارٹ لیا اور بڑی مہارت سے گیند نشانے کی جانب لڑھکا دی جو سیدھی نشانے پر جا کر گری۔

"البرٹ!" اولیویا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ان سے ملو، یہ مسٹر کارڈولا ہیں۔ پرائیویٹ سراغ رساں اور یہ آج کی رات اسی حویلی میں گزاریں گے تاکہ کوئی انکل ہیکٹر کو قتل نہ کر سکے۔"

البرٹ نے بے دلی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ دوبارہ اپنا کھیل شروع کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کے اسکور چارٹ پر نظر ڈالی اور اس سے پوچھا۔ "تمہارا اوسط اسکور کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ فخریہ انداز میں بولا۔ "میں نے پچھلے ایک ہزار گیمز میں 257 پوائنٹ اسکور کیے ہیں۔"

مجھے یقین نہیں آیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ اچھے سے اچھا کھلاڑی بھی اتنا اسکور نہیں کر سکتا پھر بھی اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے تعریف کر دی۔ "واہ تم تو زبردست کھیلتے ہو۔"

"میں روزانہ دس گھنٹے پریکٹس کرتا ہوں۔"

میں نے اس کے دائیں بازو پر نگاہ ڈالی وہ واقعی بائیں بازو کے مقابلے میں وہ تھوڑا سا بڑا تھا۔ باہر نکلنے پر اولیویا نے بتایا۔ "البرٹ کا باپ اپنے علاقے کا بہت مشہور باؤلر تھا۔ وہ اور البرٹ کی ماں کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ اس وقت البرٹ صرف دس سال کا تھا۔ اس نے چھ سال یتیم خانے میں گزارے۔ جب انکل ہیکٹر کو اس کا علم ہوا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ اس وقت سے البرٹ یہیں ہے۔ انکل نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے باؤلنگ کا انتظام کر دیا اور اب وہ سارا سارا دن اسی میں لگا رہتا ہے۔"

"البرٹ کو وصیت میں اپنا حصہ نہ ملنے پر کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ اس نے اپنی باؤلنگ کے بارے میں بتایا ہے اگر وہ سچ ہے تو وہ دنیا کا بہترین باؤلر ہے اور کوئی بھی ٹورنامنٹ بڑی آسانی سے جیت سکتا ہے۔ ان مقابلوں سے اتنی آمدنی ہوگی کہ وہ بہت کم وقت میں کروڑپتی بن جائے گا۔"

اولیویا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "البرٹ جب سے یہاں آیا ہے۔ اس کے بعد کہیں نہیں گیا۔ وہ دنیا کے کسی حصے میں نہیں جانا چاہتا، چاہے اسے کتنی ہی بڑی پیشکش کیوں نہ ہو۔"

وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گئی اور وہاں کی لائٹ آن کر دی۔ اب میرے سامنے ایک اور عجیب و غریب منظر تھا۔ وہاں کئی ٹوکریوں اور ڈبوں میں سیب، آلو، چقندر، گاجریں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے شیلف میں کئی جار رکھے ہوئے تھے جن میں مختلف قسم کے جام، جیلی، چٹنی، اچار، محفوظ شدہ پھل اور سبزیاں تھیں۔

"یہ سارے کام فیز بالٹ خود کرتا ہے۔" اولیویا نے اپنے دوسرے کزن کے بارے میں کہا۔ "بیج بونے سے لے کر ان کی کاشت تک سب کچھ اس کی ذمے داری ہے۔ پھر وہ ان پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اس نے گیراج کو ایک گودام میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں ضرورت کے مطابق گوشت اور مرغیاں ذخیرہ کی جاتی ہیں۔"

اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "فیز بالٹ نیوی میں پائلٹ تھا۔ ایک لڑائی میں اسے گولی لگی اور وہ زخمی ہو کر ایک ایسے جزیرے میں محصور ہو گیا جس کا رقبہ بمشکل ایک ایکڑ تھا۔ وہاں صرف تین پام کے درخت تھے۔ مختلف قسم کی سبزیاں ضرور تھیں لیکن ان میں کوئی بھی کھانے کے قابل نہ تھیں۔ البتہ کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ فیز بالٹ نے اس ویران اور غیر آباد جزیرے پر سات مہینے گزارے۔ اس دوران میں اس کی تلاش جاری رہی اور بالآخر نیوی کے ایک ہیلی کاپٹر نے اسے دیکھ لیا۔ اس کا وزن خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا۔ سب لوگ حیران تھے کہ وہ اتنا عرصہ زندہ کیسے رہا۔ جب وہ یہاں آیا تو ہر وقت اس کمرے کو تالا لگا کر رکھتا تھا۔ ہمیں کچن کے لیے کوئی چیز چاہیے ہوتی تو اس کی اجازت لینا پڑتی تھی لیکن اس دوران بھی وہ ہماری نگرانی کرتا رہتا۔ اب اسے یہاں رہتے ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں اور وہ ہم پر اس حد تک بھروسا کرنے لگا ہے کہ اس نے کمرے میں تالا لگانا چھوڑ دیا ہے اور ہم اپنی ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے آزاد ہیں بشرطیکہ انہیں ضائع نہ کریں۔"

ہم پہلی منزل پر واپس آئے اور ایک بڑے سے کچن میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک بھاری بھرکم عورت جس کی عمر پچاس کے قریب ہوگی، ایک میز پر بیٹھی کوئی معما حل کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے سامنے وائن کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ایک گلاس پکڑا ہوا تھا۔ وہ کزن میگی تھی۔ اولیویا نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "کزن میگی ہم سب کے لیے کھانا بناتی ہے اور حقیقت میں وہ ایک بہترین کک ہے۔"

میگی اپنا سر خم کرتے ہوئے بولی۔ "میں اپنی طرف سے بہترین کام کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی۔ کیا میں تمہارے لیے اسنیکس بناؤں؟"

"نہیں شکریہ۔ میں گزشتہ ہفتے اسنیکس لے چکا ہوں۔"

"گزشتہ ہفتے۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

اب مجھے احساس ہوا کہ کیا کہہ گیا حالانکہ اس میں کچھ غلط نہ تھا۔ میں نے واقعی ایک ہفتے پہلے اسنیکس کھائے تھے لیکن اپنا بھرم رکھنا ضروری تھا اس لیے بات بدلتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے کافی کے ساتھ سینڈوچ لے لیا تھا۔ اس لیے فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔" پھر میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اس بارے میں کیا احساسات ہیں... اگر انکل ہیکٹر اپنی وصیت تبدیل کر دیں اور تم سب اپنے حصے سے محروم ہو جاؤ؟"

میگی کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "یہ ان کی دولت ہے اور وہ اسے جس کو چاہے دے دیں۔ میں نے کبھی اپنے حصے کے بارے میں نہیں سوچا بلکہ میں تو ان کی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بس میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ یہاں میری ملازمت چلتی رہے۔"

ہم نے میگی کو وہیں چھوڑا اور دوسری منزل پر آ گئے۔ میں نے اولیویا سے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تم نے اپنی کزن کو کھانا پکانے کے لیے ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"میگی اس کام کے لیے بہت مناسب ہے اور وہ خود بھی اسے پسند کرتی ہے۔"

"اسے اپنی ملازمت ختم ہو جانے کا ڈر کیوں ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ بہت اچھی کک ہے پھر تو اسے دوسری ملازمت ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔"

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
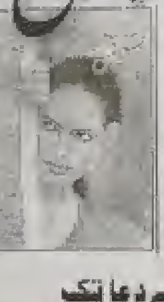
اپریل 2011ء
پربہار کہانیوں کا
حسین گلدستہ

دوا سے دعا تک
آخری صفحات پر محی الدین نواب کے قلم کی نشتر زنی ... معصوم زندگیوں کو دیمک سے زیادہ چاٹ جانے والے معاشرتی ناسوروں کا احوال

عبرت سرائے دھر
بادشاہت کے سفر میں نشیب و فراز ... چہروں کے ساتھ بدلتے حالات ... ماضی کے دامن سے ایک اور تاریخی سوغات ... ابتدائی صفحات پر
ڈاکٹر ساجد امجد کا دلکش انداز

حضرت یوشعؑ بن نون
اول و آخر ... حضرت یوشعؑ بن نون کی زندگی کے دوسرے انبیائے کرامؑ کے واقعات سے حیرت انگیز مماثلت
رضوانہ ساجد کے قلم سے ایک اور شاہکار

کالی بھیڑیں
ازل سے ہی دشمن دولت انسان کی عزت اور زندگی سے کھیلتی آ رہی ہے ... ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور جرم کہانی

انگارے

واپسی، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

منظر امام، ممتاز آزاد، کاشف زبیر، مہرین خان، تنویر ریاض، اسلم انور کی دلچسپ اور دلفریب کہانیاں آپ کی منتظر

digestpk.blogspot.com

"بدقسمتی سے اسے بہت زیادہ پینے کی عادت ہے اور اسی وجہ سے وہ کئی جگہ سے نکالی جا چکی ہے۔ یہ حویلی اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے یہاں رہ کر وہ اطمینان سے اپنا کام کر سکتی ہے۔"

اولیویا ایک کھلے ہوئے دروازے کے سامنے رک گئی۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک گنجا شخص آرام کرسی میں دھنسا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اولیویا نے اس کا تعارف فیز بالٹ کے نام سے کروایا۔ اس نے مجھے وائن کی پیشکش کی جسے میں نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا۔ وہ اپنا گلاس لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ میں نے خود تیار کی ہے اور اس کا نام فیز بالٹ 71 ہے۔"

میں نے ایک نظر کمرے میں رکھے ہوئے بک شیلف پر ڈالی۔ وہاں رکھی ہوئی تمام کتابیں سبزیوں اور پھلوں کی کاشت اور جانوروں کی افزائش سے متعلق تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم باغبانی بھی کرتے ہو؟"

"نہیں، اس کام میں سارا سال مصروف رہنا پڑتا ہے۔ میرا آدھا وقت پھلوں اور سبزیوں کو اسٹور کرنے اور انہیں موسم سرما کے لیے محفوظ کرنے میں گزر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اگلے موسم بہار کی پلاننگ کرنے کے لیے مختلف کتابیں اور رسالے بھی پڑھنا ہوتے ہیں۔"

فیز بالٹ سے ملنے کے بعد ہم ایک بار پھر راہداری میں آگے بڑھنے لگے۔ ایک کونے میں کھڑکی کے ساتھ چالیس سالہ عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید تھا اور وہ سگار کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ اولیویا نے اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور بولی۔ "آخر تم سگار پینا کیوں نہیں چھوڑ دیتیں وینڈی! جانتی ہو کہ یہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔"

کزن وینڈی نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن مجھ پر اثر ہو ہی جائے گا۔"

"وینڈی ایک رسالے کی بانی اور ایڈیٹر ہے جو مرغبانی سے متعلق تھا۔ پورے ملک میں اس کے سالانہ خریداروں کی تعداد ایک سو دس تھی جن میں سے ایک سو نہ لکھنے والے تھے۔" اولیویا نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

وینڈی نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ "یقین کرو مجھے بارہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ گزشتہ مہینے مجھے آٹھ سو مسودے پڑھنا پڑے لیکن یہاں کام کی کوئی قدر نہیں۔"

"تم جانتی ہو وینڈی کہ تمہارے کبھی پڑھنے والے معلومات کے لیے تم پر انحصار کرتے ہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "وینڈی صرف ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ مرغبانی کی ماہر بھی ہے۔"

وینڈی نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کام میں اسی وقت ہاتھ ڈالتی ہوں جب مجھے وقت ملتا ہے۔"

وہاں سے نکلتے ہوئے میں نے اولیویا سے پوچھا۔ "اس نے اپنے میگزین کا نام ٹرمیلیو کاؤنٹی پر رکھا ہے یہ وہ تو نہیں جو شمال میں تین سو میل کے فاصلے پر ہے۔"

"ہاں، وینڈی پہلے وہیں رہتی تھی۔ وہ وہاں ایک کیفے میں ویٹرس تھی اور فارغ وقت میں نظمیں بھی لکھتی تھی۔ ایک روز کسی ٹرک ڈرائیور نے اس کے ہاتھ سے ڈائری چھین لی اور گاہکوں کے سامنے بلند آواز سے اس کی نظم پڑھنے لگا۔ وینڈی نے غصے میں آ کر اس کے سر پر اسٹول دے مارا جس کے نتیجے میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ انکل ہیکٹر کو معلوم ہوا تو وہ اسے پیرول پر رہا کروا کر اپنے ساتھ لے آئے۔"

"کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ یہ سب لوگ انکل ہیکٹر کے حقیقی رشتے دار ہیں؟"

اولیویا نے ایک سرد آہ بھری اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی حقیقی رشتے دار نہیں ہے لیکن ہم سب اپنے آپ کو آپس میں کزن ہی سمجھتے ہیں۔"

وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔ "انکل کرٹس ہر چھ مہینے بعد یہاں کچھ عرصہ رہنے کے لیے آتے ہیں۔ وہ گزشتہ شب رات کے کھانے کے بعد آئے تھے۔ انکل ہیکٹر نے ہم سب کو سختی سے تاکید کر دی ہے کہ ان کے سامنے اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے کہ کوئی شخص انکل کی جان لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے مہمان کو پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ میں انکل کرٹس کے سامنے تمہیں بھی اپنا مہمان ظاہر کروں گی۔"

انکل ہیکٹر اور انکل کرٹس سے ہماری ملاقات گیم روم میں ہوئی۔ انکل ہیکٹر کا قد چھوٹا اور بال پوری طرح سفید تھے اور چہرے سے ہی وہ شریف النفس انسان معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے برعکس انکل کرٹس کا قد لمبا اور آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ انہوں نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور بولے۔ "تم مہمان ہو یا کوئی اور کزن جنہیں ہیکٹر وقتاً فوقتاً دریافت کرتا رہتا ہے؟"

اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہی ہوں...
ڈیئر! تم بھی تو کچھ بولو۔

اولیویا نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "انکل ہیکٹر! اب تک کتنی رقم جیت چکے ہو؟"

"پندرہ ہزار ڈالر۔" انکل ہیکٹر نے فخریہ جواب دیا۔ "کمال ہے جبکہ انکل کرٹس تو بہت اچھے کھلاڑی ہیں اور وائٹ بال ان کا پسندیدہ گیم ہے۔"

"ایٹ بال۔" میں نے کہا۔ "مجھے یاد ہے کہ یونیورسٹی کے زمانے میں یہ گیم کھیلا کرتا تھا۔"

انکل کرٹس نے مجھے غور سے دیکھا اور ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور بولے۔ "تم میرے ساتھ ایک گیم کھیلنا پسند کرو گے۔ ہم پانچ ڈالر سے شروع کرتے ہیں۔"

میں نے رضامندی ظاہر کر دی لیکن پہلا گیم ہی ہار گیا۔ مجھے اپنے پانچ ڈالر ضائع ہونے کا افسوس تھا لہٰذا انہیں واپس لینے کے لیے میں نے دوسرا گیم بھی کھیلنے کا فیصلہ کیا لیکن بدقسمتی سے وہ بھی ہار گیا۔ انکل کرٹس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولے۔

"میرا سونے کا وقت ہو رہا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک آخری گیم کھیل لیں۔ اس بار بازی پچاس ڈالر کی ہوگی۔"

میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے فوراً ہاں کر دی۔ ایک کے پانچ بنانے کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس بار میں نے پوری مہارت کا مظاہرہ کیا اور یہ گیم جیت گیا۔ انکل کرٹس کو اس شکست کی امید نہیں تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولے۔ "یہ ناممکن ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے دس دس ڈالر کے پانچ نوٹ نکالے اور انہیں میز پر رکھ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

انکل ہیکٹر نے ستائشی انداز میں میری طرف دیکھا اور بولے۔ "میں تو کئی برسوں سے یہ منظر دیکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

ان کی زبان سے یہ کلمات سن کر میری تھوڑی سی ہمت بندھی اور میں اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم خاموشی سے اپنی وصیت تبدیل کر لیتے اور بعد میں اہل خانہ کو بتا دیتے کہ انہیں نئی وصیت کے مطابق حق وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کتنے لوگوں کو دوسرے دن کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ جنہوں نے بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرنے والے ہیں۔"

"نان سینس۔" انکل ہیکٹر نے کہا۔ "ننانوے فیصد ایسے لوگ زندہ رہتے ہیں اور دوسری صبح اپنے وکیل سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک فیصد لوگ ہوں گے جنہیں وقت سے پہلے یہ انکشاف کرنے کی صورت میں قتل کر دیا جاتا ہے لیکن اس طرح معاملے کی اتنی شہرت ہو جاتی ہے کہ قاتلوں کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور بولے۔ "میرا خیال ہے کہ ہم سب کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم آج رات میرے بیڈ روم کے دروازے پر پہرا دو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "میں تمہارے بیڈ روم میں رہوں گا کیونکہ ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتا۔"

ہم نے اولیویا کو خدا حافظ کہا اور اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ ہیکٹر کا بیڈ روم میرے پورے اپارٹمنٹ کے برابر تھا۔ اس میں ایک بڑا سا بیڈ اور زیادہ گنجائش والا آتش دان بھی تھا۔ جب ہیکٹر لباس تبدیل کرنے گیا تو میں نے کمرے کی پوری طرح تلاشی لی پھر میں نے تمام کھڑکیوں کا جائزہ لیا اور یقین کر لیا کہ وہ سب اندر سے بند ہیں پھر میں نے پردے برابر کیے اور آرام سے بیٹھ گیا۔ میں نے ایک بار پھر غور سے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ لگتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے مجھے چیک کرنا چاہیے تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر کمرے کا طواف کرنے لگیں لیکن میں کچھ معلوم نہیں کر سکا۔

digestpk.blogspot.com

ہیکر نے اپنے سلیپر اتار دیے اور بستر پر بیٹھ گیا۔
''تمھیں رات بھر یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کاؤچ پر کیوں نہیں لیٹ جاتے۔ میں تمھیں ایک تکیہ دے سکتا ہوں۔''

''نہیں شکریہ۔'' یہ کہہ کر میں کتابوں کے شیلف کی طرف گیا۔ وہاں سے امراضِ خون سے متعلق ایک کتاب نکالی اور اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ ہیکر نے سونے کے ارادے سے آنکھیں بند کرلیں۔ پانچ منٹ بعد اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور اس کے بعد وقفے وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر اس نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں گرم دودھ کا گلاس پیے بغیر نہیں سو سکتا اور آج میں سونے سے پہلے یہ گلاس لینا بالکل ہی بھول گیا۔ اگر تمھیں زحمت نہ ہو تو کچن میں جا کر دیکھو کہ بیگی وہاں ہے۔ اگر وہ جا چکی ہو تو تم ایک گلاس دودھ کسی برتن میں ڈال کر ہلکا سا گرم کر سکو گے۔ بس اتنا کہ اس میں ایک ابال آجائے۔ پھر اس میں ایک چمچہ چینی ملا دینا۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں اس کمرے کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے پھر میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ دودھ سربمہر بوتل سے لیا جائے۔''

ہیکر اپنی گردن کھجاتے ہوئے بولے۔ ''رہنے دو۔ کچن یہاں سے کافی دور ہے۔'' پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''الماری میں عمدہ قسم کی شراب موجود ہے۔ ایک دو گھونٹ لے کر تم کافی آرام محسوس کرو گے۔''

''میرا آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ میں شراب نہیں پیتا۔''

ہیکر نے دوبارہ تکیے میں اپنا سر دے دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ صبح پانچ بجے کے قریب مجھے اچانک اس بات کا احساس ہوا جو مجھے پہلے ہی دیکھ لینی چاہیے تھی مگر میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے ہیکر کی جانب نظر ڈالی۔ وہ واقعی سو رہا تھا یا سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ میں پانچ منٹ تک یونہی بیٹھا رہا پھر ایک زوردار جماہی لی میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں نے زور زور سے خراٹے لینا شروع کردیے۔ کتاب میرے زانوؤں سے پھسل کر قالین پر جا گری۔

دانکل ہیکر نے آنکھیں کھول دیں اور تین منٹ تک مجھے دیکھتے رہے پھر وہ خاموشی سے بستر سے نیچے اتر آئے اور دبے پاؤں چلتے ہوئے ایک الماری تک گئے۔ انہوں نے دراز کھولی اور اس میں سے ایک شکاری چاقو نکال لیا۔ پھر وہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے دروازے تک گئے اور باہر نکل کر غائب ہو گئے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے تعاقب میں چل دیا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے لیکن میں نے ان سے اتنا فاصلہ رکھا کہ تاریکی میں انہیں نظر نہ آؤں۔ پھر وہ ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ آہستہ سے دروازے کی ناب گھمائی اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی خاموشی سے ان کا پیچھا کرتا رہا۔ یہ کمرا بھی تقریباً ویسا ہی تھا جو ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں بھی ویسا ہی عالیشان بستر تھا جس پر انکل کرٹس سو رہے تھے۔ انکل ہیکر بستر کے نزدیک پہنچے اور چھری والا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھا اور مضبوطی سے ان کی کلائی پکڑ لی۔ چاقو ان کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ میری آمد اور ایکشن پر گھبرا اٹھے لیکن انہوں نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا بلکہ لمحے بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ انکل کرٹس دنیا و مافیہا سے بے خبر خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ بارش اب بھی زور و شور پر ہو رہی تھی اور وقفے وقفے سے بجلی بھی چمک رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا۔ انکل ہیکر کی طرف بڑھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انکل ہیکر نے چھت کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کچھ دیر پہلے کوئی چیز اڑتی ہوئی دیکھی تھی۔''

''لگتا ہے کہ تمھیں بیڈ روم بدلنے کا شوق ہے؟'' میں نے اس کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

وہ معصوم بنتے ہوئے بولے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں جب پہلی بار اس کمرے میں آیا اور میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو مجھے جس چیز کی تلاش تھی، وہ نظر نہیں آئی اگر وہ یہاں ہوتی تو میں فوراً ہی اس کا نوٹس لیتا۔ مجھے معاملے کی تہ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگا اور جب میں جان گیا کہ جو کچھ مجھے چاہ رہا ہوں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ تب مجھے شک ہوا کہ وہ شے کسی دوسری جگہ پیش آیا تھا اور تم شاید اس کی زد میں تھے۔''

''یہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''اولیویا میرے پاس اس لیے آئی تھی کہ کسی نے تم پر

بیڈ روم کی کھڑکی سے گولی چلائی تھی۔'' میں نے کھڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی گولی لگنے کا نشان نہیں ہے۔''

انہوں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس وقت کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔''

''جھوٹ نبھانے کی اچھی کوشش ہے لیکن تم اس بات کی کیا وضاحت پیش کرو گے کہ کرٹس کے کمرے کی ایک کھڑکی پر گولی کا نشان موجود ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئے لیکن میں نے انہیں زیادہ موقع نہیں دیا اور بولا۔ ''تم نے اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کا ڈراما رچایا اور جب آج شام کرٹس یہاں قیام کے ارادے سے آیا تو تم نے اسے بتایا ہوگا کہ گیسٹ روم میں کام ہو رہا ہے لہٰذا وہ اس کے بجائے تمہارا بیڈ روم استعمال کرے۔''

''میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''کیونکہ تمہارا ارادہ کرٹس کو قتل کرنے کا تھا اور تم یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ قاتل تمھیں مارنے کے ارادے سے آیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ تم اپنے بیڈ روم میں

ہو۔ اس نے رات کی تاریکی میں تمہارے دھوکے میں انکل کرٹس پر حملہ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

ہیکر نے مجھ سے نظریں چرالیں لیکن کچھ بولے نہیں۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم کیوں کرٹس کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے؟''

انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اعتراف کیا اور بولے۔ ''ظاہر ہے کہ پیسوں کے لیے۔''

''لیکن تم تو خود کروڑ پتی ہو؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''کبھی تھا۔ میں نے انگولا، لبنان اور بنگلہ دیش میں بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی لیکن آج میں تقریباً قلاش ہو چکا ہوں۔''

انہوں نے اپنی نظریں مجھ پر جما دیں اور بولے۔ ''تم ان لوگوں سے مل چکے ہو جنہوں نے اس گھر میں سکونت اختیار کر رکھی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تب تم یہ بھی جان گئے ہو گے کہ وہ سب زخم خوردہ اور دکھوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں اگر وہ دوبارہ اپنی دنیا میں

Mob: 0300-2119514, 0346-2609625
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام اور پتہ ضرور لکھیں
نوٹ
نوٹس برائے داخلہ
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 گلبرگ، کراچی 75080

چلے گئے تو مکمل طور پر ٹوٹ جائیں گے اور میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا لہٰذا میں نے سوچا کہ اس گھر کو چلانے اور ان لوگوں کی کفالت کرنے کے لیے پیسا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کرِس کو مار دیا جائے کیونکہ اس کی صحت بہت اچھی ہے اور اس کی طبعی موت واقع ہونے کے دور دور تک آثار نہیں ہیں۔ ہم دونوں حقیقی کزن ہیں اور میرے علاوہ اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے لہٰذا اگر وہ مر جائے تو اس کی ساری دولت اور جائداد میرے قبضے میں آ جائے گی۔ تم یقیناً مجھے دوبارہ چاقو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دو گے تاکہ میں اس کا خاتمہ کر سکوں؟"

"نہیں۔" میں نے سختی سے کہا۔

اس وقت مجھے انکل ہیکٹر سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ انہیں اپنے لیے نہیں بلکہ اس گھر میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے سگے نہیں تھے لیکن انکل ہیکٹر ان کی کفالت اپنا فرض اور ذمے داری سمجھ کر رہے تھے۔ انہیں واقعی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچ لیا کہ ان کی جگہ یہ کام میں کروں گا لیکن مجھے کوئی جلدی نہیں تھی اور نہ ہی میں اس گھر میں رہ کر انکل کرِس کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا اس کے لیے مناسب وقت وہ تھا جب کرِس شہر کی کسی سنسان سڑک پر جا رہا ہو تو میں اس پر جھپٹ پڑوں اور اس کی گردن دبوچ کر والٹ نکال لوں۔ پولیس کے ریکارڈ میں یہ جرم محض ایک ڈاکا زنی کہلائے گا۔

میں نے انکل ہیکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "میں ذاتی طور پر اصرار کروں گا کہ تم کرِس کو مارنے کا خیال دل سے نکال دو۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ ایک یا دو ہفتوں میں تمہاری قسمت ڈرامائی طور پر بدل جائے گی۔"

انکل ہیکٹر شرمندہ ہوتے ہوئے بولے۔ "اب مجھے کچھ سکون محسوس ہو رہا ہے کہ آج رات میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب گزشتہ شب ہیکٹر پر حملہ ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ حملہ آور کے لیے یہ رات بری ثابت ہوئی تھی۔ میں ہیکٹر کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ جانوس مجھے واپس شہر چھوڑ آئے؟"

"ہاں... ہاں، کیوں نہیں۔ اس کا کمرا تیسری منزل پر ہے۔"

میں اوپر گیا اور جانوس کو جگا کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "بارش کی وجہ سے گاڑی کے ڈسٹری بیوٹر میں پانی چلا گیا ہوگا۔ اگر میں اسے کھول کر صاف کروں تو شاید انجن اسٹارٹ ہو جائے لیکن اس کے باوجود بھی ہم وقت پر شہر نہیں پہنچ سکیں گے اور اس وقت ہمارے پاس اس ویگن کے سوا کوئی اور گاڑی نہیں ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ جانا بھی ضروری تھا اگر فوراً نکل پڑوں تو شاید کچھ دیر بھٹکنے کے بعد مجھے شہر جانے والی کوئی گاڑی مل جائے۔ ابھی اتنا وقت تھا کہ میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر گرم پانی سے غسل کر سکتا تھا۔ جانوس نے شاید میری سوچ پڑھ لی۔ وہ بولا۔ "میں اس موسم میں تمہیں باہر جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تم تھوڑی دیر کے لیے یہیں کیوں نہیں رک جاتے۔ ہمارے گودام میں بہت جگہ ہے۔ میں وہاں تمہارے لیے ایک پلنگ ڈال دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

ہم دونوں سیڑھیاں اترتے ہوئے گودام میں چلے گئے۔ جانوس نے میرے لیے ایک پلنگ پر چادر، تکیہ اور کمبل کا انتظام کر دیا اور بولا۔ "اب آپ آرام سے سو جائیں۔"

اس کے جانے کے بعد میں بھی آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ عام حالات میں شاید ہی کسی گودام میں سونا پسند کرتا لیکن اس وقت وہ جگہ مجھے غنیمت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کافی کشادہ گودام تھا جس کے دروازے پر خوب صورت محراب بنی ہوئی تھی۔ گودام میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ اس لیے کچھ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرے پاس اتنی بڑی جگہ ہو تو اس کی تزئین و آرائش کے لیے میرے اپارٹمنٹ کا سامان بالکل ناکافی ہوگا۔

دفعتاً مجھے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے اپنے سلیپر پہنے اور باہر نکل کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اولیویا وہاں سے گزری۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور پیروں میں سلیپر تھے۔ اس نے راہداری کے آخری سرے پر واقع ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے چل دیا۔ اس کمرے میں قدیم نوادرات رکھے ہوئے تھے اور وسط میں ماربل کے پلیٹ فارم پر پتھر کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ اولیویا کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحوں بعد مجھے تابوت کا ڈھکنا اٹھنے اور پھر رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں مسکرایا اور واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اولیویا نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ بازی یوں بھی پلٹ سکتی ہے۔ خالی تابوت نے یقیناً اسے چکرا کر رکھ دیا ہوگا!

خوف پیما

ظفر سعید یوسفی

حادثے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں... لیکن کوئی ایک حادثہ اتنا دیرپا ثابت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود اس کے اثرات آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ لمحہ بہ لمحہ گزرتی زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتے چلے جاتے ہیں... ایک کوہ پیما کو پیش آنے والے حادثے کا ماجرا۔

خوف و دہشت اور انسانی نفسیات کی باریکیوں کا احاطہ کرتی تحریر

سیاحوں کی یہ بس اصل میں انگلینڈ سے روانہ ہوئی تھی۔ بس ایک ٹور کمپنی کی تھی جو پورے یورپ میں کام کرتی ہے۔ اس کی بسیں سیاحوں کو لے کر مختلف ملکوں میں گھومتی ہیں اور سیاح مطلوبہ رقم دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ان کی ٹرانسپورٹیشن اور رہائش کمپنی کے ذمے ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو کمپنی کھانے کا انتظام بھی کرتی ہے لیکن بہت کم سیاح اس پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کھانے میں بیشک انہیں ذرا زیادہ رقم خرچ کرنا پڑے تب بھی خود سے اور اپنی پسند کے کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اے ایم ڈی یہ کمپنی ایک ساکھ رکھتی تھی اور اس کے

digestpk.blogspot.com

ٹورز میں شامل ہونے والے لوگ عام طور سے مطمئن ہوتے تھے۔ اس کے بارے میں شکایات بہت کم سننے میں آتی تھیں۔ ان کی بسیں آرام دہ تھیں۔ جن ہوٹلوں میں سیاحوں کا قیام ہوتا، وہ سب معیاری ہوتے تھے۔ سفر کے دوران میں بہت کم کسی کو شکایت ہوتی تھی۔ اگر کسی کو کوئی شکایت ہوتی بھی تو کمپنی کی جانب سے اس کا فوری ازالہ کر دیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ جو ٹرانسپورٹ اور رہائش کے مسائل میں الجھے بغیر سیاحت کا مزا اٹھانا چاہتے ہیں، وہ عام طور سے ٹور کمپنیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بہت کم کمپنیاں ایسی ہیں جو گاہکوں کو وہی سہولتیں دیتی ہیں جس کا وہ اپنے ٹور بروشرز میں وعدہ کرتی ہیں۔ اے ہام کمپنی جرمن تھی اور اس کی سروس بہت معیاری تھی۔ یہی وجہ تھی جو سیاح ایک بار اس سے سفر کرتے وہ پھر کسی اور کمپنی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ اس میں خاصیت یہ تھی کہ جو بس ایک مقام یا ملک سے چلتی وہی ٹور پیکیج کے مطابق گھوم پھر کر واپس آتی تھی۔ سیاحوں کو کہیں بھی بس نہیں بدلنا پڑتی تھی۔

اے ہام کا ایک ٹور پیکیج لندن سے فرانس کے راستے سوئٹزرلینڈ تک تھا۔ اس ایک ہزار کلومیٹر سفر میں سیاحوں کو درمیان میں صرف ایک جگہ رکنا ہوتا۔

لندن سے روانہ ہونے والی اس بڑی لگژری بس میں تقریباً بائیس انگریز سوار تھے اور باقی سیاح فرانس سے اس میں سوار ہوتے، جس کے بعد بس کو سوئٹزرلینڈ روانہ ہو جانا تھا۔ مائیکل اسمتھ جب بس میں سوار ہوا تو مکمل خاموشی تھی۔ انگریز ایک خاموشی پسند قوم ہے۔ اگرچہ اس سفر میں چند جوڑے اور تقریباً نصف عورتیں تھیں لیکن وہ بھی خاموش تھیں یا سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔ اکثر مرد کتاب یا رسالے دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے یہ سفر محض مطالعے کے لیے کیا ہے۔ مائیکل اسمتھ اپنی نشست کے قریب آیا اور اس نے پہلے اپنا بیگ اوپر موجود خانے میں رکھا اور پھر نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ مختصر سا سامان لے کر نکلا تھا۔ اس کے پاس دو جوڑے اور ایک گرم جیکٹ تھی۔ اس کے علاوہ اس کا منی نوٹ بک کمپیوٹر تھا جو دوسرے بیگ میں اس کے شانے سے لٹکا تھا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مائیکل نے اسے گود میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ والی نشست خالی تھی۔ شاید اس پر فرانس کا کوئی سیاح آتا۔ اس نے سوچا... کیونکہ بس حرکت میں آنے والی تھی اور اس کے دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب یہاں سے مزید کوئی سیاح بس میں سوار نہیں ہوگا۔

کچھ دیر بعد بس ٹرمینل سے نکل کر لندن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی اور پھر لندن سے انگلش چینل ٹنل کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسی سرنگ کے راستے وہ انگلینڈ سے فرانس میں داخل ہوتی اور اس کے بعد پیرس تک کا سفر مشکل سے ایک گھنٹے کا تھا۔ پیرس کے بعد وہ صحیح معنوں میں سیاح بن جاتے۔ مائیکل بس سے باہر کے نظارے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ایک کتاب لکھ رہا تھا جس میں اس کی زندگی کے تجربات تھے۔ ان میں کچھ بہت یادگار تھے اور اچھی یادداشت رکھتے تھے لیکن کچھ تجربات بہت خوف ناک تھے اور ان تجربات نے اسے گھر بٹھا دیا تھا۔ آج وہ برسوں بعد انگلینڈ سے باہر جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا۔

سرسبز کھیت ختم ہوئے اور سرنگ شروع ہو گئی۔ سیاحوں میں پہلی بار جوش و خروش پیدا ہوا۔ یہ سرنگ انسانی عزم و حوصلے اور انجینئرنگ کی مہارت کا ایک شاہکار تھی اور جب یہ بنی تھی، تب ہی بے شمار سیاح دنیا بھر سے صرف اسے دیکھنے یہاں آئے تھے۔ اب تو اس کا چارم اتنا نہیں رہا ہے لیکن پھر بھی اس میں سفر کرنا لوگوں کے لیے ایک الگ سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے ان سیاحوں کے لیے جو پہلی بار سرنگ میں سفر کرنے والے تھے۔ خود مائیکل بھی پہلی دفعہ اس سرنگ میں سفر کرنے والا تھا۔ اس سے پہلے وہ انگلینڈ سے ہوائی جہاز کے ذریعے باہر گیا تھا۔ عجیب بات تھی، وہ دنیا کے ایک درجن ملکوں میں جا چکا تھا لیکن فرانس کی سرزمین پر اس کا یہ پہلا قدم ہوتا۔

سرنگ کا سفر دس منٹ سے بھی پہلے ختم ہو گیا کیونکہ سرنگ میں ٹریفک بہت تیز تھا اور گاڑیاں ہوا کی تیزی سے گزر رہی تھیں۔ البتہ جب وہ فرانس کی جانب نکلے تو ان کی بس ایک طرف رک گئی۔ ان کے پاسپورٹ اور دوسری چیزیں چیک ہونا تھیں۔ یہ کام بس میں ہی ہو گیا اور نصف گھنٹے بعد وہ پیرس کی طرف رواں تھے۔ مائیکل کو فرانس کا یہ حصہ انگلینڈ سے مختلف نہیں لگا۔ ویسی ہی زمین تھی اور ویسی ہی فضا۔ البتہ لوگوں کے لباس کسی قدر مختلف تھے۔ بس میں موجود افراد اب دلچسپی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ مائیکل کچھ دیر میں اکتا گیا اور اس نے سر نشست سے ٹکایا اور اونگھنے لگا۔

بس پیرس میں داخل ہوئی تو وہ کسی قدر شور سن کر چونک گیا۔ مسافر اب پیرس دیکھتے ہوئے خوش ہو رہے تھے۔ وہ بھی پیرس کی سڑکوں اور عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ لندن کے مقابلے میں پیرس کھلا اور روشن شہر ہے۔ اب تو لندن کو بھی کھلا اور روشن کیا جا رہا ہے۔ نئی بننے والی عمارتوں اور بعض پرانی

عمارتوں کو بھی روشن رنگ دیے جا رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر لندن تاریک نظر آنے والا شہر ہے۔ جیسے کوئی سیاہ لباس پہنے عمر رسیدہ عورت ہو۔ اس کے مقابلے میں پیرس کسی خوش رنگ حسینہ کی طرح شوخ اور چمکتا دمکتا نظر آ رہا تھا۔ لوگوں میں چہل پہل اور زندگی کے آثار لندن کے مقابلے میں کہیں نمایاں تھے اور حیرت کی بات ہے کہ ایک ہی جیسے عرض البلد میں واقع ہونے کے باوجود پیرس میں سورج بھرپور طریقے سے چمکتا ہے جبکہ لندن کے بیشتر دن بادلوں اور دھند میں لپٹے رہتے ہیں۔

ذرا دیر بعد بس پیرس کے بس ٹرمینل میں داخل ہوئی جہاں فرانسیسی سیاح اس کے منتظر تھے۔ بس یہاں صرف آدھے گھنٹے کے لیے رکی تھی کیونکہ ان کے ٹرپ میں پیرس کی سیر شامل نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگ بس سے اتر کر ٹرمینل میں آس پاس ٹہلنے لگے تھے۔ بس ڈرائیور نے انہیں خبردار کیا کہ وہ نزدیک رہیں ورنہ بس انہیں چھوڑ کر روانہ ہو جائے گی۔ اگر کوئی سیاح مقررہ وقت پر بس میں نہیں آیا تو پیرس میں رہ جانے کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔

پیرس سے فرانسیسی سیاح بس میں سوار ہوئے تو تقریباً تمام ہی نشستیں بھر گئیں۔ وہ فرانسیسی زبان میں سلام دعا کرتے اندر آئے اور تمام مسافروں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ اس کے بعد اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔ فرانسیسی سیاحوں کے آنے سے بس کا ماحول اچانک ہی بدل گیا تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے تک خاموشی اور زندگی میں ٹھہراؤ سا تھا، وہاں اچانک ہی کسی قدر شور اور ماحول میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ فرانسیسی قوم ویسے ہی ملنے جلنے کی عادی ہے اور جب یہ مل کر بات کریں تو آس پاس کو بھی چونکا دیتے ہیں۔

مائیکل کے برابر میں ایک جوان فرانسیسی لڑکی آ کر بیٹھی تھی۔ اس کی عمر شاید ستائیس برس ہوگی اور اس نے بہت خوب صورت پھول دار اسکرٹ پہن رکھا تھا جس میں اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔ گول چہرے اور معصومانہ نقوش کی وجہ سے وہ دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہائے۔" اور مائیکل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو۔" مائیکل بھی جواباً مسکرایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مالینا کیوسے۔" لڑکی نے اپنا نام بتایا۔ باقی فرانسیسی مائیکل کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"مائیکل اسمتھ۔" اس نے اپنا نام بتایا۔ یہ تو واضح تھا کہ مالینا کو انگریزی نہیں آتی تھی اور اسے فرانسیسی نہیں آتی

ایک صاحب نے نوجوان فقیر سے کہا۔ "آخر تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"
"میری قسمت ہی ایسی ہے۔ ہزار کوشش کرتا ہوں لیکن کوئی کام نہیں ملتا۔"
ان صاحب کو ترس آ گیا، بولے۔ "میں تمہیں پرچہ لکھ کر دیتا ہوں انہیں دست راست کی ضرورت ہے۔"
"آہ میری قسمت۔" نوجوان فقیر نے جواب دیا۔ "میں شروع سے بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوں۔"

تھی اس لیے وہ بس ایک دوسرے کو نام بتا سکتے تھے یا اشاروں کی زبان میں بات کر سکتے تھے۔ یہ بات سمجھتے ہوئے مالینا کچھ دیر خاموش رہی لیکن پھر اس نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ شاید اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ مائیکل سنتا رہا اور سر بھی ہلاتا رہا جس سے مالینا کو تاثر ملتا رہا کہ وہ اس کی باتوں پر غور کر رہا ہے۔ اس سے اس کی گفتگو میں مزید جوش و خروش آ گیا۔ مائیکل بور نہیں ہوا بلکہ اسے مزہ آ رہا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی وہ انداز سے کوئی بات سمجھ کر اسے لقمہ بھی دے دیا کرتا۔

بس پیرس سے روانہ ہوئی اور ایک بار پھر پیرس کے مضافات سے گزرنے لگی۔ مائیکل کو لگا کہ پیرس لندن کے مقابلے میں کہیں وسیع شہر ہے۔ شاید اس لیے کہ یہاں کثیر المنزلہ عمارتوں کے بجائے مکانات یا دو تین منزلہ عمارتوں کا رواج تھا۔ فرانسیسی زمین سے دوری گوارا نہیں کرتے۔ وہ ابھی تک کثیر المنزلہ عمارتوں کے عادی نہیں ہوئے تھے۔

جب پیرس ختم ہوا تو ہائی وے کے آس پاس کھیت اور جنگل نظر آنے لگے۔ بس روانی سے سڑک پر تیرتی جا رہی تھی اور مسافر ابتدائی جوش و خروش کے بعد اب کسی قدر ٹھنڈے ہو کر باہر کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ مائیکل کی ساتھی لڑکی بھی خاموش تھی اور اس نے اپنے بیگ سے ناول نکال لیا تھا، وہ اس میں مشغول ہو گئی تھی۔ مائیکل نے نوٹ بک کمپیوٹر نکالا اور اس پر اپنی کتاب کے نوٹس دیکھنے لگا۔ وہ اسی مقصد کے لیے نوٹ بک ساتھ لے آیا تھا کہ اسے راستے میں جہاں موقع ملا، اپنی کتاب پر نظرثانی کرتا رہے گا۔ دو گھنٹے بعد بس ایک ہائی وے ریسٹوران کے سامنے رک گئی۔ یہاں مسافروں کو لنچ کرنا تھا۔ ڈرائیور نے اعلان کیا۔

"جس نے جو کھانا ہے، یہاں کھا لے کیونکہ اب شام

"سات بجے سے پہلے کوئی اسٹاپ نہیں ہوگا۔"

مائیکل کا اس وقت موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد اسے بھوک لگ ہی جاتی اس لیے وہ بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے اتر آیا لیکن اس نے کھانے کے بجائے صرف کافی لی اور ایک برگر پیک کروالیا۔ جب اسے بھوک لگتی تو وہ راستے میں کہیں بھی کھا سکتا تھا۔ مالینا نے شاید ناشتا نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ڈٹ کر کھا رہی تھی۔ بس کے باقی مسافر بھی کھانے پینے میں مشغول تھے۔ مائیکل باہر ٹہلنے لگا۔ اس کا برگر پیک ہونے میں وقت لگتا۔ اس دوران میں دو فرانسیسی بچے اس کے آس پاس کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے لگے۔ وہ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار بچے نے بچی کو دھکا دیا تو وہ مائیکل سے ٹکرا گئی۔ مائیکل نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تو وہ فرانسیسی میں سوری کرنے لگی۔ مائیکل نے مسکراہٹ سے اشارہ کیا کہ کوئی بات نہیں۔ اسے مسکراتے دیکھ کر بچی بھی مسکرانے لگی۔

کھانے کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ سب دوبارہ بس میں سوار ہوئے۔ ڈرائیور نے تسلی کی کہ تمام مسافر اندر آچکے ہیں۔ پھر اس نے بس کا دروازہ بند کر دیا اور بس چلا دی۔ مائیکل نے دوبارہ اپنی نوٹ بک کھولی تو مالینا نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی۔ "ترانسلیت... ان ات۔"

مائیکل کو اس کا مطلب سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ اس کے کمپیوٹر میں ترجمے کرنے والا سوفٹ ویئر ہے؟ آج کل ایسے سوفٹ ویئر عام ہیں جو کسی ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مالینا ان کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ مائیکل نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، میرے پاس ایسا سوفٹ ویئر نہیں ہے۔"

مالینا اس کے انداز سے سمجھ گئی۔ شاید وہ چاہ رہی تھی کہ اس سے زبان سے نہ سہی لکھ کر ہی بات کر لی جائے۔ مائیکل اصل میں نوٹ بک صرف لکھنے کے لیے استعمال کر رہا تھا اور اسے کمپیوٹر کے دیگر استعمال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں اپنے کام سے متعلق وہ کوئی چیز انٹرنیٹ پر تلاش کر لیا کرتا تھا۔ اس سے زیادہ اسے کمپیوٹر کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مالینا نے پہلے زبان اور پھر اشاروں سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مائیکل نے اسے اشارے سے بتایا کہ وہ ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ یہ سن کر مالینا پرجوش ہو گئی۔ اس نے شاید کتاب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن مائیکل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس طرح بتائے کہ وہ کس موضوع پر کتاب لکھ رہا ہے۔ اس لیے وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی کتاب انگریزی میں تھی ورنہ وہ مالینا کو اس کے نوٹس پڑھنے کو دے دیتا۔

کچھ دیر بعد مائیکل کو بھوک لگی تو اس نے برگر نکال کر کھایا۔ مالینا اس دوران میں اپنے گیم میں مگن رہی۔ وہ اکیلی تھی کیونکہ مائیکل نے اسے کسی اور سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ باقی سب جوڑے کی صورت میں اور گروپ کی صورت میں سیاحت کے لیے نکلے تھے۔ اسی طرح انگلینڈ سے آنے والے سیاحوں میں مائیکل اکیلا تھا۔ فرانسیسی بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ تھے۔ ان کا باپ ایک چھوٹے قد کا اور اونچی آواز میں بات کرنے والا فرانسیسی تھا۔ میاں بیوی مائیکل اور مالینا کے برابر میں دوسری طرف بیٹھے تھے۔ مائیکل نے محسوس کیا کہ مرد بھی بھی اس کی طرف دیکھ کر اپنی بیوی سے کچھ کہتا ہے۔ مائیکل کو سنائی تو دیتا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔

شام تک وہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے پاس اس قصبے تک پہنچ گئے جہاں ایک ہوٹل میں انہیں رات رکنا تھا۔ ان کی بکنگ پہلے سے تھی چونکہ سارے کمرے ڈبل اور چار بیڈ کی صورت میں تھے۔ اس لیے ڈرائیور نے جو ایک طرح سے ان کا گائیڈ بھی تھا ان سے کہا۔ "سب کمرے میں اپنا اپنا پارٹنر منتخب کر لیں ورنہ میں سیٹ کے حساب سے فیصلہ کر دوں گا۔"

مائیکل نے مالینا کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور نے یہ اعلان فرانسیسی میں بھی کیا تھا۔ مالینا مسکرائی اور اس نے مائیکل کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی وہ رات اس کے ساتھ کمرے میں گزارنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اپنا سامان لے کر کمروں میں آئے۔ کمرے سادہ لیکن آرام دہ تھے۔ بستر بڑے اور صاف ستھرے تھے۔ باتھ روم ساتھ میں تھا۔ جب تک مالینا نہا کر آئی، مائیکل اپنے نوٹس دیکھتا رہا۔ پھر اس نے غسل کیا اور اس کے بعد وہ کھانے کے لیے نیچے آئے۔ کھانے کے لیے بھی انہوں نے ایک ہی میز کا انتخاب کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اوپر آئے۔ مائیکل نے لباس تبدیل کیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ ساتھ لایا تھا۔ مالینا کچھ دیر ہچکچاتی رہی۔ مائیکل سمجھ گیا کہ وہ اپنا سلیپنگ سوٹ نہیں لائی تھی اور شاید لباس اتار کر سونے کی عادی تھی۔ مائیکل نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ مالینا نے جلدی سے اپنا لباس اتارا اور بستر میں گھس گئی۔ وہ صبح مائیکل کے بیدار ہونے سے پہلے اٹھ گئی تھی اور تیار ہو چکی تھی۔ اس نے مائیکل سے اشاروں میں کہا کہ وہ بھی تیار ہو جائے کیونکہ ناشتے کے فوراً

بعد روانگی تھی۔

آٹھ بجے تک وہ ناشتا کر کے روانہ ہونے کے لیے بس میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے مسافروں کی گنتی کی اور اس کے بعد اعلان کیا۔ "کچھ دیر میں ہم سوئس فرنچ سرحد پر ہوں گے۔ اپنے پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس تیار رکھنا اور آج سے ہمارا اصل ٹور شروع ہو جائے گا۔ اگر تم لوگ کسی جگہ رکنے پر اصرار کرو گے تو نصف سے زیادہ مسافر اس کے حق میں ووٹ دیں گے تو تبھی میں رکوں گا لیکن رات کے اسٹاپ طے شدہ ہیں۔"

ایک گھنٹے بعد وہ سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر تھے۔ وہاں انہیں پاسپورٹ دیکھ کر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پہاڑ تو فرانسیسی علاقے سے شروع ہو گئے تھے لیکن سوئٹزرلینڈ تو ہے ہی پہاڑوں کا ملک۔ جب بس نے ایک پہاڑی سڑک پر چڑھنا شروع کیا تو مائیکل کو لگا کہ اس کے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی ہیں۔ اس نے مضبوطی سے اپنی نشست کا ہتھا تھام لیا۔ مالینا نے اس کی حالت دیکھی تو اس نے مائیکل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کی طبیعت پوچھنے لگی۔ مائیکل نے گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ جلدی سے نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مالینا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب بھی مائیکل کی نظر کھڑکی سے باہر سڑک سے نیچے گہرائی کی طرف جاتی تو اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا۔ مالینا شاید سمجھ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے مائیکل کو اپنی نشست پر آنے کا اشارہ کیا۔ مائیکل اس کی نشست پر آ گیا اور وہ کھڑکی والی نشست پر بیٹھ گئی۔ یہاں آ کر مائیکل کی حالت قدرے بہتر ہوئی اور اس نے شکر گزار نظروں سے مالینا کی طرف دیکھا۔ مالینا سمجھ گئی تھی کہ اسے بلندی سے خوف آتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں انہیں پانچ جگہوں پر رکنا تھا اور ہر مقام پر ان کا قیام دو دن کے لیے تھا۔ ان کا پہلا قیام ایک قصبے چارلوٹرز میں تھا۔ یہ قصبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے آس پاس بے شمار تاریخی قلعے اور عمارتیں ہیں۔ ایک زمانے میں یہ جرمن شہنشاہوں کا گرمائی تفریحی مقام بھی تھا۔ ان کے لیے بنائے گئے محلات ابھی تک موجود تھے۔ اپنی تاریخی اہمیت سے ہٹ کر بھی یہ جگہ بہت دلکش ہے۔ وہ شام کو چارلوٹرز پہنچے تھے۔ اس رات رک کر انہیں اگلے دن کچھ سیر و تفریح کرنا تھی اور اس سے اگلے روز وہ صبح سویرے روانہ ہو جاتے۔

اس سوئس ہوٹل میں سارے ڈبل روم تھے اور مالینا مائیکل کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رکی تھی۔ جب بس قصبے سے گزر رہی تھی تو مائیکل نے ایک سی ڈی شاپ دیکھی۔ وہ ہوٹل میں اپنا سامان رکھنے کے بعد باہر نکل گیا۔ سی ڈی شاپ خاصی بڑی تھی اور اسے امید تھی کہ اسے یہاں اپنی مطلوبہ سی ڈی مل جائے گی۔ اس نے سیلز مین سے بات کی۔ اس کی انگریزی واجبی سی تھی لیکن وہ اس کی بات سمجھ گیا اور اس نے کئی طرح کی مطلوبہ سی ڈیز مائیکل کے سامنے رکھ دیں۔ مائیکل کو ان کے بارے میں پتا نہیں تھا اس لیے اس نے سیلز مین کی مدد حاصل کی اور ایک سی ڈی لے لی۔ یہ خاصی مہنگی تھی لیکن سیلز مین نے یقین دلایا کہ اس کا سوفٹ ویئر بہت بہترین ہے۔

وہ ہوٹل واپس آیا تو مالینا تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انہیں ابھی ڈنر کرنا تھا۔ وہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آئے۔ یہاں کھانا اچھا تھا۔ گزشتہ رات کے ڈنر کی ادائیگی دونوں نے الگ الگ کی تھی لیکن اس ڈنر کی ادائیگی مائیکل نے اصرار کے ساتھ خود کی، مالینا اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

کمرے میں آ کر مائیکل نے سی ڈی نکالی اور نوٹ بک میں اس کا سوفٹ ویئر انسٹال کرنے لگا۔ اسے سمجھنے اور پھر انسٹال کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ اس نے جلدی سے سوفٹ ویئر چلایا۔ اس کے بعد اس نے کی بورڈ سے ٹائپ کیا اور بٹن دبایا تو نوٹ بک کے اسپیکر سے آواز آئی۔

"ہیلو مالینا... میں مائیکل ہوں۔"

مالینا اسے مصروف دیکھ کر اپنے گیم میں لگ گئی۔ وہ آواز سن کر اچھل پڑی۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ جھپٹ کر نوٹ بک کے پاس آئی۔ اس نے ہیجانی لہجے میں کچھ کہا۔ مائیکل نے نوٹ بک کا رخ اس کی طرف کر دیا اور اشارہ کیا کہ لکھ کر بات کرے۔ مالینا نے لکھا اور انٹر کیا تو اسپیکر سے اس بار نسوانی آواز آئی۔ اس کی سیٹنگ مائیکل پہلے ہی کر چکا تھا۔ اصل میں یہ ایسا سوفٹ ویئر تھا جو یورپی زبانوں کا آپس میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ تحریر کا ترجمہ بھی کر سکتا تھا اور اسے بول کر سنا بھی سکتا تھا۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟" مالینا نے پوچھا۔

"میں اس سوفٹ ویئر کی سی ڈی لایا ہوں۔"

مالینا بہت خوش تھی کہ اب وہ ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے پھر اسے خیال آیا۔ "صبح بس میں تمہیں کیا ہوا تھا؟"

مائیکل کچھ ہچکچایا لیکن پھر اس نے سچ بول دیا۔ "مجھے بلندی سے خوف آتا ہے۔"

مالینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''اور تم سوئٹزرلینڈ آئے ہو؟''

''ہاں، میں اپنا خوف نکالنا چاہتا ہوں۔''

''یہ اچھی بات ہے لیکن اس سے تمہیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔'' مالینا فکرمند ہوگئی۔

''شاید۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''اس کے باوجود میں یہ تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

مائیکل نے اسے دیکھا اور کہا۔ ''شکریہ۔''

رات کے دس بجے تھے لیکن وہ دونوں بہت تھک گئے تھے اس لیے پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ صبح بھی وہ اس سے پہلے اٹھ کر تیار ہوگئی۔ مائیکل تیار ہوکر آیا۔ ڈائننگ ہال میں ان کی پوری ٹیم جمع تھی اور آج ان کا پروگرام پیدل گھومنے کا تھا، بس انہیں صرف سڑک تک لے جاتی۔ ناشتا کرکے وہ باہر آگئے۔ ڈرائیور ہی گائیڈ تھا اور وہ یہاں کے بارے میں کسی مقامی گائیڈ سے بہتر جانتا تھا کیونکہ اس کا تو یہیں رہتا تھا۔ پہلے وہ انہیں ایک پہاڑی قلعے تک لے گیا۔ بس وہاں تک جاسکتی تھی اس لیے انہیں زیادہ پیدل نہیں چلنا پڑا۔ اس بار مائیکل درمیانی نشست پر بیٹھا تھا اس کے باوجود اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ مالینا نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

قلعے میں وہ ایسی جگہوں سے گریزاں رہا جہاں سے نیچے کی جگہ نظر آتی یا بلندی کا احساس ہوتا۔ مالینا ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ اگر مائیکل زیادہ ہی خوف محسوس کرتا تو وہ اسے تسلی دینے لگتی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بار بار کہتی۔ ''اٹس اوکے... اٹس اوکے۔''

مائیکل سچ مچ بہتری محسوس کرنے لگا۔ وہ مالینا کا شکر گزار تھا۔ اس نے بڑی ہمت جمع کرکے اس سفر کا سوچا تھا لیکن مالینا ساتھ نہیں ہوتی تو شاید وہ پہلے ہی روز ہمت ہار دیتا۔ اس قلعے سے نکل کر وہ جرمن شہنشاہ کا محل دیکھنے گئے۔ وہاں مائیکل کی حالت کسی قدر بہتر تھی کیونکہ محل کے اندر کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کتنے بلند پہاڑوں پر بنا ہوا ہے۔ یہ بلاشبہ بہت حسین محل تھا اور اس میں لاتعداد کمرے تھے۔ سیاحوں کے لیے تمام کمرے کھلے ہوئے نہیں تھے۔ انہیں اندر جانے کے لیے باقاعدہ ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ چار گھنٹے کی اس سیر نے سب کو تھکا دیا اور سب بھوک سے بے تاب تھے اس لیے باقی سیر لنچ تک کے لیے ملتوی کردی گئی۔ وہ واپس ہوٹل آگئے۔

کھانے کے بعد مائیکل نے مالینا سے کہا کہ وہ تھک گیا ہے، اب دوبارہ نہیں جائے گا۔ مالینا سمجھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ اوپر کمرے میں آئی اور اس نے نوٹ بک کی مدد سے اس سے کہا۔ ''تم کیوں نہیں چل رہے؟''

''میں تھکن محسوس کررہا ہوں۔'' مائیکل نے کہا۔

''تم جوان آدمی ہو اور اتنی جلدی نہیں تھک سکتے۔'' مالینا نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ ''تم اپنے خوف کی وجہ سے نہیں جارہے۔''

مائیکل نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ''شاید یہی بات ہے۔''

مالینا اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر اس نے کہا۔ ''اگر تم اسی طرح ڈرتے رہو گے تو خوف کیسے نکلے گا؟ خوف مقابلہ کرنے سے ختم ہوتا ہے، اس سے منہ چھپانے سے نہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' مائیکل نے گہری سانس لی۔ ''میں چلوں گا۔''

مائیکل نے نوٹ بک بند کی اور اپنے ہمراہ لے لی۔ ایک تو اسے مالینا سے بات کرنے میں آسانی رہتی اور دوسرے وہ اس سفر کے بارے میں نوٹس بھی لے سکتا تھا۔ وہ باہر آئے تو سب دوسرے ٹور پر جانے کے لیے تیار تھے۔ اس بار انہوں نے جس جگہ کا رخ کیا، وہ ایک بہت پرانے کھنڈر کی صورت میں پہاڑ کی بلندی پر تھا۔ بس قصبے کے نیچے رک گئی۔ مائیکل بس سے اترا اور اس نے قلعے کو دیکھا تو ڈر گیا۔ اس نے مالینا سے کہا۔

''میں اس پر نہیں چڑھ سکوں گا۔''

مالینا الفاظ تو نہیں لیکن اس کا مفہوم سمجھ گئی۔ دوسرے سیاح اتر کر بے فکری سے اوپر جارہے تھے۔ مالینا نے کچھ کہنے کے بجائے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اسے تقریباً کھینچ کر اوپر لے جانے لگی۔ مائیکل اس کے ساتھ بادل ناخواستہ چل رہا تھا۔ قلعے تک جانے کے لیے پہاڑ کے ساتھ ایک ترچھا اور پتھریلا راستہ تھا جس کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اسے محفوظ بنانے کے لیے اس کے کنارے پر ریلنگ لگا دی گئی تھی۔ اس کے باوجود، مائیکل کو خوف آرہا تھا۔ اس نے بہت ہچکچاتے ہوئے اس پر قدم رکھا۔ حالانکہ ذرا اوپر فرانسیسی بچے اسی راستے پر اچھلتے کودتے جارہے تھے۔ مالینا نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ شاید پلٹ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ ہر قدم پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ مالینا اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس نے اشارے سے کہا کہ وہ اپنی نظر اوپر رکھے، نیچے مت دیکھے۔ مائیکل نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اوپر تک پہنچنے میں

کامیاب رہا۔

لیکن جب اس نے قلعے کے چاروں طرف دیکھا تو ایک ہوش ربا منظر تھا۔ قلعے کے چاروں طرف ہی نشیب تھا اور ان کی گہرائی سے کسی طرح آنکھیں نہیں چرا سکتا تھا۔ مائیکل کچھ دیر کے لیے تو بت بن گیا پھر مالینا اس بت میں حرکت لائی۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر اور کسی قدر خود میں الجھا کر قلعے کی سیر کرانے لگی۔ مالینا دل کش تو تھی لیکن اسے اپنی دل کشی استعمال کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ اپنی اداؤں، بدن کے پیچ و خم اور آواز کے لوچ سے وہ کسی بھی مرد کو خود میں دلچسپی لینے پر مجبور کرسکتی تھی۔ مائیکل بھی مرد ہی تھا اور کچھ دیر میں وہ اس میں کھوکر اپنا خوف عارضی طور پر بھول بیٹھا۔ وہ بھی دوسرے سیاحوں کی طرح قلعے میں دلچسپی لینے لگا اور اس کی تاریخی اہمیت پر گائیڈ کا لیکچر سننے لگا۔

انہوں نے تصویریں لیں اور مالینا نے پوز دے دے کر تصویریں بنوائیں۔ مائیکل کے پاس ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا بھی تھا۔ دو گھنٹے بعد جب ڈرائیور نے روانگی کا اعلان کیا تو مائیکل کا چھپا خوف پھر ابھر آیا۔ اوپر آتے ہوئے تو اس نے نشیب کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا لیکن نیچے جاتے ہوئے وہ اور کہاں دیکھ سکتا تھا۔ نیچے گہرائی میں دیکھنا لازمی تھا اور پھر وہ اپنے خوف سے بے قابو ہونے سے کیسے روک سکتا تھا۔ وہ قلعے کے صحن میں ایک سبزہ زار میں بیٹھے تھے۔ اس نے مالینا سے نوٹ بک کی مدد سے کہا۔

''میں نیچے نہیں جاسکتا۔''

''کیوں نہیں جاسکتے؟ جب اوپر آئے ہو تو نیچے بھی جاسکتے ہو۔''

مائیکل ہچکچایا۔ ''تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں، آؤ میرے ساتھ۔'' مالینا کھڑی ہوگئی۔

مائیکل ہمت کرکے نیچے جانے والے راستے پر اس کے ساتھ آیا۔ اس وقت سارے ہی سیاح نیچے کی طرف روانہ ہوچکے تھے۔ صرف وہی دونوں اوپر رہ گئے تھے۔ مائیکل نے بلندی سے نیچے جاتے راستے کو دیکھا اور تذبذب سے بولا۔

''شاید میں نہیں جاسکتا...''

مالینا اس کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ اس نے مائیکل کا خوف کم کرنے کے لیے اچانک ہی اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اسے پیار کرلیا۔ مائیکل جھینپ گیا پھر مالینا بھی شرمانے لگی۔ اس نے اشارہ کیا کہ اب چلو۔ مائیکل نے راستے پر قدم رکھا۔ وہ نشیب کی طرف براہ راست دیکھنے سے گریز کررہا تھا اور اس کی نظریں اپنے جوتوں پر مرکوز تھیں۔

اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل جیسے حلق میں دھڑک رہا ہو۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر مالینا نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو شاید وہ نیچے ہی گرجاتا۔ کئی بار وہ اس طرح لڑکھڑایا کہ اس کا سارا بوجھ مالینا پر آگیا۔ مالینا اس کی حالت سمجھ رہی تھی اس لیے ہر بار اسے سنبھال لیتی تھی۔ نیچے آتے آتے اس کی حالت بُری ہوگئی۔ بس ڈرائیور بے تابی سے بار بار ہارن بجا رہا تھا کیونکہ باقی سارے مسافر بس میں پہنچ چکے تھے۔

مائیکل جب نیچے پہنچا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ورنہ ابھی تک اسے لگ رہا تھا کہ اس کا معدہ الٹ کر حلق کے راستے باہر آجائے گا۔ مالینا نے نیچے آنے پر اسے پانی پلایا اور پھر ڈرائیور کے مسلسل ہارن بجانے پر فرانسیسی میں چلائی۔ ''آرہے ہیں، تمہیں کیا جلدی ہے؟''

''ہمیں جانا ہے۔'' ڈرائیور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔ ''ابھی ایک جگہ اور جانا ہے۔''

''آتے ہیں، میرے ساتھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

فرانسیسی بچوں کے باپ نے بھی کھڑکی سے سر نکالا۔ ''ہم مزید انتظار نہیں کرسکتے۔''

''تو پھر چلے جاؤ۔'' مالینا غصے سے چلائی۔

''تم غصہ مت کرو۔'' مائیکل گہرے سانس لیتے ہوئے بولا پھر اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے اور اب چل سکتا ہے۔ وہ بس کے قریب آئے اور اندر سوار ہوگئے۔ کسی نے مائیکل سے اس کی طبیعت کا معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے کسی ہم وطن نے بھی نہیں۔ البتہ فرانسیسی باپ مسلسل بڑبڑائے جارہا تھا۔ ایک بار مالینا اس پر برس پڑی اور اسے خوب سنائے جارہی تھی کہ مائیکل نے اسے روک دیا۔ مالینا سخت غصے میں تھی اور مائیکل کو افسوس ہورہا تھا کہ اس کی وجہ سے ماحول خراب ہورہا ہے۔ بیشتر لوگوں نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی طبیعت کو کیا ہوا ہے۔ انہیں بس یہ فکر تھی کہ ان کے پروگرام میں کوئی خلل نہ آئے۔

خوش قسمتی سے اس بار بس ایک جھیل کے کنارے پہنچی۔ یہ خاصی بڑی جھیل تھی اور اس میں کشتیاں بھی چل رہی تھیں... جھیل کا پانی خاصا سرد تھا لیکن شوقین مزاج لوگ جھیل میں تیراکی بھی کررہے تھے۔ مائیکل نے اس کے سرد اور شفاف پانی سے منہ دھویا تو اس کی حالت خاصی بہتر ہوگئی۔ وہ اور مالینا ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ مائیکل نے اپنی نوٹ بک کھولی اور سب سے پہلے مالینا کا شکریہ ادا کیا۔

digestblogspot.com

''اگر آج تم میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں کسی صورت نیچے نہیں آسکتا تھا۔''

مالینا شرمائی۔ ''یہ میرا فرض تھا۔ تم میرے روم میٹ اور دوست ہو۔''

اس بار مائیکل شرارت سے مسکرایا۔ ''تم نے میرا خوف دور کرنے کی بڑی اچھی ترکیب سوچی ہے۔''

مالینا سچ مچ شرما گئی۔ ''بس اس وقت جو سمجھ میں آیا، میں نے کر دیا۔''

مائیکل جانتا تھا کہ وہ کسر نفسی سے کام لے رہی ہے۔ اس نے مائیکل کے لیے اس سے کہیں زیادہ کیا تھا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کے منی اسکرٹ اور اسی رنگ کی شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس پر سج رہا تھا لیکن اس نے خود کو مائیکل کے لیے بدل دیا تھا۔ وہ اس کا خوف دور کرنے کے لیے سیاح سے عورت بن گئی تھی۔ مائیکل جانتا تھا کہ وہ اس پر احسان کر رہی ہے۔ کوئی عورت ہر کسی کے لیے عورت نہیں بنتی... شاید وہ اسے پسند کرنے لگی تھی، تب ہی اس کے لیے ایسا کر گزری تھی۔

دوسرے سیاح پانی میں چھینٹا کر رہے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مائیکل کی طبیعت بہتر تھی۔ بلندی کے خوف نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے اندر اتنی ہمت پا رہا تھا کہ اٹھ کر چل پھر سکے۔ مالینا اس کے اور اپنے لیے بنیر ایک سینڈوچ لے آئی، یہ مزے کے بھی تھے اور توانائی سے بھرپور بھی تھے۔ ساتھ میں بیئر تھی۔ کھا پی کر مائیکل کی جان میں جان آئی۔ اس نے مالینا کو جھیل میں تیراکی کی تجویز دی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مالینا تیراکی کرنا چاہ رہی ہے لیکن اس کی وجہ سے بیٹھی تھی۔ اس نے کہا تو وہ کھل اٹھی۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ اب مسئلہ تیراکی کے لباس کا تھا تو وہ بھی حل ہو گیا۔ پاس ہی ایک جگہ تیراکی کے لیے لباس دستیاب تھے۔ مائیکل نے اپنے اور مالینا کے لیے لباس لیے، اسی جگہ لباس بدلنے کی سہولت بھی تھی۔ انہوں لباس بدلے اور جھیل کے سرد پانی میں اتر گئے۔ پہلے تو پانی بہت ہی ٹھنڈا لگا اور وہ کانپ اٹھے لیکن پھر رفتہ رفتہ مزہ آنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ بچوں کی طرح ایک دوسرے پر پانی اچھالتے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خاص طور سے مائیکل نے بہت عرصے بعد اس قسم کی کوئی تفریح کی تھی۔ اس کی زندگی میں عورت کا خانہ برسوں سے خالی تھا۔ اب مالینا کی قربت نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس چیز کی اس کی زندگی میں کتنی کمی تھی۔ جب وہ تیراکی سے تھک گئے تو باہر آگئے اور جھیل کنارے گھاس پر لیٹ کر سستانے لگے۔ پھر انہوں نے اپنے لباس تبدیل کیے۔ اس دوران میں سیاح بس میں جمع ہو رہے تھے۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور انہیں واپس ہوٹل جانا تھا۔ جب وہ ہوٹل پہنچے تو باہر ایک چھوٹی سی بچی سیاحوں میں ایک پمفلٹ بانٹ رہی تھی۔ اس نے یہ پمفلٹ مائیکل اور مالینا کو بھی دیے۔ یہ مقامی زبان میں تھے لیکن ہوٹل کے کلرک نے انہیں بتایا کہ آج رات سے قصبے میں تین روزہ میلے کا آغاز ہو رہا ہے اور سیاحوں سے اس میں شرکت کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

نہانے کے بعد مائیکل نے نوٹ بک کھولی اور مالینا سے کہا۔ ''کیا خیال ہے، میلے میں چلنا ہے؟''

وہ اپنے بال خشک کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹائپ کیا۔ ''ہاں، دیکھ کر تو آئیں گے۔ اسی لیے تو گھر سے نکلے ہیں۔''

وہ رات ہونے پر باہر نکل گئے۔ میلا گاؤں کے وسط میں ایک بڑے سے میدان میں لگا تھا۔ اس میں وہی سب تھا جو دیہی میلوں میں ہوتا ہے۔ لوگ ہنس بول رہے تھے اور کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مختلف قسم کے کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ مائیکل اور مالینا نے وہاں پر لطف وقت گزارا، کھانا بھی وہیں کھایا۔ واپسی میں وہ تھک کر چور ہو گئے۔ مائیکل کا خیال تھا کہ وہ سو جائیں گے لیکن مالینا نے اس سے نوٹ بک کھولنے کو کہا۔ پھر اس نے خود ہی کھول لی۔

''آج کیسا لگا؟''

''بہت مزہ آیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بہت عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بھی انسان ہوں۔''

''لگتا ہے تم نے تفریحات بالکل چھوڑ دی ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایک حادثے نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ اس کے بعد سے میں بہت ڈل اور اکیلی زندگی گزار رہا ہوں۔''

''کیسا حادثہ؟''

مائیکل دکھی ہو گیا۔ ''میں ایک جگہ سے گر گیا تھا۔ میری بہت سی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور میں دو سال اسپتال میں داخل رہا۔''

مالینا نے محسوس کر لیا کہ اسے حادثے کا ذکر پسند نہیں آیا تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ ''تم کرتے کیا ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میری کچھ انویسٹ منٹ ہے، اس کے سہارے گزر بسر کرتا ہوں لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ کچھ کروں۔''

اگلا سوال کرنے سے پہلے مالینا جھجک گئی۔ ''تم نے شادی کی ہے؟''

مائیکل نے گہری سانس لی پھر اس نے کہا۔ ''ہاں کی تھی لیکن جب میرے ساتھ حادثہ پیش آیا تو میری بیوی نے طلاق لے لی۔ وہ ایک ایسے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی جو سالوں اسپتال میں داخل رہے اور جس کے بارے میں اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اپنے پیروں پر دوبارہ چل سکے گا یا نہیں۔ اس نے علیحدگی کی بات کی اور میں نے مان لی۔''

مائیکل نے محسوس کیا کہ یہ بات سن کر مالینا کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ''تب سے تم اکیلے ہو؟''

''ہاں، گزشتہ دس برس سے میں اکیلا ہی ہوں۔''

مالینا اس سے شاید مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اب سوالات کی سیٹ مائیکل نے سنبھال لی۔ ''اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ؟''

''تم پوچھو، میں بتاتی ہوں۔'' مالینا مسکرائی۔

مالینا غیر شادی شدہ تھی۔ اس نے کئی دوست بنائے تھے لیکن ان میں کوئی شخص اسے اتنا پسند نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے شادی کر لیتی۔ وہ پیرس کے ایک میوزیم میں کام کرتی تھی۔ اس کا کام میوزیم میں آنے والے فن پاروں کی ریکارڈنگ کرنا تھا۔ مائیکل نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے۔''

''کیوں... میں ماہر نہیں لگتی؟''

''نہیں اصل میں تم بہت کم عمر لگتی ہو۔ اس وجہ سے میں نے کہا۔'' مائیکل نے کہا تو مالینا شرما گئی۔

وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ اس رات یہ ہوا کہ مالینا نے اس کے کروٹ بدلنے کا انتظار نہیں کیا اور اپنا بال بدل کر بستر پر آ گئی۔ مائیکل نے اسے غور سے دیکھا اور پھر تکیہ پر لیٹ گیا۔ اگلے روز ان کی ایک اور قصبے ریناروؤ کی طرف روانگی تھی۔ یہ قصبہ سوئٹزر لینڈ کے چند بہترین مقامات میں سے ایک تھا جہاں سردیوں میں بھی برف ملتی تھی اور یورپ بھر سے لوگ برف کے کھیلوں سے لطف اندوز ہونے وہاں آتے تھے۔ کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع اس قصبے کے چاروں طرف اونچے پہاڑ تھے جن پر ہمیشہ برف جمی رہتی۔ ان کی وسیع ڈھلانوں پر اسکیز کے شوقین افراد کا ہجوم رہتا تھا۔

اگلے روز جب وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے تو مائیکل کسی قدر فکر مند تھا۔ مالینا نے اس کی پریشانی محسوس کر کے اس سے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تمہیں یقین ہے؟'' مائیکل نے پوچھا۔

مالینا نے سر ہلایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم اپنے خوف پر قابو پا لو گے۔ ویسے کیا یہ خوف اس حادثے کے بعد ہوا ہے جس میں تم بلندی سے گر گئے تھے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہی ہے۔ اس کے بعد مجھے بلندی سے خوف آنے لگا۔''

''جب تم ایک بار بلندی کے خطرات کا سامنا کر لو گے تو پھر تمہارا خوف ختم ہو جائے گا۔'' مالینا نے اسے تسلی دی۔

لیکن مائیکل کے اندر کا خوف کم نہیں ہوا البتہ مالینا کو دکھانے کے لیے وہ زبردستی مسکرانے لگا۔ اس نے لکھا۔ ''ہاں ایسا ہی ہوگا۔''

وہ تیار ہو کر باہر آئے اور بس روانہ ہو گئی۔ یہ جگہ اتنی بلند نہیں تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ وہ سارا دن سوئٹزر لینڈ کے اونچے نیچے پہاڑوں پر سفر کرتے رہے۔ اس دوران میں مائیکل باہر دیکھنے سے گریز کرتا رہا لیکن مالینا جان بوجھ کر اسے باہر کسی نظارے کی طرف متوجہ کرتی رہی۔ جب وہ باہر دیکھتا تو اس کا خوف اس کے چہرے پر صاف نظر آنے لگتا۔

ریناروؤ کا قصبہ بذات خود اتنا بلند نہیں ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے لیکن یہ بہت اونچے پہاڑوں کے دامن میں آباد ہے اور سیاح اسی قصبے سے پہاڑوں کی طرف سفر کا آغاز کرتے تھے۔ اوپر پہاڑوں پر جانے کے لیے کیبل کار تھی جس کی مدد سے سیاح بہ آسانی بہت ہی دیر میں کم سے کم آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑوں پر پہنچ جاتے تھے۔ اس کے بعد اسکیئرز دور تک جانے کے لیے کیبل چیئرز تھیں۔ وہ شام کے وقت ریناروؤ میں داخل ہوئے تھے جب قصبے پر رات طاری ہونے والی تھی۔

وہاں سردی بہت زیادہ تھی اور شام ہونے کے بعد تو موسم بہت تیزی سے سرد ہو گیا تھا۔ سب نے راستے میں جیکٹیں اور سوئیٹر پہن لیے تھے۔ ہوٹل میں ان کے لیے کمرے بک تھے مگر ایک مسئلہ تھا کہ ہوٹل کا ہیٹنگ سسٹم خراب تھا اور اس کی مرمت جاری تھی اس وجہ سے فی الحال گرم پانی بند تھا اور کمروں میں گرمائش بھی نہیں تھی۔ ہوٹل انتظامیہ نے یقین دلایا کہ مسئلہ آدھی رات سے پہلے حل ہو جائے گا اور وہ سکون کی نیند سو سکیں گے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کمروں میں آئے تو کمرے بھی کسی فریزر کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ مالینا کو عادت تھی کہ وہ سونے سے پہلے لازمی غسل کرتی تھی مگر نلکوں سے جیسے پگھلی ہوئی برف آرہی تھی۔ اس سے ہاتھ

digestpk.blogspot.com

دھونا بھی دشوار تھا۔ نہانا تو ناممکن تھا۔ دوسری طرف اس طویل پہاڑی سفر نے اسے تھکا دیا تھا اور اسے نیند بھی آ رہی تھی۔

"تم کل صبح نہا لینا۔" مائیکل نے تجویز دی۔

"مجھے نہائے بغیر صبح سے نیند نہیں آتی۔"

"اور مجھے تو یہ سوچ کر نیند نہیں آ رہی کہ کل صبح ہمیں اوپر پہاڑوں پر جانا ہے۔" مائیکل بولا۔

"مائیکل! تمہیں ضرور چلنا ہے۔" مالینا نے کہا۔

"اگر میں نہیں جاؤں تو؟" مائیکل نے اسے تنگ کرنے کے لیے پوچھا۔ مالینا کا منہ پھول گیا۔

"تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ میں تو یہ برفانی پہاڑ ہی دیکھنے یہاں آئی ہوں۔"

"تب میں ضرور چلوں گا۔ چاہے بلندی مجھے کتنا ہی کیوں نہ ڈرائے۔"

مالینا نے خوش ہو کر اس کا رخسار چوم لیا۔ پھر شرما کر بولی۔ "مائیکل! تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔"

مائیکل نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ لیکن ہمیں کسی نتیجے تک پہنچنے سے پہلے خود کو اچھی طرح پرکھ لینا چاہیے۔"

مالینا نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا تم ڈرتے ہو کہ تم سے کوئی غلط فیصلہ نہ ہو جائے؟"

مائیکل نے سر ہلایا۔ "میں نے خود کو بڑی مشکل سے تنہائی کا عادی بنایا ہے۔ اب میں تنہا ہوا تو شاید ہی کبھی سکون ملے گا۔"

مالینا نے اس سے اتفاق کیا کہ انہیں اپنی پسندیدگی کو اچھی طرح پرکھنا چاہیے اور کسی بھی جذباتیت کے بغیر اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ کرنا چاہیے... بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ آدمی ابھی مشکل فیصلہ کر لے۔ کمرے کی تنہائی میں بھی ان کے درمیان فاصلہ برقرار رہا۔ مالینا کو مائیکل کی شرافت اور اس کی اچھائی نے گرویدہ کیا تھا۔ وہ بہت مختصر کپڑوں میں سوتی تھی لیکن ایک بار بھی مائیکل نے اسے غلط نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس کی طرف پیش قدمی کی کوشش کی تھی۔ مالینا کی طرف سے کسی قدر پیش قدمی کا اس نے کبھی کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ مالینا کو پسند کرنے لگا ہے۔ اگرچہ ان کی عمروں میں دس سال سے بھی زیادہ کا فرق تھا۔ وہ کچھ نہیں کرتا تھا اور مالینا ایک میوزیم میں اچھے عہدے پر کام کرتی تھی۔ وہ بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن دونوں کے ذہن میں یہ تھا کہ انہیں ٹین ایجرز کی طرح جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ ابھی وہ ملے تھے اور ایک دوسرے کو پرکھنا باقی تھا۔

رات کسی وقت ہوٹل کا ہیٹنگ سسٹم کام کرنے لگا اور وہ سکون سے سو گئے ورنہ اس سے پہلے وہ کمبل میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ اگلی صبح وہ کسی قدر دیر سے بیدار ہوئے کیونکہ انہیں اب کیبل کار کے ذریعے اوپر جانا تھا اور یہ سب کی اپنی مرضی تھی کہ کون کس وقت، کس طرح اور کس سمت میں جاتا ہے۔ مائیکل اور مالینا نے رات کو طے نہیں کیا تھا اس لیے صبح سویرے یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ کہاں جایا جائے۔ مائیکل کی شدید خواہش تھی کہ وہ کہیں بھی نہ جائیں مگر مالینا کی وجہ سے اسے جانا ہی تھا۔ مالینا نے اس معاملے میں نمٹنے کے بعد ہوٹل کے کلرک سے مدد چاہی اور اس نے اردگرد پہاڑوں اور وہاں موجود سہولتوں کے بارے میں ڈھیر سارے بروشران کے سامنے رکھ دیے۔ مائیکل نے ایک نسبتاً سیدھی ڈھلان والے پہاڑ کا انتخاب کیا۔ اسے امید تھی کہ یہاں اسے اتنا ڈر نہیں لگے گا۔

کلرک نے بتایا کہ یہ نسبتاً کم مقبول مقام ہے اور یہاں ایک چھوٹی کیبل کار جاتی ہے۔ شاید اس وجہ سے کم مقبول تھا کیونکہ اس کی ڈھلان سیدھی تھی اور تیز رفتار اسکیٹنگ کرنے میں مددگار نہیں تھی۔ اس نے مالینا سے کہا۔ "یہی ٹھیک ہے، ہم یہاں چلتے ہیں۔"

اس کی رضامندی دیکھ کر مالینا بھی مان گئی ورنہ اس کا ارادہ ایک دوسرے پہاڑ پر جانے کا تھا جہاں اسکیٹنگ ذرا تیزی سے کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے اوپر سردی کی مناسبت سے لباس پہنا اور کیبل کار کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو مائیکل نے یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ ان کے گروپ کا کوئی شخص وہاں نہیں تھا بلکہ اس پہاڑ پر ان کے علاوہ فی الحال کوئی نہیں جا رہا تھا۔ کیبل کار واقعی چھوٹی تھی۔ اس میں صرف چھ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کیبل کار رکی ہوئی تھی۔ وہ ٹکٹ لے کر اس میں بیٹھ گئے۔ ابھی کار چلنے میں کچھ وقت تھا کہ دو بچوں والا فرانسیسی جوڑا بھی وہاں آ گیا۔ بچوں کا شور سن کر وہ چونک گئے۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟" مائیکل نے زیر لب کہا۔

شاید اس پہاڑ کی آسان ڈھلان کی وجہ سے انہوں نے بھی اسی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بھی اسی کیبل کار میں آ گئے۔ مائیکل کو دیکھ کر مرد نے برا سا منہ بنایا اور اس سے زیادہ برا منہ مالینا نے اسے دیکھ کر بنایا۔ وہ مائیکل کے بارے میں اس کا تبصرہ سن چکی تھی اس لیے وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھا

رہا تھا۔ مائیکل ان دونوں کے تاثرات سے بے خبر سہما ہوا اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ پہلی کار میں جا رہے تھے اور اب کیبل کار کا سسٹم اسٹارٹ ہونے والا تھا۔ اس کے بعد جو بھی اوپر جاتا اسے اگلی کار میں بیٹھنا پڑتا۔ کچھ دیر بعد اس کے دروازے خودکار طریقے سے بند ہو گئے اور انہوں نے اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ ایک اعلان کے بعد کیبل کار حرکت میں آ گئی اور رستے کے سہارے جھولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئی اور جب ہوا کے جھونکوں سے اس نے جھولنا شروع کیا تو مائیکل کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس نے اتنی قوت سے اپنی سیٹ کو تھاما کہ اس کی انگلیاں بھی سفید ہو گئیں۔ فرانسیسی مرد نے اسے دیکھا اور طنزیہ انداز میں مالینا سے کہا۔

"اس بے چارے کو کہاں لے جا رہی ہو؟ کہیں اسے ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔"

اس کی بات سن کر مالینا کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے چڑ کر کہا۔ "اگر اسے کچھ ہو رہا ہے تو وہ اس کا مسئلہ ہے، تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" مرد کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ "لیکن لگتا ہے تمہیں اس سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہے۔"

"یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" مالینا مزید چڑ گئی۔ "اور لگتا ہے تمہیں دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا بہت شوق ہے۔"

مرد کی بیوی نے اسے ٹوکا۔ "لیرک! کبھی کبھی تم بہت پاگل ہو جاتے ہو۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔"

مائیکل شاید ان کی باتیں سن بھی نہیں رہا تھا کیونکہ اس کے ذہن نے چکرانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت کیبل کار ایک اونچی سی مینار نما پہاڑی کے پاس سے گزر رہی تھی اور نیچے بہت گہری کھائی تھی۔ مائیکل نے نیچے دیکھ لیا اور اسے لگا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے۔ اس نے سیٹ چھوڑ کر سر تھام لیا۔ مالینا نے پریشان ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ "مائیکل! کیا ہوا؟"

مائیکل نے اس کی آواز سن کر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی نظر فوکس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کیبل کار کا رستا ٹوٹ گیا ہے اور وہ گہرائی میں جا رہی ہے۔ وہ کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل سکی۔ مالینا نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ لیرک پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "لو اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اب شاید کار واپس جائے گی۔"

مالینا اس پر برس پڑی۔ "تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتے؟"

لیرک نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی لمحے کیبل کار بری طرح لرزی اور کوئی چیز تڑاخ کی آواز کے ساتھ ٹوٹی اور کیبل کار کی چھت سے بری طرح ٹکراتی ہوئی اور ایک طرف کا شیشہ توڑتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ عورت اور بچوں سمیت لیرک کی چیخ بھی نکل گئی۔ مالینا اور مائیکل پہلے ہی پریشان تھے۔ عورت نے چلا کے پوچھا۔ "یہ کیا تھا؟"

لیرک اب پیچھے دیکھ رہا تھا جہاں ایک سانپ جیسا بل کھاتا رسا کھائی میں گر رہا تھا۔ وہ بدحواس ہو گیا۔ "کیبل کار کا رسا ٹوٹ گیا ہے... میرے خدا! یہ گرنے والی ہے۔"

یہ سن کر عورت کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور اس کے بچے بلند آواز سے رونے لگے۔ مالینا نے ان کی طرف دیکھا۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔ کیبل کار رکی ہوئی ہے۔"

"نہیں، تم خود دیکھ لو۔ اس کا رسا ٹوٹ گیا ہے۔" لیرک نے کھڑکی سے اوپر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر رسا ٹوٹ گیا ہے تو یہ اب تک ٹکی ہوئی کیسے ہے؟" مالینا بولی۔ وہ ڈرنے کے لیے تیار نہیں تھی اور خود بھی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیرک نے نشان دہی کی۔

"وہ دیکھو... پچھلے تار سے رسا نکل کر نیچے گر رہا ہے۔"

"تب کیبل کار کیسے اپنی جگہ پر ہے؟"

"وہ سہارا دینے والے رستے پر ہے۔" لیرک نے جواب دیا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ کیبل کار کو چلانے والا رسا ٹوٹ گیا تھا اور اب کیبل کار سہارے والے اضافی رستے کی مدد سے خلا میں جھول رہی تھی۔ نیچے کوئی دو ہزار فٹ گہری کھائی تھی۔ اگر کیبل کار اس میں گر جاتی تو کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب ہی خوف زدہ تھے، سوائے مائیکل کے کیونکہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک لیرک چلایا۔

"یہ سب اس شخص کی نحوست ہے۔" اس نے مائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" مالینا غرائی۔ "کیا اس نے رسا توڑا ہے یا اس کی نحوست نے رسا توڑا ہے۔"

لیرک کی بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے یہ کون سا وقت ہے لڑنے کا۔ کچھ کرو ورنہ ہم سب مر جائیں

digestpk.blogspot.com

گے۔"

"یہ بات اپنے شوہر کو سمجھاؤ۔" مالیتا نے کہا اور کیبل کار میں لگے انٹر کام کا بٹن دبایا۔ "ہیلو... کوئی ہماری بات سن رہا ہے؟ ہم یہاں پھنس گئے ہیں، ہمیں نکالو۔"

لیکن جواب میں خاموشی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کیبل ٹوٹنے سے برقی رابطہ بھی منقطع ہو گیا ہے۔ لیرک بولا۔ "بے کار ہے، ویسے بھی انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ رسا ٹوٹ گیا ہے۔ شاید وہ مدد لے کر آ رہے ہوں۔" لیرک کا لہجہ پرامید ہو گیا۔

"اب ہم کیا کریں؟" مالیتا نے نیچے دیکھا۔ اسے بھی چکر آ گیا تھا اور اس نے خوف زدہ ہو کر مائیکل سے لپٹ کر اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔ وہ ابھی تک سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ جب مالیتا نے اس کا بازو پکڑا تو وہ چونک گیا۔ اس نے غنودہ سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"مائیکل! کیبل کار کا رسا ٹوٹ گیا ہے۔" مالیتا چلائی۔ اس نے مائیکل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے حواس تیزی سے بحال ہو گئے۔ اس نے اردگرد دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟"

لیرک کو کسی قدر ناگواری آ گئی تھی۔ اس نے ناراضی بھرے لہجے میں بتایا۔ "کیبل کار کا رسا ٹوٹ گیا ہے۔ اس وقت کیبل کار اضافی رسے کے سہارے جھول رہی ہے۔ جب تک مدد نہیں آ جاتی، ہم یہیں پھنسے رہیں گے۔"

"میرے خدا! رسا ٹوٹ گیا ہے، ہم سب خطرے میں ہیں۔"

خطرے کا احساس ہوتے ہی مائیکل کے حواس پوری طرح بحال ہو گئے۔ اس نے پہلے نیچے جھانک کر ٹوٹ جانے والے رسے کو دیکھا۔ اسی لمحے کیبل کار کو ایک جھٹکا اور ایسا لگا کہ وہ ذرا سی نیچے ہو گئی ہے۔ ان سب کے منہ سے چیخیں اور اضطراری آوازیں نکل گئیں۔ مائیکل نے اس بار بنا کسی خوف کے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ کیبل کار کی چھت میں ایک تختہ لگا تھا۔ اسے اندر سے ہک لگا کر بند کیا گیا تھا۔ مائیکل نے ہک ہٹا کر اسے کھولا۔ لیرک تیز لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"چپ رہو... مجھے دیکھنے دو شاید دوسرا رسا بھی ٹوٹ رہا ہے، جبھی کیبل کار نیچے گئی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو ہمیں اس میں سے نکلنا ہوگا۔"

لیرک نے ناقابلِ یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہارا دماغ درست ہے... ہم اس سے کیسے نکل سکتے ہیں؟"

"ہمیں نکلنا ہوگا۔" مائیکل نے کہا اور سیٹ پر پیر رکھ کر اوپر ہوا۔ اس نے خانے سے سر نکالا۔ یہاں کیبل کو رسے سے منسلک رکھنے والا سسٹم لگا تھا۔ کیبل کار اصل میں سہارے والے رسے کی مدد سے جھولتی ہے اور اسے چلانے والا رسا الگ ہوتا ہے۔ اس پر بوجھ نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا رسا بھی ہوتا ہے جو کسی ہنگامی حالت میں کیبل کار کو گرنے سے بچاتا ہے لیکن وہ اسے نظر نہیں آیا۔ شاید اس کیبل کار میں وہ رسا لگایا ہی نہیں گیا تھا۔ مائیکل اس وقت بالکل بدلا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ چند منٹ پہلے وہ بلندی کے خوف سے نیم جان ہو رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ پورے اعتماد سے کیبل کار کی چھت سے جھانک رہا تھا۔ اس کی نظر سہارے والے رسے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کیا ہوا... رسا ٹھیک ہے؟" نیچے سے لیرک نے پوچھا۔

"یہاں سے نظر نہیں آ رہا... مجھے اور اوپر جانا ہوگا۔" مائیکل بولا اور اس نے مزید اوپر ہونے کی کوشش کی تو مالیتا چلانے لگی۔ لیرک بولا۔

"تمہیں جانے سے منع کر رہی ہے۔"

مائیکل نیچے آیا اور اس نے لیرک سے کہا۔ "جو میں کہہ رہا ہوں وہ اسے بتاؤ۔ میرا اوپر جا کر دیکھنا لازمی ہے... کہ اگر کہیں سے رسا ٹوٹ رہا ہے تو ہم ایسا ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں۔"

لیرک کا ترجمہ سن کر مالیتا نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں بلندی سے خوف آتا ہے، تم گر جاؤ گے۔"

"اس وقت میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھو میں ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوں۔" مائیکل نے اسے یقین دلایا۔ مالیتا نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

مائیکل واقعی خوف زدہ نہیں تھا البتہ وہ فکر مند ضرور تھا۔ اس دوران میں کیبل کار کو دو اور ہلکے جھٹکے لگے۔ خطرہ بڑھ رہا تھا اس لیے مالیتا نے بادلِ ناخواستہ اسے کیبل کار کی چھت پر جانے کی اجازت دے دی۔ مائیکل نے لیرک کے شانوں کا سہارا لیا اور اس کی مدد سے اوپر چڑھ گیا۔ اسے بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کیونکہ چھت پر پکڑنے والی ایک ہی چیز تھی اور اگر اس کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ پاتا تو وہ کھائی میں جاتا۔ اس لیے اوپر چڑھ کر اس نے بہت احتیاط سے اس کو تھام لیا جس سے رسے منسلک تھے۔ وہ ذرا آگے ہوا تو کیبل کار کو سہارا دینے والے فولادی رسے کا ٹوٹنے والا حصہ نظر آ گیا۔ فولادی رسا لوہے کی تاروں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور ان میں سے کچھ تاریں ٹوٹ چکی تھیں جبکہ باقی پر تناؤ آ رہا تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ بھی ٹوٹنے والی ہیں۔ اگر یہ بھی ٹوٹ جاتیں تو کیبل کار ہزاروں فٹ کی گہرائی میں جا گرتی۔

مائیکل نیچے آیا، اس نے کہا۔ "کیبل کار کو سہارا دینے والا فولادی تار ٹوٹ رہا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"کیسے؟" لیرک پریشان ہو گیا۔

مالیتا جاننے کے لیے بے چین تھی کہ مائیکل کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس نے اشارے سے مالیتا کو پُرسکون رہنے کا کہا۔ پھر اس نے نشستوں کے نیچے جھک کر دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ کیبل کاروں میں ہنگامی حالات میں کام آنے والی چند چیزیں رکھی جاتی ہیں، ان میں رسی بھی ہوتی ہے۔ اسے ایک نشست کے نیچے ایک پیکٹ رکھا ہوا مل گیا۔ اس نے اسے کھولا تو اندر رسی کا لچھا تھا۔ اس نے لچھا نکال کر نشست پر ڈالا اور لیرک سے کہا۔

"جب میں کہوں تو پہلے بچوں اور پھر عورتوں کو اوپر بھیجنا۔ باری باری... سمجھ گئے نا؟"

"تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" لیرک ابھی تک پریشان تھا۔

"میں نزدیک کی پہاڑی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" مائیکل نے کہا اور دوبارہ اوپر چڑھ گیا۔ اس وقت وہ بہت تیزی سے اور نپے تلے انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ کیبل کار جس جگہ رکی تھی، مینار نما پہاڑی اس سے کوئی تیس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ مائیکل کے پاس صرف یہ رسی تھی اور اسی کی مدد سے اسے اپنی اور ان پانچ افراد کی جان بچانی تھی۔ اس نے رسی کا ایک سرا کیبل کار سے باندھا۔ اس کی مضبوطی جانچ کر اس نے نیچے جھک کر دیکھا پھر رسی کے سہارے نیچے اتر گیا۔ جب وہ کھڑکی تک پہنچا تو اس نے مالیتا کو پھٹی پھٹی نظروں سے خود کو دیکھتے پایا۔ وہ اسے حوصلہ دینے والے انداز میں مسکرایا اور پھر تیزی سے نیچے جانے لگا۔ اس نے رسی اپنے پاؤں کے گرد گھمائی تھی اور پھر اپنی کلائی پر سے گھما کر اسے آہستہ آہستہ ڈھیلا چھوڑ رہا تھا۔ اس طرح وہ تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ کوئی پچاس فٹ نیچے آنے کے بعد وہ پہاڑی کی ڈھلان سے پندرہ فٹ کی دوری پر تھا۔ اس نے رسی کو مضبوطی سے تھاما اور خود کو جھولا دے کر پہاڑی کے پاس جانے لگا۔ چند جھولے کے بعد وہ پہاڑی کے نزدیک ہو گیا لیکن اس کے جھولنے سے کیبل کار کا رسا تیزی سے جواب دینے لگا۔ اچانک ہی اسے جھٹکا لگا اور وہ تھوڑا نیچے ہوا۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ رسا ٹوٹ گیا ہے اور کیبل کار گرنے والی ہے لیکن جب وہ ایک جگہ رک گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے ایک بار پھر جھولنا شروع کیا اور تیسری کوشش میں وہ پہاڑی تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک پتھر تھام کر خود کو روکا اور پھر تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں باقی سب آسانی سے اتر سکیں۔

یہ جگہ اسے کیبل کار سے کوئی بیس فٹ نیچے مل گئی۔ یہاں ایک چھجا نما جگہ تھی اور یہاں رسی باندھنے کی جگہ بھی تھی۔ اس نے رسی باندھی اور ایک بار پھر کیبل کار کی طرف جانے لگا۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ خالی ہاتھوں سے رسی کو تھام کر اوپر جانا آسان نہیں تھا۔ اس سرد موسم میں بھی اسے پسینا آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ پھسل رہے تھے۔ ایک سخت جدوجہد کے بعد وہ کیبل کار کی چھت تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ مالیتا اور دوسرے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ خانے سے اندر کودا تو مالیتا اس سے لپٹ گئی۔ وہ فرنچ میں کچھ کہہ رہی تھی۔ مائیکل نے اسے تیار ہونے کا اشارہ کیا اور اس کے بعد چاقو کی مدد سے بقیہ رسی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا۔ چاقو اسے رسی کے ساتھ ملا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹکڑا پہلے لیرک کی بچی کی کمر سے باندھا۔ ایسا ہی دوسرا ٹکڑا لڑکے کی کمر سے باندھا۔ باقی سب کے گرد بھی اس نے اسی طرح رسی باندھ دی اور لیرک سے کہا۔

"پہلے تم اوپر آؤ، رسا ٹوٹنے والا ہے۔"

لیرک کو بھی وقت کی نزاکت کا احساس تھا اس لیے وہ زبان بند کر کے وہی کرنے لگا جو مائیکل اس سے کہہ رہا تھا۔ مائیکل اوپر گیا، اس نے لیرک کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ مائیکل نے اس کی کمر سے بندھی رسی کو اس رسی سے منسلک کیا جو پہاڑی تک جا رہی تھی۔

"ڈرنا مت... تم گرو گے نہیں۔ اب اتر جاؤ۔"

لیکن لیرک کیبل کار چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مائیکل نے چاقو اس کی جیب میں ڈالا اور اچانک ہی اسے دھکا دے دیا۔ لیرک کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ رسی کے سہارے پھسلتا ہوا تیزی سے پہاڑی کی طرف جانے لگا۔ اسے چٹانی چھجے تک پہنچنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ وہ پہلے گرا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ مائیکل نے اس سے چلا کر کہا۔

"اپنی رسی کاٹ دو۔"

digestpk.blogspot.com

لیرک نے اپنی رسّی کاٹ دی۔ مائیکل نے جھک کر مالینا سے بچی کو مانگا۔ مالینا نے لڑکی کو گود میں اٹھایا اور مائیکل کو تھما دیا۔ بچی رو رہی تھی لیکن اسے چپ کرانے کا وقت نہیں تھا۔ مائیکل نے اس کی رسّی بھی اسی طرح باندھی اور اسے نیچے دھکیل دیا۔ وہ بُری طرح چیخیں مارتی نیچے گئی۔ نیچے اس کی ماں چیخ رہی تھی لیکن جب وہ بچی سلامت نیچے تک پہنچ گئی تو دونوں کی چیخیں رک گئیں۔ لیرک نے بچی کو سنبھال کر اس کی رسّی کاٹ کر اسے الگ کر لیا تھا۔ کیبل کار کا رسّا مسلسل شکستہ ہو رہا تھا اور اس کے بل ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔

"جلدی کرو... لڑکے کو دو۔" مائیکل نے جھک کر کہا۔

مالینا نے لڑکے کو اٹھا کر اوپر کیا۔ وہ ذرا حوصلے والا تھا۔ جب مائیکل نے اسے نیچے دھکیلا تو وہ چیخا نہیں۔ لیرک نے اسے بھی الگ کر لیا۔ مائیکل اس دوران میں مالینا کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ چھت پر آتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔ لرزتی کیبل کار کی چھت پر کھڑے رہنا آسان کام نہیں تھا۔

"میں نہیں جا سکتی۔" مالینا نے نفی میں سر ہلا کر کہا لیکن مائیکل نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اس کی ڈوری بھی رسّی سے باندھ دی اور اسے نیچے دھکیل دیا۔ مالینا کا سانس رک گیا اور وہ بہت تیزی سے نیچے گئی لیکن لیرک نے اسے بھی سنبھال لیا اور اس کی ڈوری کاٹ دی۔ اب مائیکل اور لیرک کی بیوی رہ گئے تھے۔ مائیکل نے اسے بھی اوپر کھینچ لیا۔ اس دوران میں کیبل کار کے رسّے سے تڑخنے کی خوفناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ان کے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ مائیکل نے عورت کو رسّی سے منسلک کر کے نیچے دھکیلا اور اس کے نیچے تک پہنچنے کا انتظار کیے بغیر خود بھی بنا ڈوری باندھے صرف ہاتھ کے سہارے لٹک کر نیچے جانے لگا۔ لیرک کی بیوی نیچے پہنچ چکی تھی اور مائیکل نصف راستے میں تھا کہ کیبل کار کا رسّا ٹوٹ گیا اور وہ تیزی سے نیچے جانے لگی۔ مائیکل بھی جھٹکے سے نیچے گیا اور اس کے ہاتھ سے رسّی نکلنے لگی۔ مالینا زور سے چیخی۔ اسے لگا کہ مائیکل گرنے والا ہے لیکن مائیکل نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ کیبل کار نیچے جانے سے وہ پہاڑی کی طرف جانے کے بجائے الٹا کیبل کار کی طرف جانے والا تھا جو موت کی گہرائیوں میں جانے والی کیبل کار اسے بھی ساتھ لے جاتی۔ زندگی کے لیے اس کے پاس سوائے ایک طریقے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مائیکل نے اسی پر عمل کیا اور اس نے رسّی چھوڑ دی۔

☆☆☆

مالینا نم آنکھوں کے ساتھ اسپتال کے کمرے میں داخل ہوئی تو مائیکل پٹیوں میں جکڑا لیٹا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور تکلیف کے باوجود اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مالینا تیزی سے اس کے پاس آئی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا الیکٹرک ٹرانسلیٹر تھا۔ اس پر ٹائپ کرنے سے یہ آواز میں ترجمہ کر دیتا تھا۔ مالینا نے ٹائپ کیا۔ "اب تم کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" مائیکل نے ایک ہاتھ سے ٹائپ کیا۔

مالینا ابھی تک خوف زدہ تھی۔ "جب تم نے رسّی چھوڑی تو میں سمجھی کہ اب تم نہیں بچ سکو گے۔"

"اگر میں رسّی چھوڑنے میں ایک سیکنڈ بھی دیر کرتا تو کیبل کار کا مومینٹم مجھے بھی کھینچ کر لے جاتا۔ میں کیونکہ پہاڑی کی طرف جا رہا تھا اس لیے میرا مومینٹم بھی اسی طرف تھا۔ جب میں نے رسّی چھوڑی تو میرا جسم اسی طرف گیا اور میں پہاڑی پر گر گیا۔"

مالینا نے جھرجھری لی۔ "خدا کا شکر ہے۔ ورنہ میں بھی شاید نیچے کود جاتی۔"

"وہ کیوں؟" مائیکل نے انجان بن کر پوچھا۔

مالینا نے اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔ "پوچھ کیوں رہے ہو؟ جانتے تو ہو۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں بھی... اب تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔"

مالینا نے ٹائپ کیا۔ "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ تم نے یہ سب کیسے کیا؟ تم تو بلندی سے بہت ڈرتے تھے؟"

"وہ ایک نفسیاتی خوف تھا جسے دوسرے نفسیاتی جھٹکے نے دور کر دیا۔ جب میں نے تمہیں اور دوسروں کو خطرے میں دیکھا تو میں پھر وہی خطروں سے کھیلنے والا مائیکل بن گیا۔"

"خطروں سے کھیلنے والا؟" مالینا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا

"ہاں، میں پیشہ ور کوہ پیما تھا لیکن ہمالیہ میں ایک مہم کے دوران میں کافی اونچائی سے گرنے کے باعث شدید زخمی ہو گیا تھا۔ میں زندہ تو بچ گیا لیکن مجھے بلندی سے خوف آنے لگا تھا۔"

"اب تو تم بلندی سے نہیں ڈرو گے؟"

"نہیں... اب کبھی نہیں۔" مائیکل نے یقین سے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ ہو تو..."

مالینا مسکرانے لگی۔ "سمجھو اب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔"

بلیڈ میکوری نے اپنے درد میں مبتلا ہاتھوں پر سے گیلی پٹیاں کھول کر انہیں جمنازیم کے فرش پر گرا دیا اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کے ہاتھوں سے پسینے کی بو فضا میں پھیلنے لگی۔

"تمہاری تکلیف کا کیا حال ہے؟" سام نے پوچھا۔ "ہوگی؟"

بلیڈ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب بھی درد ہو رہا ہے؟"

"تھوڑا سا درد ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ فائٹ سے پہلے میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا۔" بلیڈ نے اکتاہٹ کے انداز میں بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ اس بالٹی میں ڈال دیا جس میں برف موجود تھی۔

اچانک جمنازیم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور آرمسٹرانگ اندر داخل ہوا۔ اس کے شانے پر اس کا بیگ لٹکا ہوا تھا۔ رنگ کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا بیگ جمنازیم کے فرش پر رکھ دیا۔

اس اثنا میں ٹرینرز اور دیگر باکسرز نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سب پُرجوش انداز میں باتیں کرنے لگے جبکہ آرمسٹرانگ نے اپنے ہاتھوں پر پٹیاں باندھنا شروع کر دیں پھر اپنے دستانے پہن لیے۔

جب وہ تیار ہو کر رنگ میں داخل ہوا تو سب نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

بلیڈ کی آنکھوں میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔ "اس کے پاس کیا ہے جو میرے پاس نہیں ہے؟" اس نے سام سے پوچھا۔ حسد کے جذبات اس کے لہجے سے بھی عیاں تھے۔

سام نے اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ریلیکس مین۔ موقع آنے پر تمہیں بھی چانس مل جائے گا۔"

"بات صرف ٹائٹل فائٹ کی نہیں ہے۔" بلیڈ نے ٹرینرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے اتنی رقم کما کر دی ہے جو آرمسٹرانگ اسے کبھی کما کر نہیں دے سکتا۔ لیکن وہ اس حقیقت کا اعتراف ہی نہیں کرتا۔"

"دوست! تمہیں کوچ کی جانب سے فکرمندی کے بجائے کسی اور کی فکر کرنی چاہیے۔ میں تمہیں بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن..."

"کیا نہیں بتانا چاہتے تھے؟" بلیڈ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا۔

طاقت کے زور پر فتح حاصل کرنے والے تیس مار خان کا قصہ

خود کردہ

رضوانہ منظر

عالمِ طیش میں اٹھایا گیا قدم بسا اوقات ناقابلِ تلافی صورتِ حال سے دوچار کر دیتا ہے... ایک باکسر کی عجلت پسندی جو اپنی محبت سے منسوب کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

digestpk.blogspot.com

"بات ڈیبی سے متعلق ہے۔"

اپنی منگیتر کا نام سنتے ہی بلیڈ چونک پڑا۔ وہ اور ڈیبی اسکول کے وقت سے ڈیٹنگ کر رہے تھے۔ وہ اس کی پہلی اور اکلوتی محبت تھی۔ "ڈیبی کی کیا بات ہے؟" اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آرمسٹرانگ آج کل اس کے ساتھ زیادہ ہی دوستی بڑھا رہا ہے۔" سام نے بتایا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" بلیڈ نے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

سام نے جمنازیم میں نگاہ دوڑاتے ہوئے اس بات کا یقین کر لیا کہ نہ کوئی ان کی جانب متوجہ ہے اور نہ ان کی باتیں سن سکتا ہے۔ پھر وہ بلیڈ کی جانب جھک گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "جب تم باہر گئے ہوئے تھے تو گزشتہ ہفتے ڈیبی یہاں جمنازیم میں آئی تھی۔ وہ اور آرمسٹرانگ جمنازیم سے باہر چلے گئے تھے اور لگ بھگ ایک گھنٹے تک باہر فٹ پاتھ پر باتیں کرتے رہے تھے۔"

بلیڈ یہ سن کر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ادھر آرمسٹرانگ کے ننگے شانے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور وہ پنچنگ بیگ پر لگاتار گھونسے برسا رہا تھا۔ اس کے گھونسوں کی طاقت کے نتیجے میں ڈیبی ریک جس سے پنچنگ بیگ لٹکا ہوا تھا، کھڑکھڑا رہا تھا۔ آرمسٹرانگ کے گھونسے اتنے زوردار تھے۔

"نہیں۔" سام نے بلیڈ کی کیفیت بھانپتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "اس بات کا تو سوچنا بھی نہیں۔ جب آرمسٹرانگ پیدا ہوا تھا تو اس نے اپنی ناف کی آدھی نال چبا ڈالی تھی، اپنے ڈاکٹر کو پیٹ دیا تھا اور اپنی ماں کو گھر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

بلیڈ کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پنچنگ بیگ پر آرمسٹرانگ کے ہر گرج دار گھونسے کی ضرب پر بلیڈ بے بسی سے اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ "انہوں نے صرف باتیں ہی کی تھیں نا؟" بلیڈ نے تصدیق چاہی۔

"ہاں، انہوں نے صرف باتیں ہی کی تھیں۔"

بلیڈ نے ایک جھٹکے سے اپنا بیگ اٹھایا اور بھناتا ہوا جمنازیم سے باہر نکل گیا۔ اس کی گیلی قمیص اور شارٹ اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا جسم سے ٹکراتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔

آرمسٹرانگ کے ڈیبی کے ساتھ قربت کی شبیہ اس کے ذہن کے پردے پر حرکت کرنے لگی۔ ارادے کی مضبوطی نے اس کے خون کو منجمد کر دیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے والدین کے گھر پہنچا اور اپنے باپ کا F-150 ٹرک مستعار لے لیا۔

☆☆☆

جب بلیڈ واپس جمنازیم پہنچا تو اس نے سب سے پہلے پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا جہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہاں آرمسٹرانگ کی سرخ مسٹینگ کے سوا اور کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پوری پارکنگ لاٹ خالی پڑی تھی۔

بلیڈ نے F-150..... آرمسٹرانگ کی سرخ مسٹینگ کے بالکل ساتھ لگا کر پارک کر دیا۔ پھر اس نے سیٹ کے پیچھے سے ٹائر آئرن نکالا اور اسے ہاتھ میں دبوچ کر ٹرک کے پچھلے کھلے ہوئے حصے میں جا کر چھپ کر لیٹ گیا اور آرمسٹرانگ کے جمنازیم سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔

آرمسٹرانگ کی مسٹینگ کا الارم بیپ کرنے لگا اور کار کے دروازے کے لاک ایک جھٹکے کے ساتھ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ نزدیک آنے لگی۔

بلیڈ نے ٹائر آئرن پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

قدموں کی آواز اس کے قریب آکر رک گئی۔ پھر آرمسٹرانگ کی مسٹینگ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

بلیڈ نے ایک گہرا سانس لیا اور جھٹکے سے اٹھ گیا۔ ساتھ ہی ٹائر آئرن ہوا میں تیزی سے بلند کیا اور پوری طاقت کے ساتھ آرمسٹرانگ کی کھوپڑی پر ایک زوردار ضرب لگا دی۔

اسے قدرے حیرت ہوئی کہ کھوپڑی کتنی آسانی کے ساتھ چٹخ گئی تھی۔ آرمسٹرانگ کا جسم فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

بلیڈ نے ٹرک کے عقبی حصے سے نیچے چھلانگ لگا دی اور اطراف کا بغور جائزہ لینے لگا۔

سب کچھ کلیئر تھا۔

بلیڈ نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد زمین پر منہ کے بل گرے ہوئے آرمسٹرانگ کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور اسے پیٹھ کے بل پلٹ دیا۔ اسے آرمسٹرانگ کا بازو قدرے نرم محسوس ہوا۔ اس نے ٹائر آئرن کو دوبارہ فضا میں بلند کیا اور دوسرا وار کرنے ہی جا رہا تھا کہ آرمسٹرانگ کی مسٹینگ کے اندرونی بلب نے زمین پر گرے ہوئے فرد کے چہرے کو روشن کر دیا۔

بلیڈ کے ہاتھ سے ٹائر آئرن چھوٹ کر نیچے گر گیا اور وہ بے ساختہ آگے کو جھک گیا۔

اس نے لاش کے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور آہ و بکا کرنے لگا۔ "او میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا؟ یہ میں نے کیا کیا؟"

وہ اس کی منگیتر ڈیبی تھی!

نیکی کا صلہ

محمد عفان آزاد

جرم کے راستوں پر گامزن ایک لڑکی کا فسانۂ دل پذیر..... کوئی بھی جرم کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا..... برائی کے راستے پر چلتے چلتے اچانک ہی اس کے دل میں نیکی کرنے کا خیال جاگزیں ہو گیا۔

جب کوئی صورت باقی نہ رہے تو بساط اس طرح بھی الٹ جاتی ہے

وہ عادی یا پیشہ ور چور نہیں تھی لیکن چوریاں کرنا اب اس کی مجبوری بن چکی تھی کیونکہ اسے کوئی اور کام نہیں آتا تھا اس لیے گزر اوقات کے لیے وہ اسی کام کا سہارا لیتی تھی۔ حالانکہ اسے اصلاحی مرکز سے آئے ہوئے ابھی صرف پانچ ہفتے ہی ہوئے تھے جہاں اسے نو مہینے تک رہنا پڑا تھا۔ آزاد فضا میں سانس لینے کے بعد اس نے کسی اور کام کے بارے میں بہت سوچا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس طرح تو گھر بیٹھے بیٹھے گزارہ نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ ایک بار پھر اپنے مشن پر چل دی۔ گرو پارک اِن کے صدر دروازے پر ٹیکسی سے اتر کر اس نے اپنے سر پر جمی سرخ بالوں کی وگ کو سیدھا کیا اور بڑے سائز کے چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ یہ چشمہ اس نے دو دن پہلے ہی ایک فٹنس کلب کے

digestpk.blogspot.com

لاکر سے چرایا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ جھول رہا تھا اور وہ دیکھنے میں ایک سیاح لگ رہی تھی۔ اس حلیے میں اگر کوئی اس کا جاننے والا یا قریبی ساتھی بھی دیکھ لیتا تو پہلی نظر میں نہیں پہچان سکتا تھا۔

خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے لاؤنج کے بیرونی حصے پر ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جہاں بیٹھ کر وہ حرارت سے لطف اندوز ہو سکتی۔ وہ کافی چوکنا بھی کیونکہ اس کا کام ہی ایسا تھا جس میں کسی وقت بھی کوئی غیر معمولی صورت حال پیش آ سکتی تھی۔

اس نے بیرے کو ہاتھ کے اشارے سے بلا کر ڈرنک کا آرڈر دیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج کر اٹھاون منٹ ہوئے تھے پھر اس نے محتاط انداز میں گردوپیش کا جائزہ لیا۔ ایک عمر رسیدہ جوڑا آتش دان کے بالکل قریب بیٹھا اپنے پسندیدہ مشروب سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور کئی میزیں چھوڑ کر ایک شخص نیوی بلیو کوٹ میں ملبوس اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جس کی توقع کسی سنیچر کی خاموش سہ پہر میں کی جا سکتی ہے۔ اس ماحول میں وہ بالکل اجنبی لگ رہی تھی اور اس گمنام حیثیت میں اسے کوئی پہچاننے والا نہیں تھا۔

گھڑی نے تین بجائے اور اس کے کانوں نے کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ بیرا اس کا پسندیدہ مشروب لے آیا تھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک نیپکن نکالا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ خاصا قبول صورت لڑکا تھا اور جسامت کے لحاظ سے ویٹ لفٹر معلوم ہو رہا تھا۔ لیتی نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ میز پر نیپکن رکھ کر چلا گیا۔ اس نے مشروب ہونٹوں سے لگا لیا اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی پھر اس کی نظر نیپکن پر گئی جس پر ہاتھ سے چار ہندسوں پر مشتمل نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ نمبر ذہن نشین کر لیا اور ایک بار پھر نظریں گھما کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہاں سب لوگ اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ اس نے نیپکن اٹھایا اور اس کے نیچے رکھی ہوئی چابی پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ چابی کو مٹھی میں لینے کے بعد اس نے کاغذی نیپکن کے کئی ٹکڑے کیے اور انہیں پانی کے گلاس میں ڈبو دیا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد اس نے پرس سے اپنا موبائل فون نکالا اور لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچ گئی۔ راہداری سنسان پڑی تھی اور اس وقت وہاں کوئی فرد موجود نہیں تھا۔ اس نے کمرا نمبر 5212 کے بند دروازے پر کھڑے ہو کر فرنٹ ڈیسک کا نمبر ملایا اور آپریٹر سے اس کمرے کا نمبر ملانے کے لیے کہا پھر دروازے سے کان لگا کر گھنٹی بجنے کی آواز سننے لگی۔ پانچ مرتبہ گھنٹی بجنے کے بعد بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تو اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور ایک بار پھر راہداری کا جائزہ لینے کے بعد مٹھی میں دبی چابی کی مدد سے دروازے کا تالا کھول دیا۔ یہ خاصا شاندار کمرا تھا۔ اس میں ایک جہازی سائز سنگل بیڈ اور ٹائلوں سے مزین باتھ روم، دو عدد کرسیاں اور چھت سے فرش تک ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس سے باہر کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ کمرے میں قیمتی پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ تمام درازوں کی تلاشی لی۔ یہاں تک کہ باتھ روم کے ساتھ میں لگی ہوئی درازوں اور صوفے کے کشن اٹھا کر بھی جھانکا لیکن کہیں سے بھی کوئی کام کی چیز نہیں ملی پھر اس کی نظر ایک ڈبے پر پڑی جس میں تین قیمتی سگار رکھے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں ہی غنیمت جان کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے بیگ کھول کر فون نکالا۔ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"تم کون سے کمرے میں ہو؟"

وہ اس آواز کو پہچانتی تھی لہٰذا بلا توقف کمرے کا نمبر بتا دیا۔

"فوراً باہر آجاؤ۔ وہ واپس آ رہا ہے۔"

"میں کتنی دیر یہاں رک سکتی ہوں کیونکہ ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا۔"

"میں تمہیں ہدایات دیتے دیتے تنگ آ چکا ہوں۔" وہ شخص جھلاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ وہ کسی بھی لمحے کمرے میں واپس آ سکتا ہے۔"

لیتی نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی پھر یکایک ہی اس کے قدم رک گئے۔ باہر سے کوئی کمرے کا تالا کھول رہا تھا۔

اس کے لیے فوری طور پر کمرے سے باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور تیزی سے بغلی دروازہ کھول کر وہاں چھپ گئی۔ اپنا بیگ اتار کر فرش پر رکھا اور پرس میں سے موبائل نکال کر اسے بند کر دیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے دو افراد تھے۔ اس نے جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ ان میں سے ایک نے نیوی بلیو کوٹ اور خاکی رنگ کی پتلون جبکہ دوسرے نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے فریج کھول کر وہسکی کی بوتل نکالی اور

دو گلاس تیار کیے۔ پھر ایک گلاس دوسرے شخص کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم نے اس منصوبے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا ہے؟"

"ہاں، میں اسی لیے وکٹر کے پاس گیا تھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

"پیسے لائے ہو؟"

"ہاں۔" یہ کہہ کر اس نے بریف کیس آگے بڑھا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میری معلومات کے مطابق تمہاری بیوی سے ایک لڑکا بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"اسکائیلر... وہ سات سال کا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ کل صبح دس بجے تم اسے لے کر گھر سے باہر چلے جاؤ۔ اپنی کار میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعے گیس بھرواؤ پھر کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر کافی پیو۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی سے تھوڑا سا ہنسی مذاق کرو تاکہ تمہاری شکل اس کے حافظے میں محفوظ ہو جائے۔ تمہیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ صبح دس بجے سے لے کر دوپہر تک تم گھر میں نہیں تھے۔"

"کیا تم اپنے منصوبے کے بارے میں بتا سکتے ہو تاکہ میں بھی ذہنی طور پر تیار ہو جاؤں؟"

"تمہاری بیوی عام طور پر کہاں شاور لیتی ہے؟"

"ماسٹر باتھ روم میں... جو اوپر کی منزل پر ہمارے بیڈروم سے اٹیچ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم گھر میں داخل ہو کر بیوی کو آوازیں دیتے ہوئے اپنے بیڈروم تک آؤ گے اور اسے وہاں نہ پا کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دو گے۔ کوئی جواب نہ ملنے پر تم دروازہ کھول کر اندر جھانکو گے تو تمہاری بیوی فرش پر پڑی ہوئی نظر آئے گی۔ ایسا عموماً ہوتا ہے کہ نہانے کے دوران پیر پھسل جانے سے گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔"

"او کے۔" چارلس مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔ پھر میں فوراً ہی پولیس کو فون کر دوں گا۔"

"ہاں لیکن تم انہیں یہ نہیں بتاؤ گے کہ وہ مر چکی ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ حرکت نہیں کر رہی۔"

"ایسی صورت میں پولیس مجھ پر بھی شبہ کر سکتی ہے؟"

"ممکن ہے کہ وہ شروع میں ایسا سوچیں۔"

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"پھر اپنی بیوی کو مارنے کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ کوئی صاف ستھرا اور آسان کام نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں سب سے پہلے شوہر پر ہی شبہ کیا جاتا ہے لیکن میں اپنا کام بڑی ہوشیاری سے کرتا ہوں۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا اور یہی سمجھا جائے گا کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ بشرطیکہ تم نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری بیوی کوئی کام کرتی ہے؟"

"نہیں، آج کل وہ کچھ نہیں کر رہی لیکن وہ ایک نرس ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی... تاکہ مجھے اپنی تیاری کرنے میں آسانی رہے۔"

"اس بریف کیس میں ایک فولڈر بھی ہے جس میں ڈینئی کی تصویر، گھر کا پتا، چابی اور وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو تم نے مانگی تھیں۔ اس کے علاوہ میں گھر سے نکلتے وقت سامنے کی طرف والی تیسری کھڑکی بھی کھلی چھوڑ جاؤں گا۔"

"اس کے علاوہ بھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ ٹھیک دس بج کر پندرہ منٹ پر اپنی بیوی کو فون کر کے کہنا کہ شاید تم اپنا پرس گھر پر بھول گئے ہو۔ وہ اوپر جا کر بیڈ سائڈ کی دراز چیک کرے۔ اس طرح مجھے اندر جانے کا موقع مل جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سب باتیں کسی کاغذ پر لکھ لینا چاہئیں۔"

"نہیں، کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔" سیاہ سوٹ والے نے کہا۔ "اب میں تھک گیا ہوں، کچھ دیر آرام کروں گا۔"

چارلس نے اس سے مصافحہ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آرنلڈ نے اپنے جوتے اور موزے اتارے اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ لیتی کو اس جگہ چھپے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا اور اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ آرنلڈ گہری نیند سو گیا ہے تو اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور دبے پاؤں چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور تیزی سے باہر آ گئی۔

لابی میں رش بڑھ گیا تھا۔ وہ ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آتش دان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ اسے استعمال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسے ڈینئی کا فون نمبر معلوم نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے گھر کا پتا جانتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس طرح اس کی اصلیت سامنے آ جاتی۔ وہ تو

digestpk.blogspot.com

اپنا اصلی نام بھی کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس کا اپنا ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ وہ تین بار پکڑی گئی اور مجموعی طور پر چھ سال کی سزا کاٹ چکی تھی اور اتنی جلدی چوتھی بار اس کا جیل جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان حالات میں وہ ڈینی کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ ویسے بھی اگر وہ کمرا نمبر 5212 میں نہ جاتی تو اسے یہ سب کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اس نے سوچا کہ واقعی بے خبری بھی ایک نعمت ہے۔ اس نے یہ سوچ کر موبائل فون اپنے بیگ میں رکھ لیا کہ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اب اسے چلنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہال کے بیرونی دروازے تک جاتے جاتے اس کے قدم اچانک رک گئے۔ اسے یاد آیا کہ چارلس نے ایک فولڈر کا ذکر کیا تھا جس میں ڈینی کی تصویر اور پتا موجود ہے۔ پھر وہ اس بریف کیس کے بارے میں سوچنے لگی جس میں پچیس ہزار ڈالرز موجود تھے۔ کیوں نہ ایک کوشش کی جائے۔ اس طرح ایک بڑی رقم ہاتھ آنے کے ساتھ ساتھ ایک زندگی بھی بچائی جاسکتی ہے۔ اس نے جلدی سے پرس میں ہاتھ ڈالا لیکن چابی وہاں نہیں تھی۔ اسے یاد آگیا کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے بے دھیانی میں وہ چابی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ جس بیرے نے پہلے اس کی مدد کی تھی وہ ڈیوٹی ختم کرکے جاچکا تھا لہٰذا دوسری چابی لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے۔ اس نے مایوسی کے عالم میں نظریں دوڑائیں پھر اس کی نظر لفٹ پر گئی۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے آرنلڈ برآمد ہوا۔ وہ جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہوگئی۔ آرنلڈ نے نیلے رنگ کی جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ لیٹی نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کردیا۔ اس نے جیب کاٹنے کا فن جیل میں سیکھا تھا اور اب اس کو آزمانے کا وقت آگیا تھا۔ آرنلڈ کی پتلون کی پچھلی جیب، جیکٹ میں چھپی ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ سمجھدار لوگ اپنا پرس پچھلی جیب کے بجائے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس سے ٹکرا جاتی پھر اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت کرتا اور وہ بڑی صفائی سے اس کا بٹوا اڑا لیتی لیکن اس کے لیے تجربے اور مہارت کی ضرورت تھی جس سے لیٹی محروم تھی تاہم اس نے آرنلڈ کا تعاقب جاری رکھا۔

آرنلڈ لابی سے گزرتا ہوا بار میں پہنچ گیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ کر بارٹینڈر کا انتظار کرنے لگا۔ لیٹی بھی تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی اور آرنلڈ کے برابر میں رکھے ہوئے خالی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور لاتعلقی کے انداز میں بارٹینڈر کو دیکھنے لگی جو اس کی جانب پشت کیے کسی دوسرے گاہک کے لیے ڈرنک بنانے میں مصروف تھا۔ دو منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوا تو اس نے ایک زوردار آہ بھری۔ اس مرتبہ آرنلڈ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے غور سے لیٹی کو دیکھا اور بارٹینڈر کو آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

"تم نے ابھی تک اس خاتون سے آرڈر نہیں لیا؟"

"سوری! مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کے ساتھ ہیں۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ میرے ساتھ نہیں ہیں لیکن یقیناً کچھ پینا چاہ رہی ہوں گی۔"

بارٹینڈر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میڈم! آپ کیا لینا چاہیں گی؟"

"مارٹینی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور آرنلڈ کی طرف متوجہ ہوگئی جو پہلے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "مجھے لیٹی کہتے ہیں۔"

"میرا نام آرنلڈ ہے۔"

دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ اسی دوران میں بارٹینڈر اس کے لیے مارٹینی لے آیا۔ لیٹی نے اپنا پرس کھول کر ادائیگی کرنا چاہی تو آرنلڈ نے اسے روک دیا اور بولا۔

"یہ میری طرف سے ہے۔"

لیٹی نے اپنا گلاس اٹھایا اور آرنلڈ کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے بولی۔ "نئی دوستی کے نام۔"

تھوڑی دیر میں ہی وہ دونوں خاصے بے تکلف ہوچکے تھے۔ لیٹی نے اسے بتایا کہ وہ یہاں کسی سے ملنے آئی تھی لیکن وہ لڑکا اسے نظر نہیں آرہا۔

"شاید وہ تمہیں لابی میں ڈھونڈ رہا ہو۔" آرنلڈ نے کہا۔

"نہیں، اس نے بار میں ہی ملنے کے لیے کہا تھا۔ میں تو اس کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ اسی لیے یہاں آکر بیٹھ گئی۔"

"یہ تو میرے حق میں اچھا ہوا کہ تم جیسی خوب صورت لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔"

"تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔" وہ ایک ادا سے بولی۔ "اب میں نہیں چاہتی کہ وہ لڑکا میرے سامنے آئے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو آج تم میرے ساتھ ڈنر کرو گی۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

کھانے کے دوران میں دونوں نے اپنے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا۔ لیٹی نے اپنے آپ کو ہائی اسکول کی ٹیچر بتایا جو ناول نگار بھی ہے۔ وہ صبح چار بجے اٹھتی ہے اور کام پر جانے سے پہلے تین گھنٹے تک لکھتی رہتی ہے۔ اس کے ناول کے پانچ سو صفحے لکھے جاچکے ہیں اور اب وہ اس کے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ آرنلڈ نے بتایا کہ وہ ایک سرمایہ کار کمپنی کا نمائندہ ہے اور یہاں ایک تھنک ٹینک کے سربراہ سے انٹرویو کرنے آیا ہے جنہوں نے اس کی کمپنی سے مالی معاونت کی درخواست کی تھی۔ کھانے کے بعد دونوں اپنے اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلاتے رہے پھر آرنلڈ اٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ لیٹی کی طرف بڑھایا اور اسے لے کر کمرا نمبر 5212 کی طرف بڑھ گیا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو گھڑی میں سوا نو بج رہے تھے۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ آرنلڈ وہاں نہیں تھا لیکن باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً وہ نہا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی بریف کیس ڈھونڈنے لگی۔ اس نے جھک کر بستر کے نیچے دیکھا لیکن وہاں بھی کچھ نہ تھا پھر وہ الماری کی طرف بڑھی ہی تھی کہ باتھ روم سے آرنلڈ کی آواز آئی۔

"لیٹی! کیا تم بیدار ہوگئی ہو؟"

اس نے الماری کا دروازہ کھولا۔ بریف کیس سب سے نیچے والے خانے میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بریف کیس اٹھایا اور باتھ روم کے دروازے کے پاس آکر بولی۔ "ہاں، میں اٹھ گئی ہوں۔"

"کیسا محسوس کررہی ہو؟" آرنلڈ نے پوچھا۔

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟" وہ بریف کیس کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔ مجھے فوراً ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

"ناشتا تو تم میرے ساتھ ہی کرو گے۔" وہ بریف کیس کھولتے ہوئے بولی۔

"نہیں، البتہ ہم ڈنر ساتھ کرسکتے ہیں۔"

پچیس ہزار ڈالرز کی رقم پانچ چیکوں کی صورت میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا اور بولی۔

"تم آج رات بھی یہیں ٹھہرو گے؟"

"ہاں، بشرطیکہ تم دوبارہ ملنے کا وعدہ کرو۔"

اس نے بریف کیس میں سے فولڈر نکالا اور جلدی جلدی صفحات پلٹنے لگی۔ اس میں گھر کا نقشہ، چابی اور ڈینی کی تصویر بھی موجود تھی۔ اس نے ایک کاغذ پر گھر کا پتا نوٹ کیا اور بولی۔ "ٹھیک ہے، اب ہماری ملاقات ڈنر پر ہوگی۔"

اس نے بریف کیس بند کیا اور بستر کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ کندھے پر رکھا۔ دروازے تک گئی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا۔ وہ واپس پلٹی اور بریف کیس کو دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ شاید یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین کام تھا پھر اس نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آرنلڈ اس وقت تولیے سے اپنا بدن پونچھ رہا تھا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔

"میں اپنے گھر جارہی ہوں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔" لیٹی نے کہا۔

"تم یہیں رک جاؤ۔ میں میٹنگ سے فارغ ہوکر جلدی آجاؤں گا۔"

"نہیں، مجھے تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ اپنا نمبر چھوڑے جارہی ہوں، چاہو تو رابطہ کرلینا۔"

"میرے لیے تو رات تک انتظار کرنا دوبھر ہوجائے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

لیٹی تقریباً دوڑتی ہوئی ہوٹل سے باہر آئی اور ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرکے اس کی پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوگئی۔

"تمہیں ہیملٹ کورٹ کا راستہ معلوم ہے؟"

ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ "میں تلاش کرلوں گا۔ تمہارے پاس اسٹریٹ نمبر تو ہوگا؟"

"سات سو بارہ۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور کو سو ڈالر کا نوٹ تھمایا اور بولی۔ "گاڑی ذرا تیز چلاؤ۔"

ڈرائیور ان راستوں سے واقف تھا۔ اس نے بہت کم وقت میں اسے منزل تک پہنچا دیا۔ اسٹریٹ سات سو بارہ کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی کار وہاں سے گزر سکتی تھی۔ اس نے وہاں پہنچ کر ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی روکو۔"

"میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر چار منٹ ہوچکے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی مکانوں کی قطار کے آگے سے گزری اور پھر اس کے قدم ایک مکان کے گیٹ پر رک گئے

digestpk.blogspot.com

جس پر چارلس کا نام لکھا ہوا تھا۔ رہائشی حصہ عقب میں واقع تھا اور گیٹ سے لے کر وہاں تک سبز گھاس اور درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اسے کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گئی۔ ایک مرسیڈیز اس کے پاس سے گزری۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے چارلس کی ایک جھلک دیکھی۔ پچھلی سیٹ پر اس کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ جب مرسیڈیز نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی جھاڑیوں سے نکل آئی اور کپڑے جھاڑتی ہوئی رہائشی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ دو مرتبہ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھل گیا اور ایک عورت باہر چلی آئی۔ اسے سامنے دیکھ کر لینی کو احساس ہوا کہ اس نے پہلے سے یہ نہیں سوچا کہ ڈیفنی سے کیا کہنا ہے۔ وہ عورت چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"کیا بات ہے؟"

لینی نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔ "تم ڈیفنی ہو؟"

"ہاں کہو، میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

لینی نے اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرا اور بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے تفصیل میں جائے بغیر اتنا کہوں گی کہ ایک شخص تمہیں قتل کرنے کے لیے آ رہا ہے۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"میں نے کوئی مشکل بات تو نہیں کہی۔"

"لگتا ہے کہ تم نشے میں ہو۔" ڈیفنی بیزاری سے بولی۔

"کچھ بھی ہو لیکن تمہیں میری بات سننا ہوگی۔"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر پولیس کو بلالو۔ میں اپنی بات کہے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

ڈیفنی دروازہ بند کرنے کے لیے پیچھے ہٹی لیکن لینی نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنا دایاں پیر دروازے کے درمیان میں رکھ دیا اور بولی۔ "میں تمہاری مدد کرنا چاہ رہی ہوں۔ مجھے صرف دو منٹ دے دو۔"

ڈیفنی کچھ کہے بغیر اندر چلی گئی۔ لینی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے کچن میں جا کر ایک کیتلا اٹھایا اور اسے چڑھاتے ہوئے بولی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔ اس لیے تم جلدی سے میری بات سن لو۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیفنی کو گزشتہ سہ پہر کو ہونے والا سارا واقعہ سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کے شوہر چارلس نے آرنلڈ کو اسے قتل کرنے کے لیے پچیس ہزار ڈالرز ہی نہیں دیے بلکہ مکان کا نقشہ، چابی اور اس کی تصویر بھی دی تھی۔

ڈیفنی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ جب لینی سب کچھ کہہ چکی تو وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"

"تم سمجھ رہی ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میرے پاس آج پچیس ہزار ڈالرز چرانے کا سنہری موقع تھا اور میں صرف تمہارا پتا نوٹ کر کے یہاں چلی آئی۔ اس سے بہتر تھا کہ میں رقم سمیٹ کر چپکے سے گھر چلی جاتی اور خود کو اس جھگڑے سے دور رکھتی لیکن یہ خود غرضی ہوتی۔ میں کئی بار جیل جا چکی ہوں اور اب کسی معاملے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں نے یہاں آ کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔"

ڈیفنی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

لینی نے مائیکرو ویو کے اوپر لگی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی۔ "میں ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔ اس وقت دس بج کر منٹ ہوئے ہیں۔ ٹھیک چار منٹ بعد تمہارا شوہر فون کرے گا کہ وہ اپنا پرس گھر پر بھول آیا ہے اور تم اوپر جا کر بیڈ روم کی دراز میں چیک کرلو۔ اگر اس کا فون آ گیا تو کیا تم میری بات پر یقین کر لوگی؟"

ڈیفنی نے پہلے گھڑی اور پھر لینی کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزتے نظر آئے اور اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔

"وہ تم سے کس فون پر بات کرتا ہے... لینڈ لائن یا موبائل فون پر؟"

"میرے آئی فون پر۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔" لینی نے تجویز پیش کی۔

"میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔" ڈیفنی نے جواب دیا۔ شاید اسے ابھی تک لینی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے شوہر کا فون آنے تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ اس فون کال کا مقصد یہ ہے کہ تم اس کا پرس دیکھنے کے لیے اوپری منزل پر چلی جاؤ اور اس دوران میں آرنلڈ کو اندر آنے کا موقع مل جائے۔"

ڈیفنی نے چولہا بند کیا اور اس کے ساتھ ہال کی جانب چل دی۔ ایک کونے میں لگے ہوئے ریک پر سے اس نے چابیوں کا گچھا اٹھایا اور صدر دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ باہر صبح کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اچانک ہی لینی نے اس کا بازو پکڑا اور بولی۔ "واپس چلو۔"

"کیوں؟"

"میں نے کچھ فاصلے پر ایک کار کھڑی ہوئی دیکھی ہے۔ شاید وہ پہنچ چکا ہے۔"

وہ دونوں تیزی سے گھر میں داخل ہو گئیں۔ ڈیفنی نے اندر سے دروازہ لاک کر دیا اور بولی۔ "میں عقبی دروازہ بھی لاک کر دوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے پاس چابی ہے اور اس لیے چارلس نے ایک کھڑکی بھی کھلی چھوڑ دی ہے۔ کیا گھر میں کوئی ہتھیار ہے؟"

ڈیفنی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "مجھے بتاؤ۔"

ڈیفنی اوپر جانے لگی۔ لینی اس کے پیچھے تھی۔ اوپر پہنچ کر اس کی سانس بے ترتیب ہونے لگی۔ خوف اور ہیجان کی وجہ سے اس کے اعصاب کھنچنے لگے تھے۔ ہال کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جو ماسٹر بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ اچانک ہی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ڈیفنی نے جیب سے موبائل فون نکالا اور بڑی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔

"ہائے ہنی... ہاں، ٹھیک ہے۔ اچھا میں دیکھتی ہوں۔"

ڈیفنی نے الماری کھول کر ایک شاٹ گن نکالی اور لینی کی طرف بڑھا دی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ "اس میں گولیاں ہیں؟"

ڈیفنی نے سر ہلا دیا اور فون پر مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "چارلس! میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ تمہارا پرس یہاں نہیں ہے۔"

لینی نے دوبارہ سرگوشی کی۔ "پولیس کو فون کرو۔"

ڈیفنی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس دوران میں لینی نے شاٹ گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لینے لگی پھر اس کے قدم ماسٹر باتھ روم کی طرف اٹھ گئے جو رقبے میں اس کے اپارٹمنٹ جتنا تھا۔ اس نے حیرت سے وہاں نصب اشیا کو دیکھا اور آگے بڑھ کر شاور کھول دیا۔ پھر وہ بیڈ روم میں واپس آ گئی اور باتھ روم کو

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

دروازہ بند کر دیا۔ ڈیفنی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”تم نے شاور کیوں کھول دیا؟“

”پولیس آرہی ہے؟“ لیتی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

لیتی نے کمرے کی لائٹس بھی بجھا دیں اور بولی۔ ”تم کہیں چھپ جاؤ اور اپنا فون بند کر دو۔“

ڈیفنی پیچھے ہٹ کر تاریکی میں گم ہو گئی۔ لیتی کمرے سے باہر آئی اور دروازہ بند کر کے ہال کی طرف چل دی۔ سامنے کی طرف واقع بڑی کھڑکی سے اس نے صحن کا جائزہ لیا۔ وہ کار ابھی تک ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ واپس آئی اور نیچے جھانکنے لگی۔ آرنلڈ کوئی آواز پیدا کیے بغیر اندر آچکا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں ربر کے جوتے تھے جس کی وجہ سے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی کمر میں ایک سیاہ پستول بندھا ہوا تھا۔ وہ چلتا ہوا ماسٹر بیڈ روم تک آیا اور دروازے پر رک گیا۔ لیتی اسے آتا دیکھ کر پہلے ہی دروازے کی آڑ میں ہو چکی تھی۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، لیتی نے اس کی کمر پر شاٹ گن رکھ دی اور بولی۔ ”پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ تم اس وقت میرے نشانے کی زد پر ہو۔ اپنا پستول پھینک دو۔“

آرنلڈ نے کوئی حرکت نہیں کی اور خاموش کھڑا رہا۔

”یہ سوچنے کی حماقت نہ کرنا کہ میں تم سے دوبارہ کہوں گی۔ اپنا پستول پھینک دو۔“

آرنلڈ نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پستول فرش پر پھینک دیا۔ لیتی بولی۔

”اپنے ہاتھ اوپر کرو اور گھوم جاؤ۔“

اسے دیکھ کر آرنلڈ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔ ”کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟“

”نہیں، میں کل دوپہر تمہارے کمرے میں تھی اور میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی تھیں۔“

”گویا تم چور ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے درمیان معاملات طے ہو سکتے ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”کیا میں اپنی جیب سے کچھ نکال سکتا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔“

آرنلڈ نے اپنی جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں اور اس کے سامنے نچاتے ہوئے بولا۔ ”میری کار بالکل نئی ہے اور اس کی فرنٹ سیٹ پر ایک بریف کیس رکھا ہوا ہے۔ [illegible] میں پچیس ہزار ڈالرز ہیں۔“

”میں وہ بریف کیس دیکھ چکی ہوں۔“

”تم گاڑی اور بریف کیس دونوں لے جا سکتی ہو۔ [illegible] یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے پہلے تم نے کبھی ایک دن میں اتنی کمائی نہیں کی ہوگی۔“

”اور میرے جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟“ لیتی نے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہوں، وہ اگر کسی کو مارنے کا فیصلہ کر لیں تو اسے اس دنیا سے جانا ہی ہوتا ہے۔ یہ ان کی مرضی ہے، میری نہیں۔ میں تو صرف ایک مہرہ ہوں۔ اگر میں یہ کام نہیں کروں گا تو یہ ڈیوٹی کسی اور کو سونپ دی جائے گی۔ اس لیے تمہیں اس معاملے سے الگ رہنا چاہیے۔ کیوں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہی ہو؟“

”کیا تم نے تنہائی میں کبھی سوچا ہے کہ جو کچھ کر رہے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ تم ساری حدیں پار کر چکے ہو۔ تم نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے۔“

آرنلڈ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ لیتی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے بارے میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہوں۔ تمہارے کمرے میں بھی چوری کی نیت سے گئی تھی لیکن تم دونوں کی باتیں سن کر میرا ضمیر جاگ اٹھا اور میں نے ایک انسانی جان بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ تم مجھے یہ فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“

لیتی نے الماری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ ڈیفنی باہر آئی اور اس کے برابر میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”چارلس نے مجھے قتل کرنے کے لیے تمہیں معاوضہ دیا تھا؟“

آرنلڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈیفنی نے آگے بڑھ کر اس کا پستول اٹھا لیا۔

”تمہیں اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔“ لیتی نے کہا۔

”وہ ابھی نہیں آرہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ لیتی نے حیرت سے کہا۔

”تم پہلے بھی جیل جا چکی ہو اور میں نہیں چاہتی کہ ایک بار پھر چوری کے الزام میں پکڑی جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی کار اور پیسے لے کر چلی جاؤ۔ میں تمہارے جانے کے بعد پولیس کو فون کروں گی۔“

”لیکن وہ رقم تو تمہاری ہے ڈیفنی!“

”نہیں، یہ پیسے چارلس کے ہیں۔“ پھر اس نے آرنلڈ پر پستول تان لیا اور کہا۔ ”چابیاں۔“

آرنلڈ نے لیتی کی طرف چابیاں اچھال دیں۔

”میں تمہیں اس کے ساتھ چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ ڈیفنی نے اس سے شاٹ گن لے لی اور بولی۔ ”تم نے میری جان بچائی ہے لیتی۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب تم جاؤ۔“

☆☆☆

پانچ دن بعد شام چھ بجے چارلس روک فورٹ لغب سے باہر نکلا اور اپنے موبائل فون پر باتیں کرتا ہوا لابی سے گزرنے لگا۔ اسی عمارت کی بارھویں منزل پر اس کی قانونی فرم تھی۔ ایک سرخ بالوں والی لڑکی نے اس کا تعاقب شروع کیا۔ وہ ساؤتھ پارک اسکوائر سے ہوتے ہوئے نارتھ مارکیٹ اور پھر کئی بلاک کا فاصلہ طے کر کے وڈفن کے چوک تک آگئے جہاں چارلس گاڑی سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

وہ بار کے ایک کونے میں بیٹھا اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہا تھا اور اس سے چھ اسٹول چھوڑ کر لیتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک گلاس مارٹینی کا آرڈر دیا تھا۔ بارٹینڈر کے جانے کے بعد وہ چارلس کے برابر والے اسٹول پر چلی گئی اور بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تم سے کچھ باتیں کر سکتی ہوں؟“

چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پہلے کبھی تمہیں نہیں دیکھا۔“

”لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔“

بارٹینڈر لیتی کے لیے مشروب لے آیا۔ چارلس نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا۔

”اگر تم میری کلائنٹ ہو تو ہمیں دفتر میں بات کرنی چاہیے۔“

”میں تمہاری کلائنٹ بھی نہیں ہوں لیکن تم سے ایک خاص معاملے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”کہو، کیا بات ہے؟“ چارلس نے اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں گزشتہ پانچ روز سے اخبار کا مطالعہ کر رہی ہوں

سزا

جج: تمہیں معلوم ہے دو شادیاں کرنے کی کیا سزا ہے؟

ملزم: جی ہاں جناب عالی! دو عدد ساسیں۔

مچھرو سے محمد عزیز

اور باقاعدگی سے ٹی وی دیکھ رہی ہوں لیکن اس بارے میں کوئی خبر نہیں سنی۔ میں نے تمہارے گھر فون بھی کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تم اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں اور رہ رہے ہو اور آج میں تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہوں۔“

چارلس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں وہاں موجود تھی چارلس۔“ لیتی نے اس کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟ تم کس بارے میں گفتگو کر رہی ہو؟“

لیتی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”گرو پارک ان کا کمرا نمبر... 5212 جہاں تم نے آرنلڈ سے ملاقات کی اور اسے اپنی بیوی کے قتل کے لیے مامور کیا۔ میں اس وقت وہاں چھپی تمہاری سب باتیں سن رہی تھی۔“

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

لیتی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”گزشتہ اتوار کی صبح میں تمہارے گھر گئی اور تمہاری بیوی کو سب کچھ بتا دیا۔“

”اوہ میرے خدا۔“ چارلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”اور جب میں وہاں سے رخصت ہوئی تو وہ آرنلڈ پر پستول تان کر کھڑی تھی اور پولیس کو فون کرنے ہی والی تھی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ مجھے وہاں سے نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ ابھی تک ڈیفنی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اور میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ تم کوئی جواب دو، یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں نے پولیس کے نام ایک خط میں یہ ساری تفصیل لکھ دی ہے اور اگر مجھے کوئی نقصان پہنچا تو میری ایک دوست یہ خط پولیس کو پہنچا دے گی۔“

آخری بات اس نے محض چارلس کو ڈرانے کے لیے کہی

digestpk.blogspot.com

تھی۔ چارلس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کیا اور اسے کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔

"تم واپس گھر کیوں نہیں گئے چارلس؟" لیلی نے تلخی سے کہا۔ "میرے وہاں سے آنے کے بعد تم نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

چارلس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور غصے سے بولا۔ "تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم کیا حماقت کر بیٹھی ہو۔"

"آج رات میں تمہارے گھر جاؤں گی۔" لیلی بولی۔ "لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ مجھے زندہ حالت میں ملے گی یا نہیں۔ تم کیوں نہیں بتا دیتے؟ یہاں بیٹھ کر یوں ظاہر کر رہے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

چارلس نے بار کے طویل کاؤنٹر پر نظر ڈالی اور بولا۔ "پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میری ڈیفنی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت اسکینڈل دو سال کا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اس کی اصلیت سامنے آنے لگی۔ میرے کسی دوست کو طلاق ہو جاتی تو وہ اس سے ٹیلی فون پر اظہارِ ہمدردی کرتی۔ میری نظر میں یہ اتنی اہم بات نہیں تھی لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ہمدردی نہیں بلکہ زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار ایسا کرتے دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ ہم باپ بیٹوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھتی۔ لگتا تھا اسے دوسروں کو دکھ، تکلیف اور اذیت میں دیکھ کر مزہ آتا ہے۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسے تنہا چھوڑ دو۔"

"گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے اور اسی لیے تم اسے مارنا چاہ رہے تھے۔" اسی وقت لیلی کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ وہ اپنے پرس سے پستول نکال کر ساری گولیاں چارلس کے سینے میں اتار دے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور اسٹول سے اترتے ہوئے بولی۔ "جی بھر کر جشن منا لو۔ ممکن ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری رات ہو۔"

☆☆☆

لیلی نے اپنی کار مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور ڈرائیو وے کو عبور کرتی ہوئی بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔ گہری دھند نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکی کہ دوسری منزل پر روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے بیرونی دروازے کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ تیسری

کھڑکی کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اسے کھرکیا تو اندر جانے کی جگہ بن گئی۔ وہ کھڑکی کے راستے لیونگ روم میں کود گئی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ ماسٹر بیڈ روم کے بستر کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی کے استعمال میں ہے۔ لیلی کچن میں گئی۔ وہاں بھی سنک میں گندے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کے کانوں میں موسیقی کی آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی لوری سنا رہا ہو۔ یہ آواز مکان کے آخری کونے سے آ رہی تھی۔ لیلی نے کچن کے دوسری جانب کونے کا دروازہ کھولا۔ موسیقی کی آواز اب واضح ہو گئی تھی۔ اس نے تہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھا اور ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئی جو بیس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا تھا۔ بائیں جانب ایک واشنگ مشین رکھی تھی اور اس کے ساتھ ہی میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔

لیلی دائیں جانب مڑی اور ایک کونے میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ایک ایزل پر گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈی پلیٹر، چھریوں کا سیٹ اور فرسٹ ایڈ باکس رکھا ہوا تھا۔ چھت سے لگی ہوئی زنجیر سے بندھا ایک انسانی جسم جھول رہا تھا۔ لیلی کو اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ وہ آرنلڈ تھا اور بے بسی کی تصویر بنا لیلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر ڈیفنی کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایپرن پہن رکھا تھا جس پر جگہ جگہ رنگ یا خون کے دھبے نمایاں تھے اور اس نے اپنے چہرے پر سفید ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ اس کی شاٹ گن کا رخ لیلی کی جانب تھا۔ لیلی کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا اور اس نے ڈیفنی کو باتوں میں لگانا چاہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

ڈیفنی سرد لہجے میں بولی۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ تم صحیح سلامت ہو یا نہیں۔ میں تو چارلس کے پاس بھی گئی تھی۔"

"اس نے تمہیں کیا بتایا؟ حالانکہ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آرنلڈ کے ساتھ ایک ہفتہ رہنے دے پھر میں اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں گی۔"

لیلی پچھتا رہی تھی کہ وہ کیوں اس کی ہمدردی میں دوڑی چلی آئی۔ اب خود اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بُری عورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ بُری عورت نہیں تھی اور اس نے ڈیفنی کی جان بچائی تھی۔

آرنلڈ کے کراہنے کی آواز آئی تو ڈیفنی بولی۔ "یہ شخص

مجھے مارنے کے لیے آیا تھا۔"

"ہاں اور میں نے بروقت اطلاع دے کر تمہیں بچایا۔ یاد ہے؟ تمہیں زندہ سلامت دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے، اب چلتی ہوں۔"

"تمہیں یہاں دوبارہ نہیں آنا چاہیے تھا۔" ڈیفنی اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔

"میں تمہاری طرف سے بہت پریشان تھی۔ اخبار سے بھی تمہارے شوہر یا آرنلڈ کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا تو میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ ڈر رہی تھی کہ میرے یہاں سے جانے کے بعد تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔"

ڈیفنی نے غور سے اسے دیکھا اور بولی۔ "تم جاننا چاہتی ہو کہ میں کیا کر رہی ہوں؟"

"نہیں، نہیں۔ میں یہاں اس لیے نہیں آئی۔" لیلی اپنا دفاع کرتے ہوئے بولی۔ "یہ شخص تمہیں قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔ یہ اسی سلوک کا مستحق ہے۔ ذرا ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچو جنہیں اس نے پیسوں کے عوض قتل کیا ہو گا۔"

"تم نے میری پینٹنگ دیکھی؟"

"ہاں... ہاں۔"

"پسند آئی؟"

"ہاں... ہاں، بہت اچھی ہے۔" لیلی نے اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولا۔ ابھی تک اس کی نظر تصویر پر نہیں گئی تھی۔

"یہ تصویر آرنلڈ کی ہے اور اس کے کچھ حصے اسی کے خون سے پینٹ کیے گئے ہیں۔"

خوف کے مارے لیلی کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈیفنی اتنی سفاک ہو گی۔ اب اس کی پستول کی نال کا رخ اس کی جانب تھا۔ لیلی گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ "یاد کرو، میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔"

"ہاں... میں اس بات کو کبھی نہیں بھولوں گی لیکن چارلس نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ میں ہمیشہ دوسروں کو تکلیف اور اذیت میں دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ اس وقت تمہاری پریشانی اور گھبراہٹ دیکھ کر مجھے دلی راحت ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے تمہاری اذیت بڑھتی جائے گی، اسی حساب سے میری خوشی میں بھی اضافہ ہو گا۔ جاؤ، اچھے بچوں کی طرح آرنلڈ کے پاس جا کر کھڑی ہو جاؤ۔"

"ڈیفنی!" اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم جیسی خوب صورت لڑکی کی تصویر بھی خوب صورت بنے گی۔"

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں لیلی کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا ہاتھ فوراً ہی اپنے ہینڈ بیگ پر گیا اور وہ اس کی زپ کھولنے ہی والی تھی کہ ڈیفنی کی آواز گونجی۔

"اپنا ہاتھ وہاں سے ہٹا لو۔"

"میرا فون بج رہا ہے۔"

"اسے مجھے دے دو۔"

لیلی نے بیگ کھولا اور بائیں ہاتھ سے اپنا موبائل فون باہر نکال لیا جبکہ اس کا دایاں ہاتھ بیگ کے اندر ہی تھا۔ اس نے موبائل فون ڈیفنی کی طرف اچھال دیا۔ ڈیفنی کی ساری توجہ فون پر گئی۔ اسی دوران میں لیلی نے دائیں ہاتھ سے بیگ میں رکھے ہوئے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ ڈیفنی نے ایک ہاتھ سے فون پکڑا اور اس کے ساتھ ہی لیلی نے فائر کر دیا۔ ڈیفنی کے ہاتھ سے شاٹ گن چھوٹ گئی اور وہ خود دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے گلے سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ لیلی نے کسی توقف کے بغیر اس کے سینے میں تین گولیاں اتار دیں۔

لیلی نے شاٹ گن کو ٹھوکر ماری اور آرنلڈ کے قریب جا کر بولی۔ "میں تمہارے لیے ایمبولینس بلاتی ہوں۔"

اس نے تکلیف کے عالم میں سر ہلایا اور اس کی نظریں لیلی کے پستول پر جم گئیں۔

"تم چاہتے ہو کہ میں..."

آرنلڈ زور سے کراہا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی جھلک رہی تھی۔

"آرنی!" وہ اپنا پستول اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم اس سلوک کے مستحق ہو... لیکن حقیقت یہی ہے۔"

☆☆☆

لیلی گھر سے باہر آئی تو بارش تھم چکی تھی اور بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے لیکن وہ چھتیس برس کی ہونے کے باوجود اس کی خوب صورتی سے بہت کم لطف اندوز ہو سکی ہے۔ اس نے بیگ سے موبائل فون نکالا اور چارلس کا نمبر ڈائل کرنے لگی لیکن پانچ سیکنڈ بعد ہی اس نے فون بند کر دیا۔ وہ پہلے ہی بہت کچھ کر چکی تھی اور مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

digstpk.blogspot.com

چھٹکارا

عالی نعیم

کروٹیں لیتی روایات اور وقت کی بدلتی رتوں نے محبت کی لطافتوں کو بھی معمولی بنا دیا ہے... محبت کے جذبے میں خود غرضی کی آمیزش کا انوکھا احوال۔

چند ساعتوں میں پلٹ جانے والی بازی عشق کا فسانہ

"میرا لیپ ٹاپ چرا لیا گیا ہے۔" ریکا نے کہا۔

"اوہ سویٹ ہارٹ... مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ لیکن سنو، یہ کچھ عرصہ تو تمہاری تحویل میں رہا!" اس نے سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے فون اپنے دوسرے کان پر لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بتاؤں؟ میں تمہیں نیا لیپ ٹاپ لے دوں گا۔"

"بات یہ نہیں ہے۔ تم سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"تو پھر بات کیا ہے؟"

"ہم اس پر موجود تھے۔" ریکا نے بتایا۔

ان الفاظ کو سنتے ہی گیبرائل پریسٹ کو اپنی دنیا بکھرتی محسوس ہوئی۔ "ہم اس پر موجود تھے!" کیا وہ اس حد تک احمق تھی؟ اتنی بے پروا تھی کہ وہ اس طرح منظرِ عام پر آسکتے ہیں؟ یہ بات ناقابلِ تصور تھی۔ وہ اسے بارہا متنبہ کر چکا تھا کہ وہ ان کی تصویریں اور فائلیں حفاظت سے اسٹور کیا کرے۔ کسی چیز کو اپنی ہارڈ ڈرائیو پر نہ چھوڑے۔ ان کو وہیں کے وہیں ڈیلیٹ کر دیا کرے... یا اشاراتی زبان میں محفوظ کرے... کوئی چیز کبھی نہ چھوڑے...

لیکن وہ اس کی بات سن کر قہقہے لگانے لگتی تھی اور اسے خبطی سمجھتی تھی۔

گیبرائل نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے چند گہرے گہرے سانس لیے۔

"ہوا کیا تھا؟" گیبرائل نے پوچھا۔

ریکا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے گیبرائل کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر آخرکار وہ بولی۔ "میں لیپ ٹاپ ٹرین میں بھول گئی تھی۔"

"تم احمق نہیں ہو کی... وہ کسی نے بھی اٹھا لیا ہوگا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" گیبرائل نے مٹھی بھینچتے ہوئے اپنی پیشانی پر گھونسا سا رسید کیا پھر بولا۔ "ایک منٹ رک جاؤ۔ تم نے تو کہا تھا کہ وہ چرا لیا گیا ہے؟"

"جونہی میں پلیٹ فارم پر پہنچی، مجھے احساس ہوا کہ لیپ ٹاپ میرے پاس موجود نہیں ہے۔ پھر جیسے ہی مجمع چھٹا، میں لپک کر واپس ٹرین کی اس سیٹ پر پہنچی جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔" گیبرائل کو ریکا کے تھوک نگلنے کی آواز سنائی دی۔ "وہ وہاں موجود نہیں تھا۔"

"جب تم یہ کہہ رہی ہو کہ ہم اس پر موجود تھے... تو کس حد تک؟"

"ہر چیز۔ ہم اور اس کے علاوہ ہم سے متعلق ہر چیز۔" ریکا نے بتایا۔

اتنے میں بیک گراؤنڈ میں دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

"گیبرائل! مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے گا، میں تمہیں دوبارہ فون کروں گی۔"

"کب؟"

"کیا کب؟"

"یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟"

"گزشتہ شب جب میں مانچسٹر سے واپس آ رہی تھی۔"

یہ جواب دے کر ریکا نے فون بند کر دیا۔

گیبرائل کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے ہینڈ سیٹ کو گھور رہا تھا۔ پھر جب اس نے فون واپس...... رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اب تک تو وہ کم بخت لیپ ٹاپ نہ جانے کہاں تک پہنچ چکا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ eBay پر آ گیا ہو۔ میں اس وقت بدبخت چور پاس ورڈ کو توڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہو... اگر کوئی پاس ورڈ لگا ہوا تھا اور پھر اسے جو کچھ دیکھنے کو ملے گا...

اس تصور سے گیبرائل کی سانس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اوہ

کرائسٹ! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کم از کم اس کے ساتھ نہیں! وہ گرجے کے طائفے کا مغنی تھا۔ ٹی وی پر سنڈے ایوننگ کا پرائم ٹائم اس کے لیے وقف تھا۔

اس اذیت کی کیفیت میں بھی پیٹر اسٹون کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے ہونٹوں پر زہرخند مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ پیکنڈ ریٹ معاون گلوکاروں میں سے ایک تھا اور اس کے بیت بھی نہایت گھٹیا ہوتے تھے۔

گیبرائل گرجا کے تمام گلوکاروں میں سب سے بہترین اور واحد گلوکار تھا۔ وہی بی بی سی ٹی وی پر آتا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ اس کے ذہن کے پردے پر شبیہیں رقص کرنے لگیں۔ ویسی ہی شبیہیں جیسی کہ ریکا کے لیپ ٹاپ میں اسٹور تھیں اور یہ شبیہیں صرف ان دونوں تک محدود نہیں تھیں۔

اس کا شمار معاشرے کے ایک اہم ستون کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ وہ اخلاقی امتیاز کا نمونہ تھا... ایک مقدس مثال!

وہ اور ریکا جن حرکتوں میں ملوث تھے، اگر ان کی وہ ویڈیو فوٹیج منظرِ عام پر آجاتی... تو ماسک میں چہرہ چھپے رہنے کے باوجود وہ صاف طور پر پہچانا جا سکتا تھا۔

چند کلپس میں وہ "پرنٹم" گا رہا تھا۔ پھر طائفے کے لڑکے بھی تھے۔ بہ قول ریکا کے اس کا چرچا کرنے والے فرشتے... نوجوان اور بشاش چہرے والے۔ وہ اس کے گن اس لیے گاتے تھے کہ وہ اس پر اعتبار کرتے تھے، اس پر یقین رکھتے تھے۔ اب وہ ان حرکتوں کی وضاحت کیونکر کر سکے گا؟ بی بی سی پر تو کوئی اس کی وضاحت سمجھ نہیں پائے گا۔

بی بی سی!

اگر وہ لیپ ٹاپ کسی نے بی بی سی تک پہنچا دیا تو پھر کیا ہوگا؟ ان کا اپنا ہونے کے باعث یہ ایک بہت بڑی خبر ہو گی۔ وہ اس کے لیے کسی رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ انہیں اس کی ذات سے کوئی ہمدردی نہیں ہوگی۔

اس نے اپنے ذہن میں اناؤنسر کا تصور کیا جو اپنی

گمبھیر آواز میں سنجیدہ تاثرات کے ساتھ گیبرائل پریسٹ کے زوال کے بارے میں قوم کو بتا رہا تھا۔ پھر رپورٹرز کا خیال آگیا جو اس کی بیوی فیتھ کا سڑکوں پر پیچھا کر رہے تھے۔

جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، تب بھی رپورٹرز فیتھ کا تعاقب کیا کرتے تھے۔ اس وقت فیتھ ان پر قہقہے لگایا کرتی تھی۔ لیکن جب یہ راز افشا ہو جائے گا تو کیا فیتھ جب بھی اسی طرح قہقہے لگائے گی؟

وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ گیبرائل نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور بولا۔ ”ریکا!“

”مسٹر گیبرائل پریسٹ؟“ یہ ایک انجانی آواز تھی جسے گیبرائل پہچان نہ سکا۔ ”گیبرائل پریسٹ... یہ تم ہی ہو نا؟“

گیبرائل کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

”میرا نام جارج ووڈورڈ ہے۔ میں ’ڈی سن‘ اخبار میں سینئر انویسٹی گیٹیو رپورٹر ہوں۔ میری تحویل میں ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر ہے...“

گیبرائل کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے فون پیچھے پھینک دیا۔

’ڈی سن‘... یہ اس عوامی اخبار کے لیے کامیابی حاصل کرنے کا ایک بڑا موقع تھا۔ لوگوں کے بیے ایک آبرو باختہ ہیرو سے بہتر اور کیا خبر ہو سکتی تھی۔ یہ سب کچھ بے حد ظالمانہ تھا... بالکل ناجائز اور غیر منصفانہ!

وہ سب اس کے بچوں، اس کی ماں اور پوری فیملی کے پیچھے پڑ جائیں گے۔

اور خود اسے وہ سولی چڑھا دیں گے۔

تب اسے احساس ہوا کہ وہ کھڑا ہوا ہے اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ وہ واپس بیٹھ گیا۔ اسے قید ہو جائے گی، وہ ایک طویل عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ وہاں ہر قسم کے لوگ ہوں گے... اس کے ساتھ نہ جانے کیسا برتاؤ کریں۔ اسے ضرر پہنچائیں گے۔

ویل، وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا۔ کبھی نہیں۔ وہ اسے پکڑ نہیں پائیں گے۔ اس کے پاس اب بھی اپنی چوائس موجود ہے۔ اس تصور سے اس کے چہرے پر آنسو کا چشمہ بہہ نکلا۔ البتہ ذہنی طور پر اس نے خود کو آمادہ کر لیا تھا۔

وہ سیدھا اپنے گیراج میں گیا۔ اسے جس شے کی ضرورت تھی، وہ اسے وہاں مل گئی۔

منٹوں ہی میں اس نے رسّی کا پھندا تیار کر لیا۔ رسّی کا ایک سرا اس نے وہ چھت کے شہتیر سے باندھ دیا پھر وہ خود چھت کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور نیچے فرش کا اندازہ لگانے لگا جو اس حد تک نیچے تھا کہ اس کا مقصد حل ہو سکتا تو۔

پھر اس نے پھندا گلے میں ڈالا اور وہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

ریکا نے شیمپین کا گلاس اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھی کی جانب سیلیوٹ کے سے انداز میں لہرایا اور بولی۔ ”چیئرز!“

”چیئرز، سویٹ ہارٹ!“ پیٹر اسٹون نے اپنے گلاس میں سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور ایک پُرسکون آہ بھرتے ہوئے تکیے سے ٹیک لگا لی۔ ”بہت خوب صورت رہا!“

ریکا مسکرا دی۔ البتہ وہ اس بارے میں پر یقین نہیں تھی کہ پیٹر اسٹون کا اشارہ ان کے بھلوں پر پیسے کے ملاپ سے تھا یا اس میٹنگ سے جو وہ بی بی سی کے ساتھ کر کے واپس ہوا تھا... اور قدرے تذبذب کے بعد اس نے پرائم ٹائم کے مذہبی پروگرام کی حال ہی میں خالی ہونے والی سیٹ کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ یہ جگہ گیبرائل پریسٹ کی خودکشی کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔

”ذرا وہ آواز تو دہراؤ۔“ ریکا نے اصرار کیا۔

پیٹر اسٹون نے اس کی خواہش کی تعمیل میں ایک مخصوص لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”میرا نام جارج ووڈورڈ ہے۔ میں ’ڈی سن‘ اخبار میں سینئر انویسٹی گیٹیو رپورٹر ہوں۔ میری تحویل میں ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر ہے...“

پھر وہ دونوں بے ساختہ قہقہے لگانے لگے۔

ریکا کھڑی ہو گئی۔ اس نے سائڈ بورڈ پر رکھی ہوئی برف کی باسکٹ میں سے شیمپین کی بوتل نکالی اور دونوں خالی گلاس دوبارہ بھر لیے۔

پھر کچھ خیال آنے کے بعد اس نے اپنے لیپ ٹاپ کو کسی ضرر سے بچانے کے لیے سائڈ بورڈ سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

آپ بیلا رنگ

طلسم خواب

سلیم فاروقی

کے بتائیں فریبِ طلب میں کارِ جنوں
چلے تھے جس پہ وہ رستہ بکھرنے والا تھا

ہر شخص اپنی آنکھوں میں کوئی نہ کوئی خواب... دل میں امنگ اور آرزو کی لو ضرور روشن کرتا ہے... یہی خواب اور تمنائیں اور چاہتیں زندگی کو قائم و دائم رکھتی ہیں۔ لیکن... آنکھوں میں خواب... اور دلکش نظارہ نہ رہے تو زندگی بے پتوار ناؤ کے مانند سپرد دریا ہو جاتی ہے۔ ایک ایسے ہی مردم گزیدہ... ستم رسیدہ اور ٹھکرائے ہوئے نوجوان کی جگر خراش داستان

نازک جذبوں سے لبریز وہ محبت کرنے والوں کا عبرت اثر احوال

میرا ٹھکانا آج کل کراچی کا فٹ پاتھ ہے۔ سر پہ چھت کی جگہ گھنے پتوں والا ایک درخت ہے۔ فٹ پاتھ کے باسیوں کے لیے یہ ایک پُرتعیش جگہ ہے۔ یہاں قبضہ کرنے کے لیے مجھے بھی بہت پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ اب بھی کارپوریشن اور پولیس والے مجھ سے اس جگہ رہنے کا معقول نذرانہ وصول کرتے ہیں۔ میں نے یہاں کیسے قبضہ کیا، یہ الگ داستان ہے۔

آپ نے کراچی، لاہور اور تقریباً ہر بڑے شہر کے فٹ پاتھوں پر اس قسم کے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو دیکھا ہو گا۔ آپ کے لیے یہ منظر کوئی نیا تو کبھی نہیں ہوں

گے۔ کچھ لوگ بے روزگاری سے تنگ آ کر یہاں آ بستے ہیں، کچھ اپنی ناخلف اولاد سے ذلیل و خوار ہونے کے بعد یہاں پہنچتے ہیں لیکن میری کہانی ان سب سے مختلف ہے۔ میں نہ بے روزگاری سے تنگ آ کر یہاں پہنچا ہوں، نہ میری اولاد نے مجھے گھر سے نکالا ہے اور نہ کسی معاشی مجبوری نے مجھے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔ اپنی اس تباہی اور بربادی کا ذمے دار میں خود ہوں۔ میں آج بھی اگر اپنے گاؤں چلا جاؤں تو اس فٹ پاتھ پر لیٹنے والے بے شمار افراد کو کھلا سکتا ہوں۔ ان کی دوسری ضروریات پوری کر سکتا ہوں لیکن میں گاؤں جاؤں تو کس منہ سے جاؤں اور کیوں جاؤں؟ یہ سزا تو میں نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے۔

ٹھہریئے..... میں شروع سے آپ کو سناتا ہوں کہ میں کیا تھا اور اب کیا بن گیا ہوں۔ میرا نام دلاور خان ہے... چودھری دلاور خان! میں گجرات کے ایک بہت بڑے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہماری زمین تین سو مربع سے بھی زیادہ تھی۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی شہباز اور بہن زینت تھی۔

میرے بابا روایتی جاگیرداروں کی طرح اپنے مزارعوں پر ظلم اور جبر نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر مزارع کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے اور گاؤں کے ہر آدمی کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آتے تھے۔

انہیں تعلیم کا بھی شوق تھا۔ وہ خود تو یہ شوق پورا نہیں کر سکے تھے لیکن اپنی اولاد کو پڑھا لکھا کر اس شوق کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گاؤں کے اسکول سے پرائمری پاس کر کے قریبی تحصیل کے اسکول میں داخلہ لے لیا کیونکہ ہمارے گاؤں میں اس وقت تک کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔

ہمارے اسکول کے سامنے ہی لڑکیوں کا اسکول تھا۔ وہاں بھی زیادہ تر خوش حال اور روشن خیال زمینداروں اور جاگیرداروں کی بیٹیاں پڑھتی تھیں۔ کچھ لڑکیاں مزارعوں کی بھی تھیں لیکن وہ اپنے حلیوں اور رہن سہن سے صاف ظاہر ہو جاتی تھیں۔

میں ان دنوں آٹھویں کلاس میں تھا جب میں نے پہلی دفعہ ریشماں کو دیکھا۔ وہ اپنے تانگے سے اتر کر اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی تھے۔ وہ نہ صرف بلا کی حسین تھی بلکہ اس کی چال میں بھی ایک وقار تھا۔ اس وقت مشکل سے اس کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی

لیکن اپنی جسامت سے وہ سولہ سترہ سال کی لگتی تھی۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ کالی شال میں سے یوں جھانک رہا تھا جیسے بدلی میں سے چاند جھانکتا ہے۔ سیاہ چمکیلے بالوں کی ایک لٹ نہ جانے کیسے چادر کی قید سے آزاد ہو کر اس کے بائیں رخسار تک آ گئی تھی۔

میں بھی اسی وقت اپنے تانگے سے اترا تھا اور اسے دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی، پھر سر کو مخصوص انداز میں جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ وہ آگے بڑھی تو اس کی خوشامدی سہیلیوں نے اسے گھیر لیا۔

''چلیے چودھری صاحب!'' اکبر نے کہا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ہم گاؤں سے ایک ساتھ پڑھنے یہاں آئے تھے۔

''آں...'' میں نے چونک کر کہا۔ ''چلو، اسکول لگنے ہی والا ہے۔''

''ویسے یار! ایک بات بتا۔'' اکبر نے پوچھا۔ ''تو تو لڑکیوں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ گاؤں میں اس سے کہیں خوب صورت اور حسین لڑکیاں موجود ہیں جو تیرے ایک اشارے پر اپنی جان تک دے دیں، پھر اس مغرور سی لڑکی میں تجھے کیا خاص بات نظر آئی ہے کہ تو پتھر کا ہو کر رہ گیا؟''

''کچھ نہیں یار!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں تو اس کا طمطراق دیکھ رہا تھا۔ غرور سے اکڑی ہوئی گردن اور شاہانہ چال دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''اچھا اچھا!'' اکبر نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''اس میں زیادہ دلچسپی لینا بھی مت، وہ ہمارے دشمنوں کی بیٹی ہے۔''

''دشمنوں کی بیٹی!'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا وہ ملک اکرام کی بیٹی ہے؟''

''ہاں، وہ ملک اکرام ہی کی بیٹی ہے۔'' اکبر نے کہا۔

اسی وقت اسکول کا گھنٹہ بج گیا اور ہم سب قطاریں بنا کر اسکول کے احاطے میں اسمبلی کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اکبر کی سیٹ بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ میں سارا وقت ریشماں ہی کے تصور میں کھویا رہا جس کا مجھے ابھی نام تک معلوم نہیں تھا۔

اسکول سے واپسی پر نور دین تانگہ لے کر آ گیا تھا۔ رشید اور سرور بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں میرے محافظ تھے اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔

میں باہر نکلا تو میں نے ریشماں کے تانگے کو روانہ

ہوتے دیکھا۔ اس نے پھر بے نظر غائر مجھے دیکھا تھا پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔ اس کے دونوں محافظ تانگے کی اگلی سیٹوں پر تھے۔ ان ہی میں سے ایک تانگا بھی چلا رہا تھا۔ ریشماں تنہا پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی بوجھل قدموں سے اپنے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے چھوٹے چودھری! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میرے ایک محافظ رشید نے پوچھا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اور اکبر تانگے میں بیٹھ گئے۔ رشید اور سرور اگلی سیٹ پر نور دین کے ساتھ بیٹھے تھے۔

میں راستے بھر ریشماں ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ہمارے دشمنوں کی بیٹی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے بابا چودھری شاہنواز کی بھی کسی سے دشمنی ہو سکتی ہے۔ آج تک میں نے بابا سے اس دشمنی کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد میں نے یونہی سرسری انداز میں ان سے پوچھا۔ ''بابا! ملک اکرام سے ہماری دشمنی کیوں ہے؟''

بابا نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولے۔ ''بیٹا! یہ سوال اس وقت تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟''

''بابا! میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ تو کبھی سخت لہجے میں کسی سے بات بھی نہیں کرتے ہیں، کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچتے... پھر یہ دشمنی کیسی؟ آپ جیسے آدمی سے کسی کی اور کیوں دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''او یار دلاور... تم بھی کمال کرتے ہو۔'' شہباز نے کہا۔

وہ مجھ سے صرف ایک سال چھوٹا تھا اس لیے مجھ سے اسی طرح بے تکلف ہو کر بات کرتا تھا۔ بعض اوقات ہماری لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور اکثر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی تھی۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت بابا سے بات کر رہا ہوں، تم اپنی چونچ بند رکھو۔''

''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ جب تک کسی جاگیردار یا زمیندار کی کسی سے دشمنی نہ ہو، لوگ اسے جاگیردار مانتے ہی نہیں ہیں۔''

''تم خاموش نہیں رہ سکتے؟'' میں نے درشت لہجے میں

کہا۔

اس سے پہلے کہ جواب میں وہ کچھ کہتا، بابا نے کہا۔ ''بیٹا! یہ دشمنی تو کئی پشتوں سے چلی آ رہی ہے۔ میں تو دشمن نہیں بلکہ دوست بنانے کا قائل ہوں۔''

''لیکن بابا! دشمنی ہے کس بات پر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہماری کنوئیں والی زمین کے پاس اجاڑ و ویران زمین کا ایک ٹکڑا ہے۔ میرے دادا جی مرحوم، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، بہت ضدی آدمی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ زمین کا یہ ٹکڑا ہمارا ہے۔ ملک اکرام کا پردادا بھی آخر ملک تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ زمین کے اس ٹکڑے پر ہمارا حق ہے۔ اس نے علاقے کے پٹواری کے ذریعے کاغذات میں کچھ ہیر پھیر کرا لی۔ وہ ثبوت کے طور پر وہ کاغذات دکھاتا تھا۔

''اس جھگڑے کو نمٹانے کے لیے کئی دفعہ پنچایت بھی بیٹھی۔ پنچایت میں بھی ملکوں نے وہی جعلی کاغذات پیش کر دیے۔ دادا جی بھی ہٹ کے پکے تھے۔ انہوں نے محکمے سے پرانا ریکارڈ نکلوا لیا جس کی رو سے وہ زمین ہماری تھی۔ دادا جی نے یا ان کے بڑوں میں سے کسی نے زمین کا وہ ٹکڑا فروخت بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا کوئی ثبوت ہوتا۔ بس یہیں سے پنچایت نے ملک کے دعوے کو جھوٹا قرار دیا لیکن ملک نے پنچایت کا وہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب ہمارے پاس پکے کاغذ موجود ہیں تو پنچایت ہمارے خلاف فیصلہ دینے والی کون ہے؟''

''پنچایت تو اس زمانے میں بہت بااختیار ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے پنچایت کا فیصلہ کیوں نہیں مانا؟''

''ملک بہت ہٹ دھرم تھا۔ پھر یہ کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا زمیندار نہیں بلکہ جاگیردار تھا۔ پنچایت اس پر وہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔ پھر اس نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا کہ یہ مقدمہ عدالت میں ہے اور پنچایت چودھریوں نے بلائی تھی، میں نے نہیں۔''

''پھر... پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا۔'' بابا نے کہا۔ ''دادا جی نے بھی اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ ملکوں نے اپنی ملکیت پکی کرنے کے لیے زمین کے اس ٹکڑے کو آباد کرنا چاہا۔ دادا جی نے اس کی بھرپور مزاحمت کی۔ اس مزاحمت میں ہمارے تین آدمی اور ملکوں کے دو آدمی قتل ہوئے اور کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ بس پھر کھلی دشمنی کی ابتدا ہو گئی۔''

''لیکن بابا جان! ہمارے پاس سیکڑوں مربع زمین ہے

digestpk.blogspot.com

اور ملکوں کے پاس بھی زمین کی کمی نہیں ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا اگر انہیں دے دیا جاتا تو اتنی جانیں تو ضائع نہ ہوتیں۔

"دشمنی شاید اتنی نہ بڑھتی لیکن اسی دشمنی میں دادا جی مرحوم کے چھوٹے بھائی بھی قتل ہو گئے۔ پھر تو یہ دشمنی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی اور دونوں طرف سے لوگ مارے جانے لگے اور زخمی ہونے لگے۔ مقدموں پر مقدمے بنتے رہے اور وکیل اپنی جیبیں بھرتے رہے۔ تمہارے دادا جی نے ایک مرتبہ یہ دشمنی ختم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح ہٹ دھرم اور ضدی نہیں تھے۔ اس کوشش کو ملکوں نے ان کی کمزوری سمجھا پھر ہمارے بدخواہوں نے بھی ابا جی کو چڑھایا کہ اگر آپ نے ملکوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو نہ صرف علاقے سے آپ کی دہشت ختم ہو جائے گی بلکہ ملک کل کسی دوسری زمین پر بھی قبضہ کر سکتے ہیں۔"

"بابا تو بہت ٹھنڈے دماغ کے آدمی ہیں دلاور! میں ان ملکوں کو بتاؤں گا کہ دشمنی کیا ہوتی ہے۔" شہباز نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس سے پہلے تو ہمارے خاندان میں کوئی مرد ہی نہیں تھا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم دادا جی یا ان کے دادا جی سے زیادہ طاقتور اور ضدی ہو؟ تم تو ابھی بچے ہو۔ تم نے ابھی صرف خون خرابے کی باتیں سنی ہیں، کبھی خون خرابا دیکھا نہیں ہے۔"

"تم دونوں پھر لڑنے لگے۔" بابا نے کہا۔ "تم لوگوں کی آپس میں تو بنتی نہیں ہے، دشمنوں سے کیا خاک لڑو گے؟" بابا مسکرا کر بولے۔

"ایسی بات نہیں ہے بابا!" شہباز نے کہا۔ "آپس کی بات اور ہے۔ باہر تو اگر کوئی دلاور کو ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھ لے تو میں اس کی آنکھیں نکال لوں۔"

وہ تھا بھی ایسا ہی۔ پرائمری تک وہ بھی میرے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ اسکول میں اگر کوئی لڑکا مجھ سے ذرا بھی تیز ہی بات کرتا تو شہباز اسے بے دردی سے مارتا۔ آپس کی نوک جھونک اور لڑائی سے قطع نظر وہ مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔

"بابا! کیا آپ نے بھی یہ دشمنی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا! اس خون خرابے سے بچنے کے لیے میں نے برسوں پہلے ایک دفعہ کوشش کی تھی۔ ملک اکرام کا باپ، ملک احسان بہت ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ میں خود چل کر اس کی حویلی میں گیا تھا۔ لوگوں نے مجھے منع بھی کیا کہ ملکوں کے علاقے اور حویلی میں میرا جانا کسی بھی طور مناسب نہیں لیکن اس کے باوجود میں چلا گیا۔ ملکوں کے مزارع اور حویلی کے ملازمین بھی مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میرا اب وہاں سے زندہ لوٹنا محال ہے۔

"میں حویلی پہنچا تو اللہ بخشے ملک احسان کو... اس نے مجھے بہت عزت سے اپنے ساتھ بٹھایا۔ پہلے اچھی طرح میری خاطر مدارات کی پھر مسکرا کر بولا... ہاں چودھری اب بتا تو یہاں کیسے آیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ملک صاحب! میں اس دشمنی کو جڑ سے اکھاڑنے آیا ہوں جس کی بھینٹ نہ جانے اب تک کتنے انسان چڑھ چکے ہیں، کتنی عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ میں زمین کا وہ ٹکڑا آپ کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ اٹھارہ ایکڑ کے اس ٹکڑے نے اب تک اٹھارہ سے زائد انسانوں کا خون پی لیا ہے۔ اس کی قیمت سے بس گنا زیادہ مقدمات میں خرچ ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی اسی خون خرابے میں جتلا ہوں۔ اگر یہ دشمنی نہ ہوتی تو اب تک آپ کی اور ہماری زمینوں میں کئی مربعوں کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔"

"تو تو بالکل اپنے باپ کا الٹ ہے پتر شاہنواز!" چودھری احسان نے کہا۔ "میں نے بھی ایک دفعہ ایسی ہی ایک کوشش کی تھی لیکن تیرا باپ راضی نہیں ہوا۔"

"اب پرانی باتوں کو بھول جائیں ملک صاحب!" میں نے کہا۔ "میں اپنی خوشی سے زمین کا وہ ٹکڑا آپ کو دے رہا ہوں۔"

"اوئے چودھری!" اچانک ملک اکرام کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کس وقت وہاں آ گیا تھا۔ "تو ہمیں بھیک دے رہا ہے یا ہم پر احسان کر رہا ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے اکرام!" میں نے کہا۔

"ملک اکرام بول اوئے!" وہ بھنا کر بولا۔ اس کی عمر اس وقت بہ مشکل اٹھارہ سال تھی۔

دل تو میرا چاہ رہا تھا کہ اب وہاں سے اٹھوں اور چلا جاؤں۔

"اوئے کھوتے دے پتر!" ملک احسان نے کہا۔ "تجھے کس نے کہا ہے کہ بیچ میں دخل اندازی کر۔"

"چودھری!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کی باتوں کا برا مت کرنا۔ یہ ابھی جوانی کے جوش میں ہے۔"

"ابا جی!" ملک اکرام نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری ایک بات اچھی طرح سن لیں۔ ہمیں وہ زمین بھیک میں نہیں چاہیے۔ یہ بات اگر اسی وقت ہوتی جب جھگڑا شروع ہوا تھا تو خون خرابا نہ ہوتا۔ ان لوگوں نے پنچایت بلائی۔ اب کیس عدالت میں ہے اور ہم جیتنے والے ہیں تو یہ اپنی بے عزتی کے خیال سے مجبور ہو کر وہ زمین ہمیں تحفے میں دینا چاہ رہا ہے۔ ہم اپنا حق عدالت سے وصول کریں گے اور ڈنکے کی چوٹ پر وصول کریں گے۔"

اس کی باتیں سن کر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ "ملک اکرام! اب تو وہ زمین تمہیں کسی بھی قیمت پر نہیں ملے گی۔ چاہے عدالت میں دس سال تک پیشیاں بھگتنا پڑیں یا بیس سال تک! اور ہاں، میں خون خرابے سے بھی نہیں ڈرتا۔ تم نے شاید میری شرافت کو میری کمزوری سمجھ لیا ہے۔" یہ کہہ کر میں جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کی بہت بہت مہربانی ملک احسان صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ کی یہ خاطر مدارات مجھ پر قرض ہے۔ میں جلد ہی اس قرض کو چکانے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

"لیکن پتر... بات... تو سن... میں..."

"میں اس کی بات سنے بغیر ہی لوٹ آیا۔ باہر میرے دو وفادار بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں کوئی بات کیے بغیر اپنی گھوڑی پر بیٹھا اور برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔"

"سن لیا تم نے؟" شہباز نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہ ملک لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے کب مانتے ہیں۔ خیر، میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ زمین کیسے حاصل کرتے ہیں؟" یہ کہہ کر شہباز وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی کچھ دیر بابا کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر میں بھی اٹھ گیا۔

گاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن میں نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ شہباز البتہ ان معاملات میں طاق تھا۔ میں تو اسے بھی سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ حرکت غلط ہے۔ جس دن بابا کو تمہاری حرکتوں کا علم ہو گیا تو وہ تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے۔

شہباز نے پرائمری جیسے تیسے پاس کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے میں خوب دل لگا کر پڑھ رہا تھا لیکن پچھلے کچھ دن سے میری پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔

میں جب بھی کتاب کھولتا، مجھے اس کے ہر ورق پر ایک ہی چہرہ نظر آتا... ریشماں کا چہرہ!

اکبر میرا بہترین دوست اور ہم راز تھا۔ وہ مجھے سمجھاتا تھا کہ ریشماں کا حصول تیرے لیے ناممکن ہے۔ ملک اکرام کسی بھی قیمت پر اپنی بیٹی کا رشتہ تجھے نہیں دے گا۔ پھر تجھے تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ ریشماں بھی اس رشتے پر راضی ہوگی یا نہیں؟

"میرا دل کہتا ہے کہ ریشماں اس رشتے پر راضی ہو جائے گی۔" میں جواب میں کہتا۔

"دل کی باتوں میں مت آ دلاور!" اکبر کہتا۔ "یہ دل کبھی کبھی ایسے خواب دکھاتا ہے کہ بندہ کہیں کا نہیں رہتا۔"

"یار! تو اس بات کو چھوڑ۔" میں نے کہا۔ "تو یہ بتا کہ ریشماں سے رابطہ کیسے کیا جائے؟"

"وہ اسکول سے نکلے تو تو سیدھا اس کے پاس چلا جا اور کہہ دے... ریشماں جی! مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ بتایئے، میں کیا کروں؟" اکبر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بکواس کی تو میں تھپڑ مار دوں گا۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"یار! مجھے سوچنے کا کچھ وقت تو دے۔" اکبر بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "ویسے مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تیری نہیں تو میری موت ضرور ملک اکرام کے ہاتھوں لکھی ہے۔"

"اچھا، باتیں مت بنا۔" میں نے کہا۔ "کچھ سوچ!"

آخر اکبر نے ایک ترکیب ڈھونڈ ہی نکالی۔ اس نے ایک دن اسکول سے باہر نکل کر چھوٹی سی ایک بچی کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "بیٹا! آپ اتنی اکیلی کیوں کھڑی ہو... کیا آپ کی کوئی سہیلی نہیں ہے؟"

"میری کوئی بھی سہیلی نہیں ہے۔" بچی نے افسردگی سے کہا۔ "میرا بابا گاؤں کا موچی ہے۔ میں نے رو دھو کر اسکول میں داخلہ لیا ہے۔ بابا تو مجھے پڑھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔"

وہ اسکول پہلی کلاس سے لے کر میٹرک تک تھا۔ اکبر نے اس بچی سے پوچھا۔ "بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام رانی ہے۔" اس نے کہا۔

پھر اکبر نے اس بچی کو ایک نزدیکی دکان سے کھٹا ٹافیاں اور چاکلیٹ لا کر دیں اور کہا۔ "چلو، آج سے تم میری دوست ہو۔"

digestpk.blogspot.com

''مگر تم تو دو کے ہو؟'' رانی نے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' اکبر نے کہا۔ ''دوست تو دوست ہوتا ہے۔''

اس دن کے بعد سے وہ بچی نہ صرف اکبر سے بلکہ مجھ سے بھی بے تکلف ہوگئی۔

ایک دن اکبر نے مجھ سے کہا۔ ''دلاور! اب ہم اس بچی کے ذریعے ریشماں سے رابطہ کرسکتے ہیں۔''

''اس بچی کے ذریعے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''وہ تو سب کے سامنے بھانڈا پھوڑ دے گی۔''

''یار! ہر وقت عقل کے پیچھے لٹھ لے کر مت گھوما کر۔'' اکبر نے کہا۔ ''تو ریشماں کو ایک خط لکھ، اس میں اپنا حالِ دل کہہ دے۔ معاملہ آر یا پار کا ہے۔ اگر ریشماں نے تیری محبت کو قبول کرلیا تو بہت اچھا ہوگا لیکن اگر اس نے وہ خط اپنے باپ کو دے دیا تو سوچ لے کہ کتنا خون خرابا ہوگا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا یار!'' میں نے پریقین لہجے میں کہا۔ ''کیا تو نے ریشماں کی آنکھوں میں میرے لیے پسندیدگی کی جھلک نہیں دیکھی؟ کیا تو نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی ہے؟ وہ بھی ادا سے مسکرا کر پلکیں جھپکاتی ہے۔''

''میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تو خوب سوچ سمجھ لے۔ معاملہ اس کے برعکس ہوا تو اس کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار رہ۔''

''میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خط میں خود نہیں لکھوں گا بلکہ کسی سے لکھواؤں گا۔''

''کس سے لکھوائے گا؟'' اکبر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''کسی اور سے خط لکھوانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے بھی اپنے راز میں شامل کرنا۔''

''یہ خط تو لکھے گا۔ اپنی تحریر کچھ بگاڑ دینا تاکہ خدانخواستہ بات بگڑے تو میں یہ کہہ سکوں کہ یہ خط میں نے نہیں دیا۔''

''نہیں دلاور!'' اکبر نے کہا۔ ''اس طرح تو ساری آفت رانی پر آئے گی۔ ملک شاید تیرا تو کچھ نہ بگاڑ پائے لیکن رانی اور اس کے باپ کو زندہ دفن کرادے گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ خط تو تجھے خود ہی ریشماں تک پہنچانا ہوگا۔ تو نے ملک اکرام کی حویلی تو دیکھی ہے۔ تو وہاں کا جائزہ تو لے۔ پتا لگا کہ کبھی ریشماں اپنی چھت یا کھڑکی میں آتی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے لیے گھر سے بھی نکلتی ہوگی۔ وہ حویلی سے باہر نکلے تو تو موقع پا کر اسے خط تھما دینا۔''

''تیری بات دل کو لگتی ہے لیکن مجھے ملک اکرام کے گاؤں والے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔''

اچانک وہ چٹکی بجا کر بولا۔ ''ارے... سارا مسئلہ تو حل ہوگیا۔''

''کیسے حل ہوگیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کچھ مجھے بھی تو بتا۔''

''یار! وہ ہمارا کلاس فیلو ارشد ہے نا! وہ اس محلے میں رہتا ہے جہاں ملک کی حویلی ہے۔ ہم ارشد سے ملنے تو جاسکتے ہیں۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''یار! یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟''

''تیرے دماغ پر تو ریشماں سوار ہے... اور کون سی باتیں تیرے ذہن میں آتی ہیں جو یہ بھی آجاتی؟'' اکبر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے بہت محنت سے ریشماں کے لیے ایک خط تیار کیا۔ اسے لکھنے کے لیے بھی میں نے نہ جانے کتنے خط لکھے اور پھاڑ دیے۔ میں چاہ رہا تھا کہ خط کا مضمون کچھ ایسا ہو کہ اگر ریشماں کو برا بھی لگے تو وہ اسے اپنی ذات تک محدود رکھے۔ میں نے لکھا تھا۔ ''ریشماں جی، آداب! میں اکثر آپ کو اسکول کے گیٹ پر دیکھتا ہوں۔ شاید آپ نے بھی مجھے دیکھا ہو۔ آپ کے چہرے اور شخصیت میں نہ جانے کیسی کشش ہے جو مجھے آپ کی طرف کھینچتی ہے۔ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ جس دن آپ کو نہ دیکھوں، وہ پورا دن میرے لیے عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ اگر آپ کو میری یہ جسارت ناگوار گزرے تو خدارا اسے اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے نہ جانے کیوں امید ہے کہ آپ بھی مجھے برا نہیں سمجھتیں۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ صرف ہاں یا نہ میں جواب دے دیں۔ آپ کا ایک پرستار دلاور!''

اس خط کو میں نے بہت خوب صورت لفافے میں بند کیا۔ اس پر پرفیوم کا اسپرے کیا اور اسے لے کر... ملک اکرام کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

گزشتہ کئی دن سے میں اور اکبر ارشد سے ملنے کے بہانے وہاں جارہے تھے۔ ریشماں پانچ بجے کے قریب حویلی کی کھڑکی میں آتی تھی پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے لیے حویلی کے پچھلی دروازے سے نکلتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی ملازمہ بھی ہوتی تھی۔ وہ ریشماں کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اس لیے عموماً کچھ قدم پیچھے ہی رہتی تھی۔

ہم کچھ دیر پہلے اسی راستے پر جا کر کھڑے ہوگئے جہاں سے ریشماں گزرتی تھی۔ ریشماں سفید چادر میں لپٹی گھر سے باہر نکلی تو اس کے ساتھ ملازمہ بھی تھی جو حسبِ معمول چند قدم چلنے کے بعد پیچھے رہ گئی۔

اکبر مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ ''ماں! تم جانتی ہو کہ ارشد کا گھر کون سا ہے؟'' ملازمہ اس کی طرف مڑی تو میں نے سامنے آکر ایک دم ریشماں کو وہ خط دے دیا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ ریشماں پہلے تو جھجکی، پھر شاید ملازمہ کے خیال سے وہ خط لے لیا۔ اس وقت بھی مجھے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دکھائی نہیں دیے۔

''ارشد... وہ ملک غلام حسین کا بیٹا؟'' بڑھیا نے پوچھا۔ اکبر نے اثبات میں سر ہلایا تو بڑھیا نے کہا۔ ''وہ تو پچھلی گلی میں رہتا ہے۔''

میں اس وقت تک اپنا کام کرکے دوسری طرف نکل چکا تھا۔ اکبر نے بڑھیا کا شکریہ ادا کیا اور پچھلی گلی کی طرف گھوم گیا۔

میں بھی تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اکبر کے قریب پہنچا اور کہا۔ ''یار! تو نے بھی کیا کمال کی ترکیب نکالی ہے۔''

''اب دیکھو ریشماں کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔'' اکبر کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''اگر اس نے وہ خط اپنے باپ کو دے دیا تو...''

''وہ نہیں دے گی۔'' میں نے کہا۔ ''لڑکیاں عموماً ایسے معاملات میں بزدل ہوتی ہیں۔ پھر ان کی اپنی عزت کا سوال بھی تو ہوتا ہے۔ تو پریشان مت ہو۔ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ میرے خط کا جواب نہیں دے گی یا میری طرف دیکھنا چھوڑ دے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس سے زیادہ میں خود کو تسلی دے رہا تھا۔ میرا لہجہ کھوکھلا تھا۔

وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ نہ جانے ریشماں نے کیا سمجھا ہو؟ وہ میری محبت کا جواب محبت سے دیتی بھی ہے یا نہیں؟ کبھی میں دیکھتا کہ ریشماں میرے ساتھ کھیتوں میں، نہر کے کنارے گھوم رہی ہے۔ کبھی مجھے ملک اکرام دکھائی دیتا جو گولیاں برسا رہا ہے۔

ساری رات یونہی سوتے جاگتے گزر گئی۔ میں صبح اٹھا تو مجھے ہلکا ہلکا بخار تھا لیکن آج تو اسکول جانا بھی ضروری تھا۔

میں اور اکبر وقت سے کچھ پہلے ہی اسکول پہنچ گئے۔ ابھی اِکّا دُکّا لڑکیاں ہی آئی تھیں اور مختلف سمتوں سے آرہی تھیں۔ کچھ پیدل، کچھ تانگوں میں۔

اچانک مجھے ریشماں کا تانگا دکھائی دیا تو میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ چہرہ پسینے میں تر ہوگیا اور میرے جسم کا پورا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا۔

ریشماں اسی باوقار انداز میں تانگے سے اتری۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹانے کے بجائے مجھے سلام کیا۔ ممکن ہے اس نے واقعی چہرے سے بالوں کی لٹ ہی ہٹائی ہو لیکن مجھے ایسا ہی لگا جیسے اس نے مجھے سلام کیا ہو۔ اس کا تانگا روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا، اثبات میں سر ہلایا اور شرما کر جلدی سے اسکول کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔

اس کی اس حرکت سے مجھ پر تو گویا شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اکبر بھی بغور اس سارے معاملے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''او بھائی مجنوں!'' اس نے کہا۔ ''اب تو خوش ہو جا۔ تیری لیلیٰ نے تیری محبت قبول کرلی ہے۔''

بعد میں ہم نے رانی کو استعمال کیا۔ وہ میرے خط ریشماں کو اور اس کے خط مجھے پہنچانے لگی۔ وہ بھی اتنی رازداری سے یہ کام کرتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

آخر وہ دن بھی آیا جب ریشماں مجھ سے ملاقات پر رضامند ہوگئی۔

ہمارے گاؤں کے پیچھے کچھ قدیم مکانوں کے کھنڈرات تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ وہاں جنوں اور بھوتوں کا بسیرا ہے۔ لوگ دن میں بھی اس طرف جاتے ہوئے گھبراتے تھے مگر ریشماں اس معاملے میں بزدل نہیں تھی۔ وہ بہت بے خوفی سے ان کھنڈرات تک آجاتی تھی۔ ہم گھنٹوں مستقبل کی باتیں کرتے تھے۔

ایک دن ریشماں نے مجھ سے کہا۔ ''دلاور! تم نے کہا تھا کہ تم ملکوں اور چودھریوں کی دشمنی ختم کرنے کی کوشش کرو گے؟''

''ہاں، میں کوشش کر تو رہا ہوں۔ میں بابا کو تو منالوں گا لیکن تمہارے ابا جی بہت ہٹ دھرم ہیں۔ وہ مشکل ہی سے مانیں گے۔''

''وہ مشکل سے مانیں یا آسانی سے۔'' ریشماں نے

digestpk.blogspot.com

کہا۔ ”تمہیں ہر صورت میں انہیں منانا ہے ورنہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ریشماں! میں بھی تمہارے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا۔“

”پھر جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ ابا جی میٹرک کے بعد میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ریشماں نے کہا۔

”ابھی تو میٹرک کے امتحان میں ایک سال باقی ہے۔ ایک سال میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟“ میں نے اسے تسلی دی۔

ہماری ملاقاتیں اسی کھنڈر میں جاری رہیں لیکن میں اپنی اور ریشماں کے خاندان کی دشمنی ختم نہیں کرا سکا۔

میٹرک کے امتحان کے بعد ایک دن ریشماں آئی تو بہت اداس تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی اور بولی۔

”دلاور! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ابا جی نے میری شادی میرے چاچا کے بیٹے کے ساتھ طے کر دی ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہو رہا ہے۔ اب شاید میں تم سے ملنے بھی نہ آؤں۔“

”بس یہی تھی تمہاری محبت؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم تو بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، میں مر جاؤں گی۔ وہ دعوے اب کیا ہوئے؟“

”وہ خالی خولی دعوے نہیں تھے دلاور!“ ریشماں نے کہا۔ ”اگر تم کہو تو میں ابھی اپنی جان دے دوں گی۔ میرے جنازے کو کندھا دینے تو آؤ گے؟“ وہ ایک مرتبہ پھر بُری طرح رونے لگی۔

”ریشماں! رونے سے کام نہیں چلے گا۔ یوں تو تم ساری زندگی روتی رہو گی۔“ میں نے کہا۔

”کس زندگی کی بات کر رہے ہو تم دلاور! میں تم سے کہہ تو چکی ہوں کہ شادی سے پہلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں گی۔“

”ریشماں!“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ایک راستہ اور بھی ہے۔“

”اور کون سا راستہ بچا ہے؟“ ریشماں نے کہا۔

”اگر تم تھوڑی ہمت کرو تو ہم اب بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ گاؤں بلکہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دیں گے اور اپنی دنیا الگ بسا لیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ چلوں؟“ ریشماں نے کہا۔ ”اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کے بعد قتل و خون ریزی ہو گی، تمہیں اس کا بھی کچھ اندازہ ہے؟“

”جب دنیا والوں کو ہماری پروا نہیں ہے تو ہم ان کی پروا کیوں کریں؟“ میرے لہجے میں اس وقت خود غرضی تھی۔

”لیکن دلاور۔۔۔؟“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر تم میں اتنی جرأت ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے بھول جاؤ اور اپنے اس چچازاد سے شادی کر لو۔ حرام موت مرنے سے کیا فائدہ؟“

”میں روز جیوں گی اور روز مروں گی۔ اس لیے تو میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں۔“ ریشماں نے کہا۔

”اپنی جان دینے کے بجائے اپنی خوشیاں حاصل کرو ریشماں۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں، اگر تم میں اس کی ہمت نہیں ہے تو اور بات ہے۔“

ریشماں چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو یہی سہی۔ میں کل ہی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

”میں کل تمہاری حویلی کے پچھواڑے آ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے ہم ساتھ چلیں گے۔“

”نہیں، وہاں مت آنا۔ وہاں تمہارے لیے خطرہ ہو گا۔ میں کل رات یہیں آ جاؤں گی۔“ ریشماں نے کہا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ ریشماں دوسرے دن واقعی آ جائے گی لیکن وہ تو مجھ سے پہلے ہی اس کھنڈر میں موجود تھی۔

میں نے گھر سے چلتے وقت بابا کا بھرا ہوا پستول اور ایک دھار والی کلہاڑی بھی ساتھ لے لی تھی تاکہ کسی بھی خطرے سے نمٹ سکوں۔

ریشماں بھی اپنے ساتھ خاصی نقدی اور زیور لے کر آئی تھی۔ حالانکہ میں نے اس سے زیور اور نقدی لانے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے بابا کی جیب سے اور الماری سے تقریباً دس ہزار روپے نکال لیے تھے۔

ریشماں کالی شال میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی شال میں چھپا لیا تھا۔

ہم کھنڈر سے نکل کر اس پگڈنڈی پر چلنے لگے جو ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتی تھی۔ میں بہت محتاط تھا۔ یہ ملک اکرام کا علاقہ تھا۔ راستے میں ہمیں ملک اکرام کا کوئی آدمی بھی مل سکتا تھا۔ پتا بھی کھڑکتا۔۔۔ تو میں چونک اٹھتا تھا۔

ابھی ہم نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ کوئی گرج دار آواز میں چیخا۔ ”کون ہے، رک جاؤ۔“

میں اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ ریشماں بھی پتھر کے بت کی طرح اس شخص کو دیکھنے لگی۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ ملک اکرام کا خاص کارندہ تھا۔ مزارعوں پر ظلم کرنا اس کا شوق تھا اور وہ اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو قتل کر چکا تھا۔

وہ سائیکل پر سوار تھا اور اس وقت نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پہچان گیا اور گرج کر بولا۔ ”اوئے چودھری! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ اور یہ تیرے ساتھ کون ہے؟“ اس نے سائیکل روکتے ہوئے کہا۔

اس کے شانے سے رائفل بھی لٹک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سائیکل سے اتر کر اپنی رائفل سنبھالتا، میں نے پوری قوت سے کلہاڑی اس کے سر پر دے ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کی چیخ بھی حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ کلہاڑی نے اس کے سر کو لکڑی۔۔۔۔۔ کی طرح چیر دیا تھا۔ وہ چند لمحے تڑپا، پھر ساکت ہو گیا۔

ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اب اس کی سائیکل اٹھالی تھی اور ریشماں کو آگے بٹھا لیا تھا۔ یوں گھنٹوں کا سفر ہم نے منٹوں میں طے کر لیا۔

ریلوے اسٹیشن کی عمارت نظر آئی تو میں نے سائیکل کو وہاں سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا دیا اور ہم اسٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے کراچی کے دو ٹکٹ لیے اور احتیاط کے طور پر ریشماں کو عورتوں کے ڈبے میں بٹھا دیا۔

ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خریدے تھے اس لیے ہمیں بہت آسانی سے سیٹیں مل گئیں۔ ریل گاڑی میں ایک سہولت یہ بھی تھی کہ میں اپنی بوگی میں سے ریشماں کی بوگی میں جا سکتا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ میرے ڈبے کے تمام مسافر سو رہے تھے۔

میں تھوڑی دیر بعد ریشماں کی خبر گیری کو گیا تو وہ چونک کر بولی۔ ”دلاور! تم منہ دھو کر کپڑے بدل لو۔ تمہارے کپڑوں پر خون کے نشان ہیں۔“

میں اپنے ساتھ کپڑوں کا اٹیچی کیس بھی لایا تھا۔ میں نے گاڑی کے باتھ روم میں جا کر منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور پرانے کپڑوں کو گولا سا بنا کر اسے باہر اندھیرے میں اچھال دیا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ ٹکٹ لیتے وقت کلرک نے مجھ پر غور نہیں کیا ورنہ اسے بھی خون کے نشانات نظر آ جاتے۔

گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ میں اپنی سیٹ پر لیٹ گیا تاکہ کمر سیدھی کر سکوں۔ میرا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے مجھے نیند آ گئی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے آوازیں دے رہا ہو، میرا شانہ جھنجوڑ رہا ہو۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھے ریشماں کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے ریشماں! تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

”پچھلے اسٹیشن سے میری رشتے کی ایک پھوپی گاڑی میں چڑھی ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک آتی، میں پھرتی سے اٹھ کر تمہارے پاس آ گئی۔“

”گھبراؤ مت۔ اب تو سب کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ تم میرے ساتھ گھر سے نکلی ہو۔“

”لیکن ابھی تو خطرہ ہے۔“ ریشماں نے کہا۔ ”وہ اگر پولیس کو ہمارے بارے میں بتا دے تو ہم دونوں گرفتار ہو جائیں گے۔“

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت وہاں آ گئی اور بولی۔ ”ریشماں! تو کہاں جا رہی ہے اور یہ تیرے ساتھ کون ہے؟“

”پھوپی! تم پہلے میری بات سن لو۔“ ریشماں اسے ٹرین کے کھلے دروازے کی طرف لے گئی۔ میں بھی ان سے کچھ فاصلے پر تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”صاف صاف بتا کڑیے!“ پھوپی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تو میرے بھائی کی عزت کو بٹا لگا کر آئی ہے۔۔۔ اس کی عزت داغ دار کر کے آئی ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے پھوپی۔“ ریشماں نے کہا۔ پھر غیر محسوس طریقے سے کچھ آگے بڑھی تو وہ عورت مزید پیچھے کی طرف کھسک گئی۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

”پھر کیا بات ہے؟“ عورت نے ناگواری سے کہا۔

”بات یہ ہے کہ میں گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔“ ریشماں نے اطمینان سے کہا اور اچانک اس عورت کو گاڑی کے کھلے دروازے سے دھکا دے دیا۔

اس کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید اس عورت کو ٹرین سے گرتے کسی نے دیکھ لیا تھا اور زنجیر کھینچ

digestpk.blogspot.com

لی تھی۔ لیکن جب گاڑی روہڑی کے اسٹیشن پر پہنچی تو مجھے اطمینان ہوا کہ اس عورت کو گرتے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔

ریشماں نے کہا۔ ”ہم اب اس گاڑی سے نہیں جائیں گے بلکہ یہاں سے کسی دوسری گاڑی میں کراچی جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے کہ آج رات روہڑی ہی میں رک جائیں۔ کل یہاں سے روانہ ہوں گے۔“ میں نے کہا اور ہم لوگ اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئے۔

ریشماں نے ایک بے وقوفی یہ کی تھی کہ اپنا سارا زیور تو ایک پوٹلی میں باندھ لیا تھا لیکن سونے کی چوڑیاں دونوں ہاتھوں میں پہن لی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھ چھ چوڑیاں تھیں اور وزن میں کوئی بھی چوڑی ہلکی نہیں تھی۔ سونا اتنا مہنگا تو نہیں تھا جتنا آج کل ہے لیکن یہ ایسی دھات ہے جو ہر دور میں لوگوں کو بھلی ہی لگتی ہے۔

اسٹیشن سے باہر آ کر ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔

ہم سے کچھ فاصلے پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اپنے چہروں اور حلیوں سے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر مسلسل ریشماں کے ہاتھوں کی چوڑیوں پر تھی۔ وہ دونوں آپس میں کچھ کھسر پھسر بھی کر رہے تھے۔

میں نے زیادہ دیر وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور ریشماں کو لے کر اس ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

میں اس سے پہلے کئی دفعہ کراچی اور لاہور جا چکا تھا اس لیے مجھے زیادہ گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ میرے مقابلے میں ریشماں البتہ زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔

میں وہاں ٹیکسی کی تلاش میں کھڑا ہو گیا۔ لوگ اب بھی آتے جاتے ریشماں کو اور مجھے مشکوک نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان میں سے ہر گزرنے والے کی نظر ریشماں کی چوڑیوں پر تھی۔

میں نے سوچا یہاں کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ ہم چلتے رہیں، کوئی ٹیکسی ملی تو ہم اس میں سوار ہو جائیں گے۔

ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک ٹیکسی آئی اور ہمارے پاس آ کر رک گئی۔

ڈرائیور نے بہت مؤدب لہجے میں پوچھا۔ ”چودھری صاحب! کیا آپ کو ٹیکسی چاہیے؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو۔“

”تشریف رکھو سائیں، یہاں زیادہ اچھے ہوٹل نہیں ہیں۔ سکھر میں ایک دو اچھے ہوٹل ہیں، آپ بولو تو میں آپ کو سکھر لے چلوں؟“ وہ مقامی باشندہ تھا اور جھٹکے دار لہجے میں اردو بول رہا تھا۔

وہ ورزشی جسم کا مالک تھا لیکن چہرے پر مسکینیت تھی۔ میں تو اپنے سائے سے بھی بھڑک رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس ڈرائیور سے تو میں خود بھی نمٹ سکتا تھا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو، پھر سکھر ہی لے چلو۔“ پھر میں نے آہستہ سے ریشماں سے کہا۔ ”تم اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں اتار کر اپنی اٹیچی میں رکھ لو۔“

ڈرائیور بیک ویو مرر میں ہمیں ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چرائیں اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

ریشماں نے جلدی جلدی چوڑیاں اتاریں اور انہیں اٹیچی میں رکھ دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور اب نہ جانے کون سے علاقے سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانہ اور سناٹا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں بھی اکا دکا ہی چل رہی تھیں۔

چلتے چلتے ٹیکسی جھٹکے لینے لگی۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے بند ہو گئی۔

”لعنت ہو۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں اس میں کیا خرابی ہو گئی ہے۔“ وہ گاڑی سے اتر گیا اور اس کا بونٹ کھول کر انجن کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں ریشماں اور میں گاڑی ہی میں بیٹھے رہے۔

”اس منحوس کو بھی ابھی بند ہونا تھا۔“ ٹیکسی ڈرائیور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا پھر وہ بونٹ بند کر کے واپس آیا اور بولا۔ ”گاڑی کو دھکا لگانا پڑے گا۔“ وہ خود ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی کو دھکیلنے لگا۔ گاڑی خاصی بھاری تھی، پھر ہمارا وزن بھی تھا۔ وہ دو ہی منٹ میں ہلکان ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھہرو، میں بھی تمہاری مدد کرتا ہوں۔“

”ارے آپ کہاں تکلیف کریں گے چودھری صاحب!“

”او بھائی، اس میں تکلیف کیسی؟“ میں نے کہا۔ ”آخر ہمیں بھی تو منزل پر پہنچنا ہے۔“ میں دروازہ کھول کر نیچے اترا اور گاڑی کی پشت سے دھکا لگانے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی گاڑی سے باہر نکلا ہوا دھکا لگا رہا تھا۔ ریشماں البتہ گاڑی ہی

میں بیٹھی تھی۔

اچانک گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور اچانک اچھل کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر ٹیکسی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور ٹیکسی ایک زناٹے سے نکل گئی۔ میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ ”ٹھہرو... ٹھہرو... ٹھہر جاؤ۔“ لیکن اتنی دیر میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

میں دیوانہ وار ٹیکسی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس ٹیکسی میں میری زندگی، میری جان ریشماں بھی موجود تھی۔ میں اسے اتنی تکلیفیں اور پریشانیاں جھیل کر اس لیے تو نہیں لایا تھا کہ اس اجنبی شہر میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور اسے لے اڑے۔

میں نتیجے کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ گرتے وقت... میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ایک صاف ستھرے نرم بستر پر تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون سی جگہ تھی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ کسی اسپتال کا کمرا ہے لیکن اس کمرے میں ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ کمرا اسپتال کا ہے۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا۔ دروازے کے ساتھ دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ان کرسیوں میں سے ایک پر کوئی اجنبی بیٹھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

”میری طبیعت؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا ہوا تھا؟“

”آپ مجھے بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے۔ میں اتفاق سے وہاں سے گزر رہا تھا کہ مجھے آپ زمین پر پڑے دکھائی دیے۔ آپ کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے آپ کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور گھر لے آیا۔ میں نے آپ کے زخم کی مرہم پٹی کر دی ہے۔ کوئی ایسا خاص زخم نہیں ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کل شام تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”کل شام تک؟“ میں نے کہا۔ ”میرا ابھی اور اسی وقت جانا بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔“

پھر میں نے اسے بتایا کہ کیسے ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ویرانے میں لے گیا، گاڑی کو دھکا لگانے کے بہانے اس نے مجھے گاڑی سے اتارا اور خود ریشماں کو لے کر رفو چکر ہو گیا۔

”ریشماں...“ اس نے زیرِ لب دہرایا۔ ”کون ریشماں؟ کیا آپ کی بیگم بھی ساتھ تھیں؟“

”جی ہاں، میں نے ابھی بتایا ہے کہ میرے ساتھ ریشماں بھی تھی۔“

”یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور بہت بدمعاش ہیں چودھری صاحب!“ اس نے تاسف کا اظہار کیا۔ ”آپ ایسا کیجیے، مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کا حلیہ بتائیے۔ اگر آپ نے ٹیکسی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہوتا تو بہت آسانی ہوتی۔ روہڑی چھوٹا سا شہر ہے، سکھر اچھا خاصا بڑا شہر ہے۔“

واقعی اگر مجھے اس ٹیکسی کا نمبر یاد ہوتا تو ٹیکسی ڈرائیور فوراً ہی گرفتار ہو جاتا پھر اس نے جیب سے درد دور کرنے والی دو گولیاں نکالیں اور بولا۔ ”آپ آرام کریں، میں تھانے میں رپورٹ درج کرا کے ابھی آتا ہوں۔“

میں نے دونوں گولیاں پانی کے ساتھ کھائیں اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر لیٹ گیا۔

میرے اجنبی میزبان نے آنے میں دیر نہیں لگائی اور بولا۔ ”پولیس اسٹیشن بالکل نزدیک ہے۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر اور ایس ایچ او سے کہہ دیا ہے بلکہ باضابطہ رپورٹ درج کرا دی ہے کہ میرے ایک مہمان کو کسی بدمعاش ٹیکسی ڈرائیور نے نہ صرف لوٹ لیا بلکہ اس کی بیوی کو بھی اغوا کر کے لے گیا ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”آپ نے تو کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ تندوری نان، نہاری اور چکن قورمہ لے آیا اور بولا۔ ”اس وقت یہی مل سکا۔ یہ کھانا آپ کے شایانِ شان تو نہیں ہے لیکن اس وقت مجبوری ہے، آپ کو یہی کھانا پڑے گا۔“

”ارے، میں بھی کوئی سونے چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔ آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ پھر میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ میں نے سوچا کہ جسم میں توانائی ہو گی تو ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گا۔ میرے سر میں اب بھی شدید تکلیف تھی۔ میں نے اپنے میزبان کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھیے، میں بھی کتنا خودغرض ہوں۔ آپ میرے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں اور میں نے اب تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”ارے، میں آپ کے لیے کیا کر رہا ہوں۔ میری جگہ

digestpk.blogspot.com

کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔" اس نے انکساری سے کہا۔ "میرا نام سکندر ہے لیکن ایسا سکندر جس کے دونوں ہاتھ خالی تھا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"میرا نام دلاور ہے۔" میں نے کہا۔ "میری ساری نقدی، میری بیوی کا زیور ایک اٹیچی میں تھا۔ وہ اٹیچی کیس بھی ٹیکسی میں تھا۔ وہ بھی چلا گیا۔ اب تو میرے بھی دونوں ہاتھ بالکل خالی ہیں۔ جیب میں شاید چند نوٹ پڑے ہوں۔" میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو دس دس روپے کے چار نوٹ میرے ہاتھ میں آگئے۔ میں نے سکندر سے کہا۔ "فی الحال تو میرے پاس یہی کچھ ہے۔ ہاں، بعد میں، میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔"

"ارے دلاور صاحب! آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ اب میں اتنا بھی خالی ہاتھ نہیں ہوں کہ مہمان سے اس کے کھانے پینے کے پیسے وصول کروں۔ ویسے میں نے...... رپورٹ درج کرادی ہے۔ آپ کی بیگم اور ٹیکسی ڈرائیور کا حلیہ بھی لکھوا دیا ہے۔ امید ہے کہ پولیس جلد ہی انہیں تلاش کرلے گی۔"

میری دوسری رات بھی سکندر کے گھر گزری۔ رات کو اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ شاید میرے سر میں تکلیف زیادہ تھی یا پھر کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھلی تھی۔ دوسرے کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں حیران رہ گیا کہ رات کے اس پہر سکندر کس سے باتیں کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر آہستگی سے باہر نکلا تو سکندر کی زبان سے اپنا نام سن کر چونک اٹھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "یار! یہ دلاور تو اب بلائے جان بنتا جا رہا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"تو بھی تو اس نقدی اور زیور میں آدھے کا حق دار ہے۔ اب یہ تیرا دردِ سر ہے کہ تو دلاور سے کیسے جان چھڑاتا ہے۔" دوسری آواز سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میں یہ آواز پہلے بھی سن چکا ہوں۔

میں دبے قدموں آگے بڑھا اور سکندر کے دروازے کی درز سے اندر جھانک کر دیکھا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سکندر کے ساتھ وہی ٹیکسی ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا جو ریشماں کو لے کر فرار ہوا تھا۔

ڈرائیور اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ اس لڑکی کو بھی پہنچانا ہے۔ تو اس دلاور سے ہوشیار رہنا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا تو میں پھرتی سے اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے کمرے میں کوئی آیا ہو۔ میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو میں نے آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھا۔ وہ سکندر تھا اور شاید یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں سو رہا ہوں کہ نہیں۔ اپنا اطمینان کرنے کے بعد وہ کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر کھٹر پٹر کی آوازیں آئیں پھر خاموشی چھا گئی۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب سکندر سو گیا ہوگا تو میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ میرے پاس بابا کا بھرا ہوا پستول بھی تھا جو اس وقت میری جیب میں نہیں ہے۔ وہ پستول یقیناً سکندر نے نکالا ہوگا۔ میں نے سکندر کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا، وہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور بے آواز طریقے سے اس کے نزدیک رکھی ہوئی الماری کھول دی۔ الماری کے نچلے خانوں میں کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ میں نے وہ نوٹ اپنے قبضے میں لیے پھر میں نے الماری کے سب سے اوپری خانے کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں اپنا پستول نظر آگیا۔

میں نے وہ پستول اٹھایا اور الماری کے پٹ بند کر ہی رہا تھا کہ سکندر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کون ہے؟"

"تیری موت!" میں نے کہا اور پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے کہا۔ "تم تو مجھے مارنے کا سامان کر رہے تھے لیکن دیکھ لو، اب کس کی زندگی کے دن پورے ہوتے ہیں۔"

"لیکن میرا قصور تو بتاؤ۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"تمہارا قصور؟" میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم بھی اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھی ہو۔ بتاؤ وہ ٹیکسی ڈرائیور کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

"وہ... روہڑی ہی میں رہتا ہے اور اس کا نام... زمان ہے..... وہ....."

"ریشماں اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور وہ ڈرائیور اسے کہاں لے جانے کی بات کر رہا تھا؟"

"میں نے اگر کچھ بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اور تم نے اگر زبان نہ کھولی تو میں تمہیں زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔" میں نے اس کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا پھر پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر ٹریگر پر انگلی رکھ لی۔

سکندر کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا۔ وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔ "خدا کے واسطے مجھے مت مارنا۔ میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔"

"اب جلدی سے بولنا شروع کرو۔" میں نے کہا۔

"زمان، ریشماں کو گجرات لے جائے گا۔ وہاں کسی زمیندار سے اس نے ریشماں کا سودا کیا ہے۔"

"گجرات تو بہت بڑا شہر ہے، مجھے اس زمیندار کا نام درج چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اس زمیندار کا نام حاکم خان ہے۔" سکندر اب ریکارڈ کی طرح بج رہا تھا۔ "اس نے زمان کو ریشماں کے عوض پچاس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"مجھے بتاؤ کہ زمان اس وقت کہاں ملے گا؟" میں نے کہا۔

"زمان تو اب تک ریشماں کو لے کر گجرات روانہ ہو چکا ہوگا۔" سکندر نے کہا۔

"تم جس گاڑی میں مجھے یہاں لے کر آئے تھے، وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ گھر کے پچھلے حصے میں کھڑی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ گاڑی بھی دراصل میری نہیں ہے۔ ہمارے گینگ کے باس کی ہے۔"

"اچھا... تو تمہارا کوئی گینگ بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہمارا گینگ پانچ آدمیوں پر مشتمل ہے۔ میرے اور زمان کے علاوہ تین آدمی اور ہیں جو اسی قسم کی وارداتیں کرتے ہیں۔ چھٹا آدمی باس ہے۔ وہ بظاہر بہت معزز اور شریف آدمی ہے۔ سندھ کے اعلیٰ حلقوں تک اس کی رسائی ہے۔ ان تمام وارداتوں میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ ہم سے اپنے سیاسی مخالفین کو ٹھکانے لگوانے اور بم دھماکے کرانے کا کام بھی لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ہمیں پولیس سے بھی بچاتا ہے۔"

"اس کا نام بھی لگے ہاتھوں بتادو۔"

"اب تو میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا ہی دی ہے۔" سکندر رو دینے والے انداز میں بولا۔ "اب اس کا نام بھی چھپانے سے کیا فائدہ۔ وہ مجھے زندہ تو یوں بھی نہیں چھوڑے گا۔"

"تم پھر بہکنے لگے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنے باپ کا نام بتاؤ۔"

"اس کا نام وڈیرا علی نواز ہے۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "وہ دیکھنے میں جتنا شریف اور مہذب نظر آتا ہے، اتنا ہی ظالم ہے۔ وہ اپنے ہاریوں پر کتے چھوڑ دیتا ہے۔ اس نے اپنی نجی جیل بنا رکھی ہے۔ وہاں جو کوئی ایک مرتبہ قید ہو جائے، پھر مرنے کے بعد ہی وہاں سے نکلتا ہے۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے کہا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی میں گڑا دی۔ "اگر تم واقعی مسلمان ہو تو کلمہ پڑھ لو اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"خدا کے واسطے مجھے مت مارو... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟"

"یہی کہ زمان ریشماں کو گجرات لے گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تین تک گنوں گا پھر تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔"

"تمہیں گنتی گننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ریشماں بھی یہیں ہے سکھر میں۔ ہاں، زمان اب اسے علی نواز کے پاس لے کر روانہ ہو گیا ہوگا۔"

"علی نواز کا پتا بتاؤ۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"علی نواز حیدرآباد میں رہتا ہے۔ وہ رانی باغ کے نزدیک ایک بنگلے میں رہتا ہے۔ اس کا پتا تمہیں کسی سے بھی مل جائے گا۔"

"مجھے گاڑی کی چابی دو۔"

"ایک بات اور بتادوں۔" سکندر نے کہا۔ "علی نواز کے پاس کئی خوں خوار کتے ہیں جو لمحوں میں انسان کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے گارڈز بھی بہت خونخوار ہیں۔ وہ بات بعد میں کرتے ہیں، فائر پہلے کرتے ہیں۔" سکندر نے کہا۔

"اور کچھ رہ گیا ہے تو وہ بھی بتا دو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ بعد میں تمہیں موقع نہیں ملے گا۔"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اب میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے اور کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس بھی ہتھیار تو یقیناً ہوگا۔ بتاؤ تمہارے پاس کیا ہے... رائفل یا ریوالور؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میرے پاس بغیر لائسنس کا ایک ریوالور ہے۔" اس نے کہا۔ "جو میرے بیڈ کے نیچے ٹرنک میں رکھا ہوا ہے۔" میں ٹرنک دیکھنے کے لیے ایک دم بیڈ کے نیچے جھانکنے کے

digestpk.blogspot.com

لیے جھک گیا۔ یہی میری بھول تھی۔

میں جونہی نیچے جھکا، سکندر نے خاصی قوت سے میرے سر پر لات ماری۔ وہ اگر نگے پیر نہ ہوتا تو شاید میری کھوپڑی چٹخ جاتی۔ لمحے بھر کو میرا سر چکرایا تو اس نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر چھلانگ لگائی اور میرے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اب بولو، کس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اس کھلونے کے بل پر تم شیر بن رہے تھے نا؟''

''دیکھو سکندر! تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اگر تمہیں مارنا ہی ہوتا تو اب تک مار چکا ہوتا۔''

''لیکن میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' سکندر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اب تم کلمہ پڑھ لو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی انگلی پستول کے ٹریگر پر رکھ دی۔

میں نے اسی گھسی پٹی ترکیب سے کام لیا جو آج بھی بعض اوقات کام آجاتی ہے۔

میں نے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔ ''نہیں زمن! اسے گولی مت مارنا۔''

سکندر نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا، میں نے اس کے ہاتھ پر پانی سے بھرا ہوا جگ پھینک دیا جو اس کی بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

پستول ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔ میں اب اسے مزید مہلت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے جھپٹ کر پستول اٹھا لیا اور اس سے کہا۔ ''اب واقعی تم کلمہ پڑھ لو۔ اب تم نے اپنی موت کو خود دعوت دی ہے۔''

''دیکھو دلاور! میں تمہیں...''

میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی فائر کر دیا۔ گولی اس کے بائیں جانب دل کے مقام پر لگی۔ اس نے ایک ہچکی لی اور ایک دم ساکت ہو گیا۔ گولی شاید عین اس کے دل میں گھس گئی تھی۔

میں نے بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں واقعی ایک ٹرنک موجود تھا۔ میں نے وہ ٹرنک گھسیٹ کر نکال لیا۔ اس میں ایک ریوالور، اس کی بہت سی گولیاں، ایک ڈائری اور کافی نوٹ تھے۔ میں نے سب چیزوں پر قبضہ کیا اور ٹرنک کو دوبارہ بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں چونک اٹھا... تو گویا اس مکان میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔

میں نے دو تین گھنٹیوں کے بعد ریسیور اٹھا لیا اور کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہیلو!''

''کیا ہوا سکندر؟'' دوسری طرف زمان تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی۔

''اس مردود... دلاور نے... مجھے... زخمی کر دیا ہے... اور...'' میں نے ایسی اداکاری کی جیسے مجھے بولنے میں تکلیف ہو رہی ہو۔

''اچھا تم فکر مت کرو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ اور ہاں، دلاور اب کہاں ہے؟''

''وہ... مجھے... گولی... مارنے کے بعد... یہاں سے بھاگ گیا ہے۔'' میں نے کراہتی ہوئی اذیت ناک آواز میں کہا۔

''تم فکر مت کرو، میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر زمان نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر میں مکان سے باہر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا کہ زمان آئے تو میں اسے بھی قابو کر سکوں۔

دس منٹ سے بھی کم عرصے میں زمان کی ٹیکسی وہاں داخل ہوئی۔ اس نے پہلے محتاط انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیا پھر ''سکندر... سکندر'' پکارتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ وہ جونہی اندر داخل ہوا، میں بھی اس کی پشت پر پہنچ گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''بس زمان! تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ اب ریوالور پھینک دو ورنہ تمہاری کھوپڑی میں بھی سوراخ ہو جائے گا۔''

زمان گویا پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گیا۔

''تم نے سنا نہیں۔'' میں نے یہ کہہ کر سامنے والی دیوار پر ایک فائر کر دیا۔

زمان نے گھبرا کر ریوالور پھینک دیا۔

''اب اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے لگائے تو میں نے پھرتی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک چاقو، ریوالور کی گولیاں اور کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔

میں نے وہ سب چیزیں اپنے قبضے میں کیں اور اس سے کہا۔ ''اب میری طرف گھوم جاؤ۔''

تلاشی لینے کا یہ طریقہ میں نے کئی انگلش فلموں میں دیکھا تھا۔ پھر میں اسے یہ بھی جتانا چاہتا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی اناڑی سے نہیں پڑا ہے۔ میں نے اس کا ریوالور بھی اپنے

قبضے میں لے لیا تھا۔

"سکندر تو اپنی جان سے گیا۔ اب تم بتاؤ زندہ رہنا چاہتے ہو یا سکندر کے پاس بھیج دوں؟"

"تم نے... تم نے سکندر کو مار دیا؟" اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں اور اب تم نے سچ نہ بتایا تو تمہارا بھی وہی حشر کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے سکندر کے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سکندر کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

"تم نے تو واقعی اسے مار دیا؟" زمان نے کہا۔

"تم کیا اسے مذاق سمجھ رہے تھے؟ اب تم بھی سچ نہیں بولے تو..." یہ کہہ کر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" زمان نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"ریشماں کہاں ہے؟"

"ریشماں!" اس نے دہرایا۔

"ہاں ریشماں۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی جسے تم اپنی ٹیکسی میں لے کر بھاگ گئے تھے۔"

"وہ تو اب میری پہنچ سے بھی دور ہے۔"

"دیکھو زمان! اب تم بھی جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہی سکندر نے کہا تھا اور اپنی جان سے گیا۔ بتاؤ ریشماں کہاں ہے؟"

"میں اسے حیدرآباد بھیج چکا ہوں۔" زمان نے کہا۔

"نہیں، تم تو اسے کہیں اور لے جانے کی بات کر رہے تھے؟" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔ "میں نے تمہاری اور سکندر کی ساری بات چیت سن لی تھی۔"

"ہاں، پہلے اسے پنجاب لے جانے کا پروگرام تھا پھر مجھے حکم ملا کہ ریشماں کو حیدرآباد بھیج دوں۔"

"حیدرآباد میں کس کے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا سرپرست اور پشت پناہ وڈیرا علی نواز ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ ریشماں کو حیدرآباد بھیج دو۔ میں نے اس کے ایک آدمی کے ذریعے اسے حیدرآباد بھیج دیا۔"

"اب تمہاری جان بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "مجھے ریشماں تک لے چلو۔"

"وہاں تک پہنچنا ناممکن ہے دلاور!" زمان نے کہا۔

"ممکن اور ناممکن کو چھوڑو۔ تم صرف مجھے وہاں لے چلو، جہاں ریشماں کو بھیجا ہے۔"

"تمہیں اپنی جان دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر چلو۔" زمان نے کہا۔ "ایک تو وڈیرے کے گارڈ کسی بھی مشکوک آدمی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں دوسرے وڈیرے نے بہت خوں خوار قسم کے کتے بھی پال رکھے ہیں۔"

"تم چل رہے ہو یا..." میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

وہ فوراً باہر آ گیا اور آگے بڑھنے لگا پھر وہ ٹیکسی کی طرف گھوم گیا اور اسٹیئرنگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

میں بھی پھرتی سے عقبی نشست پر بیٹھ گیا کہ کہیں وہ پہلے کی طرح فرار نہ ہو جائے۔

میں نے اس سے کہا۔ "زمان! میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور تم نے ذرا بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بلاتامل گولی مار دوں گا۔ میں تو یوں بھی زندگی سے بیزار ہوں۔"

زمان تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

ہم لوگ حیدرآباد پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔

علی نواز کے بنگلے پر پہنچ کر میں نے زمان سے کہا۔ "زمان! علی نواز کے تمام گارڈز تمہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"ہاں، یہاں کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔"

"گارڈز میں سب سے زیادہ سینئر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سومرو۔" زمان نے جواب دیا۔ "نذیر سومرو۔"

"تم کسی بھی گارڈ سے اسے باہر بلانے کی کوشش کرو ورنہ..." میں نے ایک مرتبہ پھر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

زمان کی ٹیکسی بنگلے کے سامنے رکی تو زمان نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نذیر سومرو کو باہر بلایا اور گارڈ سے کہا۔ "سائیں سومرو کو بولنا کہ بہت ارجنٹ کام ہے۔ فوراً باہر آئے۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے، فوراً ہی واپس جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط جسامت کا آدمی باہر نکلا۔ میں ٹیکسی سے پہلے ہی باہر نکل کر اس کے پیچھے کی طرف چھپ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" سومرو نے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟ ایسا کون سا ضروری کام ہے؟" وہ اسٹیئرنگ سیٹ کی کھڑکی کے پاس جھکا ہوا زمان سے پوچھ رہا تھا۔

میں اچانک ٹیکسی کے عقب سے نکلا اور اپنا ریوالور سومرو کی گردن پر رکھ دیا۔ "آواز مت نکالنا سومرو ورنہ اس ریوالور کی ساری گولیاں تمہاری گردن میں اتار دوں گا۔"

"مگر بابا، تم ہو کون؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"زیادہ بکواس مت کرو، میری بات سنو صرف۔"

"ارے تو بابا سناؤ، ہم سن رہا ہوں۔" پھر وہ زمان سے مخاطب ہوا۔ "یہ تو کس پاگل کو لے کر آیا ہے؟"

میں نے جواب میں اس کی کمر پر اتنی زور سے گھٹنا مارا کہ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تو بکواس سے پرہیز کر۔ اور تو مجھے پاگل کہہ رہا ہے۔ اس پاگل پن میں اگر گھٹنے کے بجائے میرا ریوالور چل جاتا تو تیری یہ کدو جیسی کھوپڑی یہیں بکھر جاتی۔"

"ارے بابا تم ہے کون؟ اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

"اپنے سارے گارڈ کو باہر بلاؤ اور انہیں حکم دو کہ وہ اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جائیں۔"

"ارے تم کوئی پاگل تو نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ "میں اپنے آدمیوں کو باہر بلاؤں؟"

میں نے پھر اپنے گھٹنے سے اس کی کمر پر وار کیا۔ اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکل گئی۔ شاید وہ کمر کی تکلیف میں مبتلا تھا ورنہ اتنا ہٹا کٹا آدمی ایسی ضرب سے کراہ نہیں سکتا۔

"اب تو نے اگر مجھے پاگل کہا تو میں واقعی پاگل بن کر دکھا دوں گا اور یہاں تیری لاش پڑی ہوگی۔ مجھے تو اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے، اس لیے تو میں تیرے سب آدمیوں کو باہر بلا رہا ہوں۔"

"میں ان سب کو باہر کیسے بلا سکتا ہوں؟ وہ بنگلے کے مختلف حصوں میں ہیں۔ میرے پاس کوئی وائرلیس سیٹ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا۔

"میں گاڑی میں بیٹھوں... لیکن کیوں؟ تم جھلا تو نہیں ہو گیا ہے؟"

میں نے اس مرتبہ پوری قوت سے اس کی پشت پر اپنے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ گاڑی کے دروازے سے ٹکرا کر گر گیا لیکن فوراً ہی کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور اس کے لیے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اب یہاں سے نکلو۔" میں نے زمان سے کہا۔

"اب کہاں چلنا ہے؟" زمان نے پوچھا۔

"پہلے یہاں سے تو نکلو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

زمان نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"سومرو!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ علی نواز کے بچے ہیں؟"

"ہاں، صاحب کے تین بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔"

"ان کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بابا تم ہے کون؟ کبھی ہم سے بولتا ہے کہ..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی گردن پر گھونسا مارا تھا۔ "فالتو بکواس نہیں۔ میں نے جو کچھ پوچھا ہے، اس کا جواب دے۔"

"صاحب کی بیٹی بڑی ہے، دونوں بیٹے چھوٹے ہیں۔" سومرو نے جواب دیا۔

"بیٹی کی عمر بتا؟" میں نے پوچھا۔

"بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔" سومرو نے کہا۔

"وہ بچے کس اسکول میں پڑھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

سومرو نے گھور کر مجھے دیکھا پھر میرے تیور دیکھ کر بولا۔ "بیٹی تو سینٹ فلپ اسکول میں پڑھتی ہے۔ دونوں لڑکے ابھی گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول میں جاتے ہیں۔"

"اسکول کی چھٹی کب ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسکول کی چھٹی بجن ہونے والی ہے۔ میں ہی اسے لینے جاتا ہوں۔ تمہارے کو جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھو اور ہم کو جانے دو۔ اوئی مادری بہت پریشان ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ہم اسکول ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مادری کو اسی ٹیکسی میں گھر چھوڑ دیں گے۔"

"لیکن..."

میں نے پھر ریوالور کی نال اس کی طرف کی تو وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں وڈیرے علی نواز کی بیٹی کو اٹھا کر لے جاؤں گا اور پھر اس سے سودے بازی کروں گا۔ وہ ریشماں کو چھوڑ دے گا تو میں اس کی بیٹی کو چھوڑ دوں گا۔ اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ میں اس بچی کو رکھوں گا کہاں؟ میں تو خود اس شہر میں اجنبی تھا۔

پھر اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آیا کہ اس شہر میں اکبر کا اور میرا ایک مشترک دوست افضل رہتا ہے۔ افضل نوکری کی تلاش میں پہلے کراچی گیا تھا، پھر اسے حیدرآباد میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ اصل میں دوست تو اکبر ہی کا تھا، اس کی کسی خالہ یا ماموں کا بیٹا تھا۔ اسی کے توسط سے میری جان پہچان ہوئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ میں اکیلے

dgestpk.blogspot.com

قبضے میں لے لیا تھا۔

"سکندر تو اپنی جان سے گیا۔ اب تم بتاؤ زندہ رہنا چاہتے ہو یا سکندر کے پاس بھیج دوں؟"

"تم نے... تم نے سکندر کو مار دیا؟" اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں اور اب تم نے سچ نہ بتایا تو تمہارا بھی وہی حشر کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے سکندر کے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سکندر کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

"تم نے تو واقعی اسے مار دیا؟" زمان نے کہا۔

"تم کیا اسے مذاق سمجھ رہے تھے؟ اب تم بھی سچ نہیں بولے تو..." یہ کہہ کر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" زمان نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"ریشماں کہاں ہے؟"

"ریشماں!" اس نے دہرایا۔

"ہاں ریشماں۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی جسے تم اپنی ٹیکسی میں لے کر بھاگے تھے۔"

"وہ تو اب میری پہنچ سے بھی دور ہے۔"

"دیکھو زمان! اب تم بھی جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہی سکندر نے کیا تھا اور اپنی جان سے گیا۔ بتاؤ ریشماں کہاں ہے؟"

"میں اسے حیدرآباد بھیج چکا ہوں۔" زمان نے کہا۔

"نہیں، تم تو اسے کہیں اور لے جانے کی بات کر رہے تھے؟" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔ "میں نے تمہاری اور سکندر کی ساری بات چیت سن لی تھی۔"

"ہاں، پہلے اسے پنجاب لے جانے کا پروگرام تھا پھر مجھے حکم ملا کہ ریشماں کو حیدرآباد بھیج دوں۔"

"حیدرآباد میں کس کے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا سرپرست اور پشت پناہ وڈیرا علی نواز ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ ریشماں کو حیدرآباد بھیج دو۔ میں نے اس کے ایک آدمی کے ذریعے اسے حیدرآباد بھیج دیا۔"

"اب تمہاری جان بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "مجھے ریشماں تک لے چلو۔"

"وہاں تک پہنچنا ناممکن ہے دلاور!" زمان نے کہا۔

"ممکن اور ناممکن کو چھوڑو۔ تم صرف مجھے وہاں لے چلو، جہاں ریشماں کو بھیجا ہے۔"

"تمہیں اپنی جان دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر چلو۔"

زمان نے کہا۔ "ایک تو وڈیرے کے گارڈ کسی بھی مشکوک آدمی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں دوسرے وڈیرے نے بہت خوں خوار قسم کے کتے بھی پال رکھے ہیں۔"

"تم چلا رہے ہو یا..." میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

وہ فوراً باہر آ گیا اور آگے بڑھنے لگا پھر وہ ٹیکسی کی طرف گھوم گیا اور اسٹیئرنگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

میں بھی پھرتی سے پچھلی نشست پر بیٹھ گیا کہ کہیں وہ پہلے کی طرح فرار نہ ہو جائے۔

میں نے اس سے کہا۔ "زمان! میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور تم نے ذرا بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بلا تامل گولی مار دوں گا۔ میں تو یوں بھی زندگی سے بیزار ہوں۔"

زمان تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

ہم لوگ حیدرآباد پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔

علی نواز کے بنگلے پر پہنچ کر میں نے زمان سے کہا۔ "زمان! علی نواز کے تمام گارڈز تمہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"ہاں، یہاں کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔"

"گارڈز میں سب سے زیادہ سینئر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سومرو۔" زمان نے جواب دیا۔ "نذیر سومرو۔"

"تم کسی بھی گارڈ سے اسے باہر بلانے کی کوشش کرو ورنہ..." میں نے ایک مرتبہ پھر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

زمان کی ٹیکسی بنگلے کے سامنے رکی تو زمان نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نذیر سومرو کو باہر بلایا اور گارڈ سے کہا۔ "سائیں سومرو کو بولنا کہ بہت ارجنٹ کام ہے۔ فوراً باہر آئے۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے، فوراً ہی واپس جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط جسامت کا آدمی باہر نکلا۔ میں ٹیکسی سے پہلے ہی باہر نکل کر اس کے پیچھے کی طرف چھپ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" سومرو نے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟ ایسا کون سا ضروری کام ہے؟" وہ اسٹیئرنگ سیٹ کی کھڑکی کے پاس جھکا ہوا زمان سے پوچھ رہا تھا۔

میں اچانک ٹیکسی کے عقب سے نکلا اور اپنا ریوالور سومرو کی گردن پر رکھ دیا۔ "آواز مت نکالنا سومرو، ورنہ اس ریوالور کی ساری گولیاں تمہاری گردن میں اتار دوں گا۔"

"مگر بابا! تم ہو کون؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"زیادہ بکواس مت کرو، میری بات سنو صرف۔"

"ارے تو بابا سناؤ، ہم سن رہا ہوں۔" پھر وہ زمان سے مخاطب ہوا۔ "یہ تو کس پاگل کو لے کر آیا ہے؟"

میں نے جواب میں اس کی کمر پر اتنی زور سے گھٹنا مارا کہ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تُو بکواس سے پرہیز کر! تُو مجھے پاگل کہہ رہا ہے۔ اس پاگل پن میں اگر گھٹنے کے بجائے میرا ریوالور چل جاتا تو تیری یہ کدو جیسی کھوپڑی یہیں بکھر جاتی۔"

"ارے بابا! تم ہے کون؟ اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

"اپنے سارے گارڈز کو باہر بلاؤ اور انہیں حکم دو کہ وہ اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جائیں۔"

"ارے تم کوئی پاگل تو نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ "میں اپنے آدمیوں کو باہر بلاؤں؟"

میں نے پھر اپنے گھٹنے سے اس کی کمر پر وار کیا۔ اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکل گئی۔ شاید وہ کمر کی تکلیف میں مبتلا تھا ورنہ اتنا ہٹا کٹا آدمی ایسی ضرب سے کراہ نہیں سکتا۔

"اب تُو نے اگر مجھے پاگل کہا تو میں واقعی پاگل بن کر دکھا دوں گا اور یہاں تیری لاش پڑی ہوگی۔ مجھے تو اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے اس لیے تو میں تیرے سب آدمیوں کو باہر بلا رہا ہوں۔"

"میں ان سب کو باہر کیسے بلا سکتا ہوں؟ وہ بنگلے کے مختلف حصوں میں ہیں۔ میرے پاس کوئی وائرلیس سیٹ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا۔

"میں گاڑی میں بیٹھوں... لیکن کیوں؟ تم چریا تو نہیں ہو گیا ہے؟"

میں نے اس مرتبہ پوری قوت سے اس کی پشت پر اپنے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ گاڑی کے دروازے سے ٹکرا کر گر گیا لیکن فوراً ہی کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور اس کے لیے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اب یہاں سے نکلو۔" میں نے زمان سے کہا۔

"اب کہاں چلنا ہے؟" زمان نے پوچھا۔

"پہلے یہاں سے تو نکلو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

زمان نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"سومرو!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ علی نواز کے بچے ہیں؟"

"ہاں، صاحب کے تین بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔"

"ان کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بابا! تم ہے کون؟ کبھی ہم سے بولتا ہے کہ..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی گردن پر گھونسا مارا تھا۔ "فالتو بکواس نہیں۔ میں نے جو کچھ پوچھا ہے، اس کا جواب دے۔"

"صاحب کی بیٹی بڑی ہے، دونوں بیٹے چھوٹے ہیں۔" سومرو نے جواب دیا۔

"بیٹی کی عمر بتا؟" میں نے پوچھا۔

"بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔" سومرو نے کہا۔

"وہ بچے کس اسکول میں پڑھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

سومرو نے گھور کر مجھے دیکھا پھر میرے تیور دیکھ کر بولا۔ "بیٹی تو سینٹ فلپ اسکول میں پڑھتی ہے۔ دونوں لڑکے ابھی گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول میں جاتے ہیں۔"

"اسکول کی چھٹی کب ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسکول کی چھٹی بس ہونے والی ہے۔ میں ہی اسے لینے جاتا ہوں۔ تمہارے کو جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھو اور ہم کو جانے دو۔ اوی ماروی بہت پریشان ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ہم اسکول ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ماروی کو اسی ٹیکسی میں گھر چھوڑیں گے۔"

"لیکن..."

میں نے پھر ریوالور کی نال اس کی طرف کی تو وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں وڈیرے علی نواز کی بیٹی کو اٹھا کر لے جاؤں گا اور پھر اس سے سودے بازی کروں گا۔ وہ ریشماں کو چھوڑ دے گا تو میں اس کی بیٹی کو چھوڑ دوں گا۔ اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ میں اس بچی کو رکھوں گا کہاں؟ میں تو خود اس شہر میں اجنبی تھا۔

پھر اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آیا کہ اس شہر میں اکبر کا اور میرا ایک مشترکہ دوست افضل رہتا ہے۔ افضل نوکری کی تلاش میں پہلے کراچی گیا تھا، پھر اسے حیدرآباد میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ اصل میں دوست تو اکبر ہی کا تھا، اس کی کسی خالہ یا ماموں کا بیٹا تھا۔ اسی کے توسط سے میری جان پہچان ہوئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ میں آج تک

digestpk.blogspot.com

کم وقت میں افضل کو اتنے بڑے شہر میں کیسے تلاش کروں؟ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ لطیف آباد نمبر گیارہ میں رہتا ہے۔ میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ افضل لطیف آباد نمبر سات کے علاقے میں ایک بڑے جنرل اسٹور پر سیلز مین ہے۔

میں نے سب سے پہلے تو زمان سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ کیا۔

میں نے اس سے کہا۔ "نیشنل ہائی وے کی طرف چلو۔"

"نیشنل ہائی وے؟" زمان نے حیرت سے کہا۔ "تم کراچی جانا چاہتے ہو؟"

"میں کراچی نہیں بلکہ نواب شاہ جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں جب پہلے کراچی آیا تھا تو ٹرین واپسی میں نواب شاہ کے اسٹیشن پر ہی رکی تھی۔

زمان نے بے چون و چرا گاڑی کا رخ نیشنل ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔

شہر سے نکلنے کے بعد ہی درختوں اور خود رو جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں نے ایک پگڈنڈی دیکھ کر زمان سے کہا۔ "گاڑی ادھر موڑ لو۔"

میری تباہی کا ذمے دار وہی تھا۔ وہی ریشماں کو لے کر بھاگا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا تھا اور میرا خون کھول رہا تھا۔

گاڑی جونہی ایک سنسان علاقے میں پہنچی، میں نے زمان سے گاڑی روکنے کو کہا۔

اس نے گاڑی روک دی تو میں نے کہا۔ "اب نیچے اتر جاؤ۔"

"تت... تم... کیا کرنا... چاہتے ہو؟" زمان ہکلا کر بولا۔

"نیچے اترو۔" میں نے اس کی گدی پر بھرپور تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ گھبرا کر نیچے اتر گیا۔ سومرو یہ سب کچھ سہمے ہوئے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "سومرو! تم نے اپنی جگہ سے حرکت بھی کی تو میں بلا جھجک گولی مار دوں گا۔"

زمان نیچے اترا تو میں بھی نیچے اتر گیا۔ مجھے انہی لوگوں کی تلاش کے دوران میں بڑے پھل والا کمانی دار جو چاقو ملا تھا، میں نے جیب سے وہی چاقو نکال کر کھولا اور اچانک زمان کی پشت پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ سومرو کی طرف تھا اور دوسرے ہاتھ میں تیز دھار چاقو۔ میں نے انتہائی سفاکی سے وہ چاقو زمان کی گردن پر پھیر دیا۔ مجھے اس وقت اس پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس نے تو میری ریشماں کو مجھ سے جدا کیا تھا۔

زمان تھوڑی دیر تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر سومرو کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ شاید علی نواز نے اس کا تن و توش دیکھ کر اسے اپنے محافظوں میں شامل کیا تھا ورنہ وہ انتہائی بزدل آدمی ثابت ہوا تھا۔ وہ چاہتا تو مجھے اس وقت قابو کر سکتا تھا جب میں زمان کے گلے پر چھری پھیر رہا تھا۔ اس وقت میری ساری توجہ زمان کی طرف تھی لیکن وہ تو بچوں کی طرح سہا ہوا یہ منظر دیکھتا رہا۔

"اب اسٹیئرنگ پر تم بیٹھو اور گاڑی کا رخ دوبارہ حیدرآباد کی طرف موڑ لو۔" میں نے سومرو سے کہا۔

وہ لرزتا ہوا اسٹیئرنگ سیٹ پر کھسک گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی اور حیدرآباد کی طرف روانہ ہو گیا۔

"تم حیدرآباد میں کہاں رہتے ہو؟"

"میں پٹھان کالونی کی ہی آبادی میں رہتا ہوں۔ میرے بیوی بچے تو گوٹھ میں ہیں۔ پٹھان کالونی میں بھی صرف میرا کچھ سامان پڑا ہے... ورنہ میں سارا وقت تو بنگلے پر ہوتا ہوں۔ رات میں کسی وقت آ کر سو جاتا ہوں یا پھر بھی دن میں موقع مل جائے تو وہاں چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم ماروی کے اسکول چلو۔" میں نے کہا۔

اس نے گاڑی کا رخ موڑا اور اسٹیشن روڈ پر پہنچ گیا۔ اس کے ایک سرے پر ماروی کا اسکول تھا۔

وہاں بہت سی گاڑیاں اور رکشا کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ تانگے بھی تھے۔ ان کی وجہ سے سڑک بلاک ہو گئی تھی۔ ٹریفک کا ایک کانسٹیبل سڑک سے ٹریفک ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

چھٹی ہوئی تو لڑکیاں اور لڑکے ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

اچانک خوب صورت اور نازک سی ایک بچی باہر نکلی اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

سومرو نے اسے آواز دی۔ "اڑی ماروی!"

اس نے چونک کر سومرو کو دیکھا، پھر منہ بنا کر بولی۔ "بابا سائیں کی ساری گاڑیاں کہاں گئیں جو تم یہ ٹیکسی لے کر آئے ہو؟"

میں پچھلی نشست کے پائیدان میں دبکا ہوا تھا اور میرے ریوالور کا رخ سومرو کی طرف تھا۔

"اڑی! سائیں کے کوئی مہمان کراچی سے آ رہے ہیں۔ دو گاڑیاں تو وہاں گئی ہیں، تیسری گاڑی میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ آ کیں جلدی سے بیٹھیں۔"

وہ پچھلی نشست کی طرف بڑھی تو سومرو نے میری ہدایت کے مطابق کہا۔ "اڑی! پیچھے کی سیٹ خراب ہے۔ اس کے اسپرنگ نکلے ہوئے ہیں۔ آپ آگے ہی بیٹھ جائیں۔"

ماروی منہ ہی منہ میں سومرو کو برا بھلا کہتی ہوئی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے سومرو سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فی الحال ہم ماروی کو تمہارے پٹھان کالونی والے مکان میں لائیں گے۔ وہ گاڑی موڑ کر پٹھان کالونی کی طرف بڑھا تو میں نے اچانک گاڑی صاف کرنے کا ایک بڑا سا کپڑا اٹھا کر ماروی کے منہ پر پھینکا۔ وہ بری طرح چیخی اور بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

"خاموشی سے بیٹھی رہو۔" میں نے کہا اور اسی کپڑے سے ماروی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پھر میں نے اس کی سیٹ کھولی اور اسے اس حد تک پیچھے کی طرف جھکا لیا کہ وہ تقریباً لیٹ گئی۔ اب اسے باہر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر پٹھان کالونی کا علاقہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ سومرو نے مجھے یہی بتایا تھا کہ ہم دس منٹ کے اندر اندر پٹھان کالونی پہنچ جائیں گے۔

سومرو کا مکان آبادی کے سرے پر تھا۔ گلی کے نکڑ پر کچھ بچے کھیل رہے تھے لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں تھے۔ میں نے سومرو کو اترنے کا اشارہ کیا اور اس سے کہا کہ دروازہ کھولو۔

اس نے اتر کر مکان کا دروازہ کھولا تو میں بھی گاڑی سے باہر آیا اور ارد گرد کا جائزہ لے کر ماروی کو گاڑی سے گھسیٹ لیا اور لمحوں میں مکان کے اندر لے گیا۔

مجھے سومرو کی بزدلی پر اب واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ اس دوران میں اسے بہت سے موقع ملے تھے جب وہ مجھ پر قابو پا سکتا تھا لیکن وہ شاید زمان کا حشر دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا تھا۔

اس مکان میں دو کمرے تھے۔ وہیں کونے میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ میں نے سومرو سے کہا کہ اس چارپائی کی دوائن کھولو۔

پھر میں نے اسی رسی سے سومرو کے ہاتھ پیر باندھے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اسے ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

"کون ہو تم اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" ماروی نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

سومرو سے زیادہ بہادر اور جی دار تو وہ نازک سی لڑکی تھی جو ان حالات میں بھی خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھی۔

"دیکھو ماروی! اگر تم نے میری ہدایت پر عمل کیا تو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"لیکن تم ہو کون؟" ماروی نے پوچھا۔ اس نے ابھی تک اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمہارے بابا سائیں نے میری بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ وہ اسے چھوڑ دیں گے تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں بھی چھوڑ دوں گا۔" پھر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کے اندر لے گیا اور اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی۔

اس نے پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "تم صورت سے تو شریف آدمی لگتے ہو۔"

"میں شریف آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے باپ نے میری بیوی کو اغوا کر لیا ہے، اس لیے مجھے یہ کرنا پڑا۔"

"بابا سائیں نے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "انہوں نے تمہاری بیوی کو اغوا کر لیا ہے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو تم سومرو سے پوچھ سکتی ہو۔"

"اس سومرو سے تو اب میں بات بھی نہیں کروں گی۔ یہ کس بات کا گارڈ ہے۔ اس نے ایک دفعہ بھی مجھے بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ الٹا یہ اسکول سے مجھے یہاں لے کر آ گیا ہے۔"

"اب تم مجھے اپنے بابا سائیں کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ۔ وہ نمبر جس پر ان سے بات ہو سکے۔ میں ان سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔"

میں نے چارپائی کی بچی ہوئی رسی سے ماروی کے ہاتھ پیر باندھے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگا تو وہ بولی۔ "میرا منہ کھلا رہنے دو۔ میں کوئی آواز نہیں نکالوں گی۔ منہ میں کپڑا ٹھونسو گے تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"میں تمہاری بات پر یقین نہیں کر سکتا بے بی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے چیخ پکار کر کے لوگوں کو ادھر متوجہ کر لیا تو

digestpk.blogspot.com

میری ساری محنت اکارت جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے صحن میں آ گیا۔ دروازے کے پاس ہی تالا اور چابی موجود تھی۔ وہ تالا سومرو نے مکان کے داخلی دروازے میں ڈال رکھا تھا۔

میں نے دروازے کو تالا لگایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ میں وہاں کے راستوں سے واقف نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لطیف آباد نمبر گیارہ اور سات کہاں ہیں۔

میں نے سوچا، پہلے میں وڈیرے سے بات کر لوں پھر افضل کو تلاش کروں گا۔

میں نے ایک پی سی او کے سامنے ٹیکسی روکی۔ آپ حیران ہوں گے کہ مجھے ڈرائیونگ کیسے آتی تھی۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ بابا نے ایک گاڑی بھی خرید رکھی تھی۔ وہ بھی انہوں نے میری اور شہباز کی ضد پر خریدی تھی۔ ورنہ وہ تو گھوڑے پر سفر کرنے کے قائل تھے۔ اس گاڑی پر ہم دونوں نے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔

اس زمانے میں پی سی او کا بزنس اچھا خاصا تھا۔ اس وقت تک موبائل فون عام نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے دکانوں میں کچھ بنا رکھے تھے۔

میں ایک پی سی او کے خالی بوتھ میں داخل ہوا اور وہاں سے وڈیرے علی نواز کا نمبر ملا دیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے ایک بھاری اور باوقار آواز سنائی دی۔ "کون بول رہا ہے؟"

"میری بات غور سے سنو علی نواز!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "اس وقت تمہاری بیٹی ماروی میرے قبضے میں ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم!"

"تو کیا تمہیں اس وقت یقین آئے گا جب اس کی لاش کوڑے کے کسی ڈھیر پر ملے گی؟"

"نہیں نہیں، ایسا مت کرنا۔" وہ ایک دم نرم پڑ گیا۔ "ماروی کو تو سومرو اسکول لینے گیا تھا؟"

"سومرو بھی اب میری قید میں ہے اور اب مرنے ہی والا ہے۔"

"تم کتنی رقم چاہتے ہو؟" علی نواز نے کہا۔ "جتنی تم کہو گے تمہیں دوں گا۔ میری ماروی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے رقم کی ضرورت نہیں ہے علی نواز!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا سودا؟" وڈیرے نے پوچھا۔

"تم نے میری ریشماں کو مجھ سے چھینا ہے۔ اگر ماروی کی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو ریشماں کو میرے حوالے کر دو۔ میں ماروی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ہاں، پولیس کو اس معاملے میں ملوث مت کرنا ورنہ ماروی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔"

"میں پولیس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ بتاؤ تمہیں ریشماں کب چاہیے؟"

"ابھی اور اسی وقت۔" میں نے کہا۔

"وہ ابھی تو یہاں نہیں ہے، میں نے اسے اپنی زمینوں والی حویلی پر بھیج دیا ہے۔ میری زمینیں یہاں سے ساڑھے تین سو کلومیٹر دور ہیں۔ وہاں ٹیلی فون بھی نہیں ہے ورنہ میں ٹیلی فون کر کے ریشماں کو یہاں بلوا لیتا۔ وہاں آنے جانے میں وقت تو لگے گا۔"

"جتنا وقت چاہے لے لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ماروی تمہیں اسی وقت ملے گی جب تم ریشماں کو مجھے واپس کرو گے۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کیا، پی سی او والے کو پیسے دیے اور باہر آ گیا۔

میں نے اپنی ٹیکسی وہاں سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دی تھی۔ میں پی سی او سے نکل کر باہر آیا تو مجھے پولیس کی ایک موبائل وین نظر آئی۔ پولیس والے اس میں سے اتر کر پی سی او میں داخل ہو رہے تھے۔

میں نے ایک جگہ سے ڈبل روٹی، مکھن، جام جیلی اور انڈے خریدے۔ میں ماروی کو بھوکا رکھنا نہیں چاہتا تھا پھر ایک اور پی سی او سے علی نواز کو ٹیلی فون کیا اور کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ پولیس کو اس معاملے میں ملوث مت کرنا لیکن تم باز نہیں آئے۔ تم نے جان بوجھ کر دیر تک بات کی تا کہ پولیس والے اس پی سی او تک پہنچ جائیں۔"

"میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میری بات تو سنو...."

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پی سی او سے باہر آ گیا۔

میں نے ٹیکسی وہیں ایک جگہ پارک کر دی اور خود رکشا کے ذریعے پٹھان کالونی پہنچا۔

میں مکان کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔

پہلے میں ماروی کے کمرے میں گیا۔ اس کے منہ سے کپڑا نکال کر اس کا منہ کھولا تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔ میں نے پانی کا گلاس بھر کے اسے پلایا تو اس کی جان میں جان آئی۔ پھر میں نے اس کے لیے انڈے فرائی کیے، ڈبل روٹی پر مکھن لگایا اور جام کی شیشی لے کر اس کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ "لو، کچھ کھا لو۔ تم صبح سے بھوکی ہو گی۔"

اس نے بلا تکلف کھانا شروع کر دیا اور بولی۔ "تم آدمی برے نہیں ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ میں نے کس وجہ سے یہ حرکت کی ہے۔ یقین رکھو، تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"بابا سائیں سے بات ہوئی؟" اس نے کھاتے کھاتے پوچھا۔

"ہاں، ان سے میری بات ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے ریشماں کو اپنی زمینوں والی حویلی میں بھیج دیا ہے۔ اب وہ اسے وہاں سے لے کر آئیں گے۔"

"اس وقت تک تم مجھے یہاں قید رکھو گے؟"

"تم قید نہیں ہو، میری مہمان ہو۔ جیسے ہی ریشماں مجھے ملے گی، میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"ہماری زمینیں تو بہت دور ہیں۔" وہ مایوسی سے بولی۔ "وہاں آنے جانے میں تو صبح ہو جائے گی.... تو کیا رات بھر میں یہیں رہوں گی؟"

"مجبوری ہے ماروی!" میں نے کہا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو تمہارا باپ ریشماں کو کبھی میرے حوالے نہیں کرتا۔"

"تم بہت شدید خطرے میں ہو.... کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام دلاور ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کیسا خطرہ ہے؟ اور اگر خطرہ ہے بھی تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بابا سائیں کے تعلقات پولیس کے بڑے بڑے افسروں سے ہیں۔ وہ میرا سراغ نکال لیں گے۔"

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر پولیس نے کوئی کارروائی کی تو انہیں تمہاری لاش ملے گی۔"

"تو کیا تم مجھے مار دو گے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں تمہیں ماروں گا نہیں، میں نے انہیں صرف دھمکی دی ہے۔"

"ویسے وہ یہ دھمکی سن کر ڈر گئے ہوں گے۔ میرے بابا سائیں مجھے بہت چاہتے ہیں۔" اس نے فخر سے کہا۔

وہ کھا پی چکی تو میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگا تو وہ بولی۔ "پلیز، میرے منہ میں یہ غلیظ کپڑا مت ٹھونسو۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں کوئی آواز نہیں نکالوں گی۔

یہ رہا تمہارا کھانا ... چمچہ اور کانٹا میں نے تھما دیا
اب کھانا خود کھا لو!

مجھے تم سے ہمدردی ہے دلاور۔"

"ماروی بی بی! میں ایسا رسک نہیں لے سکتا۔ میری بھی مجبوری سمجھو نا۔" میں نے کہا۔

"اچھا اگر کپڑا ٹھونسنا ہی ہے تو میرے دوپٹے کو منہ میں ٹھونس دو۔" اس نے گلے میں اگریزی حرف وی کی طرح کا ایک دوپٹہ بھی پڑا ہوا تھا۔

میں نے وہ دوپٹا اتارا اور اسے ماروی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر میں نے اس کا منہ باندھ دیا۔

اس کے بعد میں سومرو کے کمرے میں گیا۔ وہ ہوش میں تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کا منہ کھولا اور اسے بھی کھانا پلا کر دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

میں نے اب افضل کو تلاش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مجھے اس مکان میں بھی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

ویسے بھی یہ مکان آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا اور ماروی بھی میرے ساتھ تعاون کر رہی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر باہر گیا اور کھانے پینے کا بہت سا سامان لے آیا تا کہ مجھے بار بار باہر نہ جانا پڑے۔

اس مکان کی دیواریں بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ میں نے مکان کو باہر سے تالا لگایا اور دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اب اگر کوئی آتا بھی تو مکان میں تالا دیکھ کر واپس چلا جاتا۔

میں نے اس رات جاگنے کا فیصلہ کیا۔ میں چائے کا سامان بھی لایا تھا۔ گیس کا چولہا اور برتن وہاں موجود تھے۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی، پھر ماروی سے پوچھے

digestpk.blogspot.com

لیے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں رات کو دودھ کا ایک گلاس پیتی ہوں۔

میں دودھ بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے دودھ گرم کر کے اس کا ایک گلاس بھرا اور ماروی کو پلا دیا۔

اس کے کمرے کی چارپائی آرام دہ نہیں تھی۔ اس میں شاید کھٹمل بھی تھے لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

رات کو میں کرسی ڈال کر ماروی ہی کے کمرے میں بیٹھ گیا کیونکہ باہر تو خاصی خنکی تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ ماروی بوسیدہ سے ایک کمبل میں جھلنگا سی ایک چارپائی پر پڑی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے افسوس بھی ہوا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو گئی۔ رسّی باندھنے سے اس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر نیل پڑ گئے تھے۔ میں نے اس کی رسیاں بھی کھول دیں۔ ماروی کو نیند ضرور آ گئی تھی لیکن اسے بے چینی بھی تھی۔ شاید چارپائی کے کھٹمل اسے کاٹ رہے تھے۔ وہاں پھر بھی تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے چین ہو کر بیدار ہو جاتی، پھر سونے کی کوشش کرتی تھی۔

میں نے سومرو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ فرش پر ایک دری پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر بھی ڈھونڈ کر میں نے ایک چیتھڑا سی رلی ڈال دی تھی۔ میں نے خود بھی ایک رلی اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی تھی۔

پھر شاید اس ٹوٹی پھوٹی بے آرام کرسی پر بیٹھنے کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے مکان میں کوئی کودا ہو۔ کودنے کی آواز بہت مدھم تھی۔ آنے والا یقیناً بہت احتیاط سے کودا ہوگا۔ فوراً ہی مجھے ”دھپ“ کی ایک دوسری آواز سنائی دی۔ گویا مکان میں کودنے والے دو افراد تھے۔

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

اسی وقت ماروی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تو اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ سمجھی کہ شاید میں اسے گولی مارنے والا ہوں۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کے ساتھ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ اس نے گہرے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر پگڑی تھی اور پگڑی ہی کے ایک سرے کو اس نے نقاب کے طور پر اپنے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔

اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی اندر آ گیا۔

انہوں نے ابھی تک مڑ کر نہیں دیکھا تھا، اس لیے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے اچانک گرج دار آواز میں کہا۔ ”اپنے ریوالور پھینک دو ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔“

ان میں سے ایک پھرتی سے پلٹا اور مجھ پر گولی چلا دی۔ میں اگر بروقت ایک طرف جھک نہ جاتا تو وہ گولی میرے سینے میں پیوست ہو جاتی لیکن گولی میرے دائیں بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس نے بے آواز فائر کیا تھا۔ شاید اس کے ریوالور پر سائلنسر بھی فٹ تھا۔

میں نے جواب میں نتیجے کی پروا کیے بغیر اس پر فائر کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی اور وہ تیورا کر گرا۔ دوسرے آدمی نے اس وقت تک صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا اور وہ بہت پھرتی سے میرے پیچھے آ گیا تھا۔

اس نے اپنے ریوالور کی نال میری گردن پر رکھ دی اور بولا۔ ”اپنا ریوالور پھینک دو اور جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو۔“

”میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں، میں تو خود غریب آدمی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے ورنہ یوں مکان کو باہر سے تالا لگا کر اپنے گھر میں کون رہتا ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”ارے… یہ تو وڈیرے علی نواز کی بیٹی ہے۔ چلو ایک تو ہیر ہاتھ آیا۔ اب میں وڈیرے سے اس کی بہت تگڑی رقم وصول کروں گا۔“

میرے ہاتھ سے ریوالور چھین کر وہ گویا میری طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اس نے گھسیٹ کر ماروی کو کھڑا کر لیا اور بولا۔ ”چل تو میرے ساتھ چل۔“

میں نے آہستگی سے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور اچھل کر پوری قوت سے اس پر وار کیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ میرا چاقو دستے تک اس کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ اس نے ایک ہچکی لی اور خاموشی سے ایک طرف لڑھک گیا۔

ماروی سہم کر مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔ ”وڈا دو بھائی! یہ دونوں مجھے ڈاکو لگ رہے ہیں۔ یہ لوگ پہلے دولت مندوں یا ان بچوں کو اغوا کرتے ہیں، پھر ان کے والدین سے بھاری رقم وصول کرتے ہیں۔ بعض بھی تو یہ لوگ تاوان لینے کے باوجود لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑتے۔“

ماروی ان دونوں کی لاشیں دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھی لیے میں نے دونوں لاشیں گھسیٹ کر سومرو کے کمرے میں پھینک دیں۔

میرے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے آئے تھے۔ پہلے میں نے خون کے چھینٹے دھوئے، پھر اپنے لیے اور ماروی کے لیے چائے بنائی اور ہم لوگ یوں باتیں کرنے لگے جیسے ابھی ابھی میں نے انسانوں کے بجائے دو چوہے مارے ہوں۔

باتیں کرنے میں ہی صبح ہو گئی۔ میں نے انڈے فرائی کر کے اپنے لیے اور ماروی کے لیے ناشتا تیار کیا پھر میں نے سومرو کو بھی ناشتا کرایا اور کسی پی سی او کی تلاش میں نکل گیا۔ نکلنے سے پہلے میں نے ماروی کے ہاتھ پیر تو باندھ دیے تھے، اس کے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک فون بوتھ نظر آ گیا۔ میں اس کے بوتھ میں داخل ہو گیا۔

میں نے علی نواز کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے علی نواز ہی کی آواز سنائی دی۔

”ہاں علی نواز! ریشماں کہاں ہے… وہ پہنچی یا نہیں؟“

”وہ یہاں پہنچ چکی ہے۔“ علی نواز کے لہجے میں مایوسی اور شکستگی تھی۔

”تو پھر بتاؤ، میں ماروی کو لے کر کہاں آؤں؟“ میں نے بے تابی سے کہا۔ ”تم جہاں بھی کہو گے، میں ماروی کو وہاں لے آؤں گا۔“

”وڈا دو!“ علی نواز نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”اب میں ریشماں کو نہیں لا سکتا۔“

”تو پھر اپنی بیٹی کو بھی بھول جاؤ۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”یہ بات نہیں ہے کہ میں اسے لانا نہیں چاہتا۔“ علی نواز نے کہا۔ ”وہ آ نہیں سکتی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے بپھر کر کہا۔ ”کھل کر بات کرو علی نواز!“

”وہ بات… اصل… میں… یہ ہے کہ… ریشماں نے… یہاں… پہنچنے کے بعد… خودکشی کر لی ہے۔“ علی نواز کا یہ ایک لفظ نشتر کی طرح میرا دل چیرتا چلا گیا۔

میں نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟ تم… جھوٹ… بول رہے ہو۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اب تم چاہو تو میری بیٹی کو ہلاک کر دو۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں، روک بھی نہیں سکتا۔“

میرے ہاتھ سے فون کا ریسیور چھوٹ گیا۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا اور کچھ لمحے تک تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔

فون کے ریسیور سے اب بھی علی نواز کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ ”ہیلو… ہیلو… وڈا دو… میری بات سن رہے ہو تم…“

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور گرتا پڑتا وہاں سے نکلا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے پٹھان کالونی تک پہنچا۔

ماروی نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”وڈا دو! بابا سائیں ریشماں کو لے آئے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”تو پھر تم مجھے گھر پہنچا دو۔“

”ہاں، میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میرے آنسو بہہ نکلے۔

”وڈا دو! کیا بات ہے؟“ ماروی تڑپ کر بولی۔ وہ رات کے واقعے کے بعد سے مجھے وڈا دو کہنے لگی تھی۔

”ماروی… ریشماں… اب اس دنیا میں… نہیں ہے۔“

”یہ… یہ… کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”ہاں، علی نواز نے یہی بتایا ہے کہ آج صبح اس نے خودکشی کر لی ہے۔“

”پھر… پھر آپ کیا مجھے چھوڑ دیں گے؟“

”میں تمہیں کیوں نہیں چھوڑوں گا؟“ میں نے کہا۔ ”تم زردست… تم نے مجھے بھائی کہا ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کے دشمن نہیں ہوتے۔“

”وڈا دو!“ اچانک ماروی نے کہا۔ ”کہیں یہ بھی بابا سائیں کی چال نہ ہو۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاں، یہ چال بھی تو ہو سکتی تھی۔ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا تھا؟

”آپ بابا سائیں سے کہیں کہ ریشماں جس حالت میں بھی ہے، اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں ماروی کو لے آؤں گا۔“

اس معصوم کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ میری خاطر اپنے باپ کے خلاف بات کر رہی تھی۔

”نہیں ماروی… علی نواز جھوٹ نہیں بول سکتا… وہ جانتا ہے کہ میں مشتعل ہو کر تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔“

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں ماروی کو خود علی نواز کے

digestpk.blogspot.com

لیے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں رات کو دودھ کا ایک گلاس پیتی ہوں۔

میں دودھ بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے دودھ گرم کر کے اس کا ایک گلاس بھرا اور ماروی کو پلا دیا۔

اس کے کمرے کی چارپائی آرام دہ نہیں تھی۔ اس میں شاید کھٹمل بھی تھے لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

رات کو میں کرسی ڈال کر ماروی ہی کے کمرے میں بیٹھ گیا کیونکہ باہر تو خاصی خنکی تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ ماروی بوسیدہ سے ایک کمبل میں جھلنگا سی ایک چارپائی پر پڑی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے افسوس بھی ہوا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو گئی۔ رسی باندھنے سے اس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر نیل پڑ گئے تھے۔ میں نے اس کی رسیاں بھی کھول دیں۔ ماروی کو نیند ضرور آ گئی تھی لیکن اسے بے چینی بھی تھی۔ شاید چارپائی کے کھٹمل اسے کاٹ رہے تھے۔ وہاں مچھر بھی تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے چین ہو کر بیدار ہو جاتی، پھر سونے کی کوشش کرنے لگتی۔

میں نے سومرو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ فرش پر ایک دری پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر بھی ڈھونڈ کر میں نے ایک میلی سی رلی ڈال دی تھی۔ میں نے خود بھی ایک رلی اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی تھی۔

پھر شاید اس ٹوٹی پھوٹی بے آرام کرسی پر بیٹھنے کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے مکان میں کوئی کودا ہو۔ کودنے کی آواز بہت مدھم تھی۔ آنے والا یقیناً بہت احتیاط سے کودا ہو گا۔ فوراً ہی مجھے "دھپ" کی ایک دوسری آواز سنائی دی۔ گویا مکان میں کودنے والے دو افراد تھے۔

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

اسی وقت ماروی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تو اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ سمجھی کہ شاید میں اسے گولی مارنے والا ہوں۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کے ساتھ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ اس نے گہرے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر پگڑی تھی اور پگڑی ہی کے ایک سرے کو اس نے نقاب کے طور پر اپنے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔

اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی اندر آ گیا۔

انہوں نے ابھی تک مڑ کر نہیں دیکھا تھا، اس لیے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے اچانک گرج دار آواز میں کہا۔ "اپنے ریوالور پھینک دو ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

ان میں سے ایک پھرتی سے پلٹا اور مجھ پر گولی چلا دی۔ میں اگر بروقت ایک طرف جھک نہ جاتا تو وہ گولی میرے سینے میں پیوست ہو جاتی لیکن گولی میرے دائیں بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس نے بے آواز فائر کیا تھا۔ شاید اس کے ریوالور پر سائلنسر بھی فٹ تھا۔

میں نے جواب میں نتیجے کی پروا کیے بغیر اس پر فائر کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی اور وہ تیورا کر گرا۔ دوسرے آدمی نے اس وقت تک صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا اور وہ بہت پھرتی سے میرے پیچھے آ گیا تھا۔

اس نے اپنے ریوالور کی نال میری گردن پر رکھ دی اور بولا۔ "اپنا ریوالور پھینک دو اور جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو۔"

"میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں، میں تو خود غریب آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے ورنہ یوں مکان کو باہر سے تالا لگا کر اپنے گھر میں کون رہتا ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "ارے... یہ تو وڈیرے علی نواز کی بیٹی ہے۔ چلو ایک تو میرے ہاتھ آئی۔ اب میں وڈیرے سے اس کی بہت تگڑی رقم وصول کروں گا۔"

میرے ہاتھ سے ریوالور چھین کر وہ گویا میری طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اس نے گھسیٹ کر ماروی کو کھڑا کیا اور بولا۔ "چل تو میرے ساتھ چل۔"

میں نے آہستگی سے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور اچھل کر پوری قوت سے اس پر وار کیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ میرا چاقو دستے تک اس کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ اس نے ایک ہچکی لی اور خاموشی سے ایک طرف لڑھک گیا۔

ماروی سہم کر مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔ "دلاور بھوتا! یہ دونوں مجھے ڈاکو لگ رہے ہیں۔ یہ لوگ پہلے دولت مندوں کے بچوں کو اغوا کرتے ہیں، پھر ان کے والدین سے بھاری رقم وصول کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ لوگ تاوان لینے کے باوجود لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑتے۔"

ماروی ان دونوں کی لاشیں دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھی اس لیے میں نے دونوں لاشیں گھسیٹ کر سومرو کے کمرے میں پھینک دیں۔

میرے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے آئے تھے۔ پہلے میں نے خون کے چھینٹے دھوئے، پھر اپنے لیے اور ماروی کے لیے چائے بنائی اور ہم لوگ یوں باتیں کرنے لگے جیسے ابھی ابھی میں نے انسانوں کے بجائے دو چوہے مارے ہوں۔

باتیں کرنے میں ہی صبح ہو گئی۔ میں نے انڈے فرائی کر کے اپنے لیے اور ماروی کے لیے ناشتا تیار کیا پھر میں نے سومرو کو بھی ناشتا کرایا اور کسی پی سی او کی تلاش میں نکل گیا۔ نکلنے سے پہلے میں نے ماروی کے ہاتھ پیر تو باندھ دیے تھے، اس کے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک فون بوتھ نظر آ گیا۔ میں اس کے بوتھ میں داخل ہو گیا۔

میں نے علی نواز کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے علی نواز ہی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں علی نواز! ریشماں کہاں ہے... وہ پہنچی یا نہیں؟"

"وہ یہاں پہنچ چکی ہے۔" علی نواز کے لہجے میں مایوسی شکستگی تھی۔

"تو پھر بتاؤ، میں ماروی کو لے کر کہاں آؤں؟" میں نے بے تابی سے کہا۔ "تم جہاں بھی کہو گے، میں ماروی کو وہیں لے آؤں گا۔"

"دلاور!" علی نواز نے مغموم لہجے میں کہا۔ "اب میں ریشماں کو نہیں لا سکتا۔"

"تو پھر اپنی بیٹی کو بھی بھول جاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں ہے کہ میں اسے لانا نہیں چاہتا۔" علی نواز نے کہا۔ "وہ آ نہیں سکتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے بپھر کر کہا۔ "کھل کر بات کرو علی نواز!"

"وہ بات... اصل... میں... یہ ہے کہ... ریشماں نے... یہاں... پہنچنے کے بعد... خودکشی کر لی ہے۔" علی نواز کا ایک ایک لفظ نشتر کی طرح میرا دل چیرتا چلا گیا۔

میں نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟ تم... جھوٹ... بول رہے ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اب تم چاہو تو میری بیٹی کو ہلاک کر دو۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں، روک بھی نہیں سکتا۔"

میرے ہاتھ سے فون کا ریسیور چھوٹ گیا، آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا اور کچھ لمحے تک تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔

فون کے ریسیور سے اب بھی علی نواز کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ "ہیلو... ہیلو... دلاور... میری بات سن رہے ہو تم..."

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور گرتا پڑتا وہاں سے نکلا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے پٹھان کالونی تک پہنچا۔

ماروی نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "دلاور! بابا سائیں ریشماں کو لے آئے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو پھر تم مجھے گھر پہنچا دو۔"

"ہاں، میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میرے آنسو بہہ نکلے۔

"دلاور! کیا بات ہے؟" ماروی تڑپ کر بولی۔ وہ رات کے واقعے کے بعد سے مجھے دلاور کہنے لگی تھی۔

"ماروی... ریشماں... اب اس دنیا میں... نہیں ہے۔"

"یہ... یہ... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں، علی نواز نے یہی بتایا ہے کہ آج صبح اس نے خودکشی کر لی ہے۔"

"پھر... پھر آپ کیا مجھے چھوڑ دیں گے؟"

"میں تمہیں کیوں نہیں چھوڑوں گا؟" میں نے کہا۔ "تم درست... تم نے مجھے بھائی کہا ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کے دشمن نہیں ہوتے۔"

"دلاور!" اچانک ماروی نے کہا۔ "کہیں یہ بھی بابا سائیں کی چال نہ ہو۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاں، یہ چال بھی تو ہو سکتی تھی۔ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا تھا؟

"آپ بابا سائیں سے کہیں کہ ریشماں جس حالت میں بھی ہے، اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں ماروی کو لے آؤں گا۔"

اس معصوم کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ میری خاطر اپنے باپ کے خلاف بات کر رہی تھی۔

"نہیں ماروی... علی نواز جھوٹ نہیں بول سکتا... وہ جانتا ہے کہ میں مشتعل ہو کر تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔"

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں ماروی کو خود علی نواز کے

digestpk.blogspot.com

پاس لے کر جاؤں گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ مجھے مار ہی دے گا تو مار دے۔ مجھے اب زندہ رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

میں نے دوسرے کمرے میں جاکر سومرو کو کھولا اور اسے بتایا کہ ہم علی نواز کے گھر چل رہے ہیں۔

پھر ہم تینوں وہاں سے نکلے۔ کچھ دیر بعد ہمیں ایک رکشا مل گیا۔ ان دنوں حیدرآباد میں ٹیکسیاں نہیں چلتی تھیں۔ رکشا میں بیٹھ کر ہم علی نواز کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ماروی نے کہا۔ ”اداولاور! اگر یہ جھوٹ ہوا تو میں خود بابا سائیں کے ساتھ رہنے سے انکار کر دوں گی۔ اگر انہوں نے آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں بھی ریشماں کی طرح اپنی جان دے دوں گی۔“

ہم بنگلے پر پہنچے تو وہاں موجود ہر شخص حیران رہ گیا۔ علی نواز کے گارڈز نے مجھے پکڑ لیا۔ ماروی نے چیخ کر کہا۔ ”اسے چھوڑ دو اور مجھے بابا سائیں کے پاس لے چلو۔“

ماروی کی آمد کی خبر سن کر علی نواز خود ہی بنگلے سے دوڑتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ماروی کو سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولا۔ ”ماروی بیٹا! تجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”بابا سائیں! اداولاور نے تو اپنی بہنوں کی طرح میری حفاظت کی ہے۔ اس نے میری خاطر دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے تاکہ آپ سے تاوان وصول کر سکیں۔“

وڈیرا علی نواز بری طرح رونے لگا۔ سارے نوکر اور گارڈز حیران تھے کہ ان کا پتھر دل اور سفاک مالک یوں آنسو بہا رہا تھا۔ ان لوگوں نے تو لوگوں کو ہمیشہ اس کے سامنے روتے گڑگڑاتے دیکھا ہوگا۔ ان کے لیے تو یہ منظر واقعی نیا اور انوکھا ہوگا۔

علی نواز آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور مجھے سینے سے لگا لیا پھر بولا۔ ”میں تو ریشماں کو آج صبح چھ بجے ہی لے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں سفر کی تھکن کی وجہ سے تھک گئی ہوں۔ نہا کر تازہ دم ہونا چاہتی ہوں۔ وہ تب دھو کر تیار ہوئی۔ پھر اس نے مجھ سے کاغذ اور قلم مانگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک خط مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اسے آپ دلاور کے حوالے کر دیجیے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں تم دلاور کے پاس پہنچ جاؤ گی، پھر اس خط کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں دلاور کے پاس شاید کبھی نہ پہنچ سکوں۔“

”اس کے اس جملے کا مطلب اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب ایک ملازمہ اس کے لیے ناشتا لے کر گئی تو چیختی ہوئی واپس آئی اور بولی۔ سائیں! اس لڑکی نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔“

میں خالی خالی نظروں سے علی نواز کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ریشماں اس وقت کہاں ہے؟“ مجھے اپنی آواز کنوئیں میں سے آتی محسوس ہوئی۔

”ریشماں اپنے کمرے میں ہے۔“ علی نواز نے کہا۔ ”میں ایسی لڑکیوں کو کبھی اپنے گھر نہیں لاتا تھا۔ میری بیوی اور بچوں کو علم نہیں تھا کہ ان کا باپ ایسا ہو سکتا ہے۔ ریشماں پہلی لڑکی ہے جس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ وہ بھی محض ماروی کی خاطر! ماروی کی ماں تو ماروی کے صدمے سے اب تک بے ہوش ہے۔ اسے صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔“

ریشماں کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی کمرے کے بیڈ پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے چادر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ نہائی دھوئی، تروتازہ اور کھلے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کی لاش سے لپٹ کر بے اختیار بلک بلک کر رونے لگا۔ جس کی خاطر میں نے گھر، بہن بھائی، ماں باپ چھوڑے، اپنا گاؤں چھوڑا، آج وہی مجھے چھوڑ گئی تھی۔ اب میرے لیے اس زندگی میں کیا رہ گیا تھا۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے چونک کر دیکھا، وہ ماروی تھی اور میری طرح وہ بھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اداولاور! حوصلہ کرو۔ تم تو بہت ہمت والے ہو، بہت بہادر ہو۔“

”ہاں ماروی! میں بہت ہمت والا تھا۔ کاش کہ میں بزدل ہوتا تو ریشماں آج زندہ ہوتی۔ میں اسے گاؤں سے لے کر نکلنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔“ پھر مجھے خیال آیا کہ ریشماں نے علی نواز کو میرے لیے کوئی خط دیا تھا۔

میں نے علی نواز سے کہا۔ ”ریشماں نے میرے لیے کوئی خط دیا تھا۔ وہ مجھے دے دو۔“

علی نواز نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے خط لے کر کہا۔ ”اب تم چاہو تو پولیس کو بلاؤ اور مجھے قانون کے حوالے کر دو۔“

”ایسا نہیں ہوگا ادا!“ ماروی نے کہا۔ ”میں نے تمہیں ادا کہا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

علی نواز نے چونک کر ماروی کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

میں نے ریشماں کا دیا ہوا خط کھول لیا۔ وہ ریشماں ہی کی تحریر تھی۔ میں تو اس تحریر کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”دلاور! ہماری تباہی کا ذمے دار اور کوئی نہیں بلکہ تمہارا جگری دوست اکبر ہے۔ اکبر شروع ہی سے مجھ پر بری نظر رکھتا تھا۔ اسی نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ تم ریشماں کو لے کر کراچی چلے جاؤ۔ جب ہم گاؤں سے نکلے تو وہ بھی سائے کی طرح ہمارے ساتھ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تم مجھے گاؤں سے نکال لو... تو وہ تمہیں بھی ٹھکانے لگا دے اور مجھے حاصل کر لے۔ اس میں خود تو اتنی جرأت تھی نہیں کہ میرے ابا جی سے نظریں ملا سکتا۔ جب ہم کراچی کی گاڑی میں سوار ہوئے تو وہ بھی اسی گاڑی میں تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے مجھے خود بتائی تھیں۔ وہ ہمیں روہڑی پر اتارنا چاہتا تھا۔ اگر پھوپی صغراں نہ ملتیں تو اکبر شاید کوئی اور چال چلتا لیکن اس کا منصوبہ تو خود بہ خود پورا ہو رہا تھا۔ ہم روہڑی پر اتر گئے۔ وہاں اس کا ایک دوست ٹیکسی لے کر پہلے ہی موجود تھا۔ میں تو عمر میں پہلی دفعہ گاؤں سے نکلی تھی۔ تم تو کراچی اور لاہور جاتے رہتے تھے۔ تم نے بھی خیال نہیں کیا کہ روہڑی میں ٹیکسیاں نہیں چلتیں۔ ٹیکسی ڈرائیور زمان، اکبر ہی کا آدمی تھا۔ اس نے مجھے اغوا کیا اور اکبر تک پہنچا دیا۔ میں اکبر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس منحوس نے مجھے تسلی دی کہ اب میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر میں دلاور کو بھی لے آئیں گے۔ اسی دوران میں اس کا ایک ساتھی سکندر وہاں آ گیا۔ اکبر اس وقت کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ سکندر اور زمان آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے، پھر سکندر نے کہا کہ وڈیرے کو میں پسند آؤں گی۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ لے تو پچاس ہزار دے دے گا۔ میں ان کی بات سمجھی نہیں کہ وہ میرے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ پھر اکبر آیا تو ان لوگوں نے اسے کچھ رقم دے کر شہر بھیج دیا کہ تم شادی کے لیے کچھ سامان تو لے آؤ۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ اس دوران میں سکندر تمہیں وہاں سے اٹھا کر لا چکا تھا۔ اسے تم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ اس نے کہا تھا کہ تم اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو، وہ تمہارے باپ سے سودے بازی کرکے کچھ رقم اینٹھ سکے گا۔ ان دونوں نے مجھے خود ہی وہاں سے نکالا اور زمان مجھے لے کر حیدرآباد روانہ ہو گیا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ دلاور تمہاری تلاش میں حیدرآباد پہنچ

غالب محلہ

تاشقند کے اردو داں صحافی دادا خاں نوری مجھے شہر کا وہ محلہ دکھانے کے لیے بے تاب تھے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب سے موسوم ہے اور مرزا غالب محلہ کہلاتا ہے... اسی محلے میں غالب کے نام پر ایک نئی مسجد بھی تعمیر ہو رہی ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بادہ خوار غالب کے نام پر مسجد تعمیر کرکے غالبا ازبکستان کے لوگ غالب سے عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ انہیں ثواب جاریہ بھی پہنچانا چاہتے ہیں۔ اصل میں تاشقند والوں کو مرزا غالب کی یہ بات بے پناہ بھاتی ہے کہ وہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو ازبک کہتے تھے۔

دلی میں، جہاں غالب نے آنکھ کھولی اور ساری زندگی تنگ و دو اور مشقِ سخن میں بتا دی، شاید ان کے نام پر نہ تو کوئی سڑک ہے اور نہ کوئی محلہ اور ادھر پاکستان میں جہاں اردو داں لوگ اٹھتے بیٹھتے غالب کے شعر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں، اگر میں غلط نہیں تو کہیں بھی نہ تو غالب کے نام پر کوئی گلی ہے نہ کوئی کوچہ ہے اور نہ کوئی بستی۔

گدھا ٹیکس

دادا خاں نوری کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب خروشیف کے دور میں حکومت نے دیہات میں گدھوں پر ٹیکس عائد کیا تھا۔ ایک گدھے کے دام اس وقت پچاس روبل تھے لیکن ٹیکس ان پر ایک سو روبل فی گدھا لگایا گیا تھا۔

لوگوں نے اس ٹیکس سے تنگ آکر اپنے سارے گدھے سڑکوں پر چھوڑ دیے... کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ دادا خاں نوری کہہ رہے تھے کہ ایسا لگتا ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب سب لوگ اپنی کاریں سڑکوں پر چھوڑ دیں گے، گدھوں کی طرح۔

آصف جیلانی کی ”وسط ایشیا۔ ایک ادب پارہ“ کراچی سے دوروز ستمبر کا انتخاب

digestpk.blogspot.com

گیا ہے۔ اس نے مجھے وڈیرے کے حوالے کر دیا۔ وڈیرے نے ہوس زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مجھے زمینوں والی کوٹھی میں لے جائیں پھر کچھ دیر بعد وہاں علی نواز بھی پہنچ گیا اور۔۔۔ اس نے۔۔۔ اس نے۔۔۔ تمہاری ریشماں کو۔۔۔ روند ڈالا، پامال کر دیا۔۔۔ اب میں تمہارے قابل نہیں رہی ہوں اس لیے اپنی جان دے رہی ہوں۔ اتنی ذلت کے بعد زندہ رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیفیں اور دکھ اٹھانا پڑے ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ تمہاری اور صرف تمہاری ریشماں۔۔۔ جو کبھی تمہاری نہیں بن سکی۔"

خط پڑھ کر دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ میں تو اکبر کو اپنا دوست، اپنا ہمراز سمجھتا تھا۔ اس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ وہ خبیث خود بھی ریشماں کو پسند کرتا تھا لیکن اس میں اتنی جرأت تو تھی نہیں کہ ملک اکرام سے اس کا رشتہ مانگ سکتا۔ وہ ریشماں کو گاؤں سے نکالنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے مہرہ بنایا اور میرے ذریعے اس نے ریشماں کو گاؤں سے نکال لیا۔

خط پڑھ کر میں بلک بلک کر رونے لگا۔ اکبر کی دھوکا دہی کے بعد دنیا کے ہر رشتے سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔

ماروی نے ایک مرتبہ پھر مجھے تسلی دی۔ وہ معصوم لڑکی واقعی مجھے اپنے بھائیوں کی طرح چاہنے لگی تھی۔

"علی نواز!" میں نے کہا۔ "سوچ کیا رہے ہو؟ پولیس کو بلالو اور مجھے اس کے حوالے کر دو۔"

"نہیں دلاور!" علی نواز نے کہا۔ "میں اپنے جی دار اور جواں مرد کو یوں نہیں کھو سکتا۔ تم ایسا کرو، یہیں میرے پاس ملازمت کر لو۔"

"ملازمت!" میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری ملازمت کروں گا؟ علی نواز صاحب! جتنی زمین کے آپ مالک ہیں، اس سے دگنی زمین کا مالک ہوں میں۔ میرا باپ پنجاب کا بہت بڑا جاگیردار ہے۔ بس آپ اتنی مہربانی کریں کہ ریشماں کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے میں میری مدد کریں۔ پولیس کو معلوم ہو گا تو وہ اس کی چیر پھاڑ کریں گے، پوسٹ مارٹم کریں گے۔۔۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" علی نواز نے کہا۔

پھر شام تک ریشماں کو منوں مٹی کے نیچے سلا دیا گیا۔ وہ جیتی جاگتی، ہنستی کھلتی اور زندگی سے بھرپور لڑکی وقت سے پہلے ہی منوں مٹی تلے جا سوئی۔

میں نے اپنے اور ریشماں کے ہر دشمن کو ہلاک کر دیا تھا۔ میں تو علی نواز کو بھی نہ چھوڑتا لیکن ماروی کا معصوم چہرہ میری نظروں میں آجاتا تھا۔ میں نے ماروی کے صدقے میں علی نواز کو معاف کر دیا۔

اب میں اکبر کو ڈھونڈ کر اس سے اپنی تباہی اور بربادی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

جب میں وڈیرے علی نواز کے گھر سے روانہ ہوا تو ماروی نے ضد کر کے مجھے کپڑے بدلوائے اور ایک ہزار روپے میری جیب میں رکھ دیے اور روتے ہوئے بولی۔ "یہ رقم میں نے جمع کی تھی۔ میں نے بابا سائیں سے نہیں لی ہے۔" اس دور میں ایک ہزار روپے خاصی خطیر رقم تھی۔ میں نے محض ماروی کی خاطر وہ رقم قبول کر لی۔

وہاں سے نکلنے کے بعد میں پتا پوچھتا ہوا لطیف آباد نمبر سات تک پہنچ گیا۔ وہاں اس دور میں دو تین ہی بڑے جنرل اسٹور تھے۔ مجھے پہلے اسٹور پر ناکامی ہوئی لیکن دوسرے پر مجھے افضل نظر آگیا۔

وہ مجھے دیکھ کر لپک کر وہاں آیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے مالک سے کچھ دیر کی چھٹی لی کہ گاؤں سے میرا مہمان آیا ہے۔ وہ مجھے لے کر ایک قریبی چائے خانے میں آگیا اور بولا۔ "دلاور! مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا ہوا۔"

"کیسا ہوا؟" میں چونک کر بولا۔ میں سمجھ گیا کہ اکبر بھی یہیں موجود ہے ورنہ افضل کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

"ارے یار! مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ اکبر بھی حیدر آباد میں موجود ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ تم ریشماں کو لے کر گاؤں سے آئے تھے۔ پھر اسے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا۔"

وہ تو روانی میں یہ بات بتا گیا۔ اگر اکبر اس معاملے میں شریک نہ ہوتا تو اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ریشماں کو اغوا کیا گیا ہے۔

☆☆☆

افضل مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ وہاں تھوڑی دیر بعد اکبر بھی آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے سینے سے لگ گیا اور مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔ پھر بولا۔ "یار دلاور! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں بروقت وہاں نہ پہنچ سکا ورنہ وہ مردود ٹیکسی والا کبھی ریشماں کو لے کر نہیں جا سکتا تھا۔"

"اچھا تو نے اسے دیکھا تھا؟" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"میں تو گاؤں سے تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ تھا۔" پھر وہ بولا۔ "لیکن دلاور! تمہیں اس سب سے حاصل کیا ہوا؟"

"مجھے تو ریشماں مل گئی۔" میں نے کہا۔ "میں نے ریشماں کو تلاش کر لیا تھا۔ میں نے اس ٹیکسی والے زمان کو ہلاک کر دیا اور اس آدمی کو بھی ہلاک کر دیا جو میری تباہی کا ذمے دار تھا۔"

"یار! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا۔ تُو نے اتنے خون کر دیے۔ اب ریشماں کہاں ہے؟"

"میں جلد ہی تجھے بھی ریشماں سے ملواؤں گا۔" میں نے کہا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔ وہ بوکھلا گیا۔

"آستین کے سانپ!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تُو نے مجھے اور ریشماں دونوں کو ڈس لیا۔ تُو تو مجھے اپنا دوست کہتا تھا اور میری خاطر اپنی جان تک قربان کر سکتا تھا۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟"

"میں آج بھی تیرا دوست ہوں دلاور!" اکبر کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کسی نے تجھے میرے خلاف ورغلایا ہے۔ تُو یہ ریوالور جیب میں رکھ کر اطمینان سے بات کر۔"

"میرا اطمینان تو اسی روز رخصت ہو گیا تھا اکبر جب ریشماں مجھ سے بچھڑی تھی۔ تو بتا تُو نے ایسا کیوں کیا؟"

اسی وقت افضل بھی کمرے میں آگیا۔ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"خاموش رہو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "اور تم بھی اس سامنے والی دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاؤ ورنہ اکبر سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"میں پھر کہوں گا دلاور کہ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو۔۔۔"

میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے اس پر فائر کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی۔ دوسرا فائر میں نے افضل پر کیا۔ وہ بھی شریک جرم تھا۔

وہ علاقہ گنجان آباد تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے لیکن میں فائرنگ کرتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔ پھر میں ہفتوں اس قبرستان میں پڑا رہا جہاں ریشماں ابدی نیند سو رہی تھی۔

میرے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ کپڑے میلے ہو گئے تھے اور پھٹ گئے تھے۔

آخر میں ریشماں کو بھی کب تک پریشان کرتا۔ میں نے اسے زندگی میں تو سکون لینے نہیں دیا تھا، میرے یہاں رہنے سے وہ قبر میں بھی تڑپتی ہو گی۔

یہی سوچ کر میں وہاں سے نکلا اور جدھر منہ اٹھا چل دیا۔ پھر میں نے خود کو حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر پایا۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور کراچی آگیا۔

پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کر لوں لیکن اس سے میرے گناہ کا کفارہ تو ادا نہیں ہوتا۔ اس اذیت اور کرب کا ازالہ تو نہیں ہوتا جو ریشماں کو پہنچا تھا۔ میں نے خود کو سزا دینے کے لیے زندگی کا یہ ڈھب اختیار کیا ہے۔

میں کراچی کے ایک فٹ پاتھ پر پڑ گیا۔ کون جان سکتا تھا کہ فٹ پاتھ پر پڑا ہوا یہ مجبور سا شخص کروڑوں کی جائداد کا مالک ہے لیکن میں تو خود کو سزا دے رہا تھا۔

اس واقعے کو بھی پچیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ گرمی، سردی، برسات ہر موسم میں، میں وہیں موجود ہوتا ہوں۔ لوگ مجھے فقیر سمجھ کر میری جھولی میں کچھ ڈال دیتے ہیں جس سے میں اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتا ہوں۔ ہاں، ہر جمعرات کو میں حیدر آباد ضرور جاتا ہوں۔ وہاں جا کر ریشماں کی قبر پر فاتحہ پڑھتا ہوں، اس کی قبر کو پھولوں اور پتیوں سے سجاتا ہوں اور اگربتیاں جلا کر لوٹ آتا ہوں۔

چھ سال پہلے میں نے ماروی کو وہاں سے گزرتے دیکھا تھا۔ وہ بے چاری تو مجھے کیا پہچانتی لیکن میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو مرد اور چھوٹے چھوٹے دو بچے بھی تھے۔

میں نے بچوں کو اپنی طرف بلانا چاہا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ ماروی نے آگے بڑھ کر دس روپے کا ایک نوٹ میری طرف پھینک دیا۔ میں نے وہ نوٹ بھی احتیاط سے ان ایک ہزار روپے کے ساتھ رکھ لیا جو ماروی نے مجھے دیے تھے۔ میں نے وہ رقم آج تک خرچ نہیں کی ہے۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا ٹھکانا اب فٹ پاتھ ہے اور سر چھپانے کو گھنے پتوں والا درخت۔ اب تو مجھے بس موت کا انتظار ہے۔ کب مجھے مٹی کی آغوش میسر ہو گی۔ میں نے اپنے سامنے والے پنواڑی کے پاس اتنی رقم رکھوا دی ہے کہ جس سے میرے کفن دفن کا بندوبست ہو سکے۔ بس اب یہی وحشت تنہائی ہے اور میں ہوں۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کراچی کی ایک بھری پُری شاہراہ کے فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ایک بوڑھا اتنی شدید تنہائی کا شکار ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ریشماں مجھے پکار رہی ہو۔ میں بھی اس دن کا بے قراری سے انتظار کر رہا ہوں جب میں ریشماں سے ملوں گا۔

معما موت

حسام بٹ

رشتوں کی دیوار اعتماد واعتبار کے عناصر سے مضبوطی اختیار کرتی ہے... معمولی سی ملاوٹ رشتوں کو ناقابلِ اعتبار بنادیتی ہے... ہمارے اردگرد کے ماحول سے تعلق رکھنے والی سادہ ودلچسپ کہانی جس میں اچانک ہی جرم کے راستے بنتے چلے گئے

ایک لاش کی بازیابی سے شروع ہونے والی پراسرار دہشت خیز سرد کہانی

رات بھیگ چلی تھی مگر شہر کی رونقیں ابھی عروج پر تھیں۔ اکثر دفاتر میں شام چھ بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ بعض سات یا پھر آٹھ بجے تک بھی کھلے رہتے تھے اور اکا دکا اس کے بعد بھی۔ اس وقت رات کے نو کا عمل تھا اور شہر کی ایک معروف شاہراہ پر واقع وہ کثیر المنزلہ عمارت بھی تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ مذکورہ عمارت میں زیادہ تر دفاتر مختلف اور ملٹی نیشنل کمپنیز کے تھے۔ دن بھر یہاں لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر میلے کا سا سماں دیکھنے کو ملتا تھا۔ چار ایکسپریس لفٹس ہمہ وقت لوگوں کو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے لانے، لے جانے میں معروف دکھائی دیتی تھیں۔

سیکیورٹی گارڈ نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ دونوں پر رات کے نو بجے کا وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی کا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ٹھیک دس بجے اس عمارت کو لاک کر دیا جاتا پھر اگلی صبح ہی وہاں آمدورفت ہوتی۔ بلڈنگ کی گیارھویں منزل پر وکلا کی ایک کمپنی کا دفتر تھا۔ سب سے آخر میں وہی لوگ جاتے تھے۔ ان کی رخصت کے بعد بلڈنگ کے داخلی راستے کو تالا لگا دیا جاتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب سیکیورٹی گارڈ اپنی چھٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا، ایک شخص عمارت میں داخل ہوا۔ اس وقت ہر طرف سناٹا تھا اس لیے سیکیورٹی گارڈ کی نظر اس شخص پر مرکوز ہو گئی۔

وہ شخص لفٹ کی جانب بڑھا اور لفٹ کو کال کر کے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اس عمارت کی کل پندرہ منزلیں تھیں۔ لفٹ کے ڈسپلے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تیزی سے نیچے آ رہی ہے۔ سیکیورٹی گارڈ اس شخص کی جانب متوجہ تھا۔ اچانک اس شخص کے قدموں میں جنبش ہوئی۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے بعد رک چکی تھی۔ وہ شخص لفٹ کے سامنے کھڑا تھا۔

اپنی مخصوص دھیمی آواز کے ساتھ لفٹ کا سلائڈنگ ڈور کھلا۔ اس شخص نے لفٹ پر سوار ہونے کے لیے جیسے ہی قدم اٹھایا، اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔

''لاش...!''

☆☆☆

وصی ایک ٹریڈنگ کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے اکاؤنٹنٹ تھا۔ وصی کی ڈیوٹی صبح دس سے شام چھ بجے تک تھی مگر اسے دفتر سے نکلتے نکلتے سات بج جاتے تھے اور لگ بھگ آٹھ بجے وہ گھر پہنچ جاتا تھا لیکن آج ابھی تک اس کی خبر نہیں تھی۔ اب نو بجنے والے تھے اور وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ اس کی بیوی خاصی پریشان ہو رہی تھی۔

آٹھ دس پر شبانہ نے وصی کے موبائل فون پر کال کی تھی تاکہ پتا چلے کہ وہ کہاں ہے... اسے واپسی میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ وصی کا سیل فون آف مل رہا تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں وصی کے آفس بھی فون کر دیا۔

جب کسی نے فون اٹھایا تو اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔ ''میں وصی صاحب کی بیوی شبانہ بات کر رہی ہوں... کیا وصی ابھی تک آفس میں موجود ہیں؟''

''بھابی... میں سعید بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے بتایا گیا۔ ''وصی صاحب تو آف کر کے جا چکے ہیں۔''

سعید اس کمپنی کا ایک چپراسی تھا جہاں وصی اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ شبانہ نے سوال کیا۔ ''وصی کو آفس سے نکلے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

چپراسی سعید نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''بھابی... وہ تو اپنے وقت پر ہی اٹھ گئے تھے... تقریباً سات بجے...

خیریت تو ہے نا؟''

''وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔'' شبانہ کی آواز میں بے [illegible]

تھی۔

''آفس سے گھر کا فاصلہ چالیس، پینتالیس منٹ [illegible]

ہے۔'' سعید نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ [illegible]

انہیں آٹھ بجے تک گھر پہنچ جانا چاہیے۔''

''نہیں پہنچے... اسی لیے تو میں پریشان ہو رہی ہوں۔''

''آپ نے انہیں موبائل پر ٹرائی کیا؟''

''کئی مرتبہ کر چکی ہوں۔'' شبانہ نے بتایا۔ ''ان کا سیل [illegible]

فون مسلسل بند جا رہا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں بھابی۔ وہ جہاں بھی ہوں گے خیریت [illegible]

digestpk.blogspot.com

سے ہوں گے۔'' سعید نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے، وہ اپنے دوست کے ساتھ کہیں بیٹھ گئے ہوں۔''

''دوست... کون دوست؟'' شبانہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''چند روز سے ایک صاحب ان سے ملنے آرہے ہیں۔'' سعید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ہر دوسرے تیسرے دن وہ چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے آفس آجاتے ہیں پھر وصی صاحب ان کے ساتھ ہی دفتر سے نکلتے ہیں۔''

''کیا آج بھی وہ صاحب آفس آئے تھے؟'' شبانہ کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔

''جی ہاں... وصی صاحب اور وہ ایک ساتھ ہی آفس سے نکلے ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔ ''تقریباً سات بجے۔''

''ان صاحب کا نام آپ کو معلوم ہے؟''

''جی بھابی... وصی صاحب انہیں جنید خان کے نام سے پکار رہے ہیں۔''

''اوہ... جنید خان!'' شبانہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

سیکیورٹی گارڈ نے بے ساختہ لفٹ کی جانب دیکھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور لفٹ کے فرش پر کوئی شخص آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ دروازے کے باہر وہ شخص بھی موجود تھا جس نے لاش کا نعرہ لگا کر سیکیورٹی گارڈ کو اس جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ حیرانی سے لفٹ کے فرش کو تک رہا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ تیزی سے لفٹ تک پہنچا۔ مذکورہ شخص نے بٹن دبا کر لفٹ کو روک دیا تھا۔ یہ اس کا غیر ارادی فعل تھا۔ سیکیورٹی گارڈ نے پھرتی کا مظاہرہ کرکے لفٹ کے اندرونی چینل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرکے اسے گراؤنڈ پر لاک کردیا۔ اب وہ کسی کی کال پر اوپر کی جانب حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ لفٹ کے فرش پر پڑی لاش کا جائزہ لینے لگا۔

وہ درمیانی عمر کا ایک دراز قامت آدمی تھا مگر اس وقت زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا۔ اس کی لاش لفٹ کے سرد فرش پر پڑی تھی۔ واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ اس کی کھوپڑی میں گولی اتار کر اسے اس دنیا سے اُس دنیا میں پہنچا دیا گیا تھا۔ گولی نے اس کی کھوپڑی کو بری طرح چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ سفاری سوٹ میں ملبوس اس شخص کو کسی نے بڑی بے دردی سے مارا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ کے نزدیک کھڑے وحشت زدہ شخص نے کہا۔ ''تک... کون ہے... یہ...؟''

گارڈ نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دوڑتا ہوا ریسپشن کی جانب بڑھ گیا۔ ان لمحات میں ریسپشنسٹ اور گارڈ بھی کچھ وہ خود ہی تھا۔ اسی افراتفری میں چوکیدار افضل کریم بھی وہاں پہنچ گیا اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گارڈ ریسپشن پر رکھے نیلے فون سیٹ کا ریسیور اٹھانے کے بعد... یکے بعد دیگرے بلڈنگ کے مختلف دفاتر سے رابطہ کرنے لگا۔ گارڈ سب کو ایک ہی نوعیت کی اطلاع دے رہا تھا جس کا لبِ لباب کچھ اس طرح تھا۔

''سر... آپ جلدی سے نیچے آئیں... لفٹ نمبر تین میں سے ایک شخص کی لاش ملی ہے... اس کے سر میں گولی لگی ہے... پلیز... آپ جلدی پہنچیں...!''

سیکیورٹی گارڈ کی اطلاع پر دیکھتے ہی دیکھتے بارہ پندرہ افراد گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے جن میں ایڈووکیٹ جاوید برنی پیش پیش تھا۔ اس عمارت کی گیارھویں منزل پر جاوید برنی کی ایک لائرز فرم تھی جہاں اس کے علاوہ چند اور وکلا بھی بیٹھتے تھے۔

جاوید برنی نے ماہرانہ انداز میں نامعلوم شخص کی لاش کا معائنہ کیا اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ دراز قد شخص کون تھا۔ تھوڑی دیر پہلے یہی شخص جاوید برنی کے پاس ایک کلائنٹ کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ سیکیورٹی گارڈ کی جانب مڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''اس شخص کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''سر... مجھے کچھ پتا نہیں۔'' سیکیورٹی گارڈ نے اضطرابی لہجے میں بتایا۔ ''لفٹ نیچے آکر رکی تو فرش پر اس کی لاش پڑی نظر آئی۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں تو ان صاحب سے پوچھ لیں۔'' بات ختم کرکے وہ متلاشی انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جاوید برنی نے سیکیورٹی گارڈ کی نگاہوں کا تعاقب کیا پھر اسے اُلجھن میں گرفتار دیکھ کر پوچھا۔

''مراد... تم کن صاحب کا ذکر کررہے ہو... میں کس سے کیا پوچھ لوں؟''

''وہ... ابھی تو یہیں کھڑا تھا۔'' سیکیورٹی گارڈ مراد متذبذب نظروں سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، کہاں چلا گیا۔''

''وہ کون؟'' جاوید برنی نے سیکیورٹی گارڈ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے سوال کیا۔

مراد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''سر... وہ عام سی شکل وصورت کا ایک شخص تھا۔ چند منٹ پہلے وہ یہاں آیا تھا۔ لفٹ نمبر تین کو کال کرکے وہ ادھر ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ میں مسلسل اس کو واچ کررہا تھا۔ پھر جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا، وہ شخص چلایا... لاش!'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس کی پکار پر ریسپشن چھوڑا اور لفٹ کی طرف بھاگا۔ لفٹ کے فرش پر یہ شخص مردہ پڑا نظر آیا۔'' مراد نے باقاعدہ لاش کی جانب انگلی سے اشارہ بھی کردیا پھر اُلجھن زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر... وہ بندہ کہاں غائب ہوگیا؟''

جاوید برنی نے کسی شخص کا حلیہ بیان کیا پھر سیکیورٹی گارڈ سے سوال کیا۔ ''کیا وہ بندہ اس وضع قطع کا تھا؟''

''نن... نہیں...!'' مراد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

جاوید برنی نے پوچھا۔ ''جب لفٹ کا دروازہ کھلا تو اندر اس لاش کے علاوہ کوئی اور شخص بھی تمہیں نظر آیا تھا؟''

مراد نے ایک مرتبہ پھر اپنی گردن کو نفی میں جنبش دی اور کہا۔ ''نو سر... لفٹ خالی تھی... اس کے فرش پر صرف اسی مردہ شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی۔''

جاوید برنی کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوگئیں اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی لمحے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''وکیل صاحب... سیکیورٹی گارڈ کو ٹرائی کرنے کے بجائے آپ فوراً پولیس کو فون کریں۔ یہ خاصا گمبھیر معاملہ ہے۔''

''ہمدانی صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایک اور شخص نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''جو بھی تفتیش کرنا ہوگی، پولیس جائے وقوعہ پر پہنچ کر خود ہی کرلے گی... یہ خاصی خطرناک سچویشن ہے۔''

صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جاوید برنی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے سیل فون پر متعلقہ تھانے کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

شبانہ نے سعید کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ریسیور کریڈل کردیا اور جنید خان کے بارے میں سوچنے لگی۔ چند روز پہلے وصی نے جنید خان کا ذکر تو کیا تھا۔ جنید خان کا شمار وصی کے نئے دوستوں میں ہوتا تھا۔ اس کا تعلق شوبز سے تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ چینل کے لیے ڈرامے ڈائریکٹ کرتا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک ڈراما ڈائریکٹر تھا مگر پروڈکشن کے کاموں میں بھی قدم جمانے کی کوشش کررہا تھا۔ بس، ایک پروڈیوسر ڈائریکٹر بننے کے لیے اس کے پاس سرمائے کی کمی تھی جس کے لیے وہ ''پارٹیاں'' گھیرتا رہتا تھا۔ وصی سے بھی اس کی ملاقات اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

وصی کی آمدنی اتنی تھی کہ عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ پروڈکشن جیسے کھٹ راگ پھیلانے کی اس کی حیثیت تھی اور نہ ہی وہ اس نوعیت کے بکھیڑے افورڈ کرسکتا تھا مگر جنید بھی اس کے ساتھ آنکھیں بند کرکے نہیں چپکا تھا۔ جنید خان کو باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ مستقبل قریب میں وصی کے پاس بھاری رقم آنے والی ہے... اور یہ اطلاع سو فیصد درست تھی۔

وصی کے دادا کا انتقال چند ماہ پہلے ہوا تھا اور خاندانی جائداد کا بٹوارا ہونے والا تھا جس کا کچھ حصہ وصی کے حصے میں آنے والا تھا کیونکہ وہ اپنے مرحوم باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور چند سال پہلے اس کی والدہ کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ آنے والے دنوں میں وصی کے اکاؤنٹ میں لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے ڈیپازٹ ہونے والے تھے۔ جانے کیسے، جنید خان کو اس خوش آئند خبر کی بھنک کہاں سے مل گئی۔ بہرحال، وہ ہر دوسرے تیسرے روز وصی کے آفس پہنچ جاتا اور اسے ایک ڈراما سیریل میں پیسا لگانے کے لیے قائل کرنے کی کوششوں میں لگ جاتا۔

وصی نے چند روز پہلے شبانہ سے بھی جنید خان کا ذکر کیا تھا اور اس کے عزائم سے بھی اپنی بیوی کو آگاہ کیا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد شبانہ نے اپنی بے لاگ رائے دے دی تھی۔

''وصی! آپ کا یہ نیا دوست اور اس کا منصوبہ میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔''

''کیا سمجھ میں نہیں آیا؟'' وصی نے سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

''وصی... ہم ذاتی گھر میں رہ رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہ چاہتی ہوں، ہمیں ان پیسوں سے ایک گاڑی خریدنا چاہیے۔''

''گاڑی بھی خرید لیں گے مگر سیریل کے بعد۔''

''اس کا مطلب ہے، جنید خان نے آپ کو قائل کرلیا ہے؟''

''قائل کرنے کی کیا بات ہے۔'' وہ اندرونی خوشی کو دباتے ہوئے بولا۔ ''جنید خان نے مجھے اپنی جس پلاننگ سے آگاہ کیا ہے اس میں پندرہ لاکھ لگا کر صرف چھ ماہ کے اندر چالیس لاکھ سے پچیس لاکھ تک کمائے جاسکتے ہیں۔ یعنی یہ... کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس لاکھ کا منافع۔ یہ منافع میرے اور جنید خان کے بیچ برابر تقسیم ہوجائے گا۔''

digestpk.blogspot.com

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہمارے پندرہ لاکھ سے جنید خان جو سیریل تیار کرے گا، وہ بیس پچیس لاکھ میں کوئی چینل خرید بھی لے گا؟" شبانہ نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"بھئی... وہ اسی دنیا کا آدمی ہے اور ایک معروف پرائیویٹ چینل کے لیے کام بھی کر رہا ہے۔" وصی نے کہا۔ "اس کے ہر جگہ تعلقات ہیں۔ وہ اگر ڈراما سیریل تیار کرے گا تو اسے فروخت بھی کر دے گا۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا وصی!" شبانہ نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ "جس کام کا خود تجربہ نہ ہو، اس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے اور پھر وہ بھی ایک ایسے شخص پر بھروسا کر کے جس سے آپ کی شناسائی کا عرصہ چند روز پر محیط ہے۔ کہیں بیٹھے بٹھائے ہمارے پندرہ لاکھ ہی نہ ڈوب جائیں۔"

"واہ شبانہ! تم بھی کمال کرتی ہو۔" وصی نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "جو رقم ابھی ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی، تم اس کے ڈوبنے کے خوف سے پہلے ہی خدشات میں گھر گئی ہو۔"

"رقم اگر ہاتھ میں نہیں آئی تو آنے ہی والی ہے۔" شبانہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وصی! میں تو ڈرامے وراے کے حق میں بالکل نہیں ہوں۔ میں اب بھی یہی کہوں گی کہ گاڑی لیتے ہیں اور باقی کی رقم کو کسی اچھی سی اسکیم میں انویسٹ کر دیتے ہیں۔ ماہانہ ایک معقول رقم وہاں سے بھی آتی رہے گی۔"

"گاڑی کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے شبانہ۔" وصی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "وہ تو بینک سے لون پر بھی لی جا سکتی ہے۔"

"میں لون کے سخت خلاف ہوں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "وہ سود ہے... اس سے گھر کی برکت اور انسان کی عزت جاتی رہتی ہے۔ ہم تو پہلے ہی ایک کیس کے سلسلے میں عدالتی چکروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"شبانہ!" وصی اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تمہارا فلسفہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔"

"فلسفہ...!" وہ چونک کر بولی۔ "میں نے کون سا فلسفہ بول دیا ہے؟"

"بھئی، تم گاڑی خریدنے کے بعد باقی رقم کو انویسٹ کرنے کی صلاح دے رہی ہو اور اس بات پر خاصی خوش ہو کہ اس انویسٹمنٹ سے ہر ماہ معقول رقم آجایا کرے گی۔ یہ بھی تو سود کے زمرے میں آتی ہے نا۔" ثانیے توقف کر کے اس نے سوالیہ نظر سے شبانہ کو دیکھا اور کہا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ سود دینا تو حرام ہے اور سود لینا حلال... تمہاری سوچ کا یہ دُہرا معیار میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

شبانہ لاجواب سی ہو کر وصی کو دیکھنے لگی۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ہم لوگوں کا دراصل المیہ یہی ہے کہ ہم نے مذہب کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ جو بات ہمیں سوٹ کرتی ہے، اسے ہم جائز قرار دے دیتے ہیں اور جو سوٹ نہیں کرتی وہ حرام ٹھہرتی ہے... توبہ توبہ، استغفراللہ...!"

"آپ کو میری بات نہیں ماننا، نہ مانیں مگر مجھے لیکچر تو نہ پلائیں۔" شبانہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "آپ کی ذہانت سے مجھے ڈر لگتا ہے اور ٹینشن ہو جاتی ہے۔"

وصی معنی خیز انداز میں بیوی کو دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں سرزنش سے زیادہ چاہت تھی۔

شبانہ جزبز سی ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

جاوید برنی نے سیل فون کان سے لگایا اور دوسری جانب رابطہ ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہیلو! انسپکٹر اسد...!"

"ہاں برنی... بولو کیا بات ہے؟" انسپکٹر اسد نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے... تمہاری آواز میں خاصی گمبھیرتا پائی جاتی ہے؟"

انسپکٹر اسد اور وکیل جاوید برنی میں پرانی یاد اللہ تھی اور وہ ہمیشہ بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔ اس مشکل گھڑی میں جاوید نے اپنے اسی دیرینہ دوست سے رابطہ کیا جو اتفاق سے ان دنوں اسی علاقے کے تھانے ہی میں تعینات تھا۔ اسد نے جاوید برنی کی آواز میں موجود تشویش کو محسوس کر لیا تھا۔

"خیریت نہیں ہے اسد!" برنی نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہماری آفس کی بلڈنگ میں ایک قتل ہو گیا ہے... بہت ہی پُراسرار قتل!"

"اوہ!" انسپکٹر اسد نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "کیا یہ قتل آفس کے اندر ہوا ہے؟"

"نہیں... مقتول کی لاش لفٹ میں ملی ہے۔" جاوید برنی نے بتایا۔

"مقتول کا تم سے کوئی تعلق نکلتا ہے؟"

"ہاں... تعلق نکلتا ہے... لیکن یار! کیا ساری تفتیش فون پر ہی کر لو گے؟" جاوید برنی نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم فوراً یہاں پہنچو۔ پھر میں بتاتا ہوں، مقتول سے میرا کیا اور کتنا عارضی تعلق تھا۔"

"اوکے... میں پہنچ رہا ہوں۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی آجاؤ۔" برنی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہمدانی نامی موٹے تازے شخص نے برنی سے استفسار کیا۔ "وکیل صاحب... کیا صورت حال ہے؟"

"صورت حال تو آپ کے سامنے ہے ہمدانی صاحب!" جاوید برنی نے لفٹ کے فرش پر پڑی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور پولیس سے بھی میں نے آپ لوگوں کے سامنے ہی رابطہ کیا ہے... انسپکٹر اسد دس، پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بھی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"

سہیل ہمدانی شپنگ کے بزنس سے منسلک تھا اور اکثر و بیشتر اسے رات کو دیر تک اپنے آفس میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس نے جاوید برنی سے پوچھا۔

"اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"آپ لوگوں کو پولیس کی آمد تک تو یہاں رکنا ہوگا۔" برنی نے جواب دیا۔

نوید قریشی نے کہا۔ "حیرت کی بات ہے، اس شخص کو کھوپڑی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور کسی نے فائر کی آواز تک نہیں سنی؟"

نوید قریشی کا آفس آٹھویں فلور پر تھا۔ وہ مارکیٹنگ کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا۔ جاوید برنی نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"لاش کی حالت بتا رہی ہے کہ اس بدقسمت کو سائلنسر لگی گن سے شوٹ کیا گیا ہے لہٰذا فائر کی آواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہاں... یہ بھی آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" نوید قریشی نے تفہیمی انداز میں گردن ہلائی۔ "آپ وکیل ہیں۔ قتل و غارت گری اور قانونی معاملات کو ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔"

جاوید برنی نے نوید قریشی کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے سب پر باری باری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "جب تک پولیس یہاں پہنچ کر اپنی کارروائی مکمل نہیں کر لیتی، ہم سب کا موقع واردات پر موجود رہنا ضروری ہے۔"

سب نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

یہ جان کر کہ وصی آفس سے جنید خان کے ساتھ نکلا تھا، شبانہ پریشان ہو گئی۔ وہ شخص اور اس کا سیریل والا آئیڈیا شبانہ کے ذہن میں شروع سے کھٹک رہا تھا۔ اب ایک ہی صورت باقی تھی کہ وہ جنید خان کو فون کر کے وصی کی خیریت کا پتا چلاتی۔ وہ ٹیلی فون انڈیکس کھول کر جنید خان کا نمبر تلاش کرنے لگی۔

جب سے سیل فون کا استعمال عام ہوا تھا، گھروں میں رکھے ٹیلی فون انڈیکس کی ضرورت کم سے کم پیش آنے لگی تھی۔ لوگ ہر نوعیت کے نمبرز اپنے سیل فون کی کانٹیکٹ بک میں فیڈ کر لیا کرتے تھے مگر ایک اکاؤنٹنٹ ہونے کے ناتے وصی نے اپنے گھر کے فون انڈیکس کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ مینٹین کر رکھا تھا لہٰذا شبانہ کو جنید خان کا نمبر تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

وصی ایک سلیقہ مند شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں نفاست کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ دوسروں سے بھی ایسے ہی نظم و ضبط کی توقع کرتا تھا جبکہ شبانہ زندگی کے ہر معاملے میں پھوہڑ اور بے پروا تھی جس کی وجہ سے وقت بے وقت اسے وصی کی ڈانٹ بھی سننا پڑتی تھی۔ وصی کی یہ روک ٹوک اور ڈسپلن والی عادت شبانہ کو پسند نہیں تھی مگر پریشانی کے ان لمحات میں وصی کی اس عادت نے اس کا کام آسان کر دیا تھا۔ جنید خان کے دونوں کانٹیکٹ نمبرز اس کی نظر کے سامنے تھے۔

جنید کے دونوں نمبرز اوپر نیچے لکھے ہوئے تھے۔ شبانہ نے سب سے پہلے موبائل کا نمبر ڈائل کیا۔ دو بیل جانے کے بعد ریکارڈنگ سنائی دی۔

"آپ کا ملایا ہوا نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔" نمبر نہیں مل رہا تھا۔

دو تین بار کی کوشش کے بعد شبانہ نے جنید خان کے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ تھوڑی دیر تک بیل جاتی رہی پھر دوسری جانب سے فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو...!" ایک نسوانی آواز شبانہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو... میں شبانہ بات کر رہی ہوں۔" شبانہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مجھے جنید صاحب سے بات کرنا ہے۔"

"اوہو... جنید صاحب!" دوسری طرف بولنے والی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کیا ڈراموں میں کام کرنے کا شوق ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شبانہ نے خود پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں نے فون ریسیو کر لیا تو آپ نے یہ کہہ دیا... اگر جنید فون اٹھاتا تو ڈراموں میں کام

digestpk.blogspot.com

دلوانے کے لیے خوشامد کر رہی ہوتیں... ہیں نا؟"
اس عورت کی باتوں نے شبانہ کو سلگا کر رکھ دیا۔ بے ساختہ اس نے پوچھ لیا۔ "آپ کون ہیں؟"
"میں مسز خان ہوں۔" اس نے رعونت سے بتایا۔ "نادیہ نام ہے میرا۔"
"خاصی بدتمیز ہوئی ہیں آپ۔" شبانہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"کیا مطلب؟" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔
"آپ نے جس ٹون میں مجھ سے بات کی ہے، اسے بدتمیزی ہی کہا جاتا ہے۔" شبانہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے، بہت سی لڑکیاں ڈراموں میں کام لینے کے لیے آپ کے شوہر کو فون کرتی ہوں مگر میں ایسی نہیں ہوں۔"
"پھر آپ نے کس مقصد کے لیے فون کیا ہے؟" وہ معتدل انداز میں بولی۔
"میں اپنے شوہر کی وجہ سے پریشان ہوں۔" شبانہ نے بتایا۔ "وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔"
"تو آپ کے شوہر کا جنید سے کیا تعلق؟" نادیہ نے پوچھا۔
"ان دونوں کی نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔" شبانہ نے کہا۔ "جنید کی کسی سیریل میں میرے شوہر انویسٹ کر رہے ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے، شام سات بجے وہ دونوں ایک ساتھ آفس سے نکلے تھے۔"
"کس کے آفس سے؟" نادیہ نے پوچھا۔
"میرے شوہر کے آفس سے۔"
نادیہ نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان مردوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ کسی ایسے ویسے "شغل" میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔" اس نے لفظ "شغل" پر خاصا زور دیا۔
"میں آپ کے تجربے کو چیلنج نہیں کروں گی مگر میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔" شبانہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔"
"مجھے کیا۔" نادیہ نے بے پروائی سے کہا۔ "خود ہی ایک دن پچھتائیں گی۔"
"آپ میرے پچھتانے کو چھوڑیں۔" شبانہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ "صرف یہ بتائیں کہ جنید سے کس طرح رابطہ ہو سکتا ہے تاکہ میں ان سے اپنے شوہر کے بارے میں پوچھ سکوں... ان کے سیل فون پر تو مسلسل ریکارڈنگ چل رہی ہے۔"
"تو... تو آپ جنید کے سیل فون پر بھی ٹرائی کر چکی ہیں؟" نادیہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "جنید کا سیل نمبر آپ کے پاس کیسے آیا؟"
"جیسے گھر کا نمبر آ گیا۔" شبانہ نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ دونوں نمبرز جنید خان نے میرے شوہر وصی کو دیے تھے۔ جب وصی جنید خان کے کسی پراجیکٹ میں پندرہ لاکھ کی انویسٹ منٹ کر رہے ہیں تو پھر اس بات کا کیا جواز بنتا ہے کہ جنید کے نمبرز وصی کے پاس کیسے پہنچ گئے؟"
نادیہ ایک انتہائی شکی مزاج عورت واقع ہوئی تھی۔ ممکن ہے، اس میں یہ عادت جنید خان کے کسی خاص رویے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہو۔ بہرحال، شبانہ کو اس کی باتیں سخت ناگوار لگی تھیں۔
شبانہ کی وضاحت کے بعد نادیہ نے نرمی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں جنید کے دوسرے نمبر پہ فون کر کے پوچھتی ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس کے پاس ڈبل سم موبائل ہے۔"
"ڈبل سم والا موبائل ہے... تو پلیز، آپ مجھے جنید خان کا دوسرا نمبر نوٹ کروا دیں۔"
"کیا کریں گی دوسرا نمبر لے کر؟" نادیہ نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔
شبانہ نے جھلا کر کہا۔ "جو پہلا نمبر لے کر کر رہی ہوں۔"
"سوری!" نادیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "جنید کا دوسرا نمبر میں آپ کو نہیں دے سکتی۔ آپ تھوڑا انتظار کریں۔"
"انتظار... کس بات کا؟" شبانہ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
نادیہ نے کہا۔ "آپ فون رکھیں۔ میں جنید کو ٹریس کر کے حالات کا جائزہ لیتی ہوں، پھر آپ کو بتاتی ہوں۔"
"اوکے... تھینک یو۔"
"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بہن۔" نادیہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کا شوہر کوئی ننھا بچہ نہیں جو کہیں کھو جائے گا۔"
"آپ جنید خان کو ٹریس کرنے کی کوشش کریں۔" شبانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں دس منٹ کے بعد دوبارہ فون کرتی ہوں۔"
دوسری طرف کی بات سنے بغیر شبانہ نے ریسیور کریڈل کر دیا اور ٹیلے فون سیٹ کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ موجودہ صورتِ حال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ آج تک

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وصی یوں غائب ہو گیا ہو۔ اگر اسے دیر سے گھر آنا ہوتا تو وہ فون کر کے شبانہ کو اس بارے میں آگاہ کر دیا کرتا۔
"وصی کا فون بھی تو آف جا رہا ہے۔" شبانہ نے خود کلامی کی۔ "میں ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکتی۔ خدا خیر کرے، وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں۔" وہ صوفے پر نیم دراز ہو کر مسلسل وصی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی جنید خان بھی اس کی سوچ میں در آیا۔ شبانہ نے ابھی تک جنید خان کو دیکھا نہیں تھا۔ پروڈکشن کا منصوبہ سن کر ہی وہ اسے ناپسند کرنے لگی تھی اور اب جنید کی بیوی نے تو شبانہ کو کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسی بے ہودہ اور بدتمیز عورت سے زندگی میں پہلے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔
شبانہ کو نہ تو جنید خان سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ڈراما پروڈکشن سے کوئی لگن۔ وہ صرف اپنے شوہر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ "میں ایک بار پھر وصی کے سیل فون کو ٹرائی کرتی ہوں۔"
یہ کہتے ہی اس نے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا پھر ایک فوری خیال کے تحت رک گئی اور زیرِ لب بڑبڑائی۔
"نہیں... مجھے لینڈ لائن کو بزی نہیں کرنا چاہیے... نادیہ کا فون کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔"
اس سوچ کے ساتھ ہی وہ اپنے سیل فون سے وصی کا نمبر ٹرائی کرنے لگی۔ وہ وصی کا نمبر ادھورا ہی ملا پائی تھی کہ پاس رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔
شبانہ نے چونک کر فون کی طرف دیکھا اور سیل فون کو ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ ریسیور کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔
انسپکٹر اسد، جاوید برنی کے آفس میں بیٹھا تھا۔ جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی کے بعد مقتول کی لاش کو اسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر اسد نے موقع پر موجود تمام افراد سے پوچھ گچھ کر لی تھی لیکن کوئی بھی اہم بات سامنے نہیں آئی۔ اسد نے سیکیورٹی گارڈ کو روک کر باقی سب کو فارغ کر دیا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر بلڈنگ کے داخلی دروازے کو بند کر دیا گیا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ بھی برنی کے آفس ہی میں آ بیٹھا تھا۔ وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔
"سر!" گارڈ مراد خان نے اسد کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آپ پہلے مجھ سے پوچھ گچھ کر لیں اور مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔"
"ہوں...!" اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مراد خان! میں نے تمہیں پوچھ گچھ کے لیے تو نہیں روک رکھا... تم سے جو کچھ پوچھنا تھا، وہ میں پوچھ چکا۔"
"پھر سر... مجھے کیوں روکا ہوا ہے؟" مراد خان نے حیرت سے پوچھا۔
"اگر تم چلے گئے تو پھر بلڈنگ کو بند کون کرے گا؟"
"سر! اس کام کے لیے چوکیدار موجود ہے۔" مراد خان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "فضل کریم اسی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ جب میں چلا جاتا ہوں تو بظاہر یہ بلڈنگ اور اس کے داخلی دروازے بند ہو جاتے ہیں مگر چوکیدار بلڈنگ کے اندر موجود رہتا ہے۔"
اسد نے تصدیق طلب نظر سے جاوید برنی کی جانب دیکھا۔ برنی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اسد نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تب ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔"
مراد کے جانے کے بعد برنی نے اسد سے پوچھا۔ "یار! یہ بتاؤ، جائے وقوعہ کی کارروائی تم مکمل کر چکے، اس بلڈنگ میں فوری نوعیت کی کوئی اور کارروائی ابھی باقی ہے؟"
"کارروائی تو میں مکمل کر چکا ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میں مقتول کی لاش کو کبھی اسپتال نہ بھجواتا۔" اسد نے جواب دیا۔ "تم نے یہ سوال کسی خاص حوالے سے پوچھا ہے؟"
"ہاں!" برنی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر یہاں مزید کوئی کام نہیں ہے تو ہم اٹھتے ہیں۔ تمہارا تھانہ میرے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔ باقی کی گفتگو وہاں بیٹھ کر کر لیں گے، پھر میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"
"اچھا آئیڈیا ہے۔" اسد نے تائیدی انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم نکلتے ہیں۔"
جاوید برنی نے بریف کیس میں کچھ ضروری کاغذات رکھے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تائید میں انسپکٹر اسد نے بھی سیٹ چھوڑ دی۔ جب جاوید برنی اپنے آفس کو لاک کرنے کے بعد لفٹ کی جانب بڑھا تو چار میں سے صرف ایک لفٹ ورکنگ آرڈر میں دکھائی دے رہی تھی یعنی لفٹ نمبر چار!
جب وہ لفٹ میں سوار ہونے لگے تو اسد نے پوچھا۔ "برنی! تم نے بتایا ہے کہ مقتول اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے تمہارے آفس میں بیٹھا ہوا تھا... ایک کلائنٹ کی حیثیت سے۔ میں نے پچھلے ایک گھنٹے میں جو بھی تفتیش کی ہے، ا

digestpk.blogspot.com

سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قتل کے معمے کو حل کرنے کے لیے مجھے سب سے زیادہ تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"کیوں نہیں۔" برنی نے جواب دیا۔ "میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

"ویری گڈ... تمہیں یہی جواب دینا چاہیے تھا۔" اسد نے سوچتی ہوئی نظر سے برنی کی طرف دیکھا۔

برنی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "تم کیا جاننا چاہتے ہو؟"

قبل اس کے کہ اسد، برنی سے کوئی سوال کرتا، لفٹ نمبر چار گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔ اسد نے زیرِ لب مسکرا کر برنی کی جانب دیکھا۔ اگلے ہی لمحے لفٹ کا سلائڈنگ ڈور کھل گیا۔ وہ دونوں لفٹ سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

شبانہ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ کال اٹینڈ کرنے سے پہلے فون کے سی ایل آئی سسٹم نے شبانہ کو بتا دیا تھا کہ وہ فون جنید خان کے گھر سے آیا ہے۔ شبانہ نے کال ریسیو کرتے ہی اضطراری لہجے میں کہا۔

"ہاں نادیہ... کچھ پتا چلا...؟"

"میں نے بڑی مشکل سے جنید کو ٹریس کیا ہے۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "آپ کا شوہر جنید کے ساتھ نہیں ہے... جنید کسی ڈرامے کی ریکارڈنگ پر ہے۔"

"تو... تو پھر وہ کہاں ہے؟" شبانہ نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ "وہ دونوں ایک ساتھ نکلے تھے۔"

"ہاں... جنید نے بھی مجھے یہی بتایا ہے کہ وہ آپ کے شوہر کے آفس اسی کے کسی کام سے گیا تھا۔" نادیہ نے شک زدہ انداز میں بتایا۔ "شاید وصی آج کل کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے اور..."

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مسز جنید؟" شبانہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"میں نے وہی کہا ہے جو جنید نے مجھے بتایا ہے۔" نادیہ نے روکھے انداز میں جواب دیا۔ "کیا آپ کا شوہر کسی قانونی پیچیدگی کے حوالے سے پریشان ہے... کسی عدالتی چکر میں...؟"

"ہاں، ایسی بات ہے تو...!" شبانہ جزبز ہو کر رہ گئی۔

"مجھے آپ لوگوں کے گھریلو مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔" نادیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جنید نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آپ کے شوہر کو اپنے کسی وکیل دوست کے پاس لے کر گیا تھا۔"

"پھر... کیا ہوا؟" شبانہ کی آواز میں بے پناہ تشویش تھی۔

"جنید نے آپ کے شوہر کو اپنے وکیل دوست سے ملا دیا تھا۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "اس کی آج شوٹنگ تھی لہٰذا وہ آپ کے شوہر کو وکیل کے آفس میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"کیا جنید کو اس بات کی خبر ہے کہ میرے شوہر ابھی تک گھر نہیں پہنچے؟" شبانہ تقریباً روہانسی ہو رہی تھی۔

"جنید کو خبر تو نہیں تھی لیکن میں نے بتا دیا ہے۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "جنید کا کہنا ہے کہ میں آپ سے کہوں، فکر مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ وصی ممکن ہے، ابھی تک اسی وکیل کے آفس میں بیٹھا ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ کہیں اور چلا گیا ہو۔"

"وصی اور کہیں نہیں جا سکتا بلکہ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہے کہ اس نے مجھے کسی وکیل سے ملاقات کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔" شبانہ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "اور وصی کا سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا ہے۔"

"یہ سارے سوالات آپ اپنے شوہر سے کیجیے گا، جب وہ گھر واپس آ جائے۔" نادیہ بے رخی سے بولی۔ "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"آپ پلیز جنید سے پوچھ کر یہ تو بتا سکتی ہیں کہ وہ وصی کو کون سے وکیل کے پاس لے کر گئے تھے۔" شبانہ نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "میں ان وکیل صاحب کے دفتر جا کر وصی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ رات کے دس سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی تک وصی کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں۔"

"آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "میں نے آپ کی آسانی کی خاطر ایک کام کیا ہے۔ جنید سے میں نے ان وکیل صاحب کا نام اور فون نمبر لے لیا ہے۔ آپ گھر بیٹھے ان وکیل صاحب کو فون کر کے اپنے شوہر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔"

"جی، بہت شکریہ۔" شبانہ نے فون سیٹ کے قریب ہی رکھے رف پیڈ اور قلم کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جی لکھوائیں۔ ان وکیل صاحب کا نام اور فون نمبر کیا ہے؟"

نادیہ نے اسے مطلوبہ نمبر لکھوا دیا۔ شبانہ نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ بہن...!"

"کوئی بات نہیں۔" نادیہ بے پروائی سے بولی۔ "آپ کے شوہر کا پتا چل جائے تو مجھے بھی بتا دیجیے گا۔"

"جی ضرور...!" شبانہ نے تشکرانہ انداز میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ریسیور ابھی تک اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ اس نے رف پیڈ پر لکھے ہوئے نام کو زیرِ لب دہرایا۔

"ایڈووکیٹ جاوید برنی...!"

☆☆☆

جاوید برنی نے نگاہ اٹھا کر اپنے دوست انسپکٹر اسد کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہاں اسد... ہم تھانے پہنچ گئے۔ اب پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

"مختصر آبتاؤ، مقتول کس سلسلے میں تم سے ملنے آیا تھا؟" اسد نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تاکہ میں اس کے قتل کے حوالے سے اپنا ایک ذہن بنا سکوں۔"

"وہ دراصل میرے ایک دیرینہ شناسا کے ہمراہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔" جاوید برنی نے جواب دیا۔ "میرے اس دوست نے سہ پہر میں فون کر کے مجھے اپنی آمد کے حوالے سے بتا دیا تھا... میں نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ آٹھ بجے میرے آفس آ جائے۔"

"کیا وہ ٹھیک آٹھ بجے تمہارے پاس پہنچ گئے تھے؟" گفتگو کے دوران میں انسپکٹر اسد ضروری پوائنٹ بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ برنی نے جواب میں بتایا۔

"ہاں... وہ دونوں لگ بھگ آٹھ بجے میرے آفس میں تھے۔"

"تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے جو مقتول کو تمہارے پاس لایا تھا؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"جنید خان!" برنی نے جواب دیا۔ "جنید خان کا تعلق شوبز سے ہے۔ وہ ڈراما ڈائریکٹر کی حیثیت سے ایک پرائیویٹ چینل کے ساتھ منسلک ہے۔"

"اور... تمہارا دوست جنید خان، مقتول کے کسی قانونی معاملے کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا تھا۔" انسپکٹر اسد کے سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ "مجھے مقتول کے مسئلے کے بارے میں بتاؤ اور... اس سے بھی پہلے میں مقتول کا نام جاننا چاہوں گا؟"

"مقتول نے مجھے اپنا نام وصی... وصی شاہ بتایا تھا۔" جاوید برنی نے جواب دیا۔ "وصی فیملی کورٹ کے ایک کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میاں بیوی میں کوئی تنازع چل رہا ہے۔"

"ایک منٹ۔" اسد نے ہاتھ اٹھا کر برنی کو مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ "ہماری گفتگو تو جاری رہے گی۔ پہلے تو تم مجھے مقتول کے گھر بار کے بارے میں بتاؤ۔ میرا مطلب ہے، اس کے گھر کا فون نمبر وغیرہ تاکہ اس کے لواحقین کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع تو دی جا سکے۔ کیا تمہارے پاس مقتول کے گھر کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟"

"ہاں بالکل ہے۔" جاوید برنی نے اپنا مخصوص بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "گھر کا بھی اور موبائل کا بھی، دونوں نمبر اس نے مجھے نوٹ کروائے تھے بلکہ... اس کا وزیٹنگ کارڈ بھی ہے میرے پاس۔"

"موبائل پر فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اسد جلدی سے بولا۔ "مقتول کی جامہ تلاشی کے دوران میں وہ سیل فون میں نے برآمد کر لیا تھا اور اتفاق سے مذکورہ سیل فون مجھے آف ملا تھا۔ مجھے اس کے گھر پر فون کرنا ہو گا۔"

تھوڑی سی تلاش کے بعد برنی نے مقتول کا وزیٹنگ کارڈ اپنے بریف کیس میں سے برآمد کر کے انسپکٹر اسد کی جانب بڑھا دیا۔

اسد نے بغور اس کارڈ کا جائزہ لیا پھر ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے چہرے سے ایک عزم جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

شبانہ کی پریشانی عروج پر تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے اور ابھی تک وصی کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں مل سکی تھی۔ وصی کا سیل فون مسلسل آف جا رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی۔ دوسری طرف جنید خان کی بیوی نے شبانہ کو کسی وکیل کا جو نمبر دیا تھا، وہ اس نمبر پر بھی کئی بار فون کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ کوشش اس لیے کہ ابھی تک اس سلسلے میں اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف گھنٹی تو بجتی تھی مگر کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ایڈووکیٹ جاوید برنی آفس بند کر کے اپنے گھر جا چکا تھا۔

"یا خدایا... میں بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔" وہ ریسیور کو کریڈل پر پٹختے ہوئے خود سے مخاطب تھی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، کہاں جاؤں... کس سے وصی کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ پتا نہیں، وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔ وکیل کے آفس میں تو کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا۔ میں ایک بار پھر جنید خان کو فون کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، کوئی سراغ، امید کی کوئی کرن دکھائی دے جائے۔"

اس خیال کے ساتھ ہی شبانہ نے پے در پے، چار پانچ مرتبہ جنید کے سیل فون پر رنگ کر ڈالا مگر اس کی کال اٹینڈ نہیں

digestpk.blogspot.com

ہوسکی اور ہر بار اس کی سماعت کو مخصوص ریکارڈنگ ہی سننے کو ملی۔ تھک ہار کر اس نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔

وہ پریشان کن خیالات میں گھری ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شبانہ نے دزدیدہ نظر سے فون کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

"یااللہ... کوئی خیر کی خبر ہو۔"

شبانہ نے ریسیور کو کان سے لگا کر اضطراری لہجے میں کہا۔ "ہیلو...!"

"کیا یہ وصی شاہ کا گھر ہے؟" کسی نامانوس مردانہ آواز نے استفسار کیا۔

"جی... جی ہاں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ کون ہیں؟"

"آپ مسز وصی بات کر رہی ہیں؟" دوسری جانب سے بولنے والے نے شبانہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"جی ہاں، میں مسز وصی بول رہی ہوں۔" وہ سنبھلتے ہوئے مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔ "لیکن آپ کون ہیں اور یہ... مجھ سے پولیس والوں کے انداز میں سوالات کیوں کر رہے ہیں؟"

"مسز وصی! آپ بہت ذہین خاتون ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میرے بارے میں آپ نے بالکل درست اندازہ قائم کیا ہے۔ میں انسپکٹر اسد بات کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے، آپ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی ثابت ہوں گی۔"

"کک... کیا مطلب ہے... آپ کا؟" شبانہ کی آواز بکھر کر رہ گئی۔

"مسز وصی!" انسپکٹر اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے... آپ کے شوہر وصی شاہ ایک اندوہناک واقعے کا شکار ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

"یہ... یہ آپ... کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں آپ کو ایک تلخ حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں مسز وصی۔" اسد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ فوراً تھانے چلی آئیں۔"

"لیکن... یہ تو بتائیں..." شبانہ روہانسی ہو گئی۔ "وصی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے...؟"

"کسی سفاک شخص نے ٹھوڑی میں گولی اتار کر آپ کے شوہر کو بڑی بے دردی سے موت کی نیند سلا دیا ہے۔" اسد نے گمبھیر انداز میں بتایا۔ "وصی کی لاش کو اسپتال بھجوا دیا گیا ہے۔"

"کک... کون سے اسپتال؟"

"آپ تھانے تشریف لے آئیں۔" انسپکٹر اسد نے بڑی نرمی سے کہا۔ "میں خود آپ کو اسپتال بھجوا دوں گا۔ مجھے آپ سے بہت سی باتیں بھی کرنا ہیں۔"

"اوکے... انسپکٹر صاحب... میں آرہی ہوں۔"

☆☆☆

اسد نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد جاوید برنی کی طرف دیکھا اور معتدل انداز میں کہا۔ "ہاں برنی! تم میاں بیوی کے کسی تنازع کا ذکر کر رہے تھے۔ اب بتاؤ وصی اور اس کی بیوی کے درمیان کیا جھگڑا چل رہا تھا۔"

"وصی اور شبانہ کے بیچ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔"

"پھر...؟" اسد نے الجھن زدہ نظر سے برنی کو دیکھا۔ "تم نے کہا ہے نا، ان کے تنازع کا کیس کسی عدالت میں بھی چل رہا ہے؟"

"ہاں... میں نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔" برنی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ کیس وصی اور فوزیہ کے بیچ ہے۔"

"فوزیہ... یہ کون ہے؟" اسد میز پر کہنیاں رکھ کر تھوڑا آگے کو جھک گیا۔

"فوزیہ وصی کی بیوی ہے... دوسری بیوی۔"

"اوہ... انٹرسٹنگ!" اسد معنی خیز انداز میں گردن ہلانے لگا۔ "اس معاملے کی تفصیل کیا ہے؟"

"وصی اور شبانہ کی شادی کو لگ بھگ دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اللہ کی مرضی سے ابھی یہ دونوں صاحب اولاد نہیں ہو سکے۔" جاوید برنی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اولاد سے محرومی کتنا بڑا عذاب ہے، اس کا اندازہ کوئی بے اولاد ہی لگا سکتا ہے۔ خیر... تین سال پہلے وصی نے اولاد کی وجہ سے دوسری شادی کا ارادہ ظاہر کیا اور اپنے اس ارادے کو شبانہ پر بھی ظاہر کر دیا۔ کوئی بھی بیوی اپنی سوتن لانے کے لیے دلی خوشی تیار نہیں ہوتی مگر وصی نے مجھے جو اسٹوری سنائی ہے، اس کے مطابق شبانہ نے اس کے منصوبے کی مخالفت نہیں کی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا۔

"یار برنی! مجھے تو یقین نہیں آرہا۔" برنی سانس لینے کے لیے تھما تو اسد نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔" برنی نے رسان سے کہا۔ "لیکن یار! یہ دنیا ہے۔ یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ وصی نے

شبانہ کی رضامندی کو اس کی محبت قرار دیا۔ مقتول کے مطابق، شبانہ اس سے اتنی شدید محبت کرتی ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کے لیے جان قربان کرنے کو تیار رہتی تھی۔"

"محبت کی طاقت سے تو انکار ممکن نہیں ہے برنی۔" اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ اگر کسی دل میں سما جائے تو پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کی مثال بھی قائم کر سکتی ہے۔ اینی ہاؤ۔" اسد نے ایک گہری سانس خارج کی پھر برنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آگے کیا ہوا...؟"

"آگے یہ ہوا کہ..." برنی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "جلد ہی وصی اور فوزیہ کی شادی ہو گئی۔ فوزیہ اور شبانہ وصی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گزارنے لگیں۔ ان میں سگی بہنوں سے زیادہ محبت اور اتفاق نظر آنے لگا۔ لوگ فخر سے ان کی مثالیں دینے لگے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اس ہنستے بستے گھرانے کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اسد نے چونک کر برنی کی طرف دیکھا۔

"دوسری شادی کے ایک سال بعد پتا چلا کہ فوزیہ ماں بننے والی ہے۔" برنی نے وصی کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ "اس خبر نے وصی کو بے تحاشا خوش کر دیا۔ شبانہ کے دل اور نیت کے احوال کو خدا ہی جان سکتا ہے تاہم وہ فوزیہ اور وصی کی خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر شریک نظر آتی تھی۔ جب زچگی کا وقت قریب آیا تو فوزیہ اپنے میکے چلی گئی اور بہ خیر و خوبی ایک خوب صورت بچی عافیہ کو جنم دیا اور... یہیں سے اس کہانی میں ایک اور ٹوئسٹ آتا ہے۔"

"ٹوئسٹ؟" انسپکٹر اسد نے آنکھیں سکیڑ کر جاوید برنی کی جانب دیکھا۔ "تم کس ٹوئسٹ کی بات کر رہے ہو؟"

"بچی کی پیدائش کے بعد، وصی کی سسرال والوں کی جانب سے ایک عجیب و غریب مطالبہ آ گیا۔" برنی نے بتایا۔ "اس مطالبے نے وصی کے ہوش اڑا دیے تھے۔"

"کیسا مطالبہ؟" اسد نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ "وصی کی سسرال والوں نے کون سی ڈیمانڈ کر دی؟"

"انہوں نے واضح طور پر وصی سے کہہ دیا کہ فوزیہ اب ایک ہی شرط پر اس کے ساتھ جا سکتی ہے۔" برنی نے بتایا۔

"کہ وصی اسے الگ گھر میں رکھے؟" اسد نے خیال آرائی کی۔

برنی نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اسد نے پوچھا۔ "پھر؟"

"ان کا مطالبہ تھا کہ جب تک وصی شبانہ کو طلاق نہیں دے دیتا، فوزیہ اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔" برنی نے بتایا۔

"اوہ... یہ تو کھلی بلیک میلنگ تھی۔" اسد نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "بچی کی پیدائش کے بعد شبانہ کے مقابلے میں فوزیہ کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔"

"ہاں، یہ تو حقیقت ہے۔" برنی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اسد نے پوچھا۔ "اس صورت حال میں فوزیہ کا موقف کیا تھا؟"

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔" برنی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دوسری شادی کے موقع پر شبانہ کے دل میں کیا تھا اس کی خبر صرف اور صرف اللہ ہی کو ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ذات پاک دلوں کے حال اور نیتوں کے حال سے واقف ہے اسی طرح میں اب بھی یہی کہوں گا کہ فوزیہ کے دل میں کیا تھا، یہ صرف خدا ہی کو معلوم تھا مگر بظاہر وہ بھی اپنے میکے والوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی تھی... اس کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ جب تک وصی شبانہ کو اپنی زندگی سے نہیں نکال دیتا، وہ واپس اس کی زندگی میں قدم نہیں رکھے گی۔"

"اوہ...!" اسد نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "وصی بے چارہ تو بڑی مصیبت میں آ گیا تھا۔"

"کوئی ایسی ویسی مصیبت۔" برنی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اس نے فوزیہ کو منانے کے لیے تن من کا سارا زور لگا دیا۔ بات گھر سے نکل کر یونین کونسل تک بھی گئی تھی مگر وصی کی مراد پوری نہ ہو سکی۔ بعض دوستوں نے کچھ دوسری نوعیت کے جارحانہ مشورے بھی دیے لیکن وصی کسی بھی ایسی کارروائی کے لیے تیار نہ ہو سکا اور پھر ایک روز اسے فوزیہ کے وکیل کی طرف سے لیگل نوٹس موصول ہوا۔"

"نوٹس... میں کچھ سمجھا نہیں۔" اسد نے الجھن زدہ انداز میں برنی کی طرف دیکھا۔

"فوزیہ نے عدالت میں خلع کا کیس دائر کر دیا تھا۔"

"اوہ۔" اسد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"پچھلے چھ ماہ سے وصی شدید ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا۔"

برنی نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی سسرال والوں کی ہٹ دھرمی اور فوزیہ کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے یہ کڑوا گھونٹ بھرنے کو تو تیار تھا کہ فوزیہ اگر اس

digestpk.blogspot.com

کی زندگی سے نکلتی ہے تو بے شک نکل جائے مگر وہ اپنی ایک سالہ بچی عافیہ کو ہرگز ہرگز کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا وہ چائلڈ کسٹڈی کے حوالے سے میرے پاس آیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں عافیہ کو اس کی تحویل میں دلوانے کے لیے ایک زبردست کیس فائل کروں۔"

"اب تو وہ عدالتی جھمیلوں سے اتنی دور جا چکا ہے کہ اسے کسی کیس وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رہی۔" اسد نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ "ویسے خلع والے کیس کی کیا پوزیشن تھی؟"

"تم بھی قانون کے آدمی ہو یار!" جاوید برنی نے کہا۔ "تمہیں بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی بھی عورت کی جانب سے دائر ہونے والے کیس کا فیصلہ ہمیشہ اسی کے حق میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، ایک آدھ پیشی میں عدالت فوزیہ کے حق میں فیصلہ دینے والی تھی اور وصی کو پریشانی بھی اسی بات کی تھی۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ننھی عافیہ کی عمر ابھی محض ایک سال ہے۔ اگر فوزیہ اور وصی میں عدالتی سطح پر علیحدگی ہو جاتی تو یقیناً معصوم عافیہ کو فوزیہ ہی کی تحویل میں دے دیا جاتا اور... وصی یہی نہیں چاہتا تھا اسی لیے وہ میرے ذریعے فی الفور چائلڈ کسٹڈی کا کیس عدالت میں دائر کرانا چاہتا تھا۔"

"مگر افسوس کہ زندگی نے اسے اتنی مہلت نہ دی۔" اسد نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔ "وہ اپنی لختِ جگر کو تحویل میں لینے سے پہلے ہی موت کی تحویل میں چلا گیا۔"

"قدرت کے کام قدرت ہی بہتر جانتی ہے۔" برنی نے کہا۔ "انسان سوچتا کچھ ہے، ہو کچھ اور جاتا ہے۔"

"اور جو کچھ بھی ہو جاتا ہے اسے پولیس کو بھگتنا پڑتا ہے۔" انسپکٹر اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ "وصی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے ساتھ ہی فوزیہ کے کیس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ وہ اب خلع یافتہ نہیں بلکہ وصی کی بیوہ کہلائے گی۔ معصوم عافیہ کو بھی کوئی قانونی طریقے سے فوزیہ سے چھیننے کی کوشش نہیں کر سکے گا۔ باپ کی موت کے بعد بلاشرکت غیرے فوزیہ ہی عافیہ کی مالک و مختار ہے لیکن... یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔"

جاوید برنی بڑی توجہ سے انسپکٹر کی بات سن رہا تھا۔ جب اسد نے لمحاتی توقف کیا تو بھی برنی خاموش ہی رہا۔ اسد نے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"برنی! مقتول وصی شاہ کی کہانی کسی بھی نوعیت کی ہو... میرا فوکس صرف اور صرف قتل کی ایک واردات پر ہے۔ میں اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھوں گا، جب تک وصی کا قاتل قانون کی گرفت میں نہیں آ جاتا۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"جو بھی تم کہو گے، میں حاضر ہوں۔" برنی نے سنجیدگی سے کہا۔

"میری نگاہ میں تمہارا وہ دوست بھی بہت اہم ہے جو وصی کو تمہارے پاس لے کر آیا تھا۔" اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا نام ہے اس کا... جنید خان!"

برنی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

"وہ دونوں ایک ساتھ تمہارے آفس آئے تھے؟"

"ہاں... لگ بھگ آٹھ بجے۔" اسد کے سوال کے جواب میں برنی نے بتایا۔

"اور دونوں ایک ساتھ ہی نو بجے رات رخصت بھی ہوئے ہوں گے۔" اسد نے سوالیہ نظر سے برنی کو دیکھا۔ "لہٰذا جنید خان سے زیادہ، وصی شاہ کی پراسرار موت پر کوئی اور شخص روشنی نہیں ڈال سکتا۔"

"یہاں میں تم سے اختلاف کروں گا اسد۔"

"کیسا اختلاف؟" اسد نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

برنی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ جنید خان اور مقتول وصی شاہ ایک ساتھ میرے آفس پہنچے تھے مگر ان کی واپسی الگ الگ ہوئی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مقتول تو رات نو بجے آفس سے اٹھا تھا مگر جنید خان اس سے پہلے ہی رخصت ہو گیا تھا۔" برنی نے بتایا۔ "اس کا بنیادی مقصد مقتول کو مجھ سے ملوانا تھا۔ اگر اس کی ریکارڈنگ نہ ہوتی تو شاید وہ مزید کچھ دیر رک جاتا۔ اسی لیے وہ مقتول سے پہلے ہی میرے آفس سے نکل گیا تھا۔"

"کتنا پہلے...؟" اسد گویا بال کی کھال اتارنے پر کمربستہ تھا۔

"آدھا گھنٹا پہلے۔" جاوید برنی نے جواب دیا۔

"گویا ساڑھے آٹھ بجے...!" اسد نے کاغذ پر نوٹس لینے کا عمل جاری رکھا اور استفساریہ انداز میں کہا۔ "اگرچہ تمہاری نظر میں جنید خان کا قتل کے اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا لیکن میں اپنے فرائض کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کا ٹرائل ضرور کرنا چاہوں گا۔" لمحاتی توقف کر کے اسد نے بوجھل سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"برنی... تم سے زیادہ اور کون شخص یہ بات جان سکتا ہے کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے ہی آگے بڑھتی ہے۔ اگر ہم شک کی عادت کو ترک کر دیں تو پھر تھانے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے مکھیاں مارتے نظر آئیں... اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مجرم خود ہی شرافت سے ہمارے پاس آ کر کہیں کہ... لو ہمیں گرفتار کر لو... آج کے بعد ہماری توبہ، ہمارے باپ کی توبہ، ہمارے دادا پردادا کی توبہ جو کسی چھوٹے سے چھوٹے جرم کا بھی ارتکاب کریں۔"

"اسد!" برنی نے انسپکٹر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ تم جنید خان سے ہر قسم کی پوچھ گچھ کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، تم مجھے جنید خان کے نمبرز، گھر کا ایڈریس اور اس پرائیویٹ چینل کا نام نوٹ کروا دو جس کے لیے وہ ڈرامے وغیرہ بناتا ہے۔" اسد نے کہا۔ "میں اس سے مل کر ایک تفتیشی انٹرویو کرتا ہوں۔"

جاوید برنی نے انسپکٹر اسد کی مطلوبہ معلومات اسے فراہم کر دیں اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور کچھ...؟"

"اور کچھ اور کچھ...!" اسد نے برنی کے الفاظ دہرائے پھر بولا۔ "ہاں... اور یہ کہ کل کسی وقت دن میں مجھے سیکیورٹی گارڈ مراد کی ضرورت پیش آئے گی۔ صرف دو گھنٹے کے لیے۔"

"کس سلسلے میں؟" برنی نے پوچھا۔

"مراد اس مشکوک شخص کے حلیے سے بخوبی واقف ہے جس نے لاش دریافت کی تھی... یا یوں سمجھو کہ جس نے سب سے پہلے مقتول وصی شاہ کی لاش کو دیکھا تھا۔" اسد نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "وہ شخص جائے وقوعہ سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ میں اس نامعلوم بندے کی تلاش کے سلسلے میں سیکیورٹی گارڈ کی مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے آرٹسٹ سے سیکیورٹی گارڈ کی راہنمائی میں اس مشکوک اجنبی شخص کا اسکیچ بنوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"اچھا آئیڈیا ہے۔" جاوید برنی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "جب تم کہو گے، سیکیورٹی گارڈ مراد کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

"ایک بات اور...!" انسپکٹر اسد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "جیسا کہ تم نے بتایا اور یہ ایک ٹھوس حقیقت بھی ہے کہ مقتول کا اس کی دوسری بیوی کے ساتھ کوئی عدالتی تنازع چل رہا تھا لہٰذا وصی شاہ کی موت کے حوالے سے اس پارٹی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا... وہ لوگ بھی تو اس کی موت کے ذمے دار ہو سکتے ہیں۔"

"تم نے نکتہ تو بہت اچھا اٹھایا ہے۔" برنی نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں، اس امر کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو برنی؟" اسد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"پہلی بات تو یہ کہ جیسا کہ تم بھی جانتے ہو، خلع کے کیس کا فیصلہ بہرصورت فوزیہ ہی کے حق میں ہونا تھا۔" برنی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لہٰذا فوزیہ کے گھر والوں میں سے کسی کا وصی شاہ کے خون میں ہاتھ رنگنے کا کوئی جواز نہیں بنتا اور جہاں تک چائلڈ کسٹڈی والے معاملے کا تعلق ہے تو یہ کیس ابھی فائل ہی نہیں ہوا تھا... چنانچہ اس بات کے ڈر سے کہ کہیں مقتول فوزیہ کی بچی کو عدالتی کارروائی کے بعد اپنی تحویل میں نہ لے لے، فوزیہ کے لواحقین کا وصی کو راہ سے ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"گویا... اگر کسی بھی ذریعے سے فوزیہ کے گھر والوں کو یہ بھنک مل گئی ہو کہ مقتول عدالتی کارروائی کے بعد ننھی عافیہ کو اپنی کسٹڈی میں لینے کے بارے میں سوچ رہا ہے تو ان میں سے کوئی مقتول کے خلاف کوئی بھی سنگین قدم اٹھانے کی کوشش کر سکتا تھا؟" اسد نے ٹٹولنے والی نظر سے برنی کو دیکھا۔

"ہاں... اس امر کے امکانات کو صفر کے برابر نہیں سمجھا جا سکتا۔" برنی نے مثبت انداز میں گردن ہلائی۔ "ایسا بہرحال ہو تو سکتا ہے۔"

"تم مقتول کے سسرال والوں کے بارے میں جتنا جانتے ہو، وہ بھی مجھے بتا دو۔" اسد نے کہا۔ "ان معلومات سے میں خود کوئی کلیو ڈھونڈ لوں گا۔"

"میں اس پارٹی کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں رکھتا کیونکہ آج مقتول سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔" برنی نے جواباً بتایا۔ "بہرحال، وصی شاہ کی زبانی جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں، وہ میں تم سے شیئر کرنے کو تیار ہوں۔"

اسد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "میرے لیے یہ بھی کافی ہوگا۔"

☆☆☆

شاہد کے گھر کا ماحول سوگوار اور فضا ماتمی تھی۔ مقتول وصی شاہ کی تدفین کر دی گئی تھی لیکن ابھی تک اس کے قاتل کا سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔ اسد نے فنگر پرنٹس سے لے کر واقعاتی شہادتوں تک ہر پہلو کو بغور جانچ لیا اور اس نتیجے پر

digestpk.blogspot.com

پہنچا کہ وصی کو بہت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اسد نے شبانہ سے ابتدائی پوچھ گچھ تو کرلی تھی مگر اس سے حاصل ہونے والی معلومات قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ دراصل وصی شاہ کی اندوہناک موت نے شبانہ کو اتنا اپ سیٹ کردیا تھا کہ وہ اسد کے سوالات کے مناسب جواب نہیں دے پائی تھی لیکن اب صورتِ حال خاصی مختلف تھی۔ اسی لیے انسپکٹر اسد، شبانہ کا تفصیلی بیان لینے اس کے گھر چلا آیا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اسد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے آپ کے شوہر کی المناک موت کا بہت دکھ ہے۔ میں وصی کے قاتل کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ ظالم شخص عبرت ناک انجام کو پہنچے جس نے میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔“ شبانہ نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟“

”شبانہ صاحبہ!“ اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تک کی تحقیق سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا شوہر کسی اتفاقی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے اور اس قسم کی کارروائی کوئی دشمن ہی کرسکتا ہے۔ یہ آپ بتائیں گی کہ وصی شاہ کی دشمنی کس سے تھی؟“

”وصی بہت ہی صلح جو انسان تھے۔“ شبانہ نے جواب دیا۔ ”ان کے پاس دشمنیاں پالنے کا وقت ہی نہیں تھا لیکن جب سے فوزیہ نے انہیں عدالتی چکروں میں پھنسایا تھا، وہ اکثر یہی کہتے تھے... پتا نہیں فوزیہ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں... وصی کی موت میں فوزیہ کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟“ اسد نے سوالیہ نظر سے شبانہ کی طرف دیکھا۔

”میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ فوزیہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہوگا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن ممکن ہے، اس نے یہ کام کسی اور ذریعے سے کرایا ہو۔“

”تو گویا... آپ کا شک فوزیہ کی جانب اشارہ کرتا ہے؟“

”جی ہاں، میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اسد نے سوچا ممکن ہے شبانہ، فوزیہ کو محض اس لیے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو کہ وہ اس کی سوتن تھی اور ایک بچے کی ماں بھی تھی۔ اس کے دل کی آواز سننے کے لیے اسد نے گھما پھرا کر سوالات کرنا شروع کردیے۔

”آپ کے ایسا سمجھنے کا کوئی جواز تو ہوگا۔“ اسد نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”ایک آدھ پیشی میں خلع کے کیس کا فیصلہ فوزیہ کے حق میں ہونے والا تھا پھر اسے ایسا خطرناک قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی اور... وہ بھی کسی اور کی خدمات حاصل کرکے؟“

”دیکھیں انسپکٹر صاحب!“ شبانہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ پچھلے چھ ماہ میں فوزیہ نے وصی کو جو ناچ نچایا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس کی ذات سے کوئی اچھی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس نے تو ایک موقع پر وصی کو غنڈوں سے پٹوانے کی کوشش بھی کی تھی اور...“

”غنڈوں سے پٹوانے کی کوشش؟“ اسد نے قطع کلامی کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا وہ اتنی ہی اپروچ والی ہے؟“

”وہ اپروچ والی نہیں مگر اس کے پیچھے جو ذہن کام کررہا ہے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔“ شبانہ نے جواب دیا۔

”کون سا ذہن؟“ اسد نے چونک کر پوچھا۔

”جمشید!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”فوزیہ کا انکل جمشید۔“

”اوہ۔“ اسد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر پوچھا۔ ”انکل جمشید کو وصی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟“

وصی کے قتل کا معاملہ جو حل ہوتا نظر آرہا تھا لہٰذا اسد کی توجہ شبانہ پر مرکوز ہوگئی۔ اس کے سوال کے جواب میں شبانہ کوئی بھی حیرت انگیز انکشاف کرسکتی تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

”انکل جمشید کی شہرت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ شخص الٹے سیدھے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کی وصی سے براہِ راست تو کوئی دشمنی نہیں مگر اس کی شدید خواہش رہی ہے کہ وصی، فوزیہ کو اپنی زوجیت سے آزاد کردے۔ اس کیس کو خراب کرنے اور فوزیہ کے کان بھرنے میں اسی کا ہاتھ رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، فوزیہ بُری عورت نہیں۔ ہم نے ایک سال، ایک چھت کے نیچے دو سگی بہنوں کی طرح گزارا ہے اور اس دوران میں مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں رہی۔“ وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی۔ ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”بچے کی پیدائش کے سلسلے میں فوزیہ جب اپنے میکے

گئی تو اس وقت تک اس کے رویے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ واپس نہیں آئے گی یا اس کے گھر والے میری طلاق کا مطالبہ کر دیں گے۔ میں سمجھتی ہوں، یہ ساری آگ انکل جمشید ہی نے لگائی تھی۔ فوزیہ اور اس کے گھر والوں کو بھی انکل جمشید ہی نے بھڑکایا تھا اور اسی کے مشوروں پر فوزیہ کی جانب سے خلع کا دعویٰ دائر کیا گیا تھا۔"

"کوئی بھی انکل اپنی بھتیجی کا گھر اس انداز میں برباد کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔" اسد نے خیال انگیز انداز میں کہا۔ "کیا جمشید فوزیہ کا سگا چچا ہے؟"

"نہیں!" شبانہ نے قطعیت سے جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ جمشید، فوزیہ کا سگا چچا نہیں۔ بس یوں سمجھیں کہ وہ... کا انکل ہے اور دوسری بات یہ کہ... انکل جمشید نے یہ ساری شیطانی ایک خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے کی ہے۔"

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے مسز وصی۔" اسد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آپ سے یہی سوال کرنے والا تھا کہ فوزیہ کی اچھی خاصی زندگی کو برباد کرنے میں جمشید کا کیا فائدہ تھا؟"

"میری معلومات کے مطابق انکل جمشید کا بیٹا علی نواز فوزیہ کو پسند کرتا ہے۔" شبانہ نے بتایا۔ "علی نواز کی ضد پوری کرنے کے لیے جمشید نے یہ سارا الٹا راگ چھیڑا تھا۔ وہ فوزیہ کو وصی سے آزاد کرانے کے بعد علی نواز سے اس کی شادی کرانا چاہتا تھا۔"

"لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے فوزیہ کے گھر والوں کی جانب سے آپ کی طلاق کا مطالبہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔" اسد نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "وہ ابتدا ہی میں فوزیہ کو فارغ کرنے کی بات کر سکتے تھے؟"

"اس ناٹک کی ایک خاص وجہ تھی۔" شبانہ نے بڑی روانی سے جواب دیا۔ "فوزیہ اور اس کے گھر کے تمام افراد یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وصی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنی زندگی سے مجھے خارج کرنا وصی کو کسی بھی قیمت پر قبول نہیں تھا۔ فوزیہ کے گھر والوں کے توسط سے یہ بات انکل جمشید کو بھی معلوم ہو گئی تھی لہٰذا وصی کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ راہ اختیار کی گئی۔ وہ جانتے تھے کہ وصی مجھے طلاق دینے کے لیے راضی نہیں ہوگا چنانچہ ان لوگوں کے مطالبے کے سامنے مجبور ہو کر اسے فوزیہ کو چھوڑنا پڑے گا۔ جب فوزیہ آزاد ہو جائے گی تو پھر اس کی علی نواز سے شادی کے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی لیکن وصی ان کے لیے اتنا آسان چارہ ثابت نہیں ہوا جتنا وہ سمجھ رہے تھے۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"جب فوزیہ روٹھ کر میکے بیٹھ گئی اور ادھر سے میری طلاق کا مطالبہ آ گیا تو وصی نے طلاق کی بات نہ مانتے ہوئے فوزیہ کو منانے اور گھر واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ جب فوزیہ کے گھر والوں نے دیکھا کہ وصی کسی بھی طور جھکنے کو تیار نہیں تو انہوں نے انکل جمشید کے تعاون سے عدالت میں خلع کا کیس دائر کر دیا۔ یہی ایک واحد قانونی راستہ تھا جسے اختیار کر کے فوزیہ کو وصی کی زوجیت سے آزاد کیا جا سکتا تھا۔ خلع کے دعوے کے بعد وصی، فوزیہ کو زبردستی اپنی بیوی بنا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔"

"یہاں تک مجھے آپ کی بات سے مکمل اتفاق ہے مسز وصی!" شبانہ خاموش ہوئی تو اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میرا سوال ابھی تک جواب طلب ہے۔"

"کون سا سوال؟" وہ عجیب سی نظر سے اسد کو دیکھنے لگی۔

"خلع کے کیس کا فیصلہ یقیناً فوزیہ کے حق میں ہوتا تھا یعنی عدالت اسے آزاد کر دیتی۔" اسد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "عدالت کے اس فیصلے کے بعد فوزیہ کے گھر والوں اور انکل جمشید کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ وہ بہ خوشی اپنا وہ مقصد پورا کر سکتے تھے جس کے لیے انہوں نے عدالت میں خلع کا کیس دائر کیا تھا پھر..." اسد نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے شبانہ کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔

"اس صورتِ حال میں وصی کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ وصی کی موت کو جمشید کے کھاتے میں کس طرح ڈالا جا سکتا ہے، ذرا اس نکتے کی وضاحت کریں گی آپ؟"

"انسپکٹر صاحب! میں نے یہ نہیں کہا کہ وصی کو انکل جمشید نے قتل کیا ہے یا کسی کرائے کے آدمی سے قتل کرایا ہے۔" شبانہ نے جواب دیا۔ "میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ وصی کی موت کے سلسلے میں ان لوگوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں انکل جمشید کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور... میرے اس خیال کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔"

"کیسی وجہ؟" اسد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"چائلڈ کسٹڈی والا کیس!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "وصی بچی کے حصول کے لیے کیس کرنے والا تھا۔ خلع کا کیس پہلے سے عدالت میں موجود تھا۔ چائلڈ

بے چاری بھوکی چیلیں... چوزے نہیں ملے تو ان کی پینٹنگ ہی لے اڑیں

کسٹڈی والا کیس اس کیس کو متاثر کر سکتا تھا یا کم از کم فوزیہ کو عدالتی تھپیڑوں میں کافی عرصے تک الجھا کر رکھ سکتا تھا۔ ممکن ہے اس سارے کھٹ راگ سے بچنے کے لیے وصی کو راستے کا پتھر سمجھ کر ہٹا دیا گیا ہو۔"

"ایسا عین ممکن ہے۔" اسد نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ چائلڈ کسٹڈی والے کیس کی اطلاع انکل جمشید کو ہو گئی ہو لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" شبانہ نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اسد نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں، بچی کی تحویل کے کیس کی خبر ابھی دوسری پارٹی تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے اس وکیل سے بھی تفصیلی بات کی ہے، وصی جس سے ملنے گیا تھا۔"

اسد نے شبانہ کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ جاوید برنی کا بہت گہرا دوست بھی تھا اور اسی کے بلاوے پر اس کیس پر کام شروع کیا تھا۔ شبانہ نے اسد کے خاموش ہونے پر استفسار کیا۔

"پھر ان وکیل صاحب نے آپ سے کیا کہا؟"

"جاوید برنی سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق چائلڈ کسٹڈی کیس کے بارے میں آپ دونوں میاں بیوی کے علاوہ صرف ایک شخص اور جانتا تھا۔" اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور وہ شخص... انکل جمشید نہیں۔"

"پھر..." شبانہ کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ "کون ہے وہ شخص؟"

"اس شخص کا نام ہے جنید خان۔" اسد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "جو کسی پرائیویٹ چینل کے لیے ڈرامے ڈائریکٹ کرتا ہے۔"

"اوہ...!" شبانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

اسد نے پوچھا۔ "کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟"

"صرف نام اور کام کی حد تک۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "ابھی تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"آپ کے چہرے پر ابھرنے والی کوفت اور خفگی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ جنید خان کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔" اسد نے شبانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ بجا فرما رہے ہیں۔" شبانہ نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔

"اس ناپسندیدگی کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟"

"ایک ہی وجہ ہے۔" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ "لیکن بات لمبی ہو جائے گی۔"

"آپ بات کے لمبی یا مختصر ہونے کی فکر نہ کریں مسز وصی!" اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں آپ کی ہر بات پورے انہماک اور توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ کے شوہر کو کسی شقی القلب شخص نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور میں جلد از جلد آپ کے شوہر کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس کام میں آپ ہی میری بہتر راہنمائی کر سکتی ہیں۔ وصی کی اندوہ ناک موت کی ذمے داری کے حوالے سے آپ کو جس جس پر بھی شک ہے، آپ کھل کر بتائیں جیسا کہ آپ نے فوزیہ کے انکل جمشید کا ذکر کیا ہے۔" لمحاتی توقف کر کے اسد نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے شبانہ کو دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا یہ جنید خان بھی مشکوک افراد کے سلسلے کی کڑی ہے؟"

شبانہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

جاوید برنی نے نمبر ڈائل کیے اور رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو اسد! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ٹھاک!" اسد نے جواب دیا۔ "تم سناؤ، وصی مرڈر کیس کے حوالے سے کوئی اور کلیو ملا؟"

"اس کیس کی تفتیش تم کر رہے ہو یا میں؟" برنی نے

پوچھا۔

"ظاہر ہے، میں کر رہا ہوں۔" اسد نے کہا۔ "تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یار! سیدھی سی بات ہے۔" برنی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے کہ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ میرے پاس جس حد تک معلومات تھیں، وہ میں نے تمہیں فراہم کر دی ہیں۔"

"ہوں۔" اسد نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "کل شام مقتول کی بیوی شبانہ سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ دو مشکوک نام سامنے آئے تو ہیں۔ ان دونوں افراد سے ملنے کے بعد کوئی واضح صورت سامنے آ سکے گی۔"

برنی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "وہ دونوں مشتبہ افراد کون ہیں؟"

"ایک تو فوزیہ کے کوئی انکل جمشید صاحب ہیں۔" اسد نے بتایا۔ "یہ وہی شخص ہے جس نے خلع والے کیس میں فوزیہ اور اس کے گھر والوں کی راہنمائی کی تھی۔ شبانہ کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ جمشید کا بیٹا علی نواز، فوزیہ سے شادی کا خواہاں ہے اور جمشید نے یہ سارا چکر اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنے کے لیے کیا تھا۔"

"ہاں... اس فتنہ پرور شخص کا ذکر مقتول وصی نے بھی مجھ سے کیا تھا۔" برنی نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "اور دوسرا مشکوک شخص کون ہے؟"

"وہ تمہارا دوست ہے... جنید خان، ڈراما ڈائریکٹر!" اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" برنی نے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وصی کی موت کے حوالے سے مقتول کی بیوہ شبانہ کو تمہارے دوست پر بھی شک ہے۔" اسد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جنید خان کو سخت ناپسند کرتی ہے۔"

"بات ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کی نہیں ہے اسد!" برنی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں، جنید خان اس لائن کا بندہ نہیں ہے۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے معاملے میں خراب یا متضاد اور متنازعہ شہرت کا حامل ضرور ہے مگر قتل و غارت گری جیسے کاموں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔"

"جو بھی ہے، وہ سامنے آجائے گا۔" اسد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نے آج انکل جمشید اور جنید خان دونوں کو مختلف اوقات میں ٹرائی کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ جو بھی نتیجہ برآمد ہوگا، شام تک تمہیں آگاہ کر دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔" برنی نے کہا۔

"لیکن ایک وعدہ کرو برنی!"

"کیسا وعدہ؟"

"تم اپنے دوست کو کوئی ٹپ نہیں دو گے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یار!" برنی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جنید خان میرا دوست ضرور ہے لیکن اگر اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو میں اس کی حمایت میں ایک لفظ نہیں کہوں گا۔ دوستی اپنی جگہ اور اصول اپنی جگہ۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک مشتعل انداز میں سانس خارج کی پھر بولا۔

"تم تو اچھی جانتے ہو اسد... میں قانون کی بالادستی کا حامی ہوں۔ عدالت کے اندر بھی اور عدالت کے باہر بھی میں قانون کے دائرے سے باہر نکل کر کوئی کام نہیں کرتا۔"

"اچھی طرح ہی نہیں، بہت اچھی طرح معلوم ہے۔" اسد نے تائیدی انداز میں کہا۔ "اور میں سمجھتا ہوں، ہماری اس دیرینہ دوستی کا سبب بھی تمہارا یہی کھرا پن ہے۔"

"جسے اکثر لوگ کھرا پن کہتے ہیں۔" برنی نے بدمزگی سے کہا۔ "اور میری اس عادت سے اپنے اور بیگانے مجھ سے ناخوش ہی نظر آتے ہیں اور جو جتنا زیادہ قریب ہے، وہ میرے اصولوں سے اتنا ہی نالاں رہتا ہے۔"

"لیکن میرا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا... وکیل صاحب۔"

"بالکل ایسی ہی بات ہے۔" برنی نے اپنے دوست کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابھی تک تم نے مجھے اسکیچ کے حوالے سے کوئی رپورٹ نہیں دی؟"

"اوہ... ہاں۔" اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے سیکیورٹی گارڈ مراد کی یادداشت اور مشاہدے کے سہارے اپنے آرٹسٹ سے مشکوک شخص کا جو اسکیچ بنوایا تھا، اس کی کاپیاں کرانے کے بعد نہایت ہی خفیہ طریقے سے اس شخص کی تلاش کا کام جاری رکھے ہوئے ہوں۔ امید ہے، میں بہت جلد اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"میری دعا ہے، ایسا ہی ہو۔" برنی نے خلوص دل سے کہا۔

الوداعی کلمات ادا کرنے کے بعد اسد نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

☆☆☆

انکل جمشید سے اسد نے کوئی دو گھنٹے پوچھ گچھ کی لیکن

وہ کسی خاطر خواہ نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ اس "پوچھ گچھ" میں نرم اور سخت دونوں قسم کا رویہ اپنایا گیا مگر جمشید نے وصی کے قتل کے حوالے سے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کر دیا بلکہ الٹا اسد سے اس نے پوچھا تھا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ ہی بتائیں، وصی کو قتل کرنے میں میرا کون سا مفاد تھا۔ خلع والے کیس میں لازمی طور پر وصی کو گھٹنے ٹیکنا پڑتے۔ عدالت ایک آدھ پیشی میں فوزیہ کے حق میں فیصلہ سنا دیتی۔ اللہ اللہ خیر سلا!"

"اور پھر فوزیہ کے آزاد ہوتے ہی تمہاری امید بر آتی۔" اسد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کچھ عرصے کے بعد تم اپنے بیٹے علی نواز سے اس کی شادی کر دیتے۔ یہی تھی نا تمہاری پلاننگ؟"

"آپ کو کسی نے مس گائیڈ کیا ہے جناب۔" جمشید نے سادگی سے کہا۔

"مجھے کسی نے مس گائیڈ نہیں کیا۔" اسد نے سخت لہجے میں کہا۔ "فوزیہ کے عدالتی معاملات کے پیچھے تمہاری نقل و حرکت بڑی واضح دکھائی دیتی ہے۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا تو پھر تم نے فوزیہ کے گھر کو کیوں برباد کر دیا؟"

"جناب! میں پھر یہی کہوں گا کہ کسی نے غلط سلط باتیں کر کے آپ کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔" جمشید نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ فوزیہ کے خلع والے کیس میں، میں پیش پیش رہا ہوں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کام کے لیے فوزیہ کے گھر والوں نے مجھ سے درخواست کی تھی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اسد نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"فوزیہ اور اس کے گھر والے وصی سے صرف یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر وہ فوزیہ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ساتھ رکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔" جمشید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اور وصی اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ جب کسی بھی طور وصی نے ان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا اور میں نے انہیں نہ صرف یہ کہ بالکل درست مشورہ دیا بلکہ ان کی بھرپور مدد بھی کی۔"

"خلع کا مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ...؟" اسد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

جمشید نے جواب دیا۔ "عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اس مسئلے کا اور کوئی حل ہی نہیں تھا۔ یہ تو ایک اتفاق ہے کہ وصی کو کسی نے بڑے بھیانک انداز میں قتل کر دیا ورنہ ایک آدھ پیشی میں عدالت کا فیصلہ تو فوزیہ کے حق میں آنے ہی والا تھا۔"

"اچھا، ایک بات بتاؤ جمشید!" اسد نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ "فوزیہ اور مقتول کی پہلی بیوی ایک ساتھ راضی خوشی رہ رہی تھیں۔ ایک سال تک تو فوزیہ کے والدین کو اس کے حقوق کا اس انداز میں خیال نہیں آیا کہ وصی سے پہلی بیوی کی طلاق کا مطالبہ کیا جاتا لیکن بچی کی پیدائش کے بعد یہ بات اتنا بڑا ایشو کیوں بن گئی تھی؟ یہ کھلی بلیک میلنگ نہیں ہے۔ تم لوگوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عافیہ کی پیدائش کے بعد فوزیہ کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وصی نے اولاد کے حصول کی خاطر دوسری شادی کی تھی لہٰذا عافیہ کی وجہ سے وہ جذباتی اور اخلاقی طور پر خاصا بے بس ہو گیا تھا۔"

"میں نے عرض کیا ہے جناب... کہ فوزیہ کی وصی سے علیحدگی یا وصی کی پہلی بیوی کی طلاق کے مطالبے والے معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" جمشید نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اس بارے میں آپ فوزیہ اور اس کے والدین سے تفتیش کریں تو زیادہ مفید ثابت ہوگا۔"

"ان کو تو ضرور شامل تفتیش کیا جائے گا۔" اسد نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو معاملہ تم سے تعلق رکھتا ہے، پہلے اس کو تو کلیئر کر دو..."

جمشید نے سوالیہ نظر سے اسد کو دیکھا۔ اسد نے استفسار کیا۔

"فوزیہ کی حیثیت اب ایک بیوہ کی سی ہے۔ اگر آگے چل کر اس کی شادی تمہارے بیٹے علی نواز سے ہو جاتی ہے پھر تم اس بارے میں کیا کہو گے؟"

"اگر ایسا ہو جاتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔" جمشید نے بے ساختہ کہا۔

"یعنی تمہیں اپنے بیٹے کی خواہش کی تکمیل کا بہت خیال ہے۔" اسد نے تیکھے انداز میں کہا۔ "اسی لیے تمہیں اس بات کی بہت زیادہ خوشی ہوگی؟"

"اولاد کی خوشیوں کا احساس کس باپ کو نہیں ہوتا" جمشید نے گول مول جواب کی مدد سے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ "اور پھر علی نواز تو میرا اکلوتا بیٹا ہے۔"

"اور یہی اکلوتا بیٹا اتفاق سے فوزیہ کو پسند بھی کرتا ہے؟"

"کسی کی پسند یا ناپسند پر کوئی پابندی تو عائد نہیں کی

سکتی نا۔'' جمشید نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

''پابندی تو عائد نہیں کی جاسکتی، جب تک یہ پسند اور ناپسند اپنے مقام پر رہے۔'' اسد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی شخص اپنی پسند یا ناپسند کی تکمیل کے لیے قانون کو ہاتھ میں لے لے تو پھر اس پر کڑی سے کڑی پابندی عائد کی جاسکتی ہے اور اسے عدالت میں پیش کر کے جیل یا پھر پھانسی پر بھی بھیجا جاسکتا ہے لہٰذا...'' اسد نے تھوڑا سا وقفہ دیا پھر اسی دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''اگر اس کیس کی تفتیش کے دوران میں کسی مرحلے پر مجھے محسوس ہوا کہ تم یا تمہارا اکلوتا سپوت کسی بھی زاویے سے وصی کے قتل میں ملوث ہیں تو پھر تم بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں تمہارا کیا حشر کرسکتا ہوں...؟''

''مجھے یقین ہے انسپکٹر صاحب!'' جمشید بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ایسا موقع کبھی نہیں آئے گا۔''

''ایسا موقع نہ ہی آئے تو تمہارے حق میں بہتر رہے گا...!'' اسد کے لہجے کی سنگینی بدستور قائم تھی۔

جمشید چپ چاپ اسد کو دیکھتا چلا گیا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟'' اسد نے اچانک سوال داغ دیا۔

جمشید کے چہرے پر الجھن آمیز حیرت نمودار ہوئی۔ اس کی زبان سے دو الفاظ پھسل گئے۔ ''کس کو...؟''

اسد اس کے استفسار کو نظر انداز کر کے یکا یک انداز میں اپنی میز کی دراز کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

جائے وقوعہ سے دیگر شہادتوں کے ساتھ ہی انسپکٹر اسد نے مختلف مقامات سے فنگر پرنٹس بھی اٹھائے تھے۔ خصوصاً لفٹ نمبر تین کی اندرونی دیواروں اور ہینڈل سے۔ یہ وہی لفٹ تھی جس کے اندر سے وصی کی لاش دریافت ہوئی تھی جس نامعلوم اجنبی شخص نے سب سے پہلے وصی کی لاش کو دیکھا تھا، وہ ابھی تک اسد کی گرفت میں نہیں آسکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس پُراسرار بندے کو زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔ اگر وہ شخص اسد کے ہتھے چڑھ جاتا تو وصی کی اندوہناک موت کا معما حل ہوسکتا تھا۔

اب تک اس کیس کے سلسلے میں اسد نے جس کسی کو بھی شاملِ تفتیش کیا تھا، سب سے پہلے اس کے فنگر پرنٹس کا موازنہ لفٹ کے اندر سے حاصل ہونے والے فنگر پرنٹس سے کیا تھا۔ یہی عمل جمشید اور اس کے بیٹے کے ساتھ بھی دہرایا گیا تھا۔ لیکن تاحال اس سلسلے میں کامیابی کی کوئی کرن نہیں پھوٹی تھی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے اسد کے بھیجے ہوئے پولیس اہلکار جنید خان کو اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔ جنید خان گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک میانہ قد شخص تھا۔ اس کے سر پر ''ایم'' واضح ہو چکا تھا اس کے باوجود بھی وہ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ شخص نظر آتا تھا۔ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ہی خوش لباس بھی تھا۔ تفتیش کی ابتدا اس نے فنگر پرنٹس کے موازنے سے کی۔ جنید خان اس ٹیسٹ میں کامیاب ہوگیا۔ لفٹ نمبر تین کے اندر سے حاصل ہونے والے مختلف افراد کی انگلیوں کے نشانات میں جنید خان کے فنگر پرنٹس نہیں تھے۔ علاوہ ازیں جنید خان کے پُراعتماد انداز گفتگو نے بھی اسد کو یقین دلا دیا کہ وہ وصی شاہ کے قتل میں ملوث نہیں ہوسکتا تھا۔

''سر! آپ ایک نکتے پر غور کریں۔'' جنید نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جو شخص میرے ایک پراجیکٹ میں پندرہ لاکھ کی خطیر رقم انویسٹ کرنے میں اپنی دلچسپی ظاہر کر چکا تھا، میں اس کی جان لینے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں؟''

اس کی بات کے جواب میں اسد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اپنی موت سے قبل مقتول وصی نے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزارا تھا، لہٰذا آپ سے پوچھ گچھ تفتیش کا لازمی جزو ہے اور اس صورت میں تو اور بھی لازمی قرار پاتا ہے جب مقتول کی بیوہ نے بھی آپ پر شک کا اظہار کیا ہے۔''

''کیا بھابی شبانہ نے اپنے شک کا کوئی جواز بھی دیا ہے؟''

''جواز تو نہیں دیا تاہم اسے آپ پر بالکل بھروسا نہیں ہے۔'' اسد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں، وہ آپ کو سخت ناپسند کرتی ہے۔''

''یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آسکی سر!'' جنید خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تو وہ کوئی وہمی اور شکی عورت لگتی ہے۔ میری بیوی بتارہی تھی کہ وہ خاصی بدتمیز بھی ہے۔''

''ہوں...!'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''مسٹر جنید! شوبز کی دنیا بڑی دل پھینک، بولڈ اور فارورڈ ہے۔ ہوسکتا ہے، شبانہ کو آپ کی کوئی بات بُری لگ گئی ہو۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انسپکٹر صاحب!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''آج تک میں شبانہ بھابی سے ملا ہوں اور نہ ہی بات ہوئی ہے۔ میری کوئی بات ناگوار گزرنے کا کیا سوال...!''

''پھر وہ آپ سے خفا اور برہم کیوں نظر آتی ہے؟'' اسد نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو صرف ایک ہی بات آرہی ہے سر...!'' جنید خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''شبانہ بھابی کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ وصی کسی ڈراما سیریل میں پندرہ لاکھ کی رقم انویسٹ کرے جبکہ وصی ذہنی طور پر اس کام کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ بھابی کی ناپسندیدگی اور مخالفت کے بارے میں وصی نے مجھے بتایا تھا۔ اس کے مطابق، شبانہ بھابی کا یہ خیال تھا کہ میں وصی کے ساتھ فراڈ کر کے اتنی بڑی رقم ڈبو دوں گا۔''

''اوہ...!'' اسد کے کان کھڑے ہوگئے۔ ''مقتول وصی نے ڈراما سیریل کے سلسلے میں آپ کو اب تک کتنی رقم دی تھی؟''

''ایک پیسا بھی نہیں... ابھی تو صرف پلاننگ ہورہی تھی۔'' جنید نے جواب دیا۔ ''آپ میری اس بات کی تصدیق شبانہ بھابی سے بھی کرسکتے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے، میں ان سے اس بارے میں ضرور پوچھوں گا۔'' اسد نے سرسری انداز میں کہا۔

جنید خان آگے کو جھک آیا اور ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا شبانہ بھابی نے رقم کے لین دین کی کوئی بات کی ہے آپ سے؟''

''نہیں!'' اسد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''وہ ایسی بات کر ہی نہیں سکتیں۔'' جنید خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا...؟'' اسد نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں، جنید خان کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

☆☆☆

رات کے نو بجے تھے۔ انسپکٹر اسد اس وقت شبانہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ جنید خان کے انکشافات نے اسے بلا کر رکھ دیا تھا۔ جب اسد نے مشکوک شخص کا اسکیچ جنید کو دکھا کر پوچھا کہ کیا وہ اس بندے کو جانتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا حالانکہ اس سے پہلے اسد نے جمشید سمیت جس سے بھی اسکیچ کے حوالے سے سوال کیا، جواب نفی ہی میں آیا تھا۔ جنید خان کے مثبت اور سنسنی خیز جواب نے اسد کو فی الفور شبانہ سے ملاقات پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو شبانہ کو تھانے بلا کر بھی پوچھ تاچھ کرسکتا تھا تاہم اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر اسد کی ایک مستند ساکھ تھی۔ اس کی ذات کے حوالے سے کبھی کوئی منفی بات منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔

شبانہ نے اسد کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ کے جوش کو دیکھ کر لگتا ہے آپ نے وصی کے قاتل کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔''

''انشاء اللہ! آج کی تاریخ میں یہ بھی ہوجائے گا۔'' اسد نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ کو میری مد[د] کرنا ہے۔''

''جی بتائیں، میں کیا کرسکتی ہوں؟'' شبانہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

اسد نے مشکوک شخص کے اسکیچ کو شبانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ بندہ ہے جس نے وصی کی لاش سب سے پہلے دیکھا تھا، پھر یہ جائے وقوعہ سے اچانک غائب ہوگیا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے، یہ شخص وصی کا کوئی قریبی رشتے [دار] ہے۔''

مذکورہ اسکیچ کو دیکھ کر شبانہ کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ تو شاکر سے بہت ملتا ہے۔''

''شاکر کون...؟'' اسد نے چبھتے انداز میں پوچھا۔

''شاکر، وصی کا کزن ہے۔'' شبانہ نے جواب د[یا]۔ ''میں نے ایک آدھ بار ہی اسے دیکھا ہے۔ ان لوگو[ں کا] ہمارے گھر میں آنا جانا نہیں ہے۔''

''مگر یہ بندہ وصی کے آفس میں دیکھا گیا ہے۔'' [اسد] نے جنید خان کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں [کی]۔ ''وصی نے اپنے ایک دوست سے اس کا تعارف اپنے ر[شتے] دار کی حیثیت سے کرایا تھا۔''

''مجھے تو یہ نوّے فیصد شاکر ہی لگ رہا ہے۔'' شبانہ [نے] کہا۔ ''باقی دس فیصد کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''وہ دس فیصد دریافت کر کے میں خود شاکر علی [سے] تصدیق کرلوں گا۔'' اسد نے شبانہ کے ہاتھ سے اسکیچ [واپس] لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے بتائیں گی، یہ شاکر رہتا [کہاں] ہے؟''

''جی ضرور بتاؤں گی۔'' شبانہ نے مفاہمت آمیز [انداز] میں کہا۔ ''آپ شاکر علی کا پتا نوٹ کرلیں۔''

اسد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

پُرعزم اور بہادر لوگ اپنے الفاظ کی حرمت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اسد نے بھی شبانہ کے سامنے کیے وعدے کی لاج رکھ لی تھی۔ اس دن کی تاریخ کے اختتام سے پہلے، رات ساڑھے گیارہ بجے شاکر کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے گرفتاری دیتے وقت اچھی خاصی مزاحمت بھی کی تھی جس سے اس کے جرم کے ثبوت اور بھی پکے ہوگئے۔ رات کا باقی نصف حصہ شاکر کو کڑی تفتیش سے گزارا گیا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے وصی کو شوٹ نہیں کیا تھا بلکہ اس کام کے لیے اس نے کرائے کے ایک قاتل کی خدمات حاصل کی تھیں۔

مذکورہ قاتل نے ایک ہفتے کے اندر اس کا ''کام'' کرنے کا یقین دلایا تھا۔ یہ شاکر کی بدقسمتی تھی کہ وہ وقوعہ کی رات اپنے ایک ضروری کام سے اس بلڈنگ میں آیا تھا۔ اسے متعلق خبر نہیں تھی کہ اس کا خریدا ہوا قاتل اس بلڈنگ کی لفٹ میں وصی کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ جب لفٹ کھلی اور اس نے وصی کی لاش کو خون میں لت پت دیکھا تو بے ساختہ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی... لاش!

اس سنگین صورتِ حال نے شاکر کو بُری طرح بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ جیسے ہی اسے موقع ملا، وہ جائے وقوعہ سے رفو چکر ہوگیا مگر اس کی ایک اور بدقسمتی کہ سیکیورٹی گارڈ مراد کی یادداشت میں اس کا حلیہ محفوظ رہ گیا اور بعدازاں انسپکٹر اسد نے اس کے اسکیچ کی مدد سے بالآخر اس تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ شاکر کی نشاندہی پر مختلف مقامات پر چھاپے مار کر وصی کے قاتل کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

شاکر علی نے اپنے حلفیہ بیان میں اقرار کیا کہ اس نے دولت کے لالچ میں وصی کو قتل کرایا تھا۔ ان کے دادا کی جو جائداد بٹنے والی تھی، اس کا ایک حصے دار وصی بھی تھا۔ اگر وصی کو راستے سے ہٹا دیا جاتا تو پندرہ لاکھ کی وہ رقم باقی لوگوں میں تقسیم ہوجاتی اور اتفاق سے باقی لوگوں میں صرف شاکر علی اور اس کی بہن بشریٰ ہی تھے۔ بشریٰ کی شادی ہوچکی تھی۔ شاکر علی نے دولت کے لالچ میں ایک انتہائی سنگین قدم اٹھایا لیکن یہ سودا اسے انتہائی مہنگا پڑ گیا۔

''دولت کی ہوس نے شاکر کو اندھا کردیا تھا۔'' برنی نے اس کیس کے متعلق انجام تک پہنچنے کے بعد اسد سے کہا۔ ''اور یہ اندھی دولت اس کے کسی کام نہ آسکی۔''

''برنی! لالچ چاہے کسی شے کا بھی ہو، اسے بُری بلا کہا گیا ہے تو بالکل ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔'' اسد نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بلا جس شخص کے پیچھے پڑ جائے، جہنم تک اس کا تعاقب کرتی ہے۔''

''مبارک ہو اسد! تم نے یہ کیس حل کرلیا۔'' برنی نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''معمائے موت کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔''

''خیر مبارک...!'' اسد نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''امید ہے، تم بھی بہت جلد مجھے مبارک باد کہنے کا موقع فراہم کروگے۔''

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' برنی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میری تمام تر ہمدردی شبانہ کے ساتھ ہے۔ وصی کے حق کو چھیننے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ گویا ایک طرح سے شبانہ کو اس کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ شبانہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہو... تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

جاوید برنی نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''تم نے مجھ سے کہیں زیادہ قانون کی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔'' اسد اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کوئی ایسا راستہ نکالو کہ وصی کے حصے میں آنے والے پندرہ لاکھ شبانہ کو مل جائیں۔''

''میں ایسا راستہ اسی صورت نکال سکتا ہوں جب اس کام میں شبانہ کی مرضی شامل ہو۔'' برنی نے حقائق کی روشنی میں کہا۔

''میں شبانہ کو اس کام کے لیے آمادہ کرلوں گا۔'' اسد نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''اور بھی کسی سلسلے میں اگر میری مدد کی ضرورت پیش آئے گی تو میں بھرپور تعاون کروں گا۔''

''اگر تمہارا تعاون شاملِ حال رہا تو شبانہ کو اس کا حق مل کر رہے گا۔'' برنی نے بڑے جوش سے کہا۔

''انشاءاللہ...!'' اسد نے دایاں ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

برنی نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ مصافحہ اس امر کی دلیل تھا کہ عنقریب شبانہ کو پندرہ لاکھ کی رقم مل جائے گی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ... کیا یہ خطیر رقم اس نقصان کی تلافی کرسکتی تھی جو وصی کی موت کی شکل میں شبانہ نے اٹھایا تھا۔

اس سوال کو کہیں سے بھی گھما پھرا کر دیکھیں، ایک ہی جواب ملتا ہے... ہرگز نہیں...!